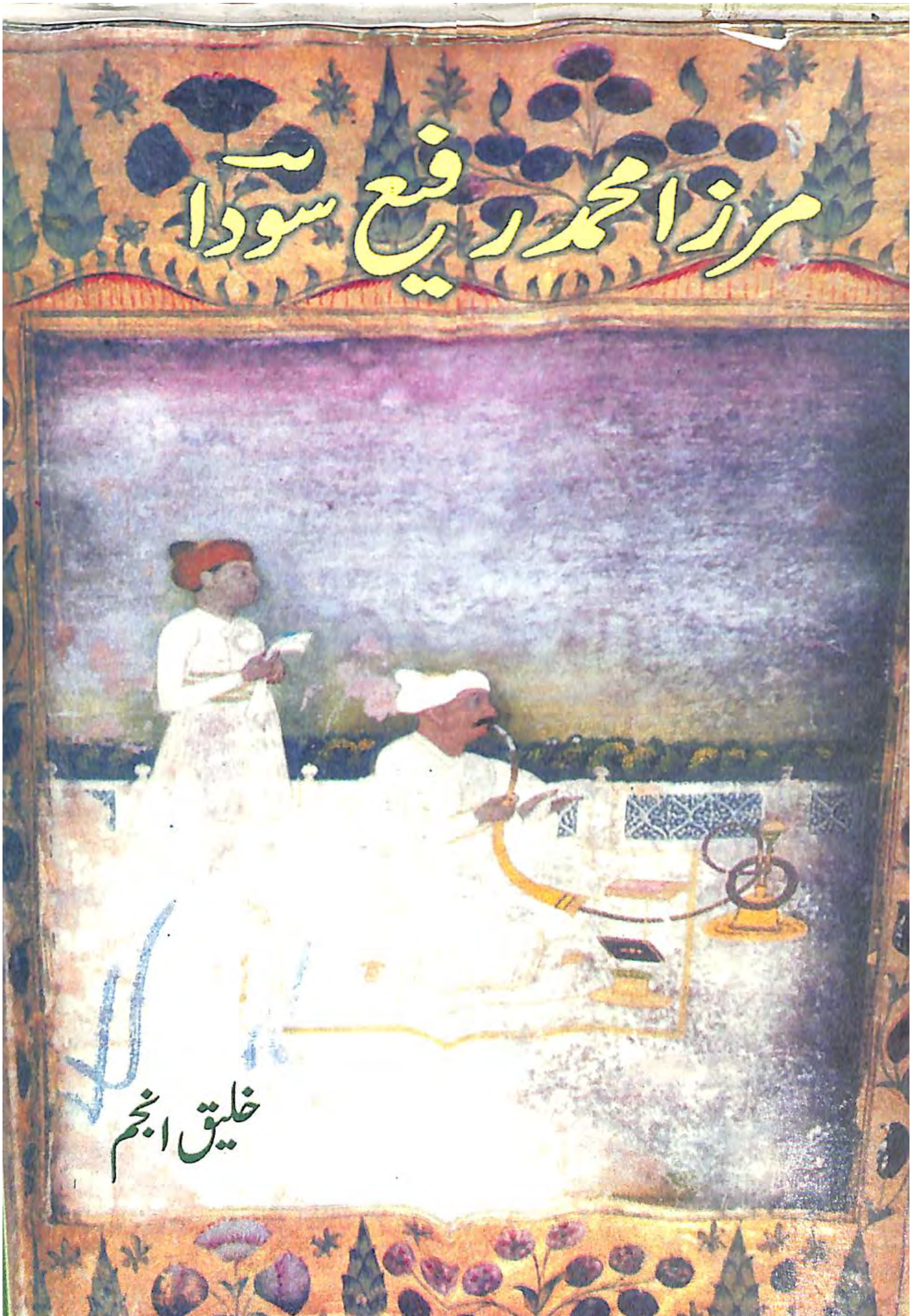

مرزا محمد رفیع سودا

خلیق انجم

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع سودا

خلیق انجم

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک-I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Mirza Mohd. Rafi Sauda
By
Khaliq Anjum

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی-ستمبر 2003 شک 1925

پہلا اڈیشن : 500

قیمت : =/219

سلسلۂ مطبوعات : 1097

سرورق : محمد ساجد

کمپوزنگ : انجمن کمپیوٹر سینٹر، انجمن ترقی اردو (ہند)

ISBN : 81-7587-010-9

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

طابع : جے۔کے۔آفسٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی - 110006

فہرست

پیش لفظ -- حمید اللہ بھٹ	۱۳
اس کتاب کے بارے میں (آلِ احمد سرور)	۱۵
حرفِ آغاز -- خلیق انجم	۱۷
سیاسی و سماجی حالات	۲۱
مغل حکومت کا زوال اور اس کے اثرات	۳۵
زوال کے اثرات	۳۷
اقتصادی بدحالی	۳۷
فوجی کمزوری	۴۱
اہلِ ہنر کا ترکِ وطن	۴۵
زندگی سے فرار	۴۷
ذکرِ کیفیتِ ناگل	۵۳
سوانح	۵۹
آبا و اجداد	۶۱
مرزا کے چچا	۶۲
نعمت خانِ عالی	۶۲
مرشد قلی خاں	۶۴
مرزا شفیع	۶۹
مرزا کا نام	۷۰
ولادت	۷۰
ابتدائی زندگی	۷۵
تعلیم و تربیت	۷۷
ریختہ گوئی کی ابتدا	۷۸
مرزا کا تخلص	۸۲
تلمذ	۸۲
ملک الشعرائی کا خطاب	۸۶
میر غلام حیدر مجذوب	۸۹

سودا کا نواسہ	۹۱
سودا کا اخلاق	۹۲
ظرافت	۹۶
آبِ حیات میں سودا کے لطائف	۹۸
موسیقی دانی	۱۰۶
کتے پالنے کا شوق	۱۰۷
ترکِ وطن	۱۰۹
سودا اودھ میں	۱۱۷
وفات	۱۲۴
تنقید	۱۳۱
ادبی پس منظر	۱۳۳
فارسی کا عہدِ زوال اور اردو شاعری شمالی ہند میں	۱۳۳
اردو شاعری کا آغاز	۱۳۹
سودا کی غزل گوئی	۱۵۴
سودا اور فارسی شاعر	۱۶۲
داخلیت	۱۶۶
تصورِ حسن و عشق	۱۶۸
محبوب	۱۷۳
تصوف	۱۷۸
واعظ و زاہد	۱۸۱
بے ثباتی	۱۸۲
قناعت	۱۸۴
احساسِ تشنگی	۱۸۸
غم پرستی	۱۹۰
زورِ بیان	۱۹۳
نشاط آمیزی	۱۹۹
سادگیِ بیان	۲۰۳
مشکل زمینیں	۲۰۷
ایہام گوئی	۲۱۱
مزاح و ظرافت	۲۱۲
قطعات	۲۱۸
عریانیت	۲۲۰
تمثیل نگاری	۲۲۱
خیال بندی	۲۲۲
حسنِ تعلیل	۲۲۶

تشبیہات و استعارات ۲۲۸
قصیدہ نگاری ۲۳۰
مطلع ۲۳۵
تشبیب ۲۳۷
گریز ۲۴۲
مدح ۲۴۶
عدل و انصاف ۲۴۸
شجاعت و بہادری ۲۵۲
فیاضی ۲۵۴
مروّت ۲۵۵
دعایا حُسنِ طلب ۲۵۶
ہجو گوئی ۲۵۷
ادبی معرکے ۲۶۶
سوداؔ اور قائمؔ ۲۶۹
سوداؔ اور ندرتؔ کاشمیری ۲۷۱
مرزا مظہرؔ جانجاناں ۲۷۳
سوداؔ اور بقاؔ ۲۷۴
میر تقی مرثیہ گو ۲۷۵
میر تقی میرؔ اور سوداؔ ۲۷۸
سوداؔ اور فدویؔ ۲۸۳
جعفر علی حسرتؔ اور سوداؔ ۲۸۷
میر سوزؔ اور سوداؔ ۲۸۸
فاخر مکینؔ اور سوداؔ ۲۸۹
میر غلام حسین ضاحکؔ اور سوداؔ ۲۹۶
مذہبی ہجویں ۳۰۳
دیگر ہجویں ۳۰۷
مصحفیؔ اور سوداؔ ۳۱۲
مرثیہ نگاری ۳۱۹
چہرہ ۳۲۹
سراپا ۳۳۰
رخصت ۳۳۱
آمد ۳۳۲
رجز ۳۳۳
شہادت ۳۳۶
دعا ۳۴۰
شہر آشوب ۳۴۲
مثنوی نگاری ۳۵۴
ہجویہ ۳۵۶

مدحیہ	۳۵۹
اخلاقیہ	۳۶۲
خطوط	۳۶۸
تنقیدی	۳۶۸
منظر نگاری	۳۶۹
عشقیہ	۳۷۱
واسوخت	۳۸۰
رباعیات	۳۸۴
عشقیہ	۳۸۵
متصوفانہ	۳۸۵
مذہبی	۳۸۷
اخلاقی	۳۸۸
مدحیہ	۳۸۹
ہجویہ	۳۸۹
تعلّی	۳۹۰
پہیلیاں	۳۹۰
سودا تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں	۳۹۳
سودا کی تصانیف	۴۱۵
نثر	۴۱۷
کلیاتِ سودا	۴۲۰
نسخۂ حبیب	۴۲۰
نسخہ رچرڈ جونسن	۴۲۱
کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخے	۴۲۲
نسخۂ مصطفائی	۴۲۴
نسخۂ نول کشوری	۴۲۵
نسخۂ آسی	۴۲۵
عکس نسخہ رچرڈ جونسن	۴۲۸
نسخۂ رچرڈ جونسن اور نسخۂ حبیب کا اشاریہ	۴۳۰
سودا کا الحاقی کلام	۴۶۸
سودا کا غیر مطبوعہ کلام	۴۸۸
سودا کے شاگرد	۵۲۳
۱- احسن، مرزا احسن علی	۵۲۸
۲- اسد، میر امانی	۵۳۳
۳- بسمل، مرزا بچھو بیگ	۵۳۷
۴- جرأت، مرزا مغل	۵۳۸
۵- جینا، جینا بیگم	۵۳۹

۶- حجام، عنایت اللہ ۵۴۰
۷- حسن، میر محمد حسن دہلوی ۵۴۳
۸- راقم، بندرابن ۵۴۴
۹- رضا، مرزا احسن ۵۴۹
۱۰- شرف، شیخ شرف
الدین حسین ۵۵۳
۱۱- شیدا، میر فتح علی ۵۵۴
۱۲- عظیم، مرزا عظیم بیگ ۵۵۶
۱۳- فدا، لچھمی رام پنڈت ۵۶۲
۱۴- قائم، قیام الدین ۵۶۳
۱۵- قربان، میر جیون ۵۶۵
۱۶- لطف، مرزا علی ۵۶۷
۱۷- ماہر، فخر الدین ۵۷۳
۱۸- مجذوب، غلام حیدر ۵۷۶
۱۹- محب، شیخ ولی اللہ ۵۷۹
۲۰- معین، شیخ محمد معین الدین ۵۸۵
۲۱- ممتاز، حافظ فضل علی ۵۸۸
۲۲- نالاں، میر احمد علی ۵۹۴
۲۳- منشا، منشی سدا سکھ ۵۹۵
۲۴- نظیر، ۵۹۶
۲۵- وحشت، میر ابوالحسن ۵۹۶
۲۶- ہاشمی، میر ہاشم علی ۵۹۹
حاصلِ سخن ۶۰۱
اشعارِ سودا کا انگریزی ترجمہ ۶۰۶
کتابیات ۶۳۵
اشاریہ ۶۴۹

عکس

۱- نسخۂ رچرڈ جونسن کے دو صفحے ۴۲۸
۳- گل کرسٹ کی
ایک کتاب کا سرورق ۶۰۷
۴- سودا کی کہی ہوئی ایک
تضمین کی طرز ۶۳۴

یہ طرز مسٹر برڈ نے بنائی تھی۔ جس کا عکس گل کرسٹ نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

اپنی آپا
طلعت سعید
کے نام

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب دھیرے دھیرے نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ ماضی کا قیمتی ورثہ ہے۔ اس لیے اس سے واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اپنی روایات کی پاسداری کریں اور اپنی جڑوں کی شناخت کر سکیں۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہلِ فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہد حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے ایک حد تک اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو ہمیں تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

اس کتاب کے بارے میں

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس قابلِ قدر تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ سودا کی عظمت تو شروع سے مسلّم رہی ہے لیکن سودا کی یہ بدقسمتی اور اردو کے محققوں اور نقادوں کی یہ بدتوفیقی ہے کہ نہ تو اُن کے کلیات کا کوئی صحیح اڈیشن اب تک شایع ہوا ہے اور نہ شیخ چاند اور حال میں محمد حسن کے علاوہ کسی نے سودا کی حیات، شخصیت اور کلام کے سیر حاصل جائزے کی ضرورت سمجھی۔ شیخ چاند کی کتاب قابلِ قدر ہے مگر اب خاصی پرانی ہوگئی ہے۔ اس لیے جدید تحقیق کے معیار سے سودا پر ایک نئی اور سیر حاصل کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ خلیق انجم نے اس ضرورت کو بڑی خوبی سے پورا کیا ہے۔

پہلے حصے میں جو سماجی پس منظر ہے اس میں بادشاہوں کے جشن و جلوس کی طویل داستان نہیں۔ اس زمانے کے سیاسی تغیرات، اقتصادی مسائل اور علمی رجحانات پر واضح اشارے ہیں۔ اس فراریت کا بھی بہت دل چسپ تذکرہ ہے جس کا ایک پہلو تصوف تھا اور دوسرا جنسی بے راہ روی۔ سودا کے آباد اجداد کے وطن، ان کی نانہال، ان کے سنِ ولادت، فرخ آباد کے قیام، اودھ میں ورود اور سالِ وفات کے متعلق جدید ترین تحقیق نے کتاب کی اہمیت بڑھادی ہے۔

دوسرے حصے میں تنقید ہے جس میں سودا کی قادرالکلامی، اُن کی ہمہ گیری اور ماحول کی عکاسی کو خاص طور سے ابھارا گیا ہے۔ ماحول کی ہر گردش اور وقت کی ہر کروٹ کا جس طرح سودا کے یہاں احساس ہوتا ہے اور جس طرح اس کی ذہنی تصویر بنتی ہے اس طرح ان کے کسی اور معاصر کے یہاں نہیں ملتی۔ سودا کے قصائد کی عظمت کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے لیکن ان قصائد کی سماجی اور تہذیبی اہمیت پر اور زور دینے کی ضرورت تھی۔ ان کے ہجویات پر گو کہیں کہیں آنکھ نیچی ہوجاتی ہے، مگر انھوں نے جس طرح ان میں اپنے دور کا سارا درد و غم محفوظ کردیا ہے، اس پر بھی نظر ذہنی

چاہیے۔ یہ بھی دل چسپ بات ہے کہ شہر آشوب کے پھلنے پھولنے کا یہی دور ہے اور سودا کے شہر آشوب دوسروں پر ادبی رتبے کے لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔ سودا کی غزلوں کے ساتھ اب تک انصاف نہیں ہوا ہے۔ وہ میر کے پائے کے غزل گو نہ سہی، مگر غزل کی کسی تاریخ میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے مراثی کی ادبیت کا بھی اور گہرا اعتراف ہونا چاہیے، گو اُن کی مثنویاں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر ان میں بھی فن کی بہت سی اصطلاحات محفوظ ہوگئی ہیں۔

خلیق انجم نے سودا کے کلام کا جس طرح جائزہ لیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے سودا کی عظمت کا نقش گہرا ہوگا اور ان کے کلام کے مطالعے کا ذوق بڑھے گا۔ اٹھارویں صدی کے آخری نصف کی تہذیب کی دھوپ چھاؤں کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی رایوں کے اقتباسات کی وجہ سے یہ حصّہ اور وقیع ہوگیا ہے۔

سودا کی تصانیف کے سلسلے میں کلیات کے قلمی نسخوں کا جائزہ اور خصوصاً حبیب گنج اور رچرڈ جونسن کے نسخوں کی اہمیت کا تذکرہ، مصنف کی عرق ریزی کا بیّن ثبوت ہے۔ ان نسخوں کے اشاریے سے کلیات کا صحیح اڈیشن مرتب کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ سودا کے یہاں الحاقی کلام بہت ہے۔ خلیق انجم نے سوز کی ایک سو سترہ غزلوں کی نشاندہی کی ہے اور دوسرے ہم عصر شعرا کے کلام کی بھی۔ سودا کے چھبیس شاگردوں کا تذکرہ کتاب کی اہمیت کو اور بڑھاتا ہے۔ گل کرسٹ نے اپنی ہندوستانی گرامر میں سودا کے جو اشعار مثالوں کے سلسلے میں مع انگریزی ترجمے کے دیے تھے، خلیق انجم نے انھیں بھی ڈھونڈھ نکالا ہے اور ایک جامع فہرست حوالوں کی کتابوں کی بھی دی ہے۔

اس علمی و تحقیقی کارنامے پر خلیق انجم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ جدید ترین تحقیقی معیاروں پر پورا اُترتا ہے اور سودا کے مطالعے کے سلسلے میں اس سے استفادہ ضروری ہے۔ سودا کے فکر و فن کی عظمت کا احساس جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی روایت کا وہ تسلسل بھی میسر آئے گا جو ادب کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

آلِ احمد سرور

حرفِ آغاز

شیخ چاند مرحوم کی کتاب 'سودا' ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ غالباً اردو کا پہلا تحقیقی مقالہ ہے جو سائنٹفک انداز میں لکھا گیا تھا۔ اس مقالے کو شائع ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران ہندوستان اور غیر ممالک کی لائبریریوں سے بہت سے ایسے مخطوطات، اردو شاعروں کے کئی قدیم تذکرے اور نئے مآخذ دریافت ہوئے جن سے کلاسیکی ادب پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ سودا کی زندگی اور فن سے متعلق بھی بہت سا نیا مواد سامنے آیا اس لیے شیخ چاند کے تحقیقی مقالے 'سودا' کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ تاہم شیخ چاند کی تحقیقی صلاحیتوں کے پیش نظر میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ سودا پر شیخ چاند مرحوم کی کتاب اگر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوتی تو یقیناً میری کتاب سے بہتر ہوتی۔

میں نے یہ کتاب لکھتے وقت قاضی عبدالودود مرحوم کے مضامین سے بہت استفادہ کیا ہے۔ کئی مقامات پر مجھے ان کی رائے یا نتائج سے اختلاف تھا، جس کا میں نے مودبانہ طریقے سے اظہار کر دیا ہے۔

پہلا اڈیشن شائع کرنے کے بعد سودا کے سلسلے میں جو تحقیقی مواد فراہم ہوا ہے، میں نے اس کی روشنی میں ترمیم، حذف اور اضافے کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی ہے۔

سودا نے اپنی کلیات کا ایک نسخہ اودھ کے نائب ریذیڈنٹ رچرڈ جونسن کو پیش کیا تھا۔ سودا کے کلیات کے اس مخطوطے میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سودا نے یہ نسخہ ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان تیار کرایا اس کلیات میں سودا کی ایک پینٹنگ شامل ہے۔ رچرڈ جونسن کا یہ نسخہ پہلے لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھا اور اب یہ انڈیا آفس لائبریری کی کتابوں کے ساتھ برٹش لائبریری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جب میری کتاب کا پہلا اڈیشن شائع ہو رہا تھا تو میں نے انڈیا آفس لائبریری سے یہ پینٹنگ حاصل کی تھی۔ چوں کہ پینٹنگ

مدھم تھی اس لیے دہلی کے ایک مشہور آرٹسٹ چودھری رشید صاحب سے اس پینٹنگ کی بنیاد پر سوداؔ کا ایک پورٹریٹ بنوایا تھا۔ دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے وقت جب میں نے اپنے کاغذات میں سوداؔ کی وہ پینٹنگ تلاش کی جو میں نے انڈیا آفس سے منگوائی تھی تو پوری کوشش کے باوجود مجھے نہیں ملی۔ میں نے اپنے عزیز دوست عاشور کاظمی صاحب کو برمنگھم خط لکھا، ہمیشہ کی طرح انھوں نے میری مدد کی اور برٹش لائبریری سے اچھا خاصا روپیہ خرچ کرکے وہ پینٹنگ حاصل کرکے مجھے بھیج دی۔ میں ان کی محبت اور کرم فرمائی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب میں وہ پینٹنگ اور اس پینٹنگ کی بنیاد پر چودھری رشید صاحب کا بنایا ہوا پورٹریٹ دونوں اس کتاب میں شائع کر رہا ہوں۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۷ء میں پروفیسر آل احمد سرور کی کرم فرمائی سے انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا تھا۔ چوں کہ اُس وقت بازار میں اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہیں تھی اور پھر انجمن جیسے ممتاز ادارے نے اسے شائع کیا تھا، اس لیے کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ اُس وقت سے اب تک میں اپنی نئی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور دوسرے کاموں میں ایسا مصروف رہا کہ اس کتاب کا نیا اڈیشن شائع کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اب اپنے عزیز دوست اور قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے توجہ دلانے اور ان کی عنایت سے اس کتاب کا نیا اڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ میں بھٹ صاحب کی کرم فرمائی کا شکرگزار ہوں۔ اگر وہ اس کام میں دل چسپی نہ لیتے تو نہ جانے کب تک یہ کتاب اشاعتِ ثانی سے مرحوم رہتی۔

مجھے فخر ہے کہ ادبی مشاغل میں مجھے اپنے دوستوں سے ہمیشہ مدد اور رہنمائی ملتی رہی ہے، ان دوستوں میں پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور جناب رشید حسن خاں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ میں انجمن میں اپنے ساتھیوں محمد ساجد، جاوید رحمانی، عارفہ خانم اور عبدالرشید کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں جنھوں نے بڑی محنت سے اس کتاب کو کمپوز کیا۔

خلیق انجم

سیاسی اور سماجی حالات

دورِ ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشمِ پُر آب
دیکھ سودا گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع کی ولادت ۱۱۱۸ھ(۱۷۰۶ء۔۱۷۰۷ء) میں ہوئی ۔اس وقت تک مغل حکومت کے زوال کے اثرات کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ کیوں کہ ابھی تقریباً دو صدیوں کی محنت سے حاصل کی ہوئی دولت و طاقت اور عزت وشوکت باقی تھی۔ مغل خزانے بے شمار دولت سے بھرے ہوئے تھے۔ابھی تختِ طاؤس اور کوہِ نور جیسی بیش قیمت اشیاء ظالم اور جابر نادرشاہ کے ہاتھوں سے محفوظ تھیں۔لیکن مرزا کے دیکھتے ہی دیکھتے خزانے خالی ہوگئے۔ عظیم مغل بادشاہ جن کا جاہ و جلال تاریخ میں ضرب المثل ہے۔اُن کے وارث بے بسی کی مکمل تصویر بن گئے ۔مرزا نے اُن بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے دیکھیں جن کی ''خاکِ پا'' کو''کحلِ جواہر'' سمجھا جاتا تھا۔نازونعم میں پلے ہوئے شہزادے ایک ایک روٹی کوترستے۔پھولوں میں تلنے والی شہزادیاں جنھیں کبھی سورج کی کرن نے بھی نہیں دیکھا تھا۔حملہ آوروں کے ہاتھوں بے آبرو ہوئیں اور نہ جانے کتنی بار'' عالم میں انتخاب دلّی'' جس پر آسمان کو بھی رشک آتا تھا،انسان کی وحشیانہ اور بہیمانہ مظالم کا شکار ہوئی۔

جن طاقتوں نے ڈیڑھ سو سال کی لگاتار جدوجہد سے مغل حکومت کی بنیادوں کو ہلایا اور آخرکار ۱۸۵۷ء میں اس عظیم الشان عمارت کو ڈھادیاان میں مرہٹے، جاٹ، سکھ اور انگریز سب ہی شامل تھے۔ مسلمانوں میں روہیلے، مغل دربار کے ایرانی وتورانی گروہ اور خودمختار ریاستوں نے بھی زوال کی رفتار کو تیز کیا۔انگریزوں کے علاوہ باقی تمام طاقتیں خود مغلوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ یہ طاقتیں اور فرقے کس طرح پیدا ہوئے؟ کیوں بغاوت پر آمادہ ہوئے؟اور کس طرح انھوں نے ہندوستان سے مغلوں کا نام ونشان تک مٹا کر رکھ دیا؟اس کا جواب صرف یہ ہی نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے بعد مغل تخت کے تمام وارثین نااہل تھے۔ڈاکٹر کالیکنکر Dr.Kalikinker

جیسے مورخ کی طرح یہ کہہ دینا بھی کافی نہیں کہ:

> ''حکمرانوں اور امیروں میں کردار، قابلیت اور دور بینی کی کمی، دربار میں ہونے والی بدتر سازشیں اور گٹھ جوڑ، نادر شاہ کا حملہ اور احمد شاہ ابدالی کی لگاتار یورشوں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فتح و کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے مرہٹوں نے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو متاثر کرنا شروع کر دیا''۔[1]
>
> (انگریزی سے ترجمہ)

ہندوستان کی اقتصادی حالت اس لیے خراب نہیں ہوئی تھی کہ یہ تمام واقعات رونما ہوئے تھے بلکہ اقتصادی نظام خراب ہونے کی وجہ سے ایسے واقعات ہوئے۔ اس کی تفصیل کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم سیاست کے ساتھ ساتھ اُس دور کے زرعی[2] اور تجارتی نظام کا بھی مطالعہ کریں۔

مغل حکومت کے جاہ و حشم کا دارومدار لگان کی صورت میں حاصل ہونے والی کثیر دولت پر تھا۔ اسی لیے جب اکبر کی وفات کے بعد اُس سے کم صلاحیتوں کا مالک جہانگیر[3] تخت نشین ہوا تو مغل دربار کے شان و شکوہ میں ذرا بھی فرق نہ آیا بلکہ اور بھی ترقی کی۔ جہانگیر اور شاہ جہاں پر تبصرہ کرتے ہوئے شیلوانکر نے لکھا ہے۔

> ''اُس (اکبر) کے جانشین کم درجے کے تھے۔ جہانگیر شراب پینے کا پورا سلیقہ رکھتا تھا اور شاہجہاں نے اپنا دربار ایسے عظیم الشان طریقے سے سجا رکھا تھا کہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ پھر بھی ان دونوں کے عہد میں حکومت برابر ظاہری طاقت اور شان و شکوہ میں

---

1. K. K. Datta, Survey of India 's Social life etc. Calcutta.1961. P-113.

۲۔ میں نے ڈاکٹر عرفان حبیب کی The Agrarain System of Mughal India سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

3. Thompson & Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule in India Allahabad, 1962, P-12.

ترقی کرتی رہی۔ انھوں نے دل کھول کر فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر موسیقی، مصوری، شاعری اور فنِ تعمیر کی سرپرستی کی۔ جس کی وجہ سے ہماری تہذیب کا نشاۃ ثانیہ ہوا اور یہ عہد ہندوستان کی تاریخ کا روشن ترین باب بنا"۔[1]

(انگریزی سے ترجمہ)

۱- جہانگیر کے متعلق تھامس رو نے لکھا تھا:

"جہانگیر کی عظمت خود اس کی ذات میں نہیں تھی بلکہ پڑوسیوں (ریاستوں) کی کمزوری میں تھی۔ جہانگیر کی حیثیت ایک پختہ عمر مچھلی کی تھی اور وہ چھوٹی مچھلیاں تھیں جنھیں بڑی مچھلی کھا جاتی ہے"۔ (انگریزی سے ترجمہ)

جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار کو رونق بخشنے والے غریب کاشتکار تھے۔ اُن سے اتنا لگان وصول کیا جاتا تھا کہ وہ بہ مشکل تمام پیٹ بھر سکتے تھے۔ امرا و روسا کو تنخواہ کی بجائے اکثر جاگیریں ملتیں۔ بادشاہوں کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ کوئی علاقہ کسی جاگیردار کے پاس زیادہ عرصے نہ رہے۔ اس لیے وہ اُس علاقے کی فلاح اور بہبودی کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتے۔ بقول برنیر اُن کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ "ہمیں ایک لمحے میں (اس علاقے سے) محروم کیا جا سکتا ہے۔ پھر ہماری محنتوں کا پھل ہمیں ملے گا اور نہ ہماری اولاد کو۔ ہمیں چاہیے کہ اس زمین سے جتنی دولت کھینچ سکتے ہیں، کھینچ لیں۔ چاہے کاشتکار فاقے مریں یا فرار ہو جائیں اور جب ہمیں اس علاقے کو چھوڑنے کا حکم ملے تو ہم اسے ایک اجاڑ جنگل کی حالت میں چھوڑیں"۔[2] (انگریزی سے ترجمہ)

جاگیردار کے علاوہ عامل، قانون گو، چودھری اور دوسرے سرکاری ملازمین غیر قانونی طریقے سے اپنا اپنا حصہ لیتے تھے۔ ظلم اور تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار زمینیں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس کی ابتدا عہدِ اکبری میں ہوگئی تھی۔ عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں۔

1. K. S. Shelvankar, The Problem of India, NewYork, 1940, P-16.
2. F. Bernier, Travels in the Moghal Empire, 2Ed. London, 1916, P-227.

''کروڑیوں کے ظلم کی وجہ سے اکثر علاقے ویران ہوگئے اور کاشتکار (رعایا) بیوی بچوں کو فروخت کر کے مختلف اطراف میں چلے گئے''۔[1] (فارسی سے ترجمہ)

عہدِ جہانگیر کے ایک سیاح مینریک نے لکھا ہے کہ کاشت کاروں کے پیروں میں بھاری بیڑیاں ڈال کر مختلف میلوں اور بازاروں سے لے جایا جاتا تھا۔ان کی بدنصیب بیویاں گود میں بچوں کو لیے روتی پیٹتی پیچھے پیچھے چلتی تھیں''۔[2] (انگریزی سے ترجمہ)

برنیر عہدِ شاہجہاں کے آخر میں (۱۶۵۶ء) ہندوستان آیا تھا اور ۱۶۶۵ء تک وہ یہیں رہا۔غریب کاشتکاروں پر ظلم وستم کا ذکر اس نے بھی کیا ہے۔وہ لکھتا ہے۔''......قابلِ کاشت زمینوں کا اچھا خاصا کاشت نہ ہونے کی وجہ سے بیکار پڑا ہے۔ان کاشتکاروں میں بہت سے لوگ گورنروں کے ظلم کا شکار ہو کر برباد ہوگئے۔جب یہ غریب لوگ اپنے لالچی آقاؤں کے تقاضے پورے نہ کر سکے تو انھیں نہ صرف بنیادی ضرورتوں کے سامان سے محروم کر دیا گیا بلکہ ان کے بچے بھی چھین لیے گئے جنھیں غلام بنا کر لے جایا گیا۔اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے کاشت کار اتنے شدید ظلم سے تنگ آ کر گاؤں سے چلے جاتے ہیں اور شہروں اور کیمپوں میں زندہ رہنے کے قابلِ برداشت ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔یہ لوگ وہاں قلی، سقے یا سائیس بن جاتے ہیں''۔[3]

اورنگ زیب کے زمانے میں اس قسم کے واقعات زیادہ ہونے لگے۔ایک دیوان محمد ہاشم کاشت کاروں پر بہت زیادہ ظلم کرتا تھا۔خانِ دوراں نے اس کی شکایت کرتے ہوئے بادشاہ کو لکھا۔'' خالصہ کے علاقے ویران ہوگئے ہیں اور حالات بہت خراب ہیں۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمد ہاشم نے بہت لگان مقرر کر دیا ہے''۔(انگریزی سے ترجمہ) خانِ دوراں نے آگے چل کر لکھا ہے'' کاشت کاروں کے مصائب لکھنا ناممکن ہے۔اُن میں کچھ لوگ لگان نہ دے سکے تو انھیں اتنا مارا پیٹا کہ وہ مر گئے۔بہت سے

---

۱ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۴ء، ۲، ص ۱۸۹۔

1. F. S. Manrique, Travels, 1629-43, Vol-II, London, 1927, P-272.

2. Bernier, P-205.

کاشت کار قید میں ہیں۔ان کی بیویوں اور بچوں کو فروخت کر دیا گیا ہے"۔[1]

(انگریزی سے ترجمہ)

حکمرانوں کے اس ظلم اور ستم سے تنگ آکر کاشت کاروں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ وہ لگان دینے سے انکار کر دیتے۔شاہی فوجیں باغیوں کی سرکوبی کو جاتیں۔چوں کہ یہ بغاوتیں بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھیں۔اس لیے باغیوں پر قابو پانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔عہدِ اورنگ زیب کے بارے میں منوچی نے لکھا ہے۔" گاؤں والوں کو شکست ہونے پر جو کوئی ہاتھ آتا ہے اُسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ان کی بیویاں، لڑکے، لڑکیاں اور مویشیوں کو لے جایا جاتا ہے۔ان میں سب سے زیادہ خوب صورت لڑکیوں کو باغی کی حیثیت سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ کچھ وہ (جاگیردار) اپنے لیے رکھتے ہیں اور باقی فروخت کر دی جاتی ہیں"۔[2] (انگریزی سے ترجمہ) اس پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ خوب صورت لڑکیاں اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کر دی جاتی تھیں۔

زمینداروں کو اپنی زمینداری بڑھانے کا موقع چاہیے تھا۔ کاشت کاروں کی بغاوت سے انھوں نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ کاشتکاروں کو فنِ سپہ گری کی تربیت دی اور انھیں ضروری ہتھیاروں سے مسلح کیا۔

یوں تو بغاوتیں جہانگیر کے زمانے سے ہو رہی تھیں لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ان کی تعداد بڑھ گئی۔ نیز پہلے سے کہیں زیادہ منظم ہونے لگیں۔

جاٹ، مرہٹے اور سکھ اسی قسم کے زمیندار اور کاشت کار تھے جنھوں نے ابتدا میں لگان دینے سے انکار کیا۔حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں اور آخرکار اتنی طاقت حاصل کر لی کہ ان سب کی آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔

عہدِ مغلیہ کے صوبہ آگرہ میں وسطی دوآبہ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس کے بارے میں

---

1. J. N. Sarkar, Studics in Auamgzib's Reign, Calcutta, pp.243-244.
2. N. Manucci, Storia Do Mogor, Vol.-11, London. 1907, P-451.

ابوالفضل نے لکھا ہے۔ "آب و ہوا کی خصوصیت کی وجہ سے اس علاقے کے لوگ سرکشی، مردانگی اور جانبازی کے لیے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں"۔[۱]

(فارسی سے ترجمہ)

اس سرکشی کے پیش نظر بقول شاہ ولی اللہ "زمانۂ شاہ جہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لیے گڑھی نہ بنائیں"۔[۲]

سکھ پنجاب کے جاٹ تھے۔ان کا پیشہ بھی کاشت کاری تھا۔مغل حکمرانوں کے ظلم و ستم نے انھیں بھی بغاوت پر مجبور کیا اور یہ کاشت کار ایک بڑی فوج کی صورت اختیار کر گئے۔حکومت پوری کوشش کے باوجود ان کی سرکوبی نہ کر سکی۔مرہٹے بھی دکن کے کاشت کار تھے۔شیواجی احمد نگر کے ایک امیر کا لڑکا تھا۔ابتدا میں اس کا مقصد صرف اپنی زمیں داری کو بڑھانا تھا۔جاگیرداروں نے دکن میں ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اکثر کاشت کار شیواجی کے ساتھ ہو گئے۔مغل شہنشاہ کے پاس جب یہ شکایت آئی کہ شاہی علاقے کے کاشت کار مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں تو حکم دیا گیا کہ تمام گاؤں کے ہتھیار اور گھوڑے وغیرہ ضبط کر لیے جائیں اور ایسا ہی کیا گیا۔بعد میں جن کسانوں کو ہتھیار مل سکے وہ مرہٹوں کے ساتھ ہو گئے۔[۳] بھیم سین دکن کے زمیں داروں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فوجداروں کے ایجنٹ، دیش مکھ اور زمیں داروں کا ظلم حد سے بڑھ گیا تھا۔یہ لوگ ہر ممکن بہانے سے ان غریب کاشت کاروں سے پیسہ وصول کرتے تھے۔زمیں داروں پر "پیشکشِ پادشاہی" مقرر تھی۔یہ لوگ اپنی جیب سے ایک پیسہ نہیں دیتے بلکہ انھوں نے آدمی مقرر کر رکھے تھے۔جو کاشت کاروں سے روپیہ وصول کرتے تھے۔ان غریب انسانوں پر ظلم کی کوئی حد نہیں تھی۔پھر ان پر جزیہ لگایا گیا اور جزیہ وصول کرنے والے مقرر کیے گئے۔ان زمیں داروں کے ظلم و ستم کے متعلق کوئی کیا لکھ سکتا ہے۔[۴] اسی لیے بیشتر کاشت کار باغی مرہٹہ زمیں داروں کے ساتھ ہو گئے۔

۱۔ ابوالفضل، اکبرنامہ، کلکتہ، ۱۸۸۶، ۳، ص ۲۳۱

۲۔ شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مترجمہ خلیق احمد نظامی، دہلی، ۱۹۵۰، ص ۱۰۱

۳۔ دلکشا۔ بھیم سین (قلمی) ورق ۱۳۸ ب۔۱۴۰ الف۔

۴۔ دلکشا، ورق ۱۳۸ ب۔۱۴۰ الف۔

روہیلوں نے مغل حکومت کی بربادی میں نمایاں حصّہ لیا۔ روہ کے ایک بزرگ شاہ عالم خاں کا غلام داؤد خاں اٹھارویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی خرید و فروخت کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت مغل حکومت کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ داؤد خاں نے یہ حالات دیکھ کر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور بہت جلد کٹھیر کے مقام پر اچھی خاصی جمعیت اکٹھا کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جمعیت نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ شاہ آباد، مراد آباد، سنبھل اور دوسرے پرگنوں پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں بہت نڈر اور بہادر روہیلہ سردار تھے۔ شجاع الدولہ نے ۱۷۷۴ء میں کڑاں میر پور کے قریب ایک جنگ میں حافظ رحمت خاں کو قتل کر کے روہیلہ طاقت کو ختم کر دیا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

سب سے بڑی طاقت انگریز تھے جنھوں نے آخر کار مغل حکومت پر قبضہ کر لیا۔

مغل بادشاہوں میں غالباً اکبر پہلا بادشاہ ہے جس نے نقد کی صورت میں لگان وصول کرنا شروع کیا۔ جب کاشت کار کو پیداوار فروخت کر کے لگان ادا کرنا پڑا تو پھر اُس نے ایسی چیزوں کی کاشت شروع کی، جس سے زیادہ فائدہ ہو سکے۔ ایسی کاشت کے لیے خود حکومت بھی ہمّت افزائی کرتی تھی جس میں زیادہ فائدہ ہو۔

سری رام شرما لکھتے ہیں کہ شیر شاہ اور اکبر کے زمانے میں ”حکومت ایسی کاشت کرنے والوں کی ہمّت افزائی کرتی تھی جس سے اچھی آمدنی ہو اور اس سلسلے میں وہ کاشت کاروں کو کچھ روپیہ بھی قرض دیتی جس کی ادائیگی ایک سال میں کرنی ہوتی۔“[1] جمنا کے پاس اور وسطِ ہند میں نیل کی بہت زیادہ کاشت کی جاتی۔ روئی اور سلک کے کارخانوں کی مانگ پوری کرنے کے لیے یہ دونوں اشیا ہندوستان کے بعض علاقوں میں بہت زیادہ مقدار میں پیدا کی جاتیں۔[2] تجارت کے فائدے نے حکمراں طبقے کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ نیل کے پورے کاروبار پر شاہ جہاں کا قبضہ تھا۔ اس نے منوہر داس نامی ایک

---

1. S.R. Sharma, Mughal Government and Administration, Bombay, 1951, pp. 83-84
2. R.C. Majumdar, An Advance History of India, London, 1960, p-571

شخص کو اس کی اجازت دی تھی کہ وہ شاہی خزانے سے روپیہ قرض لے کر نیل کا کاروبار کرے اور نفع میں سے اپنا حصہ لے کر باقی خزانے میں داخل کر دے۔[1]

نور جہاں نے بھی نیل اور زردوزی کے کپڑوں کی تجارت میں حصہ لیا تھا۔[2] شاہ جہاں کا خسر آصف الدولہ بہت بڑا تاجر تھا۔ شاہ جہاں کی لڑکی جہاں آرا بھی تجارت کرتی تھی۔[3]

اس قسم کی چیزوں کی پیداوار اتنی بڑھ گئی کہ ہندوستان کے امرا و رؤسا اور تاجروں کی مانگ پوری کرنے کے بعد بھی بہت مال بچ رہتا۔ اس لیے اُن تاجروں کو بھی مال دیا جانے لگا جو ایشیا کے مختلف ممالک اور یورپ سے ہندوستان آتے تھے۔ باہر کے تاجروں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ اس زمانے میں کپڑے کی صنعت نے بہت زیادہ ترقی کی۔ کپڑا بنانے کے بڑے بڑے مرکز تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے...... اڑیسہ سے لے کر مشرقی بنگال تک تمام ملک کپڑا بنانے کا بہت بڑا کارخانہ معلوم ہوتا تھا۔ بہت باریک ململ بنانے میں ڈھاکہ بہت مشہور تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں پیلسیرٹ (Pelseart) لکھتا ہے کہ ''مشرقی بنگال (چھپور اور سونر گاؤں) میں سب لوگ کپڑا بُنتے ہیں اور بہت اچھا مال تیار کرتے ہیں۔ سلک تیار کرنے کا سب سے بڑا مرکز بنگال تھا اور یہیں سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور یورپ کے تاجروں کو مال سپلائی ہوتا تھا''۔[4]

ہندوستان نے دست کاری میں بھی بہت ترقی کی تھی۔ روئی اور سلک سے تیار کیے ہوئے مال کے علاوہ بہت سی چیزیں ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھیں۔ مغلوں کے پاس جہاز رانی کے وہ ذرائع نہیں تھے جن سے انھیں دوسرے ملکوں سے تجارت کرنے میں سہولت ہوتی۔ اس وقت بحر اوقیانوس بہت خطرناک راستہ تھا۔ اکثر تجارتی جہاز لوٹ لیے جاتے

1. The Commercial Policy of Mughals. p.195
2. The Commercial Policy of Mughals .p.195
3. Ibid. P-165.
4. An Advance History of India, pp-572-574.

تھے اور تاجروں کو بڑے بڑے لڑنے والے جہازوں سے آمدورفت کرنی ہوتی تھی۔ ہندوستان نے جہاز رانی کے فن میں بالکل ترقی نہیں کی تھی۔اس لیے ہندستانی تاجر باہر سے آنے والے تاجروں کو غنیمت جانتے تھے۔[۱] ابتدا میں یہ تاجر عام طور پر عرب تھے اور پھر سولھویں صدی کی ابتدا میں پرتگالی آئے۔سترھویں صدی کے آغاز میں ڈچ تاجر آئے اور ۱۶۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان آئی۔شروع میں اس کمپنی کا مقصد صرف تجارت رہا۔لیکن آہستہ آہستہ ملک گیری کی ہوس نے انھیں سیاست میں حصّہ لینے پر مجبور کردیا اور تقریباً ایک صدی میں بنگال کا بہت بڑا حصّہ اُن کے قبضے میں آگیا۔۱۷۵۷ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیانی زمانے میں بنگال، شمالی ہند، پنجاب اور کرناٹک میں ان کی فتوحات بڑھتی ہی گئیں۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد دہلی دربار میں ایرانی اور تورانی گروہوں کی آویزش سیاسی اقتدار کی جنگ ہے۔ان امرا کی آمدنی کا ذریعہ زمینوں سے حاصل کیا ہوا لگان ہوتا جو بہت کم رہ گیا تھا۔اس لیے اب ان کی نظریں خالصہ کی زمین اور شاہی خزانے پر تھیں۔

یہ بجا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد جتنے بادشاہ تخت نشین ہوئے۔وہ اورنگ زیب سے کم صلاحیتیں رکھتے تھے۔لیکن یہ کہنا ٹھیک نہ ہوگا کہ وہ سب نااہل اور شاہی کاروبار سے بالکل بے بہرہ تھے۔اُن میں ملکی انتظام کی صلاحیتیں نہیں تھیں۔حقیقت یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کی زرعی اور اقتصادی پالیسی نے جن طاقتوں کو جنم دیا تھا انھوں نے اورنگ زیب کی زندگی ہی میں ایوانِ حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنی شروع کردی تھیں۔اورنگ زیب کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے اتنی طاقت حاصل کرلی تھی کہ تقریباً چالیس سال تک وہ دکن میں اُن سے نبرد آزما رہا۔ادھر شمالی ہند میں اورنگ زیب کی عدم موجودگی کا

---

[۱] بال کرشن نے اس عہد کی جہاز رانی کے متعلق لکھا ہے:"یورپین سمندر کے بادشاہ تھے۔وہ کسی بھی بندرگاہ کا راستہ بند کرسکتے تھے۔کسی بھی جہاز پر قبضہ کرسکتے تھے۔وہ ایسا بھی کرسکتے تھے کہ ایشیا کے سوداگر اپنی بندرگاہ سے باہر نہ آسکیں۔اس لیے انھوں نے آہستہ آہستہ ہندستانیوں کے ہاتھ سے غیرملکی اور سمندری تجارت چھین لی۔(انگریزی سے ترجمہ)

Bal Krishan ,Commercial Relations Between India and England, London, 1924, pp-86-87

سب سے بڑا فائدہ جاٹوں نے اُٹھایا۔ "انھوں نے جاٹ کاشت کار کو تلوار چلانا سکھائی اور بندوقیں فراہم کیں"۔[1] بقول جادو ناتھ سرکار مغل حکومت کا زوال اورنگ زیب کی زندگی ہی میں شروع ہوگیا تھا۔[2] لیکن اس نے حکمتِ عملی اور تدبّر سے کام لے کر نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دس سال کے عرصے میں تخت کی وراثت پر سات بار لڑائی ہوئی جس سے زوال کی رفتار تیز ہوگئی۔

سادات بارہہ کے دو بھائی سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے اتنا اقتدار حاصل کیا کہ بادشاہ گر کہلائے جانے لگے۔[3] مغل دربار میں ایرانی اور تورانی گروہوں کی اقتدار کی جنگ بھی زوال کی رفتار کو تیز کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ایک طرف مغل حکومت کی دشمن طاقتیں کام کر رہی تھیں اور دوسری طرف خود حکومت میں اندرونی انتشار تھا جس کی وجہ سے مغل حکومت بالکل بے بس اور لاچار ہوگئی۔

عوام کو مغل حکومت کی مجبوری کا مکمل احساس نادر شاہ کے حملے کے وقت ہوا۔ نادر شاہ نے دہلی آکر جو قتل و غارت گری، لوٹ مار اور انسانیت سوز بہیمانہ حرکتیں کی ہیں، وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ رضا لائبریری رام پور میں ایک قلمی کتاب "قصہ حقیقت برآمدنِ نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد" ہے۔ اندرونی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ کتاب کا مولف اس طوفانِ حشر خیز میں خود موجود تھا۔ افسوس ہے کہ نسخے کے ناقص الطرفین ہونے کی وجہ سے مولف

1. J.N. Sarkar, History of Aurangzib, vol. V. Calcutta, p.240

2. Sarkar, Fall of Mughal Empire, vol. I, Calcutta, p.1,

۳۔ اگرچہ ان دونوں کے اقتدار کا زمانہ (۱۷۱۳ء۔۱۷۲۵ء) تک بہت مختصر ہے لیکن اسی زمانے میں انھوں نے جہاندار شاہ کو شکست دے کر فرخ سیر کو تخت نشین کیا۔ فرخ سیر کو گرفتار کر کے اندھا کیا اور کچھ دن بعد قتل کردیا اور رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا۔ رفیع الدرجات کا ایک مہینہ کچھ دن میں انتقال ہوگیا تو ان بھائیوں نے رفیع الدولہ کو تخت کا وارث مقرر کیا۔ یہ بادشاہ بھی دو ڈھائی مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں بعض امرا نے سازش کر کے سید حسین علی خاں کو قتل کرادیا اور دوسرا بھائی شاہی فوج کے مقابلے میں شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ گویا سات سال کی مدت میں ان بھائیوں نے چار بادشاہوں کو تخت نشین کیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

Satish Chandra Parties and Politics at the Mughal Court,Aligarh,1959, pp. 86- 176

کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ دہلی پر نادر شاہ کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے مولف لکھتا ہے:

"گھڑی دن باقی تھا۔ شہر کے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ نادر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ تمام غارت گر اور حرام زادے جمع ہو گئے۔ پندرہ تاریخ کو ہر طرف یورش کر دی۔ بندوق اور جزائل سے تمام رات قتل و غارت گری کی۔ ایرانی (نادر شاہ کے سپاہی) کوچوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور امان مانگتے تھے۔ آخرالامر صبح ہوئی۔ اس خبر سے بادشاہ غصّے میں دیوانہ ہو گیا۔ نادر شاہ نے بیرونِ شہر سے اپنی فوجیں طلب کیں اور خود قلعہ سے باہر آ کر مسجد روشن الدولہ چاندنی چوک میں بیٹھ گیا۔ قتلِ عام اور اہلِ شہر کے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ چناں چہ قزلباشوں نے شریفوں کی حویلیوں پر یورش کر دی۔ وہاں کے رہنے والوں کو قتل کیا...... چوک سعد اللہ خاں، چاندنی چوک، دیبہ گڑھ اور نئے شاہ جہاں آباد کو غارت اور برباد کر دیا اور شہر کے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا۔ سات آٹھ ہزار انسانوں کا خون ہوا اور شاہ جہاں آباد اس طرح برباد ہوا کہ دہلی دروازے سے نخاس تک ویران ہو گیا اور کوئی عمارت نظر نہ آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں برسوں سے آبادی نہیں ہے...... پردہ نشین عورتوں نے ناموس کی خاطر کنوؤں میں چھلانگ لگا دی اور بہت سی عورتیں مر گئیں"۔[1]

(فارسی سے ترجمہ)

مرزا رفیع نے دہلی کی بربادی اور تباہی کا مرثیہ بڑی دردمندی کے ساتھ کہا ہے۔ ایسے ہی

---

[1] قصہ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہ جہان آباد (قلمی) رام پور

(ب) اس حملے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ دولت یار جنگ، داستانِ ترک تازانِ ہند، بمبئی ۱۳۱۰ھ، ۳، ص ص ۲۹۔۱۶۱۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء، ۲، ص ص ۴۷۹۔۴۸۶۔ مغل حکومت کا زوال، ۱، ص ص ۱۔۳ (انگریزی) نادر شاہ کی تاریخ (انگریزی)

(ج) جمیز فریزر کا بیان ہے کہ تقریباً دس ہزار عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگا دی، جن میں سے کچھ دو تین دن بعد زندہ نکال لی گئیں۔ نادر شاہ کی تاریخ، ص ۱۸۱ (انگریزی)

کسی عبرت ناک واقعے سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ درد انگیز اشعار کہے ہوں گے:

باغ دلّی میں جو اک روز ہوا میرا گزر
نہ وہ گُل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اُڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار
بدمِ سرد و بصد حسرت و صد سوزِ جگر
دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے بہ نالۂ زار
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

نادرشاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے پانچویں حملے میں نادرشاہ کی تاریخ دُہرادی۔ دہلی کے گلی کوچوں میں ایک بار پھر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور ساری دہلی خاک و خوں میں نہا گئی۔ خوب چند ذکا لکھتے ہیں کہ "اس ہنگامۂ قتل و غارت گری میں میرے بزرگوں نے عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے مستورات کو جان سے مار دیا اور خوف و ہراس کی وجہ سے خود کنوؤں میں چھلانگ لگادی"۔[1] (فارسی سے ترجمہ)

بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ خود ہندوستان میں ایسی طاقتیں اُبھر رہی تھیں جو مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ تھیں۔ مرہٹے وسطِ ہند سے پھیل کر مغرب میں سندھ اور مشرق میں بہار اور اڑیسہ تک قابض ہو چکے تھے۔ شمالی ہند میں روہیلوں کی طاقت زور پکڑ گئی تھی۔ آگرہ جاٹوں کے قبضے میں آچکا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ لوٹ مار کرتے ہوئے دہلی تک آجاتے تھے۔ ایک دفعہ لال قلعہ میں داخل ہو کر بیشتر قیمتی پتھر اکھاڑ کر لے گئے اور شاہی فوج کچھ نہیں کرسکی۔

---

[1] خوب چند ذکا، عیار الشعرا، ص ۱۳۶۔۱۳۷ (مائیکرو فلم دلی یونی ورسٹی لائبریری)

مغل حکومت کا زوال اور اس کے اثرات

اس بات کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے کہ مغل حکومت بعض وجوہ سے اندرونی طور پر کمزور ہوگئی تھی۔ایک وقت وہ بھی تھا جب ملک کے کسی بھی علاقے میں مغل حکومت سے سرکشی کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔لیکن اب حالت یہ تھی کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مرہٹوں،روہیلوں اور سکھوں کی بغاوت یا انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا جو طوفان بھی اُٹھتا،اس کا رُخ دہلی کے لال قلعے کی طرف ہوتا تھا۔اس کا نتیجہ سیاسی انتشار،سماجی شکست و ریخت، معاشی ابتری اور مذہبی بے راہ روی اور فوجی کمزوری کی شکل میں سامنے آتا تھا جس نے زوال کی رفتار کو اور تیز کردیا۔

اٹھارویں صدی کے جن شاعروں نے مغل حکومت کے زوال کے ان آثار کا ماتم دردناک لفظوں میں کیا ہے،ان میں سودا،میر اور حاتم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔اس عہد کے شعرا میں خواجہ میر درد ایسے ہیں،جنھوں نے تصوّف اور روحانیت کا سہارا لے کر گردوپیش کی المناک زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور بہت کم اپنی شاعری کی عشق و محبت کی دنیا سے باہر آئے۔

قلعے کا حشر یہ ہوگیا تھا کہ وہاں پھلوں کے درختوں کے بجائے گھاس پھوس نظر آتی تھی۔مرتضیٰ حسین بلگرامی،جو عالمگیر ثانی کے عہد میں دہلی میں موجود تھے،لال قلعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”شاہی قلعہ اور اس کی اندرونی عمارات میں پھل پھول کے درختوں کی جگہ گھاس اور کانٹے دار پودوں کا جنگل پیدا ہوگیا ہے۔بادشاہ کی نشست کے لیے ایک معمولی کرسی بمشابہ تخت دیکھنے میں آتی ہے“۔[۱]

---

[۱] مرتضیٰ حسین اللہ یار عثمانی بلگرامی،حدیقۃ الاقالیم،لکھنؤ،۱۸۷۹،ص ۴۴ بحوالہ پروفیسر ظہیر ملک،سودؔا کے شہرآشوب اور سید فولاد خاں کی ہجو کا تاریخی مطالعہ،مشمولہ مرزا محمد رفیع سودؔا،مرتبہ پروفیسر نذیر احمد،نئی دہلی،۲۰۰۱،ص ۱۷۸

سودا نے جو ہجویں اور شہر آشوب لکھے ہیں، وہ مغلوں کی عظیم الشان حکومت کے زوال اور ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی، تہذیبی، علمی اور ادبی مرکز دلّی کے اُجڑنے کے دردناک مرثیے ہیں۔ انھوں نے دلّی کے نجیبوں اور اہلِ اقتدار کی بربادی اور تباہی کا ماتم کیا ہے۔

مرکزی حکومت کی زمینوں اور جاگیرداروں کی جاگیروں پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دہلی کے امرا و رؤسا معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ سودا نے ایک شہر آشوب میں دولت مند طبقے کی مفلسی، شاندار عمارتوں کی خستہ حالی اور نجیب زادیوں کی بدحالی کا بہت دردناک انداز میں ذکر کیا ہے۔ سودا لکھتے ہیں:

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدّت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبوں کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداریٔ کول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمن میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے، کہیں ڈھے مرغول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

زوال کے اثرات

کسی شخصی حکومت کے بدلنے کا عوام پر بہت کم اثر ہوتا ہے لیکن مغل حکومت کا زوال عوام کا زوال تھا۔ زوال کی مسموم ہواؤں نے نہ صرف اس ہرے بھرے درخت کے سبز پتوں کا منہ زرد کر دیا تھا بلکہ اس کی جڑوں تک میں زہریلے اثرات پھیلا دیے تھے۔ جو مصیبت مغل بادشاہوں پر آئی تھی اس کا امرا اور رؤسا سے لے کر عوام تک سب پر برابر اثر پڑا تھا۔

چناں چہ اس کا اثر ہندوستان کے تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں پر بالواسطہ طور بھی پڑا اور بلاواسطہ طور پر بھی۔ شاعر جو کہ ملک کے فکری اور جذباتی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے، ان حالات میں چوٹ کھائے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس سیاسی و سماجی اور معاشی طوائف الملوکی نے اس کا روزگار ہی نہیں چھینا، اس کے قلب و ذہن کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ دراصل سودا کی زندگی کے واقعات اور ان کا کلام بڑھتے ہوئے اس مادّی و روحانی خلفشار کو ہمارے سامنے عیاں کر دیتے ہیں۔ چناں چہ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سودا کے کلام کا جائزہ دل چسپ بھی ہوگا اور مفید بھی۔

اقتصادی بدحالی

مرہٹے، جاٹ، سکھ اور روہیلے اچھے خاصے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ دکن اور بعض

دوسرے صوبے خودمختار ہو گئے۔ خالصہ کی زمین بہت کم رہ گئی۔[1] اور اس کی آمدنی کا بھی بہت بڑا حصہ وزیر اور دوسرے امرا کی نذر ہو جاتا۔ قلعہ کا خزانہ بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں بالکل خالی ہو گیا۔ بقول مرزا:

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی پھاڑ کرکے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کنول

نادر شاہ کی لوٹ مار تاریخ میں یادگار ہے۔ کروڑوں روپے کی مالیت کے سونے چاندی کے برتن، جواہرات اور دوسرا سامان اس کے ہاتھ آیا۔ تختِ طاؤس اور کوہ نور جیسی نادر اور بیش بہا اشیا بھی اس کے خزانے میں منتقل ہو گئیں۔ اس کی لوٹ مار صرف شاہی خزانے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس نے امرا و روسا کی حویلیوں کو بھی خالی کر دیا۔ سر ہنری ٹارنس[2] اور جیمز فریزر[3] نے پورے سامان کی تفصیل دی ہے۔

اس واقعے کے تقریباً دس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی کے گلی کوچوں میں پھر نادر شاہ کی تاریخ دہرائی۔ ایک بار پھر شاہی خزانہ خالی ہو گیا اور امرا و روسا کی ذاتی دولت چھن گئی۔

---

[1] صاحب تاریخ عالم ثانی نے ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:
"صوبہ دہلی کے پرگنے اور چند دیگر صوبوں کے پرگنے جو خالصہ میں شامل تھے اور جن سے بادشاہ کے ذاتی ملازمین کی تنخواہیں ادا ہوتی تھیں۔ اب ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ سہارن پور جس کے محاصل جاگیرداروں کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ اب نجیب خاں روہیلہ کے قبضے میں تھا۔ آگرہ کے قریب کے علاقے جاٹوں کے پاس تھے۔ جے پور کے مادھو سنگھ نے نارنول وغیرہ کے علاقوں پر تسلط کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ایک محل میں خالصہ میں نہ تھا...... نوبت بایں جا رسید کہ بادشاہ کے دسترخوان کے لیے بھی روپیہ نہ رہا۔ بیگمات بہت سے اخراجات اپنی جیب خاص سے کرتی تھیں۔ تاریخ عالم گیر ثانی ص ۲۹-۲۸-۲۲ بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔

[2] تاریخ نادری (فارسی) ص ص ۲۵۴-۲۵۵

[3] نادر شاہ کی تاریخ (انگریزی) ص ص ۲۲۰-۲۲۱

دلّی بارہا ان حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی۔ میرؔ نے ایک دفعہ دلّی کے ویران ہونے کا نقشہ ان دردانگیز الفاظ میں کھینچا ہے:

''ایک روز میں شہر کے تازہ ویرانے کی سیر کو گیا۔ ہر قدم پر روتا اور عبرت پکڑتا تھا۔ جتنا آگے گیا، اتنی ہی ویرانی بڑھی۔ میں مکانوں کو نہ پہچان پایا، شہر نہ نظر آیا۔ عمارتوں کے آثار نہ دکھائی دیے۔ (وہاں) رہنے والوں کی کچھ خبر نہ ملی۔

از ہر کہ سخن کردم، گفتند کہ این جا نیست

از ہر کہ نشان جستم، گفتند کہ پیدا نیست

مکان گر گئے، دیواریں ٹوٹ گئیں۔ خانقاہوں میں صوفی رہے اور نہ خرابات میں مے خوار۔ دُور تک ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔

ہرکجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ

بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ [1]

(فارسی سے ترجمہ)

مرزا دلّی کی بربادی پر اس طرح ماتم کرتے ہیں:

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا

مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا

کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا

عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

---

[1] میر تقی میر، ذکرِ میر، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۲۸، ص ۹۹۔

لوگ در بدر مارے مارے پھرتے تھے لیکن ایسی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی جس سے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا جا سکے۔ اگر گھوڑا لے کر کسی کی نوکری کرو تو تنخواہ غائب اور بقول مرزا:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

مرزا اس اقتصادی بحران کے اسباب سے بخوبی واقف تھے۔

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداریٔ کول

میرؔ نے بھی بادشاہ و وزیر کے قلاش ہونے کا ماتم کیا ہے:

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
ہے لبِ نان پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

عوام کی مالی حالت کتنی خراب تھی۔اس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔خود بادشاہ مفلسی کا شکار تھا۔شاہ ولی اللہ نے شاہی ملازمین کے متعلق لکھا ہے۔"جب خزانہ بادشاہ نہیں رہا نقدی بھی موقوف ہوگئی۔آخرکار سب ملازمین تتر بتر ہوگئے اور کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔سلطنت کا بجز نام اور کچھ باقی نہیں رہا"۔[۱] سلطنت سے متعلق تقریباً یہی الفاظ سید غلام حسین خاں طباطبائی کے ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔"محمد شاہ کی وفات کے بعد سلطنت کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور کچھ نہیں"۔[۲]

فوجی کمزوری

اس اقتصادی بدحالی کا اثر براہِ راست فوج پر پڑا۔ایران،خراسان،ترکستان اور افغانستان سے آنے والے سپاہیوں کی بھرتی بند ہوچکی تھی۔راجپوت اور مرہٹے جو کبھی مغل فوج کی طاقت کا بہت بڑا حصہ تھے۔اب مغلوں کے سب سے بڑے دشمن بن چکے تھے۔شاہی خزانے میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے رہی سہی فوج بھی بے بس ولاچار ہوگئی تھی۔مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے سپاہیوں کے ولولے سرد پڑ گئے تھے۔بادشاہ اپنے افلاس کی وجہ سے تنخواہیں دینے سے معذور تھا"۔احمد شاہ کے زمانے میں محلاتِ شاہی کے سازوسامان کی فہرست بنا کر دوکان داروں کو دے دی گئی تھی تاکہ اس کو فروخت کرکے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کردی جائیں"[۳] بقول صاحب

---

[۱] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات،ص۱۰۴
[۲] سیرالمتاخرین،۳، ۸۷۰
[۳] شاکر خاں پانی پتی،تذکرہ شاکر خاں (قلمی)،ص۳۴،بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات،ص۱۶۲

"تاریخ عالم گیر ثانی" فوجیوں نے تنگ آ کر اپنے گھوڑے بیچ دیے تھے۔ پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہی تھیں۔ جانوروں کو چارہ نہ ملتا تھا اس وجہ سے وہ مرنے لگے تھے۔ فوجی اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے۔ بعض اوقات وہ شاہی سواری کی ہمراہی میں بھی نہ ہوتے۔[۱]

ایسے واقعات بھی ہوتے تھے کہ تنخواہ نہ ملنے پر سپاہی اپنے آقا کو سرِ بازار بے عزت کر دیتے۔ عمادالملک کے سپاہی پانی پت کی سڑکوں پر اُسے گھسیٹتے پھرے اور ذلیل و خوار کیا۔ ہمارے شہر آشوبوں میں اس فوجی کمزوری کا طرح طرح سے مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ شہزادے بھوک سے تنگ آ کر گھر سے باہر نکل آتے تھے۔ بقول مرزا :

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آ دے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائے ہیکی پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول

نجیب زادیاں جنھوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، در در بھیک مانگتی پھرتی تھیں۔ مرزا نے اس دردناک حقیقت کو بھی شہر آشوب میں بیان کیا ہے:

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول

---

[۱] تاریخ عالم گیر ثانی (قلمی) ص ص ۱۵۔۲۳ بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ص ۱۶۲۔۱۶۳

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی معاشی بدحالی، سیاسی ابتری اور بدنظمی پر جتنے شہرآشوب کہے گئے ہیں، اتنے کبھی کسی دور میں نہیں کہے گئے۔ مرزا کے استاد شاہ حاتم نے اپنے شہرآشوب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شرفا ننگے اور بھوکے ہیں اور رزالے خوب عیش کر رہے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

جہاں میں صاحب خسخانہ گھاس والے ہیں
جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے (کہ) ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں
سواب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب ہوئے دوچار

شاکر ناجی کہتے ہیں:

لڑے ہوئے نہ برس بیس اون کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی ددوں کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیں بازو اوپر طلا کی نال
قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا
ملے تھی دہان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دوکاں نہ غلّہ و بقّال

وہ لوگ جن کی تلواریں لاکھوں قسمتوں کا فیصلہ کرتی تھیں۔ مجبور اور لاچار تھے۔ مفلسی نے یہ حال کر دیا تھا کہ اُن کے پاس پورے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ بقول مرزا :

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کر کے ڈھلتے انھوں نے ہو ناچار
ندان قرض میں بنیوں کے دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سوتا ہے ہاتھ میں کچکول

یہ تو اُن لوگوں کا حال تھا جو کبھی صاحب اقتدار تھے۔ بقول مرزا عام سپاہی کی حالت اور بُری تھی۔ حالات نے انھیں اتنا بُودل بنا دیا تھا کہ لڑائی کے نام سے کانپتے تھے۔

پڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو مُوتے بھری لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

اس فوجی کمزوری نے بادشاہ کی عزّت و ناموس کو خاک میں ملا دیا۔ قائمؔ نے ایک شہر آشوب میں عالم گیر ثانی اور اس کے دادا جہاندار شاہ کو کھلم کھلا گالیاں دیں اور عالم گیر ثانی اس کا کچھ نہ کر سکا[1]

---

[1] شہر آشوب کا ایک بند ملاحظہ ہو:

دادا ترا جو لال کنور کا تھا جلا کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خاندان میں حمق کا جاری تھا سلسلہ دوں روش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھاپن ان کا ترا عذرخواہ ہے

شاہ عالم بے بسی اور لاچاری کی مکمل تصویر تھا۔ جس امیر کا اقتدار ہوتا وہ اپنی من مانی کرتا اور بادشاہ محض کٹھ پتلی کی طرح اس کے ہاتھوں میں ناچتا۔ کنور پریم کشور فراقی کا بیان ہے کہ قلعہ میں بادشاہ کے روبرو "توتو" "میں میں" کی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ چوکیدار اور فراش تک بادشاہ کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ انند راؤ نے بادشاہ سے اجازت لیے بغیر مرہٹہ سردار پٹیل پر کچھ نقدی نچھاور کردی۔ تمام فراش چوکیدار نقدی لوٹنے پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں بادشاہ کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔[۱] بادشاہ سر دربار خود بھی گالیاں دیتا اور اس کے جواب میں فحش اور واہیات کلمات سنتا۔ فراقیؔ نے ایک ایسا واقعہ بھی لکھا ہے۔[۲]

اہلِ ہنر کا ترکِ وطن

جاگیرداری دور میں اہلِ ہنر کی سرپرستی جاگیردار طبقہ کرتا ہے۔ مگر اس عہد میں یہ طبقہ بہت زبوں حال تھا۔ اس لیے اہلِ ہنر دربدر مارے مارے پھرتے تھے۔ عرضِ ہنر میں فائدہ خاک نہیں تھا۔ بقول مرزا، شاعر جو مستغنی الاحوال کہلاتے تھے وہ بھی فکروتردّد میں گھر گئے۔

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکروتردد کو تو یاں ہے
مشتاقِ ملاقات انھوں کا کس و ناکس
ملنا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جاکے دوگانہ
نیت قطعۂ تہنیتِ خانِ زماں ہے

---

۲ کنور پریم کشور فراقی، وقائع عالم شاہی، رام پور، ۱۹۴۹، ص ۱۴۴
۳ ایضاً، ص ۱۴۱

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر

گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا

پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

اہل دول کے در پہ جبہہ سائی کے باوجود دولت حاصل کرنے میں شاعر ناکام رہتے تھے۔ جب بے زری انتہا کو پہنچ گئی تو بقول مرزا:

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا

کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا

تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا

نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا

کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

گارساں دتاسی نے تذکرہ مجمع الانتخاب کے حوالے سے سوداؔ کی والدہ کو عالیؔ کی بہن بتایا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

"ایک ایسے معاشرے میں جہاں خون کا رشتہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ نعمت خاں عالی کا نواسہ کوئی ایسی غیر اہم بات نہیں جس کا ذکر سودا کے معاصر تذکرہ نگار نہ کرتے۔ سودا کے اس شعر سے بھی نعمت خاں عالی سے قرابت داری کی تردید ہوتی ہے:

کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں

اس سے مرغوب تر ہے اُس کا خیال

ہندوستان میں دکن، فرخ آباد اور اودھ وہ علاقے تھے جہاں شاعروں کا استقبال ہوتا تھا۔ یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ بقول شاہ ولی اللہ سعادت خاں ایرانی اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پر قابض تھے۔ دو کروڑ اس صوبے سے وصول کرتے تھے۔ ایک کروڑ خرچ کرتے تھے اور ایک کروڑ جمع کرتے تھے۔[۱] ''منتخب روزگار'' ترکِ وطن کر کے ان مقامات پر چلے گئے۔ جہاں متاعِ ہنر کی قیمت سونے چاندی کے سکّوں میں ملتی تھی۔ خانِ آرزو، عارف علی خاں عاجز، قیام الدین قائمؔ، احسن اللہ خاں بیانؔ، محمد فقیہہ صاحب دردمند، ہدایت اللہ ہدایت، قلندر بخش جرأت، مصحفیؔ، میر قمرالدین منت، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ وہ شاعر ہیں جنھیں حالات سے مجبور ہو کر دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔[۲]

مرزا رفیع دربدر مارے پھرنے کو بُرا سمجھتے تھے۔ ان کی ایک رباعی ہے۔

سوداؔ پئے دنیا تو بہرسو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے ہے کہ دنیا ہوئے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

لیکن دہلی کے ناگفتہ بہ حالات میں ان کے لیے بھی ترکِ وطن کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اور انھیں بھی ''آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو'' ہونا پڑا۔

زندگی سے فرار

دَورِ زوال میں مغل حکومت کی حالت ایک ایسے مریض کی تھی جو جانکنی کے عالم میں

۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۰۴

۲۔ دلّی سے جانے والے شاعروں کی یہ فہرست قطعی نامکمل ہے۔ نیز ان کے زمانۂ رخصت کے تقدیم و تاخیر کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ مرزا مظہر جانجاناں جیسے صوفی منش انسان بھی روز روز کی قتل و غارت گری سے تنگ آ کر ترکِ وطن کا ارادہ کر چکے تھے۔ مگر کچھ خانگی مجبوریوں نے باز رکھا۔ ملاحظہ ہو۔
مرزا مظہر جانجاناں، مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، مرتبہ و مترجمہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۹

ہو،مگر جسے موت نہ آتی ہو۔ یہ تکلیف بادشاہ ،امراء اور عوام تک سب ہی کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گردن پر ایک ننگی تلوار لٹکی ہوئی ہے جو کسی وقت بھی ان کے سر کو جسم سے علاحدہ کرسکتی ہے۔ عظمتِ ماضی کا احساس ان کے زخموں پر نمک تو چھڑک سکتا تھا، سکون نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جاگیر طبقہ کے دست و بازو شل ہوچکے تھے۔اس لیے سماج کے تمام افراد کے سامنے ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا'' فرار'' زندگی اور اس کے تلخ حقائق سے فرار۔

فرار کی دو نمایاں صورتیں تھیں۔ مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات کی کوشش کی جائے اور مادّی دنیا کی ناکامی کے احساس کو مٹانے کے لیے عالمِ آخرت کے لیے جدوجہد کی جائے، دوسرا راستہ تھا دین و دنیا سے بے نیاز ہوکر رامش و رنگ و بو میں ڈوب جانا:

انچہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر
شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

اس دور میں فرار کی یہ دونوں صورتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔اس موضوع پر اسلم پرویز کا ایک شعر ہے:

عبادت ہوکہ میخواری فرارِ زندگانی ہے
یہ وہ کرتے ہیں اسلم جن سے غم کھایا نہیں جاتا

تصوف کو اس عہد میں جتنی مقبولیت رہی ہے۔شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔
سعادت یار خاں رنگین کے شہر آشوب کا ابتدائیہ اس ذہنی فرار پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔

سنو بیان اک میرا یارو منصف ہو تو سُن کر رو دو
ایک دن مجھ کو سوچ یہ آیا یعنی زمانے نے ہے ستایا
اس دنیا میں آئے ہیں جب سے چین نہیں ہے مطلق تب سے

دولت اپنے پاس نہیں ہے　　کچھ آمد کی آس نہیں ہے
فکرِ معیشت نے ہے مارا　　کیجیے کس صورت سے گزارا
ہوا بہت سا جب میں مضطر　　تب یہ کہا دل نے گھگھیا کر
کیوں رے دل کیا مرضی ہے تیری　　فکر تجھے کچھ ہے بھی میری
چیز بڑی دنیا میں ہے دولت　　دن اس کے ہوتی ہے ذلّت
کھیتی کر یا کر تو تجارت　　نوکری کر یا باندھ کے ہمّت
سن کر دل نے یوں کہا مجھ کو　　خاص میں کہتا ہوں تجھ کو
ہووے اگر امدادِ الٰہی　　سب سے بہتر یادِ الٰہی
صبر کی داد خدا ہی دے گا　　دل کو مراد خدا ہی دے گا[۱]

یہ اشعار بتارہے ہیں کہ عوام تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتے تھے اور جب ناکامی ہوتی تھی تو تجارت، کھیتی اور نوکری کا خیال چھوڑ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہوجاتے۔ خانقاہوں میں صبر وقناعت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں سمجھایا جاتا تھا کہ دنیا قحبہ خانہ ہے جس سے ہر انسان کو دامن بچا کر نکل جانا چاہیے۔ اردو شاعری تصوف کی مقبولیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ تصوف کے فلسفیانہ مسائل، مذہبی رواداری، پاکیزگی خیال، عشقِ حقیقی اور افلاطونی عشق کا تصور، خودداری، عظمتِ انسانی کا احساس، بے ثباتیٔ دنیا اور صبر وقناعت اسی راستے سے اردو شاعری میں آئے ہیں۔ جس کا اثر مرزا کی شاعری پر بھی بہت نمایاں ہے۔

اس دور میں مرزا مظہر جانجاناں، شاہ ولی اللہ، مولانا فخر الدین اور خواجہ میر درد جیسی قابلِ احترام ہستیاں بھی تھیں۔ یہ تمام حضرات اس زوال کو روکنے کی پوری جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے اندازِ فکر سے اختلاف ممکن ہے لیکن ان کے خلوص، ایمان داری اور

---

۱ ڈاکٹر صابر علی خاں، سعادت یار خاں رنگین، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۱۹۵

صداقت پر شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

فرار کا دوسرا راستہ عیش و عشرت تھا۔ مادی مشکلات میں جنسی آسودگی کچھ دیر کے لیے انسان کو سب کچھ فراموش کرا دیتی ہے۔ جب مغل بادشاہ حالات کی تاب نہ لا سکے تو غرقِ مئے ناب ہو گئے۔

جہاندار شاہ کی تفریح اور عیاشی کے لیے مہینے میں تین دفعہ سارے شہر میں چراغاں ہوتا تھا۔ لال کنور جیسی بازاری عورتوں کو قلعہ اور ملک کی سیاست میں پورا پورا دخل تھا۔ صرف اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جہاندار شاہ نے جمنا میں آدمیوں سے بھری ہوئی ایک کشتی کو ڈبونے کا حکم دیا۔ قائم نے جس کا اپنے شہر آشوب میں ذکر کیا ہے۔ محمد شاہ کے زمانے میں یہ عیاشی انتہا کو پہنچ گئی۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے میں ایک ناقص الاوّل بیاض ہے۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی تصنیف غالباً عہدِ محمد شاہ ہی میں ہوئی ہے۔ مصنف نے محمد شاہ کی عیاشی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''حضرت سبحانی (محمد شاہ) مقدماتِ سلطانی سے بے خبر قلعہ دارالخلافہ شاہ جہاں آباد کو فوزِ عظیم سمجھتے ہیں۔ ستمن برج اور انگوری باغ وغیرہ کی سیر کو غنیمت جانتے ہیں۔ ہمیشہ شراب خوری، بچہ بازی اور زنا کاری میں مشغول رہتے۔ اپنے ساتھ برہنہ ہونے کی حد تک چست اور تنگ لباس سے آراستہ عورتیں رکھتے (کذا) شہر کے لوگوں نے خدا کو فراموش کر دیا ہے۔ خواص و عوام نے عورتوں کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ روزے نماز کے بدلے حرام کاری، شراب خوری اور اغلام میں مطلق العنان ہو گئے ہیں''۔[1]

محمد شاہ نے بھی ایک بازاری رقاصہ ادھم بائی کو ملکہ بنا لیا تھا جس نے بہت جلد اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ ہر فرمان پر اس کی مہر لگنے لگی۔ بقول سرکار جس زمانے میں سپاہی اپنی تنخواہوں کے لیے روز بغاوت کرتے تھے اور حکومت قلعہ کے سونے چاندی کے برتن

---

[1] قلمی وقدیم بیاض، بحوالہ دلّی نمبر، دلّی کالج میگزین، ص ۲۹۵

فروخت کرنے کے بعد بھی اس قابل نہیں تھی کہ دو لاکھ روپے ہی ادا کر دیتی۔ اودھم بائی نے جنوری ۱۷۵۴ء میں اپنا یومِ پیدائش منایا اور اس پر دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔

نواب درگاہ قلی خاں ۱۱۵۱ء میں دہلی آئے تھے اور تین سال تک ان کا یہاں قیام رہا۔ انھوں نے اس زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیرزادوں نے عیش وعشرت کو بحیثیتِ فن ترقی دی تھی۔ ان کے دن رات شراب، امردوں اور عورتوں میں گزرتے تھے۔ فدوی خاں کے لڑکے اعظم خاں کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب نے لکھا ہے:

> ''یہ خانجہاں بہادر عالم گیری کے بھتیجے ہیں۔ امرائے عظیم الشان میں ہیں۔ مزاج میں رنگینی اور موسیقی میں مہارت حاصل ہے، اس لیے ہندوستان کے موسیقار اِن کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت امرد پسند ہے اور مزاج سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار ہے اُن کی جاگیروں کی آمدنی اس فرقے پر خرچ ہوتی ہے اور تمام دنیا کی دولت ان امردوں کے قدموں پر نثار۔
>
> جہاں کہیں کسی امرد کی خبر ملتی ہے، دل کی ہاتھوں مجبور ہو کر اُس پر اپنی رفاقت کی کمند ڈالتے ہیں اور جہاں کہیں سے کسی سادہ رو کا پیغام ملتا ہے اُسے اپنے احسان کے جال میں پھانس لیتے ہیں۔ اس گروہ کے بہت سے لڑکوں نے اُن کی حسنِ سعی سے مناصبِ مناسب پر امتیاز حاصل کیا ہے اور (اب بھی) اُن کے دوست ہیں۔ بعضے خانگی مراعات پر اکتفا کر کے محفلِ نشاط میں رونق افروز ہیں۔ (یہ امرد) بڑی شان وشوکت سے ناقابلِ بیان تجمل کے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ غرض جہاں کہیں سبز رنگ نظر آئے، وہ اعظم خاں سے منسوب ہے اور جہاں کہیں کوئی نوخط نظر آئے، تو پتا چلتا ہے کہ اسی عظیم الشان سے وابستہ ہے۔ ان گلرخوں کے حسن کے پرتو سے (اعظم خاں) بڑھاپے کو

جوانی میں بدلے ہوئے ہیں اور اس خیال سے کہ عمرِ عزیز بہت کم باقی ہے۔نفسانی لذتوں کے حصول میں عجلت سے کام لے رہے ہیں"۔[1]

"مرزامنواس زمانے کے امیرزادوں میں ہیں اورامرد پرستی کے فن میں یگانۂ روزگار ہیں اکثر امیرزادے اس علم کے اہم نکات انہی سے سیکھتے ہیں، وہ اُن(اعظم خاں) کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔(مرزا منو) اس محفل کے منتظم اور اس بزمِ غلمان کے مہتمم ہیں۔ ان کا گھر بہشتِ شدّاد ہے اور اُن کا کاشانہ خانۂ مجمع پریزاد ہے۔ ہر وہ نوخطِ رنگیں، جس کا اس محفل سے تعلق نہیں ہے،وہ فردِ باطل ہے اور جس سانولے سلونے کا اس مجلس سے ربط نہیں ہے،وہ ناقابلِ اعتبار ہے۔اُن کی مجلس میں حسین امردوں کی پرکھ ہوتی ہے اور اُن کی محفل گلرخوں کی کسوٹی ہے۔اگر حسن کے سونے چاندی کا سکہ ان کی محفل کی دارالضرب میں نہ ڈھلے تو کھرا نہیں ہوتا۔کیا ہوا اگر وہ(حسین) سونا چاندی ہے۔جب حسن کی چاندی اس محفل کی بھٹی میں نہ پگھلے،چاندی نہیں ہے۔کیا ہوا اگر چاندی خالص ہے۔رباعی:(ترجمہ)

دوستو اب قمارخانے میں ایسے کچھ ہی رند باقی ہیں،

جو کم عیار لوگوں سے نہیں ملتے۔

رند بہت کم ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ بہت کم ہیں

(یہ رند) دو عالم کے نقد وادھار(اس دنیا کے نقد

اور آخرت کے ادھار) پر ہنستے ہیں"۔[2]

کسل سنگھ بادشاہی ہزاریوں میں تھے۔انھوں نے مادّی عیش وعشرت کے لیے جو سامان فراہم کیے تھے،اس کی تفصیل نواب صاحب نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

---

[1] درگاہ قلی خاں،مرقع دہلی،مرتبہ ومترجمہ خلیق انجم،نئی دہلی،۱۹۹۳،ص ص ۱۳۷۔۱۳۸

[2] مرقع دہلی،مرتبہ ومترجمہ خلیق انجم،ص ۱۳۸

''کسل سنگھ بادشاہ کے ہزاری منصب داروں میں ہیں۔ ہم سردوں میں اپنی دولت و ثروت پر فخر کرتے ہیں۔ کسل پورہ بڑی خوب صورتی اور تکلّف کے ساتھ آباد کیا ہے۔ ہر طرح کی طوائفوں اور رنڈیوں کو لاکر آباد کیا ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں اور نشہ آور اشیا کے فروخت کرنے والوں کو اپنی سرپرستی میں وہاں لاکر رکھا ہے۔ اگرچہ وہاں بہت بھیڑ رہتی ہے، لیکن محتسب اس علاقے کے قریب سے بھی نہیں گزرتا، اس کی کیا مجال کہ احتساب کرے۔ ہر راستے پر رنگ برنگے لباس پہنے عورتیں خود کو مردوں کے سامنے پیش کرتی ہیں اور ہر گلی کوچے کے موڑ پر دلال لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ کسل پورے کی ہوا شہوت انگیز اور فضا باہ انگیز ہے۔ خاص طور سے شام کو بہت مجمع اور عجیب ہنگامہ ہوتا ہے۔ ہر گھر میں رقص ہوتا ہے اور ہر مکان میں سرود۔ اہلِ ہوس بغیر کسی مزاحمت اور ممانعت کے وہاں آتے ہیں اور دامنِ شہوت کو خیارک اور سوزاک (جیسی بیماریوں سے) بھرتے ہیں اور پھر باقی زندگی حسرت و یاس میں گزارتے ہیں۔ غرض عجب مقام اور طرفہ تماشا ہے''۔[۱]

ذکر کیفیتِ ناگل

'' خواجہ بسنت اسد خانی کی سرائے کے قریب ایک احاطہ ہے بہت خوب صورت اور صاف ستھرا۔ اس میں ناگل نامی ایک صاحبِ کمال مدفون ہیں۔ ہر مہینے کی ستائیس تاریخ کو عاشق مزاج عورتیں خوب سج دھج کر جوق در جوق زیارت کے لیے وہاں آتی ہیں۔ حقیقت میں اُن کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔ جن مردوں سے اُن کا تعلق ہوتا ہے، اُن سے مل کر دادِ عیش دیتی ہیں۔ بہت سے مجرد اور پردیسی لوگ خوب بن سنور کر، اس اُمید میں

۱؎ مرقع دہلی، ص ۱۴۶

کہ شاید انھیں کوئی قبول کرلے، اُس جلوہ گاہ میں خود کو پیش کرتے ہیں۔ مصرع:

دیکھیے دوست کسے چاہے گا اور کس پر توجہ کرے گا

کہا جاتا ہے کہ اس مقام کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر پردیسی اس تفریح گاہ میں آجائے تو فوراً اُسے اپنا جوڑا مل جاتا تھا۔ اگرچہ یہ تماشا گاہ بہت وسیع ہے، پھر بھی تماشائی اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔ لوگ وہاں صبح آتے ہیں اور شام کو واپس جاتے ہیں۔ سڑک کے کنارے جو باغ ہیں، واپسی میں اُن کی سیر کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ غرض عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے ہیں اور خوب چیزیں اختراع کی ہیں۔ خدا تمام دوستوں کو نصیب کرے۔[1]

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ "فرار" کے یہ دونوں راستے ایک دوسرے میں ضم ہوگئے۔ اس عہد میں تصوف کے جس فلسفے کو مقبولیت تھی۔ وہ وحدت الوجود کا فلسفہ تھا۔ یعنی ہر چیز خدا ہے۔ یہ فلسفہ مذہب کی ظاہری رسوم، دیر و حرم کی تفریق وغیرہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ سماج پر اس فلسفے کے مثبت اثرات یہ ہوئے کہ عوام میں مذہبی رواداری پیدا ہوگئی۔ مندر اور مسجد کا فرق ختم ہوگیا۔ لیکن نقصان یہ ہوا کہ عام سماجی زندگی میں بے اعتدالیاں پیدا ہوگئیں۔ جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ انسان بھی خدا ہے تو پھر یہ مضحکہ خیز بات ہے کہ خدا خدا کی عبادت کرے۔ ایسی صورت میں کوئی گناہ گناہ نہیں رہتا۔ کیوں کہ گناہ کا مرتکب خود خدا ہے۔ جب خدا ہی مرتکب ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ خدا خود اپنی ذات کو سزا دے۔

اسی فلسفے نے حرم اور میکدے کی سرحد ختم کردی۔ لوگ خدا اور اپنے نفس دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ صوفی انفرادی نجات حاصل کرنے میں کوشاں ہوگئے۔ عوام ان کی خدمت میں نجات کا راستہ دیکھنے لگے۔ بادشاہ اور امراء و رؤسا جو دنیا بھر کی عیاشیاں کرتے۔ صوفیوں کی بہت عزت کرتے اس طرح ایک طرف تو عوام میں تصوف کی مقبولیت بڑھتی گئی اور دوسری طرف خود بادشاہ کو ذہنی فرار حاصل ہوتا۔ بادشاہ دعا گوئی

کے صلے میں مددِ معاش کے طور پر جاگیریں عنایت کرتے اور مختلف انعام واکرام سے نوازتے۔ اس لیے بعض عیار و مکار لوگوں نے تصوف کو ذریعۂ معاش بنالیا۔ عالم گیر ثانی کو صوفیوں سے بڑی عقیدت تھی۔ احمد علی سندیلوی نے لکھا ہے کہ عالم گیر ثانی مرزا مظہر سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔[۱]

سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ شاہ عالم خواجہ میر درد کے ہاں حاضر ہوا تھا۔[۲] عالم گیر ثانی کا قتل بھی اس بہانے سے کیا گیا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ فیروز شاہ کوٹلہ میں کوئی برگزیدہ بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ جب بادشاہ وہاں پہنچا تو دشمنوں نے قتل کر دیا۔ صاحبِ ''سیر المتاخرین'' لکھتے ہیں۔'' آخری عمر میں (محمد شاہ) فقیروں کی صحبت میں خوش رہتے اور انھیں کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے''۔[۳] درویشوں اور فقیروں سے محمد شاہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اس نے شاہ مبارک کو برہان الطریقت، شاہ بدا کو برہان الحقیقت اور شاہ رمز کو فصیح البیان کے خطابات دیے تھے[۴] محمد شاہ نے قمر الدین خاں وزیر کی معرفت مرزا مظہر سے کہلوایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہم کو ملک عطا کیا ہے جو کچھ آپ کو پسند آئے بطور ہدیہ قبول فرمائیے۔[۵] مرزا مظہر نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔

چوں کہ اُس سماج میں صوفیاء کی بہت عزّت ہوتی تھی۔ اس لیے تصوف سماجی عزّت و وقار حاصل کرنے کا بھی بہترین ذریعہ بن گیا اور بد سے بدکردار لوگوں نے اس مسلک کو اختیار کر کے پیسہ کمانے کا ایک بڑا موثر ذریعہ بنالیا۔ انھیں علمائے سو نے المجاز قنطرۃ الحقیقت کے فلسفے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ''امرد پرستی'' جیسے غیر فطری فعل کو جنسی آسودگی کا ذریعہ بنالیا۔ انھیں حرم اور میکدہ دونوں سے خلوص تھا۔ ان کی راتیں میخانوں اور دن خانقاہوں میں گزرتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں کو باقاعدہ دکانیں بنالیا گیا۔

---

۱ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب (قلمی)، ورق ۲۲۰ ب

۲ سعادت خاں ناصر لکھنوی، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)۔ نیز ملاحظہ ہو، قدرت اللہ شوق رام پوری، تکملۃ الشعرا (قلمی) ص ۲۲۷

۳ سیر المتاخرین، ۳، ص ۸۷۰

۴

۵ شاہ غلام علی، مقاماتِ مظہری، دہلی، ۱۳۰۹ھ، ص ص ۳۸-۳۹

شاید آج بھی پیرس کے نائیٹ کلبوں میں وہ شرمناک جنسی مناظر نظر نہ آتے ہوں گے جو اس دور کے عرسوں میں عام تھے۔نواب درگاہ قلی خاں نے ایسے بہت سے عرسوں کا ذکر کیا ہے۔دہلی میں سرائے خواجہ بسنت اسد خانی کے قریب کسی ناگل نامی بزرگ کا مزار تھا۔اس پر ہر مہینہ عرس ہوتا تھا۔نواب صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ہر مہینے کی ساتویں تاریخ کو عاشق مزاج بدکردار عورتیں پوری سج دھج کے ساتھ جوق در جوق زیارت کے لیے آتی ہیں۔دراصل ان کے آنے کا مقصد کچھ اور ہی ہوتا ہے۔یہاں آکر لطف اٹھاتی ہیں۔اُن مردوں کے ساتھ داد عیش دیتی ہیں جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔اکثر اہل تجرید اور غریب پیشگاں اس امید میں کہ شاید اُن پر بھی کسی کی نگاہِ انتخاب پڑ جائے اور انھیں بھی کوئی قبول کر لے۔خوب بن ٹھن کر وہاں آتے ہیں۔اُس جگہ کے خواص کا بیان ہے کہ اگر کوئی پردیسی یہاں آئے تو اسے فوراً اپنا جوڑا مل جاتا ہے''۔[1]

مذہب اور جنسی لذتوں کی بگڑی ہوئی مکمل شکل خلد منزل (بہادر شاہ اوّل) کے عرس میں ملتی ہے۔

''۲۳ر ماہ محرم کو خلد منزل کا عرس ہوتا ہے۔ان کی قبر حضرت قطب الاقطاب کے جوار میں ہے۔مہرپرور جو خلد منزل کی زوجہ ہیں حیات خاں ناظر کی مدد سے ایک ماہ پہلے ہی چراغاں بندی کی تزئین و ترتیب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں، چراغاں طرح طرح سے اور عجیب عجیب شکلوں میں ہوتا ہے...... ہر گوشہ و کنار میں تجلّی آگیں بنگلے وادیٔ ایمن سے سبقت لے جاتے ہیں۔عاشق (معاشران) ہر گوشہ و کنار میں اپنے محبوبوں کو بغل میں لیے، عیاش لوگ نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے کوچۂ بازار میں رقص

[1] مرقع دہلی، ص ۳۹

> کرتے ہوئے، مے خوار محتسب سے بے خوف سیہ مستوں کی تلاش میں، شہوت طلب کسی بھی مزاحمت سے بے خوف شاہد پرستی میں مصروف، زاہدوں کی توبہ توڑنے والے نوخط امردوں کے ہجوم (نظر آتے ہیں) ۔[1]

ان تمام سماجی حالات سے اردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ میرؔ، مرزاؔ اور حد تو یہ ہے کہ مرزا مظہر جیسے ثقہ بزرگوں کے کلام میں امردوں کے نام ملتے ہیں۔ میر کے ذہن پر تصوف کی گرفت مضبوط تھی۔ غالباً اس لیے کہ ان کی پرورش متصوفانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ مرزا تصوف سے صرف ایک حد تک متاثر ہیں۔ اُن پر ان سماجی حالات کا اثر نسبتاً زیادہ ہے اور شاید اسی لیے اردو شاعری میں خارجیت کی ابتدا ان ہی سے ہوتی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے سماجی حالات تقریباً ایک ہی تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لکھنؤ والوں پر تصوف کا کوئی نمایاں اثر نہیں تھا۔ دبستانِ دلّی کے لب و لہجہ میں جو شائستگی ہے وہ تصوف کی دین ہے۔ اگرچہ اکثر وہ شائستگی کی حدوں سے باہر بھی آجاتے ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں عشق و محبت اور معاملہ بندی کے مضامین زیادہ ہیں۔ یہ مضامین حقیقی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ تصوف کے فلسفوں سے خلط ملط نہیں ہیں۔

ان سیاسی اور سماجی حالات کی روشنی میں مرزا کی زندگی اور ان کے فن کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ مرزا ایسے بااقتدار لوگوں سے متوسل رہے تھے، جو صاحب حل و عقد تھے جس کی وجہ سے انھیں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کو زیادہ بہتر سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے شہر آشوب اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان میں بھرپور سیاسی شعور تھا۔ انھوں نے امراء و رؤسا مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ان شہر آشوبوں اور ہجووں میں وہ ہنسی ہے، جو انتہائے غم پر آجانے کا نام ہے۔

---

[1] مرقع دہلی، ص ۱۱۔۱۲

سوانح

سیر کی یوں کوچۂ ہستی کی ہم
نَے میں سے جوں نالہ گزر کر گیا

آباواجداد

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مرزا کے آباواجداد کابل سے ہندوستان آئے تھے۔[1] لیکن یہ درست نہیں۔ کیوں کہ نقش علی نے ان کا وطنِ اصلی بخارا بتایا ہے۔[2] نقش علی کے مرزا سے ذاتی تعلقات تھے۔ اس لیے ان کا بیان زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ بھگوان داس ہندی نے بھی یہی لکھا ہے کہ اُن کے اجداد بخارا سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔[3] بعض معاصرین کے بیانات کے علاوہ خود مرزا کے کلام میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ بخارا کے تھے۔ نیز یہ کہ وہ کابل کے مغلوں کو بُری نظر سے دیکھتے تھے۔ میر علی ہاتف نے حکیم آفتاب کی ہجو کہی تھی۔ مرزا نے حکیم صاحب کی فرمائش پر اس ہجو کا جواب دیا۔ جو کلیاتِ سودا میں موجود ہے اور جس کا ایک بند یہ بھی ہے:

شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی
وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی
کونان کو کونون کہنے پہ تیری زباں جھکی

---

[1] ان میں چند قابلِ ذکر تذکروں کے نام یہ ہیں: حکیم قدرت اللہ قاسم، مجموعہ نغز، مرتبہ محمود شیرانی لاہور، ۱۹۳۳ء، جلد ۱، ص ۳۰۴۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، گلشن بے خار، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۹۹۔ ایف فیلن و مولوی کریم الدین، طبقات شعرائے ہند، دہلی، ۱۸۴۸ء، ص ۱۰۳۔ مولوی عبدالغفور نساخ، سخن شعرا، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۲۲۳۔ شیخ چاند، سودا، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۳۵۔ لالہ سری رام، خم خانۂ جاوید، جلد ۴، دہلی، ۱۹۲۶ء، ص ۳۱۷۔ مفتی صدرالدین آزردہ، تذکرہ آزردہ (قلمی) کیمبرج انگلینڈ، ص ۴۸

[2] نقش علی، باغ معانی (قلمی)، خدا بخش، ورق ۶۲ ب

[3] بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی، مرتبہ محمد عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۵

ہرگز کسے نگویدت آغا علی قلی

زیں گفتگو عبث دلِ خود شاد کردۂ

اگر مرزا خود کابل کے ہوتے تو کابل کے مغلوں کو اس انداز میں ہرگز بُرا بھلا نہ کہتے۔اس لیے ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے آباواجداد بخارا ہی سے آئے تھے۔[۱]

مرزا کے چچا

ان کا نام نہیں معلوم ہوسکا۔تذکرۂ قائمؔ سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ بہادر شاہ اوّل کی فوج کے ساتھ دکن گئے تھے اور اُن کے ساتھ مرزا ابوطالب نامی فارسی شاعر دہلی آئے تھے۔[۲] البتہ مرزا کے ننھیال سے متعلق دو اہم نام ملتے ہیں۔

نعمت خاں عالی

غالباً شاہ کمال پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے مرزا کو "پسرِ دخترِ نعمت خاں عالیؔ" لکھا ہے۔[۳] گویا کمال کے بیان کے مطابق نعمت خاں عالیؔ مرزا کے سگے نانا تھے۔دتاسی کو نہ جانے کیا غلط فہمی ہوئی۔اس نے کمالؔ کے حوالے ہی سے لکھا ہے کہ مرزا کی والدہ نعمت خاں عالیؔ کی بہن تھیں۔[۴] قصائد سودا کے ایک قلمی نسخے کا آغاز ان الفاظ سے

---

۱ شاید آزادؔ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے لکھا ہے کہ "بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔مرزا شفیع (والدِ مرزا) بطریقِ تجارت واردِ ہندوستان ہوئے۔محمد حسین آزاد، آبِ حیات، لاہور، ۱۹۱۳ء، ص ۱۴۸۔ممکن ہے آزاد سے پہلے بھی کسی اور نے لکھا ہو مگر وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔البتہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ" یکے از اجداوش (مرزا شفیع نہیں) بہ ہندوستان آمدہ" بعد کے تذکرہ نگاروں نے آزاد کا بیان دہرایا ہے۔مثلاً سودا، ص ۳۵۔ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، دلّی کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ، ۱۹۴۴ء، ص ۱۵۰۔اثرؔ کاکوروی، نیرنگِ سودا، ص ۲۱

۲ شیخ محمد قیام الدین قائمؔ، مخزنِ نکات، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء، ص ۱۰

۳ شاہ کمال الدین کمالؔ، مجمع الانتخاب (قلمی)، انجمن، ورق ۳۶۲ ب۔شیخ چاند نے بھی کمالؔ کے بیان کو تسلیم کیا ہے۔سودا ص ۳۵

۴ گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات، ۳، ص ۶۷، بحوالہ معاصر، حصہ ۲

ہوتا ہے۔قصائدِ مرزا محمد رفیع سودا۔دختر زادۂ نعمت خاں عالیؔ[1]۔سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ" مادرِ گرامی ان کی دختر خجستہ اختر خاندانِ نعمت خاں عالی سے ہے۔[2] ہمارے خیال سے یہ درست نہیں کہ سوداؔ کی والدہ عالیؔ کی بہن یا بیٹی تھیں۔اگر ایسا ہوتا تو اکثر تذکرہ نگار اس کا ذکر ضرور کرتے۔خاص طور پر میر، قائم اور گردیزی۔ کیوں کہ یہ سب لوگ سوداؔ کو بہت قریب سے جانتے تھے اور نعمت خاں[3] عالی کا بھانجا یا نواسہ ہونا سودا کے لیے باعثِ عزّت تھا۔[4]

گارساں دتاسی نے تذکرہ مجمع الانتخاب کے حوالے سے سودا کی والدہ کو عالیؔ کی بہن

---

1. قصائد سودا (قلمی) آصفیہ، نمبر ۱۱۸

2. نعمت خاں عالیؔ کا اصل نام مرزا محمد تھا۔ان کے اسلاف شیراز میں پیشۂ طبابت میں شہرت رکھتے تھے۔خود ان کے والد فتح الدین بھی حکیم تھے۔حکیم فتح الدین کے بھتیجے حکیم محسن خاں شاہ عالم اوّل کی شہزادگی کے زمانے میں اُن کے مصاحب تھے۔حکیم محسن خاں کے لڑکے اور عالی کے چچا زاد بھائی حکیم حاذق کو عہدِ عالم گیری کے سالِ آخر میں حکیم الملک کا خطاب ملا اور محمد شاہ کے عہد میں پنج ہزاری منصب پر فائز ہوئے اور حکیم الملوک خطاب پایا

3. آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ عالیؔ ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن صغر سنی میں اپنے والد کے ساتھ شیراز چلے گئے تھے، جہاں کسب کمال کیا تھا اور پھر عہد اورنگ زیب کے وسط میں ہندوستان آئے اور اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کرلی۔اورنگ زیب نے پانصدی منصب، نعمت خاں خطاب اور خدمت خان سالاری عنایت کی۔اورنگ زیب کے دورِ آخر میں جواہر کی داروغگی اور مقرب خاں خطاب ملا۔بادشاہ کے انتقال کے جب محمد اعظم شاہ، شاہ عالم کے مقابلے کے لیے آیا تو یہ شاہ عالم کے ہم رکاب تھے۔محمد اعظم شاہ کے مارے جانے پر انھوں نے شاہ عالم کی ملازمت کرلی۔اسی کے عہد میں سہ ہزاری منصب پایا اور دانش مند خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔
ہجو گوئی میں کمال رکھتے تھے اور حج بھی کیا تھا۔اس لیے بقول خوشؔ گو فارسی کے مشہور شاعر بیدلؔ انھیں حاجی ہجوی کہا کرتے تھے۔خوشؔ گو کا بیان یہ بھی ہے کہ عالیؔ کے علم و فضل اور قوتِ گویائی کا یہ عالم تھا کہ پورے ہندوستان میں کسی کو ان سے بحث کرنے کی مجال نہیں تھی۔
بقول خوشؔ گو ۱۱۲۳ھ میں اور بقول آزادؔ بلگرامی ۱۱۲۱ھ میں انتقال کیا۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔بندرابن داس خوشؔ گو، سفینۂ خوش گو، مرتبہ شاہ محمد عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، پٹنہ ۱۹۵۹ء، ص ۵۹۔۶۱۔میر غلام علی آزاد بلگرامی، سروِ آزاد، مرتبہ عبداللہ خاں، حیدرآباد ۱۹۱۳ء، ص ص ۱۳۶۔۱۳۹ میر غلام علی آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، کان پور، ۱۸۷۱ء، ص ص ۳۳۳۔

4. تاریخ ادبیات (جلد سوم) ص ۶۷

بتایا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

"ایک ایسے معاشرے میں جہاں خون کا رشتہ بڑی اہمیت رکھتا تھا نعمت خاں عالی کا نواسہ ہونا کوئی ایسی غیر اہم بات نہیں جس کا ذکر سودا کے معاصر تذکرہ نگار نہ کرتے۔ سودا کے اس شعر سے بھی نعمت خاں عالی سے قرابت داری کی تردید ہوتی ہے"۔

کم ہے ناصر علی سے نعمت خان

اس سے مرغوب تر ہے اُس کا خیال

البتہ یہ ممکن ہے کہ سودا کی والدہ خاندانِ عالی سے ہوں۔ یعنی اُن کا عالی سے کوئی دور کا رشتہ ہو۔

مرشد قلی خاں

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں "ذکر مغنیانِ ہندوستان بہشت نشان" کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس کے مصنف مرزا کے ایک ہم عصر لطف علی خاں صادق کے لڑکے عنایت خاں راسخ ہیں۔ یہ کتاب غالباً واحد ذریعہ ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا مرشد قلی خاں خراسانی تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس فارسی کتاب کا ایک اقتباس دیا ہے۔ یہ اقتباس کافی طویل ہے لیکن چوں کہ اس سے مرشد قلی خاں کے حالاتِ زندگی اور بعض دل چسپ واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے یہاں مکمل اقتباس کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

"ایک دن اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) نے امیر الامرا علی مردان خاں سے پوچھا کہ اے یار وفادار ہم تمھاری رائے کو مستقیم جانتے ہیں۔ ہمارے بعد تمھارے خیال سے کس شہزادے کو حکومت کا وارث ہونا چاہیے۔ انھوں نے دیکھا کہ بادشاہ کی خاطرِ اقدس

داراشکوہ کی کامیابی چاہتی ہے۔اگر موافق مزاج بات کہوں تو خلاف واقعہ ہوگا اور جب دوسرے شہزادے سنیں گے تو ناخوش ہوں گے اور اگر کسی دوسرے (شہزادے) کا نام زبان پر آگیا تو سوائے اس شہزاے کے جس کا نام لوں۔بادشاہ، داراشکوہ اور باقی تمام شہزادوں کی ناراضگی کا سبب ہوگا۔ (علی مردان خاں نے) عرض کیا۔جس شہزادے کے ساتھ بھی مرشد قلی خاں ہو (اُسے حکومت ملنی چاہیے......خانِ مذکور (مرشد قلی خاں) کمال جوہرو شجاعت رکھتا تھا۔ وہ شاہ عباس ثانی کے امرا کے رشتہ داروں میں تھا اور ان سرداروں میں ممتاز تھا جو علی مردان خاں کے ساتھ صاحب قران (شاہ جہاں) کے ملازم ہوئے تھے۔ آنحضرت (شاہ جہاں) کو امیرالامرا کی فہم و ادراک پر بڑا اعتماد تھا۔بادشاہ نے نصیحت فرمائی کہ مرشد قلی خاں کی دلجوئی کی جائے اور انھیں داراشکوہ کے ہمراہان میں منسلک کردیا۔لیکن چوں کہ وہ شہزادہ نازپرور آنحضرت کی قدر نہیں جانتا تھا اور اپنے باپ......کے ملازموں کے ساتھ تفقد و دلداری کی بجائے تحکمانہ انداز سے پیش آتا تھا۔اس لیے تھوڑے ہی زمانے میں انھوں نے شہزادے سے قطع تعلق کرلیا اور امیرالامرا کے پاس دوبارہ گئے۔اسی دوران میں جب شاہزادہ اورنگ زیب (کرم خوردہ......کذا) کو صوبجات دکن کی نظامت ملی تو وہ امیرالامرا کے گھر ان کی عیادت کو گیا اور خلوت میں کہا میں آپ سے ایک تحفے کا طلب گار ہوں۔اگر آپ قبول فرمائیں تو میں آپ سے عرض کروں۔امیرالامرا نے عرض کیا۔آپ پر سے میرے جان و مال نثار ہیں۔اورنگ زیب نے کہا۔مرشد قلی خاں کو ہمیں دے دیجیے۔یاروفادار نے جواب دیا۔اگر حضور (شاہ جہاں) رخصت دے دیں تو وہ جان و مال سے حاضر ہیں۔انھوں (اورنگ زیب) نے فیہ مافیہ پر نظر کرتے

ہوئے کہا کہ اس سلسلے میں ہمارا عرض کرنا درست نہیں......جس طرح بھی ہو حضور سے رخصت دلانے کی ذمہ داری آپ اپنے سر لیں۔ اورنگ زیب کا اصرار اس حد تک پہنچا کہ امیر الامرا نے ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ عرصے بعد جب وہ تندرست ہوئے تو دربار آئے۔ کئی دفعہ تمہید اُٹھانے کے بعد مدعا عرض کیا۔ مگر بادشاہ نے یہ بات سن کر ٹال دی۔ اس سے یار وفادار کو سخت پریشانی ہوئی۔ ساتھ بیٹھنے والوں میں سے کسی نے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ امیر الامرا نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ وہ سوال کرنے والا خوشحال کلاونت کا ہم سایہ تھا اور اس سے بڑے اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ دربار کا ذکر کرتے ہوئے اس شخص نے (کلاونت کو) یہ واقعہ بھی سنایا۔ خوشحال خاں نے کہا کہ اگر امیر الامرا مجھے ایک لاکھ روپیہ عنایت فرمائیں تو شاید مرشد قلی خاں کی رخصت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس عزیز نے دوسرے دن خوشحال خاں کا یہ مقولہ انھیں (امیر الامرا) کو سنایا۔ انھوں نے کہا کہ ایک لاکھ روپیہ دینا معمولی بات ہے مگر میں اسے عار سمجھتا ہوں کہ میری درخواست تو منظور نہ ہو اور کلاونت کے ذریعہ میں اپنا کام نکالوں۔ اس شخص نے امیر الامرا کی یہ بات خوشحال خاں سے کہی۔ اس نے جواب دیا کہ لطف تو یہی ہے کہ درخواست خود امیر الامرا کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ (درخواست اس وقت پیش کی جائے) جب یہ کمینہ اشارہ کرے۔

چند روز بعد نوروز کی تقریب میں جشن ہوا اور مغنیانِ مذکور......نے راگنی ٹوڈی تان سین سے گانے کی ابتدا کی اور طبع مبارک کے پسندیدہ دھرپد اس انداز میں گائے کہ مزاجِ مقدس پوری طرح متاثر ہو گئے......اس وقت خوشحال خاں نے امیر الامرا کو اشارہ کیا

> اور انھوں نے مرشد قلی خاں کے رخصت کی درخواست پیش کردی......عرضی پر دستخط کردیے گئے اور امیرالامرا نے سیاہہ خلعت خانے کو بھیج دیا۔ دوسرے دن دیوان میں مرشد قلی خاں کو خلعت خانہ سیاہہ کے ساتھ دو دروغاؤں نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تا کہ خلعتِ رخصت عنایت ہو......بادشاہ نے کہا ہم نے مرشد قلی خاں کو رخصت کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ یاروفادار نے......عرضی......پیش کی......اس وقت آنحضرت نے کہا کہ دستخط کرتے وقت درخواست پر ہماری توجہ نہیں تھی چوں کہ اظہار غفلت مناسب نہیں تھا اس لیے بہرحال خلعت رخصت کا حکم ہوگیا۔ اورنگ زیب خانِ مذکور کی رفاقت کو فوز عظیم جانتا تھا اور بہت بڑی عنایت سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ دوسری لڑائی (۱۰۶۸ھ میں جسونت سنگھ نے دارا شکوہ کی حمایت میں اورنگ زیب سے جنگ کی تھی) میں داراشکوہ نے انھیں جان سے ماردیا۔ اکثر اوقات شاہ جہاں یاروفادار (مرشد قلی خاں) کی تعریف کرتے تھے اور ان کے قتل پر اظہارِ افسوس کرتے۔ اسمٰعیل قلی خاں صاحب جو ۱۱۷۰ھ میں عظیم آباد میں مقیم ہیں۔ وہ مرشد قلی خاں کے پوتے ہیں اور مرزا......رفیع ان کے نواسے۔ [1]

بقول قاضی عبدالودود[2] ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی دوسرے ذرائع سے تصدیق نہیں ہوتی اور بعض تو صریحاً غلط ہیں۔ خان راسخ نے مرشد قلی خاں کے حالات اسمٰعیل قلی خاں سے سنے ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ راسخ نے اسمٰعیل قلی خاں اور سودا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ غلط ہو۔ ممکن ہے خان راسخ کے خود سودا سے بھی تعلقات رہے ہوں۔

مرشد قلی خاں اپنے زمانے کے مشہور اور نامور امیروں میں تھے۔ وہ ابتدا میں علی مردان

---

[1] عنایت خاں راسخ، ذکر مغنیانِ ہندوستان بہشت نشان (قلمی) پٹنہ، بحوالہ معاصر، حصہ ۲، ص ص ۱۱۱۔۱۱۴

[2] معاصر، حصہ ۲، ص ۱۱۴

خاں زیک حاکم قندھار کے ملازم تھے۔ جب علی مرداں خاں نے قندھار کا قلعہ شاہ جہاں کے حوالے کر کے اپنی فوج کے ساتھ اس کی ملازمت اختیار کی تو مرشد قلی خاں بھی اس کے ہمراہ تھے۔ یہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد بادشاہ کو عزیز ہو گئے۔ جلوسِ شاہ جہانی کے انیسویں سال خنجر خاں کی جگہ پر کانگڑہ کی فوجداری پر مقرر کیے گئے جب اورنگ زیب بلخ اور بدخشاں کی صوبہ داری پر نامزد ہوا تو مرشد قلی خاں کو بخشی گیری فوج پر متعین کیا گیا۔ جلوس کے بائیسویں سال میں جاں نثار خاں کی جگہ آختہ بیگی کا عہدہ ملا اور چوبیسویں سال میں لاہور کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

جلوس کے چھبیسویں سال میں جب شہزادہ اورنگ زیب نے صوبہ دکن کے انتظام کی طرف توجہ کی اور ہزارو پانصدی اور پانصد سوار کے منصب پر فائز ہوا اور بالا گھاٹ کی خدمتِ دیوانی ملی تو مرشد قلی خاں بھی ساتھ تھے اور دستوری کے عہدے پر سرفراز تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں اورنگ زیب کی سفارش پر پانصدی منصب اور خطاب خانی ملا۔ انتیسویں سال میں منصب میں پانصد سوار کی افزونی ہوئی اور ملتفت خاں کے بدلے انھیں پایاں گھاٹ کی خدمتِ دیوان پر سرفراز کیا گیا۔ جب دارا شکوہ نے شاہ جہاں پر اتنا قابو پالیا کہ کاروبارِ حکومت میں صرف اس کا نام باقی رہ گیا تو اورنگ زیب اس طرف متوجہ ہوا۔ بہت کم وقت میں اس نے ایک شاندار لشکر تیار کر لیا اور ایک اچھی قسم کا توپ خانہ ترتیب دیا۔ اس صوبہ میں شاہ جہاں کے جتنے ملازم تھے۔ سب اورنگ زیب کے ساتھ ہو گئے۔ مرشد قلی خاں بھی اورنگ زیب کے ملازم ہو گئے۔

یہاں مرشد قلی خاں کی وفاداری کا وہ واقعہ نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا جو حمید الدین خاں نے بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرشد قلی خاں کو اورنگ زیب کے مزاج میں کتنا دخل تھا۔ جب اورنگ زیب کو دکن کی صوبہ داری ملی اور وہ اورنگ آباد کے لیے روانہ ہوا تو راستے میں برہان پور میں قیام کیا۔ یہاں اتفاقاً اس کی نظر اپنے خالو سیف خاں کی ایک حرم زین آبادی (جس کا اصل نام ہیرابائی تھا) پر پڑ گئی۔ جس نے اورنگ زیب کے ہوش و حواس چھین لیے۔ اورنگ زیب نے مرشد قلی خاں سے (جن سے محرمیت خاص حاصل تھی) دل کا حال بیان کیا۔ مرشد قلی خاں نے عرض کیا۔ میں سیف

خاں کو قتل کر دیتا ہوں۔ میدان صاف ہو جائے گا۔ میرا جو حشر ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ اورنگ زیب نے جواب دیا کہ تمھاری جاں نثاری کا میں قائل ہوں۔ مگر میں خالو کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ تم جا کر اُن سے سارا واقعہ کہہ دو۔ جب سیف خاں نے یہ بات سُنی تو اپنی بیوی کی معرفت کہلا بھیجا کہ اورنگ زیب اپنی حرم چترباٸی میرے پاس بھیج دیں۔ میں زین آبادی کو دے دوں گا۔ اورنگ زیب نے شرط منظور کر لی اور وہ حرم اورنگ زیب کے پاس آگئی۔[1]

مرشد قلی خاں نے اورنگ زیب کی وفاداری ہی میں جان دی۔ ۱۰ ر رجب ۱۰۶۸ھ کو جب رایات پادشاہی نے آب نربدا پار کیا تو دارا شکوہ کے حامی مہاراجہ جسونت سنگھ سے لڑائی کرنی پڑی۔ اس وقت مکند سنگھ ہادہ، رتن راٹھور، دیال داس جھالہ جیسے بہادر اور دلیر راجپوت مہاراجہ جسونت کے ساتھ تھے۔ مہاراجہ نے پہلے اورنگ زیب کے توپ خانے پر حملہ کیا جو مرشد قلی خاں کے اہتمام میں تھا۔ انھوں نے جان پر کھیل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا، اپنی جگہ سے نہ ہٹے اور مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی۔ مولف ماثر الامرا ان کے بہت مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد قلی خاں جوششِ بہادری اور نشۂ سپہ گری کے وصف کے باوجود اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ بڑے دیانت دار اور خدا ترس تھے۔ دیوانی دکن کے زمانے میں عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے بہت کوشاں رہے۔ زمین کاشت کاروں میں تقسیم کر دی تھی، جس میں کاشت کار کو پیداوار کا چوتھا حصہ داخلِ سرکار کرنا ہوتا تھا۔ انھوں نے زمین سے متعلق ایک دستور العمل بنایا، جس پر مدتوں عمل ہوا۔[2]

مرزا شفیع

مرزا کے والد مرزا شفیع کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ چوں کہ مرزا کے

۱۔ حمید الدین خاں نیمچۂ عالم گیری، احکام عالمگیری، مرتبہ جادو ناتھ سرکار، کلکتہ ۱۹۱۲ء ، ص ص ۶۔۸

۲۔ مرشد قلی خاں کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہوں۔ محمد ہاشم خافی خان، منتخب اللباب، مرتبہ مولوی کبیر الدین احمد، کلکتہ، ۱۸۷۴ء، ص ص ۷۳۱۔۷۳۴۔ نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، ماثر الامرا، ۳، موتبہ مولوی مرزا اشرف علی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ص ص ۴۹۳۔۴۹۶۔ منشی محمد کاظم، عالم گیر نامہ، مرتبہ، مولوی خادم حسین و مولوی عبد الحئی، کلکتہ، ۱۸۶۸ء، ص ص ۴۴۔۵۴۔

اجداد ہندوستان آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ مرزا شفیع بھی دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ بتانا بھی بہت مشکل ہے کہ مرزا کے اجداد ہندوستان سپاہی کی حیثیت سے آئے تھے یا تاجر کی؟ اور مرزا شفیع کے والد کا پیشہ کیا تھا؟ بہر حال مرزا شفیع ایک تاجر تھے۔ قائم نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ عملِ تجارت میں مشہور تھے اور یہ بھی قائم کا بیان ہے کہ انھوں نے جوڑ کر چھوڑا تھا۔ مرزا نے بہت جلد دوست نوازی میں ختم کر دیا۔[۱] جس کا مطلب یہ ہے کہ مرزا شفیع کی مالی حالت اچھی خاصی تھی۔

مرزا کا نام

میر نے مرزا کا نام مرزا رفیع لکھا ہے۔[۲] لیکن اشپرنگر نے گردیزی کے حوالے سے مرزا رفیع الدین بتایا ہے۔[۳] جب کہ گردیزی خود مرزا رفیع الدین لکھتے ہیں۔[۴] لیکن عبرت الغافلین کے دیباچے میں سودا اپنا نام صرف محمد رفیع لکھتے ہیں۔[۵] ان کا نام وہی ہے جو گردیزی نے لکھا ہے یعنی "مرزا محمد رفیع"۔

مرزا کی ولادت

مرزا کے سنِ ولادت کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے اس امر پر براہِ راست روشنی پڑتی ہو۔ اس لیے تذکرہ نگاروں نے محض قیاس سے کام لیا ہے جو بیشتر غلط ہے۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد نے اُن کا سنِ پیدائش ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔[۶] یہ سنِ پیدائش قرار دینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میر اور سودا ہم عصر اور ایک دوسرے کے حریف تھے۔ آزاد نے اُن کی ادبی چشمکوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ چوں کہ

---

۱ مخزنِ نکات، ص ۳۵۔
۲ میر تقی میر، نکات الشعرا، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۳۱۔
۳ اشپرنگر، یادگارِ شعرا، مترجمہ طفیل احمد، الہ آباد، ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۱۔
۴ سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویان، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء، ص ۶۷۔
۵ کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ۳۷۷
۶ آبِ حیات، ص ۱۴۸

آزاد کے نزدیک میر کا سنِ پیدائش ۱۱۲۵ھ ہے اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے میر کے حریف سودا کو ہم عصر ثابت کرنے کے لیے یہ سنِ ولادت قرار دے دیا ہو۔ [۱] ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ ایک فقیر نے پیشن گوئی کی تھی کہ:

''انشاء اللہ تعالیٰ شہرت تیری چہار دانگ ہندوستان میں بے حد وحساب اور عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی'' [۲]

مرزا کے تخلص ''سودا'' سے ۷۱ برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح ان کا سنِ ولادت ۱۱۲۴ھ قرار پاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آزاد کا ماخذ یہ تذکرہ رہا ہو۔

شیخ چاند نے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۰۶ھ قرار دیا ہے۔ وہ قیام الدین قائم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قائم نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ کے زمانے (۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ) میں مرزا رفیع، بہادر شاہ کی فوج کے ساتھ دکن گئے تھے۔ اگر اس بیان کو صحیح تسلیم کریں تو اس زمانے میں اس کی عمر فوجی ملازمت کے لیے کم از کم ۱۸ سال ہوگی اور اس لحاظ سے سنِ ولادت ۱۱۰۶ھ سے قبل ہوسکتا ہے''۔ [۳]

شیخ چاند کے اس معروضے کی بنیاد قائم کے اس بیان پر ہے کہ:

''مرزا ابوطالب المتخلص بہ طالب مردے بود ہفتاد سالہ از متوطنانِ قبضۂ بلنڈہ کہ درنواحِ اورنگ آباد است۔ در لشکرِ بہادر شاہ سابقۂ آشنائے باعموے بزرگوار حضرتم مرزا رفیع صاحب بہم رسانید، ہمراہ لشکر ظفر اثر بہ رفاقت ایشاں برائے کارِ جاگیر خود بہ

---

[۱] بہت سے تذکرہ نگاروں نے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔ مثلاً دلّی کا دبستان شاعری، ص ۱۵۰۔ حکیم سید عبدالحیٔ، گل رعنا، اعظم گڑھ، ۱۳۴۰ھ، ص ۱۳۳۔ جگ ناتھ پرشاد، گلزار سخن لکھنؤ، ۱۳۲۶ھ، ص ۲۱۲۔ ان کا ماخذ آبِ حیات ہی معلوم ہوتا ہے۔

[۲] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) لکھنؤ

[۳] سودا، ص ۳۵

دارالخلافت شاہجہاں آباد رسیدہ تا مدتے کہ اقامت نمود ہم خانہ ایشاں بود"۔[۱]

شیخ چاند نے اس عبارت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مرزا ابوطالب قائم کے چچا یعنی مرزا رفیع کے آشنا تھے اور جب مرزا بہادر شاہ اوّل کی فوج کے ساتھ دہلی آئے تو ابوطالب بھی ساتھ تھے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ قائم کی مراد مرزا کے چچا سے ہے خود مرزا سے نہیں۔ کیوں کہ پورے تذکرے میں قائم نے کہیں بھی مرزا کو چچا نہیں لکھا۔ مرزا ابوطالب ہی کے ذکر میں قائم نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"بعضے ازیں احوال و اشعار کہ سابق مرقوم شدہ، زبانی مرزا ابوطالب مسطور بہ مرزا صاحب رسیدہ بود از ایشاں علی سبیل ذکر و مذکور بہ فقیر معلوم گردیدہ"۔[۲]

امکان اس بات کا ہے کہ ابوطالب، مرزا کے سنِ شعور تک دہلی میں رہے ہوں کیوں کہ اگر ہم قائم کے بیانات کا مطلب وہی لیں جو شیخ چاند نے لیا ہے تو مرزا کا سنِ پیدائش ۱۱۰۶ھ قرار پاتا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مرزا کی ولادت ۱۱۰۰ھ سے قبل ہوئی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں کلیاتِ سودا کا ایک نادر قلمی نسخہ ہے اور اس پر کسی لچھمی نرائن کی مہر اور (۱۱۱۶ھ/۰۴-۱۷۰ء) لکھا ہوا ہے۔ گویا یہ کلیات ۱۱۱۶ھ کے قریبی زمانے میں لکھا گیا۔

اگر شیخ چاند کا بتایا ہوا سنِ ولادت یعنی ۱۱۰۶ھ تسلیم کر لیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دس سال کا بچہ اتنا بڑا شاعر ہو جائے کہ اس کا کلیات مرتب ہو جائے۔ ہاں ایک سولہ سال کے لڑکے سے یہ توقع کی جا سکتی ہے۔[۳]

---

[۱] مخزنِ نکات، ص ۹ [۲] مخزنِ نکات، ص ۱۰

[۳] صدیقی صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"ہمارا خیال ہے کہ ولادت ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء سے قبل ہوئی ہوگی اور اگر یہ بھی مان لیں کہ دیوان ۱۱۱۶ھ/۰۴-۱۷۰ء میں ہی لچھمی نرائن کے قبضہ میں آیا تو اس وقت سودا کی عمر پندرہ سولہ سال کی ہو چکی ہوگی اور اس مدت میں سودا جیسے قادر الکلام شاعر کا صاحبِ دیوان ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں"۔

ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، علی گڑھ، ۱۹۴۴ء، ص ۸۸

شیخ چاند اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے قرار دیے ہوئے سنین کا مطلب یہ ہوگا کہ مرزا اپنے استاد شیخ حاتم (سنِ ولادت ۱۱۱۱ھ[۱]) مرزا مظہر (سنِ ولادت ۱۱۱۰ھ[۲]) سے عمر میں بڑے تھے اور خانِ آرزو (سنِ ولادت ۱۰۹۹ھ) کے ہم عمر تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تذکرہ نگار اس کا ضرور ذکر کرتے۔ اس کے برعکس خانِ آرزو، مرزا مظہر اور حاتم وغیرہ کے مقابلے میں مرزا کے ساتھ اُن کا جو رویّہ ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ مرزا کو ان تمام لوگوں کا نہ صرف خورد بلکہ عقیدت مند سمجھتے تھے۔

اگر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا یہ بیان کہ مرزا کا کلیات ۱۱۱۶ھ سے قبل مرتب ہو چکا تھا، تسلیم کر لیں تو ہمیں شمالی ہند کی تاریخ ادب اردو میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی اور بہت سے نظریات کو بدلنا ہوگا---امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر خوردبین کی مدد سے کلیاتِ سودا کا نسخہ پڑھا جائے تو یہ مہر صاف پڑھی جاتی ہے اور وہ ۱۱۱۶ھ نہیں بلکہ ۱۱۷۶ھ ہے۔ میں نے خود بھی اس امر کی تصدیق کی ہے۔ اس لیے صدیقی صاحب کا قرار دیا ہوا سنِ ولادت بھی درست نہیں۔

قاضی عبدالودود نے اس سلسلے میں بہت سے مقالے لکھے ہیں اور سب سے آخری مقالے میں مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۲۸ھ تسلیم کیا ہے۔[۳] قاضی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ میر سوز اپنے ایک معاصر شاہ کمال الدین کمال سے کہا کرتے تھے کہ مرزا مجھ سے عمر میں ایک سال چھوٹے ہیں۔ میر سوز کی وفات ۱۲۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ جرأت نے مادۂ تاریخ یہ نکالا تھا۔

داغ اب سوز کا لگا دل کو

۱۲۱۳ھ

اور ایک یا اس سے زیادہ تذکروں میں مرقوم ہے کہ وفات کے وقت میر سوز کی عمر اسّی سے متجاوز تھی۔ اگر اس وقت میر سوز کی عمر پچاسی سال مان لی جائے تو زمانۂ ولادت

۱۔ سید محی الدین قادری زور، سرگزشت حاتم، حیدرآباد، ۱۹۴۴ء، ص ۲۱

۲۔ مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، ص ۱۳

۳۔ سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء ، ص ۸

۱۱۲۷ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔ اس طرح مرزا کا سن ولادت ۱۱۲۸ھ ہوگا۔

لیکن اس سن کو تسلیم کرنے میں دقت یہ ہے کہ ہمیں یہ مفروضہ قائم کرنا پڑتا ہے کہ وفات کے وقت میر سوز کی عمر پچاسی سال ہوگی۔ اگر کسی تذکرہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ میر سوز اسی سے تجاوز کر گئے تھے تو ہم یہ کیوں نہ فرض کریں کہ میر سوز کی عمر اکیاسی یا بیاسی سال ہوگی جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس طرح مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۳۱ھ کے قریب ہوگا۔ یہاں سودا کے ایک شاگرد رشیدا کا ایک شعر قابلِ غور ہے جو میر تقی میر کی ہجو میں کہا گیا تھا۔

جن روزوں یہ حاصل تھا سخن کا اسے کمال

تھی میر کی تب مبتدیانہ بھی نہ تقریر

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا عمر میں میر سے کافی بڑے تھے۔ میر کی ولادت ۱۱۳۵ھ میں ہوئی۔[۱] اس شعر میں عمر کے جس تفاوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف چار سال یا قاضی صاحب کے بتائے ہوئے سنِ ولادت کے مطابق صرف آٹھ سال قرین قیاس نہیں۔

اس سلسلے میں دو تذکرے بہت اہم ہیں جو مرزا کی ولادت پر روشنی ڈالتے ہیں اور سنِ ولادت کے تعین میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ایک تو نقش علی کا ''باغِ معانی'' اور دوسرا میر حسن کا ''تذکرہ شعرائے اردو''۔ نقش علی مرزا سے براہِ راست تعلقات کے مدعی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''با مولف ایں اجزا (نقش علی) اشفاقِ بسیار ظاہری نماید''۔[۲]

اس بیان کی روشنی میں کوئی وجہ نہیں کہ ہم نقش علی کے بیان پر شبہ کریں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرزا کی عمر پچپن سال کو پہنچ چکی ہے۔[۳] نقش علی نے بقول قاضی عبدالودود مرزا کا ترجمہ ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ لکھا ہے۔[۴] جس سے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے۔

[۱] ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۶۱

[۲] باغِ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

[۳] باغِ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

[۴] سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۷

اس کی تصدیق میر حسن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مرزا ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد سے فیض آباد گئے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا آج کل نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں وسیلۂ فن شاعری سے سرفراز ہیں۔ [1] نواب شجاع الدولہ کا انتقال آخر ذیعقدہ ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ میر حسن نے مرزا کا ترجمہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھا ہے۔ جب مرزا فیض آباد آئے تھے۔ میر حسن اکثر ان سے ملاقات کرتے تھے، جس کا ذکر انھوں نے خود تذکرے میں کیا ہے۔ اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا کا ترجمہ لکھتے ہوئے انھوں نے مرزا سے ان کی عمر دریافت نہ کی ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا کا سن شریف ستر سال کو پہنچ گیا ہے۔ چوں کہ یہ عبارت ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھی گئی ہے۔ اس لیے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۵ھ [2] اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔ اگر ہم ۱۱۱۸ھ تسلیم کریں تو نقش علی کے بیان کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لیے ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔

مرزا کی ابتدائی زندگی

مرزا کے بچپن کے حالات کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ اُن کا کلام دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے مروّجہ علوم ضرور حاصل کیے تھے۔ فارسی زبان پر انھیں اچھی خاصی قدرت تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز ہی فارسی شعر گوئی سے کیا تھا۔

---

[1] میر حسن، تذکرہ شعرائے اُردو، مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۸۳

[2] (ا) کلب علی خاں فائق نے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۸ھ۔ ۱۱۲۰ھ کے درمیان بتایا ہے۔ سودا کی صحیح عمر، معارف جولائی ۱۹۵۲، ص ص ۶۴۔ ۷۵

(ب) پہلے خود قاضی صاحب بھی مرزا کے سن ولادت کو ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار دیتے تھے۔ سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۷

(ج) بعض تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا نے ۶۰ سال کی عمر میں دہلی چھوڑی۔ یہ صحیح نہیں۔ اُس وقت مرزا کی عمر لگ بھگ ۵۵ سال تھی۔ ان تذکروں میں قابل ذکر یہ ہیں:

مردان علی خاں مبتلا، گلشن سخن (قلمی)، رام پور، ورق ۵۶ ب

مرزا علی لطف، گلشن ہند، مرتبہ مولوی شبلی اور مولوی عبدالحق، لاہور، ۱۹۰۶ء، ص ۱۰۳۔

مرزا کی والدہ کے بارے میں تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ البتہ قائم کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد کا جب انتقال ہوا ہے تو وہ سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے۔ قائم نے لکھا ہے:

"اُن (مرزا) کے والد مرزا شفیع نام مغل زاد عملِ تجارت میں مشہور تھے۔ ان کی وفات کے بعد ترکہ میں جو کچھ دولت مرزا کے ہاتھ آئی۔ اسے شاعر مزاجی کی وجہ سے قلیل مدت میں دوستوں میں اڑا دیا اور مصاحبت اختیار کر لی"۔ [1]

(فارسی سے ترجمہ)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کو جو کچھ ترکہ میں ملا تھا۔ انھوں نے دوستوں میں اڑا دیا اور مصاحب ہو گئے۔ میر نے نوکر پیشہ لکھا ہے۔ [2] جس سے بظاہر مراد مصاحبت ہی ہے اور کم از کم سپہ گری تو ہرگز نہیں۔ [3] مرزا کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں صرف گردیزی نے انھیں سپاہی پیشہ لکھا ہے [4] جس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا۔

شیخ چاند نے گردیزی کے بیان کو صحیح تسلیم کیا ہے اور مزید ثبوت کے طور پر مرزا کے یہ دو اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

کہی جاتی نہیں وہ مجھ سے جو اس ظالم نے
جس طرح کی مری اوقات میں ڈالی ہل چل

---

[1] مخزن نکات ص ۳۵

[2] نکات الشعرا، ص ۳۱

[3] خواجہ خان حمید اورنگ آبادی نے انھیں منصب دار لکھا ہے جو کسی طرح درست نہیں۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی، گلشن گفتار، مرتبہ، سید محمد، حیدرآباد، ۱۳۲۹، ص ۳۷

[4] سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۶۷
بعد کے تذکروں میں شاہ محمد حمزہ نے بھی انھیں سپاہی پیشہ لکھا ہے۔ فص الکلمات (قلمی) رام پور، ورق ۲۱۷ ب۔ دراصل فص الکلمات میں جن شعرا کا ذکر ہے وہ گردیزی کے تذکرے کی نقل ہے۔ کہیں کہیں شاہ حمزہ نے اضافہ کیا ہے۔ (خ۔ا)

لا بٹھایا مجھے گھربار چھڑا لشکر میں
پال بے چوب تلے اپنے بغیر از پر تل

یہ اشعار ایک قصیدے کے ہیں جو مرزا نے حضرت علیؓ کی شان میں کہا تھا۔شیخ چاند کا خیال ہے کہ مرزا نے اوائلِ جوانی ہی میں پیشہ سپہ گری ترک کر کے مصاحبت اختیار کر لی تھی۔ان کے خیال سے یہ قصیدہ نوعمری اور نومشقی کے زمانے کا ہے۔لیکن اس قصیدے میں جو فنی مہارت، زبان و بیان پر قدرت اور پختگی نظر آتی ہے، اسے دیکھ کر ہرگز یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مرزا کا ابتدائی کلام ہے۔مزید برآں قصیدے میں مرزا نے جو تعلی کی ہے وہ بھی ایک خاص عمر پہ پہنچ کر اور ایک ادبی مقام حاصل کرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اور میرا سخن آفاق میں تا یومِ قیام
رہے گا سبز بہر مجموع و ہریک دنگل
تا ابد طرزِ سخن کی ہے مری رنگینی
جلوۂ رنگ چمن جاویگا اک آن میں ڈھل
ہو جہاں کے شعرا کا مرے آگے سرسبز
نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل

میرے خیال سے یہ قصیدہ اُس وقت کہا گیا ہے جب مرزا عماد الملک کے ساتھ ترکِ وطن کر کے دہلی سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

تعلیم و تربیت

مرزا کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔صرف ان کے کلام سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے مرّوجہ علوم اور خاص طور پر فارسی کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔سری رام کا بیان ہے کہ مرزا کو ترکی، فارسی اور

عربی ہر علم میں دستگاہ تھی [1]۔ اوّل تو سری رام کے بیان کی تصدیق کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی اور دوسرے مرزا کے کلام سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ انھیں ترکی اور عربی میں بھی مہارت تھی۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "(مرزا نے) دہلی میں پرورش پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہتی تھی۔ وہ دروازہ تباہیٔ دہلی میں تباہ ہوا۔ شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ اکثر ادھر ٹہلتے ہوئے جانکلتے تھے۔ میں (آزاد) ہم رکاب ہوتا تھا۔ مرزا کے وقت کے حالات کا ذکر کرکے قدرتِ خدا کو یاد کیا کرتے تھے" [2]۔

ریختہ گوئی کی ابتدا

مرزا کو ریختہ گو شاعر کی حیثیت سے ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔ رسالہ عبرت الغافلین اور سبیلِ ہدایت ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیانی زمانے کی تصنیفات ہیں۔ عبرت الغافلین میں مرزا نے لکھا ہے کہ بندے نے پینتالیس سال فنِ ریختہ میں ضائع کیے ہیں۔ [3] سبیلِ ہدایت میں مرزا لکھتے ہیں کہ "مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہرِ سخنِ عاصی زیب گوشِ اہلِ ہنر ہوا ہے" [4]۔ مرزا کے بیانات سے صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۰ھ کے درمیان ریختہ گوئی کا آغاز کیا اور قابلِ ذکر شاعروں میں وہ ۱۱۵۴ھ کے قریب شمار ہونے لگے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حاتم نے جس شاعر کی زمین میں غزل کہی ہے، اس کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ دیوان زادہ حاتم میں ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۶۹ھ تک کی غزلیں موجود ہیں۔ حاتم نے مرزا کی

---

[1] خم خانہ جاوید، ۴، ص ۳۶۴

[2] آبِ حیات، ص ۱۴۸

[3] مرزا کے اصل الفاظ یہ ہیں...... چناں چہ بندہ ہم از چہل و پنج سال اوقات خود را درفنِ ریختہ ضائع ساختہ است۔ کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ۴۲۴

[4] کلیاتِ سودا، آسی، ص ۴۳۳

سات زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ پہلی تین غزلیں ۱۱۵۴ھ، ۱۱۵۹ھ، اور ۱۱۶۱ھ کی ہیں۔[۱] اس کا مطلب یہی ہے کہ مرزا ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے۔

اس سے پہلے وہ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ صاحب ''نشترِ عشق'' کا بیان ہے۔ ''ابتدا میں موزونیتِ طبع کی وجہ سے فارسی گوئی شروع کی اور سراج الدین علی خاں آرزو سے اصلاح لی۔ خانِ آرزو نے کہا کہ کلامِ فارسی کا درجہ بہت بلند ہے اور ہماری تمھاری زبان ہندی ہے۔ ہر چند اہلِ ہند نے فارسی دانی کو مدارج ارتفاع تک پہنچادیا۔ لیکن استادانِ سلف و ایران (کہ یہ ان کی زبان ہے) کے سامنے وہی حیثیت ہے جو چراغ کی آفتاب کے سامنے ہوتی ہے۔ ابھی تک ریختہ گوئی میں کسی نے شہرت نہیں پائی۔ لہذا اگر تم اس زمانے میں مشقِ سخن کرو تو فیضِ طبیعت سے شاید اس فن کے امام ہو جاؤ۔ چوں کہ مستحسن مشورہ تھا۔ ان کو (مرزا) پسند آیا اور اس دن سے ریختہ میں شعر گوئی کی ابتدا کی۔ اور تھوڑے زمانے میں مشقِ سخن کے بعد ریختہ گو شعرا کے اُستاد ہو گئے۔ زباں دانیٔ ریختہ کے بانی مبانی قرار پائے اور ہندوستان کے تمام ریختہ گو شعرا انھیں اس فن کا امام اور پیغمبر سمجھتے تھے''۔[۲] (فارسی سے ترجمہ)

مرزا کا ایک قطعہ ہے جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابتدا میں وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن بعد میں کسی فارسی داں نے ریختہ گوئی کا مشورہ دیا۔ قطعہ میں فارسی داں کا نام لیا گیا۔[۳] لیکن صاحبِ نشترِ عشق کے بیان اور مرزا اور خانِ آرزو کے

---

۱ سرگزشت حاتم، ص ۱۱۷

۲ (ا) حسین قلی خاں عاشق عظیم آبادی نشترِ عشق (قلمی)، رام پور، ص ۶۶۵

(ب) محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ (مرزا) خان آرزو کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ان کی صحبت سے بہت فائدے حاصل کیے۔ چناں چہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو نے کہا مرزا فارسی اب تمھاری زبان مادری نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمھارا کلام اہلِ زبان کے مقابل میں قابلِ تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اُردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو گے۔ مرزا بھی سمجھ گئے اور دیرینہ سال استاد کی نصیحت پر عمل کیا۔ آبِ حیات، ص ۱۳۹۔

۳ کلیات سودا، مرتبہ آسی میں اس قطعہ کا عنوان ''قطعہ ہجو مرزا فاخر مکیں'' ہے جو درست نہیں۔ لیکن بہت سے غیر مطبوعہ نسخوں میں اس قطعہ کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا۔

تعلقات، نیز خان آرزو کی ریختہ گو شعرا کی سرپرستی کے پیشِ نظر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فارسی داں خانِ آرزو ہی تھے۔ شیخ چاند اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس قطعہ میں مرزا نے خسرو، فیضی، آرزو اور فقیر جیسے فارسی شاعروں کے نام لیے ہیں۔ شیخ چاند کی دلیل یہ ہے کہ "خان آرزو کا مشورہ نہیں تھا۔ اگر وہ مشورہ دیتے تو اس طرح فخر یہ مسلم الثبوت اساتذہ میں اپنا شمار نہ کرتے"۔[1] ہمارے خیال سے یہ دلیل مناسب نہیں ہے کیوں کہ یہ قطعہ مرزا کا کہا ہوا ہے آرزو کا نہیں۔ دوسرے یہ قطعی ناممکن ہے کہ جو کچھ مرزا اور اُس فارسی داں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ اسے مرزا نے ہو بہو نظم کر دیا ہو۔ کیوں کہ شعری ضرورتوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔ چوں کہ وہ فارسی داں خانِ آرزو ہیں اور آرزو کا نام قطعہ میں بحیثیت استادِ فن آ گیا تھا۔ اس لیے مرزا کو آرزو کا نام پوشیدہ رکھنا پڑا۔ ورنہ بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا عنوان ہی میں فارسی داں کا نام نہ بتاتے۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ فرمائیے:

میں ایک فارسی داں سے کہا کہ اب مجھ کو
ہوئی ہے بندشِ اشعارِ فرس ذہن نشیں
جو آپ کیجیے اصلاح شعر کی میرے
نہ پایئے غلطی تو محاورہ میں کہیں
ہے اور زیرِ فلک ذاتِ میرزا فاخر
سلامت ان کو رکھے حق سدا بروے زمیں
سوکب انھوں کو ہے اصلاح کاکسو کی دماغ
قبول کب کرے ان کی متانتِ رنگیں
کہا یہ بعد تامل کہ دوں جواب تجھے
جو میری بات کا اے یار تجکو ہووے یقیں

---

[1] سودا، ص ۴۱

جو چاہے یہ کہ کہے ہندکا زباں داں شعر
تو بہتر اس کے لیے ریختے کا ہے آئیں
وگرنہ کہہ کے وہ کیوں شعرِ فارسی ناحق
ہمیشہ فارسی داں کا ہو موردِ نفریں
کوئی زبان ہو لازم ہے خوبیِ مضموں
زبانِ فرس پہ کچھ منحصر سخن تو نہیں
اگر فہیم ہے تو چشمِ دل سے کرکے نظر
زباں کا مرتبہ سعدیؔ سے لیکے تا بہ حزیںؔ
کہاں تک اُن کی زباں تو درست بولے گا
زبان اپنی میں تو باندھ معنیِ رنگیں
دیارِ ہند میں دوچار ایسے ہو گزرے
جنھوں نے باز رکھا مضحکے سے اپنے تئیں
چنانچہ خسروؔ و فیضیؔ و آرزوؔ و فقیرؔ
سخن انھوں کا مثل کے لیے ہے قابلِ تحسیں
سوائے ان کے کوئی اور بھی ہو پر شاعر
سوادِ ہند میں وہ ہی ہیں با مزہ نمکیں

ایسے مشوروں اور ریختہ گوئی کی مقبولیت نے مرزا کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

مرزا کا تخلص

اشپرنگر نے قائم کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا نے تخلص سوداؔ اپنے والد کے پیشے کے اعتبار سے رکھا تھا۔[1] لیکن قائم نے کہیں اس قسم کا ذکر نہیں کیا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: ''بعض کا قول ہے کہ باپ کی سوداگری سودا کے لیے وجہِ تخلص ہوئی۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایشیا کے شاعر ہر ملک میں عشق کا دم بھرتے ہیں اور سودا اور دیوانگی عشق کے ہم زاد ہیں۔ اس لیے وہ بھی ان لوگوں کے لیے باعثِ فخر ہے۔ چناں چہ اس لحاظ سے سودا تخلص کیا''۔[2] سعادت خاں ناصر نے اس سلسلے میں ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ''ایک فقیر روشن ضمیر نظر توجہ کی مرزا موصوف کے حال پر مبذول رکھتے تھے۔ بعد وفات اُن کے پدر بزرگوار اس گوہر یتیم سے فرمانے لگے۔ یہ وقت ہے کہ استدعا حاجت مندی کی درگاہ قاضی حاجات میں مقبول اور مستجاب ہو جو چاہو سو مانگو اس نے عرض کی آپ کی دولت سے استغنا تمام رکھتا ہوں اور اگر آپ بہ ضد ہیں تو دولتِ سخن، کہ عبارت اس سے شعر گوئی ہے، عنایت فرمایئے۔ اس مستجاب الدعوات نے تبسم فرمایا اور دیوانہ لاابالی کے تخلص کے واسطے صرف سودا زبان پر لایا بعد اس عنایتِ بے غایت کے کہا۔ '' انشاء اللہ تعالیٰ شہرت تیری چہار دانگ ہندوستان میں بے حد و حساب اور عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی''۔[3] ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں جس سے ناصر کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔

سوداؔ کا تلمذ

شیخ چاند مرحوم نے سودا کے صرف ایک اُستاد شاہ حاتم کا ذکر کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے چار استادوں کے نام ملتے ہیں۔ سب سے پہلا

---

1. یادگارِ شعرا، ص ۱۱۱
2. آبِ حیات، ص ۱۴۹
3. تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)

نام خانِ آرزو کا ہے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ سودا خان آرزو[1] کے شاگرد تھے۔ لیکن اپنے کچھ اشعار شاہ حاتم کو بھی سناتے تھے۔[2] کریم الدین نے بھی انھیں شاگردِ خان آرزو لکھا ہے۔[3] ہمارے خیال سے سودا کو خان آرزو سے باقاعدہ تلمذ تو نہیں تھا۔ البتہ ان کی صحبت سے فیض ضرور اٹھایا تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ میر تقی میر اپنے تذکرے نکات الشعرا میں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ جب کہ انھیں آرزو کے شاگردوں کی فہرست بڑھانی منظور تھی۔ اس کے ثبوت موجود ہیں کہ سودا خان آرزو کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے خان آرزو کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ایک دن خان آرزو کے گھر پر مجلسِ مشاعرہ منعقد تھی۔ سودا نے حاجی محمد جان قدسی کی غزل کا ترجمہ کیا تھا اور بڑے شد و مد سے پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے اہلِ محفل میں کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ قدسی کی غزل کا ترجمہ ہے یا شاید اس خیال سے خاموش رہے کہ مترجم (سودا) معمولی سی بات پر ہجوگوئی پر اُتر آتے تھے۔ خانِ آرزو نے البتہ بہت تعریف کی اور دورانِ توصیف انھوں نے فی البدیہہ ایک شعر کہا۔

---

[1] سراج الدین علی خاں آرزو کا سلسلۂ نسب شیخ کمال الدین خواہر زادہ شیخ نصیر الدین تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف سے شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری عطاری پر ختم ہوتا ہے۔ آرزو ۱۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے (سروآزاد، ص ۲۲۷) عہدِ محمد فرخ سیر کے اوائل میں گوالیار میں کسی خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۱۳۲ھ میں دہلی آئے۔ دہلی میں آنندرام مخلص کے توسط سے دربارِ شاہی میں رسائی ہوئی اور منصب و جاگیر عنایت ہوئے۔ اسحاق خاں شوستری بھی اُن کے مربی تھے۔ اسحاق خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نجم الدولہ ان کا خیال رکھتے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ باندھ دیا۔ نجم الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سالار جنگ کے ساتھ آرزو چلے گئے، جہاں شجاع الدولہ کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ نواب نے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ باندھ دیا۔ ۲۳ ربیع الاول ۱۱۶۹ھ کو انتقال ہوا۔ لاش دہلی لاکر مدفون کی گئی۔ آرزو فارسی کے زبردست عالم اور شاعر تھے۔ عربی اور ہندی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ سنسکرت کے بھی ماہر تھے۔ فارسی میں ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔ بقول قاسم انھوں نے بابا فغانی اور کمال خجند کے دواوین کے جواب کہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ضخیم کلیات موجود ہے۔ نثر میں سراج اللغات، چراغِ ہدایت نوادر الالفاظ، موہبتِ عظمیٰ، عطیہ کبریٰ، دادِ سخن، مجمع النفائس، تنبیہ الغافلین اور خیاباں تصنیفات ملتی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:

سروآزاد، ص ص ۲۲۷۔۲۳۱۔ خزانۂ عامرہ، ص ص ۱۱۶۔۱۱۹۔ نکات الشعرا، ص ص ۳۔۴۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۵۔

اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳ء، ص ص ۳۔۲۵

[2] مجموعہ نغز، ۱ ص ۳۰۴

[3] طبقات شعرائے ہند، ص ۱۰۴

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے
لکھ رکھیں چاہیے فلک پہ ملک[1]

سودا نے فارسی داں سے متعلق جو قطعہ لکھا ہے۔اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خان آرزو کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔

سودا کے استادوں میں دوسرا نام سلمان قلی خاں وداد[2] کا ہے۔خود وداد کے لڑکے

---

[1] مجموعۂ نغز،۱،ص ص ۲۵۔۲۶
آزاد نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے لیکن قدرے ترمیم کے ساتھ۔بظاہر ان کا مآخذ مجموعۂ نغز ہی ہے۔انھوں نے فارسی شعر اور اس کا ترجمہ بھی دیا ہے۔فارسی کا شعر ہے۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سودا نے اس کا ترجمہ کیا تھا:

آلودۂ قطرات ِ عرق دیکھ جبیں کو اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

آب حیات،ص ص ۱۷۲۔۱۷۳

فارسی شعر دیوانِ قدسی میں نہیں ہے۔البتہ مجالسِ رنگیں میں ہے۔رنگین نے دو ایسے فارسی شعر نقل کیے ہیں،جن کا سودا نے اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔آزاد نے بھی وہی دونوں شعر اور ان کے تراجم نقل کیے ہیں۔قیاس یہ ہے کہ آزاد نے یہ دونوں شعر مجالسِ رنگین سے لیے ہیں۔
(سعادت یار خاں رنگین،مجالسِ رنگین،مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب،لکھنؤ،۱۹۲۹،ص ص ۸۔۹)اور پہلا شعر خواہ مخواہ قدسی سے منسوب کر دیا ہے۔

[2] مصحفی اور قدرت اللہ قاسم نے ان کا نام سلیمان قلی خاں لکھا ہے،لیکن ان کے لڑکے مظہر علی خاں ولا سلمان لکھتے ہیں۔اس لیے یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ولا نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی فرمائش پر ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں اقبال نامہ جہانگیری کا اُردو ترجمہ "جہاں گیر شاہی" کے نام سے کیا تھا۔اس کتاب کی ابتدا میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات بھی لکھے ہیں۔وہ لکھتے ہیں میں سلمان قلی خاں وداد کا چھوٹا بیٹا اور آقا محمد حسین اصفہانی کا پوتا ہوں۔سید آقا محمد حسین اصفہان سے ہندوستان آئے تھے اور نواب سعید الدین خاں بہادر میر آتش کی وساطت سے محمد شاہ کے ملازم ہوئے۔اپنی لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کے مزاج میں اتنا دخل پایا کہ بہت جلد بائیس خدمتوں پر مامور ہو گئے۔علی قلی خاں کا خطاب محمد شاہ نے دیا تھا۔اُن کی وفات کے بعد محمد شاہ نے سلمان قلی خاں وداد کو منگل باشی کے عہدے پر سرفراز کیا۔شاہ عالم کے دور میں وداد نے نواب موسیٰ خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔بقول مصحفی انھیں تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔قاضی عبدالودود نے کلیاتِ ولا کے حوالے سے لکھا ہے کہ وداد کا انتقال ۱۱۸۱ھ میں ہوا۔تاریخِ وفات اس شعر سے نکلتی ہے:

سالِ تاریخ ہاتف از سر آہ
گفت ماداے اور ریاضِ جناں
(معاصر،حصہ ۲، ص ۲۲)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:محمد عتیق صدیقی،گل کرسٹ اور اس کا عہد،علی گڑھ،۱۹۶۲ء،ص ص ۳۰۶۔۳۰۸۔ غلام ہمدانی مصحفی،عقدِ ثریا،مرتبہ مولانا عبدالحق،دہلی ۱۹۳۴ء،ص ص ۵۹۔۶۰۔مجموعۂ نغز،۲،ص ۳۱۲

مظہر علی خاں ولاؔ نے سوداؔ کو شاگردِ ودادؔ لکھا ہے۔[1]

غالباً ریختہ گوئی کے ابتدائی زمانے میں سوداؔ کو سلیمان قلی خاں ودادؔ سے تلمذ تھا۔ بعد میں شاہ حاتمؔ سے رجوع کیا۔ مولانا محمد حسین[2] آزاد اور مولانا عبدالحئی نے بھی وداد سے سودا کے تلمذ کا ذکر کیا ہے۔[3]

سوداؔ کے تیسرے استاد شاہ حاتمؔ تھے۔ یہ واحد استاد ہیں جن سے سوداؔ کے تلمذ میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کیوں کہ اکثر معاصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدرت اللہ قاسمؔ نے لکھا ہے کہ حاتمؔ کو سوداؔ کی استادی پر بہت ناز تھا۔ انھوں نے ہدایت اللہ خاں ہدایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ اکثر شاہ حاتم یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔

رتبہ شاگردی من نیست استاد مرا

اور کہا کرتے تھے کہ یہ مصرع میری استادی اور مرزا کی شاگردی کے متعلق کہا گیا ہے۔[4]

قدرت اللہ قاسمؔ نے اس سلسلے میں نظام الدین احمد صانعؔ [5] کا بھی نام لیا ہے۔ ان کا

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۳۰۷

[2] آبِ حیات، ص ۱۴۹

[3] گلِ رعنا، ص ۱۳۳

[4] مجموعہ نغز، ص ۱۸۰

[5] نظام الدین احمد صانعؔ بلگرام کے رہنے والے تھے۔ شاہ حمزہ اور آزادؔ بلگرامی کا بیان ہے کہ نام سے سنہ ولادت نکلتا ہے جو ۱۱۳۹ھ ہے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ نام سے سنِ ولادت نکلتا ہے جو ۱۱۰۸ھ ہے۔ اگر نظام الدین احمد پڑھا جائے تو ۱۱۰۸ھ ورنہ ۱۱۳۹ھ نکلتا ہے۔ غالباً کریم الدین کا بیان درست ہے کیوں کہ اگر وہ ۱۱۳۹ھ میں پیدا ہوتے تو شاید سودا ان کا تلمذ اختیار نہ کرتے۔ صانعؔ نے میر نوازش علی سے تعلیم و تربیت پائی اور انھیں سے مشقِ سخن کی۔ مصحفی کہتے ہیں میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ بعد میں وہ کلکتہ چلے گئے تھے۔ علی ابراہیم خاں نے لکھا ہے آج کل کہ جلوس شاہ عالم کا بائیسواں سال ہے (۱۱۹۶ھ) مرشدآباد اور کلکتہ میں بسر کرتے ہیں۔ فارسی دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ غالباً مرشدآباد یا کلکتہ میں انتقال کیا۔ صاحب معدن الجواہر ان کا سن وفات "الف و ثلاثمائة و ثلثۃ عشر" بتاتے ہیں۔
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: علی ابراہیم خاں خلیل، تذکرۂ ابراہیم، مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، علی گڑھ، ۱۹۳۴ء، ص ۱۶۹۔ خوب چند ذکا، عیار الشعرا (مائکروفلم) دلی یونی ورسٹی لائبریری، ورق ۱۲۲ ب۔ عقدِ ثریا، ص ۳۸۔ سروِ آزاد، ص ص ۳۴۸۔۳۴۹۔ فص الکلمات (قلمی) ورق ۴۱۸ ب۔ محمد مہدی واصف، معدن الجواہر، قلمی، آصفیہ، ورق ۱۸۸ الف۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۳۵۷

بیان ہے کہ جن دنوں سوداؔ کو فارسی گوئی کا شوق تھا۔ وہ صائبؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ علی ابراہیم خاں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ صائبؔ مُتبانِ سوداؔ میں ہیں۔[1]

سوداؔ کے تلمذ سے متعلق دو دل چسپ لطیفے بھی سُن لیجیے۔ عنایت اللہ فتوتؔ نے انھیں محمد میر میرؔ کا شاگرد لکھا ہے اور ثبوت کے طور پر مرزا کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھے میرؔ سے استاد کی طرح[2]

ناصر نذیر فراقؔ جو دردؔ کے خاندان سے ہیں۔ اپنے بزرگوں کی عظمت میں اضافہ کرنے کے لیے لکھتے ہیں۔ "مشاعرے آپ (درد) کی بارہ دری میں طرفہ شان و شوکت سے ہوتے تھے..... سودا، میر اور میرسوز وغیرہ استاد آتے اور بڑے ادب کے ساتھ غزل پڑھتے۔ اب مشاعرہ ختم ہوجاتا اور آپ اور یہ تینوں باکمال اور لائق شاگرد رہ جاتے تو اردو زبان کی درستی اور اصلاح کے دفتر کھولے جاتے"۔[3]

ملک الشعرا کا خطاب

ضیغم[4]، عبدالغفور نساخ[5] اور جگ ناتھ پرشاد[6] وغیرہ کا بیان ہے کہ سوداؔ کو نواب آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ کیوں کہ میر تقی میر اور قیام الدین قائمؔ نے بہت پہلے انھیں ملک الشعرا لکھا تھا۔

محمد انوار حسین تسلیم سہسوانی نے "کلیاتِ سوداؔ" مطبوعہ نول کشور ۱۲۸۹ھ کے اختتام پر ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ سودا شیخ علی حزیںؔ سے ملنے گئے اور حزیںؔ کو اپنا

---

[1] گلزار ابراہیم، ص ۱۶۹
[2] عنایت اللہ فتوت، ریاض حسنی (قلمی)، سینٹرل، ص ۱۲۳
[3] سید ناصر نذیر فراق، میخانہ درد، دہلی، ۱۳۴۴ھ، ص ۱۵۲
[4] محمد عبداللہ خاں ضیغم، یادگارِ ضیغم (قلمی) ادارۂ ادبیاتِ اُردو، ص ۳۲۵
[5] سخنِ شعرا، ص ۲۲۳
[6] گلزارِ سخن، ص ۲۱۲

کلام سنایا۔ اُس میں یہ شعر بھی تھا:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

تڑپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ حزیں نے دریافت کیا کہ تڑپھے ہے کیا معنی ہیں؟ سودا نے بتایا ''می تپد''۔ شیخ جھوم اُٹھے۔ پھر شعر پڑھوایا اور کہا مرزا رفیع قیامت کردی، یک مرغ قبلہ نما باقی بود آنرا ہم نہ گزاشتی، کھڑے ہو کر حزیں نے سودا کو گلے سے لگایا اور ''ملک الشعرا'' کے خطاب سے نوازا۔ شیخ چاند نے اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ حالاں کہ شیخ حزیں جیسے بد دماغ اور متعصب ایرانی سے اس انعام و اکرام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر سودا کا یہ شعر اتنا معمولی ہے کہ ہرگز حزیں جیسے عالم و فاضل شخص کو اتنا متاثر نہیں کرسکتا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ''بعض اشخاص کی روایت ہے کہ شیخ نے کہا۔ در پوچ گویانِ ہند بد نیستی''۔[۱] صاحبِ بوستانِ اودھ کا بیان ذرا اور مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''شیخ بیتاب شد و گفت کہ مرزا در پوچ گوئی بہ از خاقانی است''۔[۲] ان مختلف روایات کی روشنی میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ حزیں نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔

ابتدائی تذکرہ نگاروں میں صرف میر تقی میر اور قیام الدین قائم نے انھیں ملک الشعرا لکھا ہے۔ میر نے تو صرف اتنا لکھا ہے کہ سودا ملک الشعرائی کے لائق ہیں۔[۳] جس کا سیدھا سادہ مطلب یہی نکلتا ہے کہ سودا ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خطاب میر کی ادبی سازش کا ایک حصہ ہو۔ یعنی جس وقت میر نکات الشعرا تالیف کررہے تھے۔ مرزا مظہر گروہ شمالی ہند کی اردو شاعری پر چھایا ہوا تھا اور آرزو گروہ کو ایہام گوئی کی وجہ سے شکست ہو رہی تھی۔ مرزا مظہر گروہ میں انعام اللہ خاں یقین خاص طور پر بہت نمایاں تھے۔ تقریباً دس برس تک شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند تک جو مقبولیت اور شہرت یقین کو ملی وہ میر اور سودا کو کافی بعد میں نصیب ہوئی۔ تذکرے کی

۱۔ آبِ حیات، ص ۱۷۲

۲۔ بوستانِ اودھ، ص ۹۵

۳۔ نکات الشعرا، ص ۳۱

تالیف کے وقت نوجوان شعرا میں یقینؔ ملک الشعرائی کے مستحق ہو سکتے تھے۔ چوں کہ میر نے یقین کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کیا ہے [۱] اس لیے سوداؔ کو ملک الشعرا کہہ کر بالواسطہ یقینؔ سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لچھمی نرائن شفیقؔ نے کسی کی دو رباعیاں نقل کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کافی عرصے تک بعض اہلِ ذوق صرف سودا اور یقینؔ کو اردو کے بہترین شاعر سمجھتے تھے اور بعض کا تو یہ خیال تھا کہ سودا بھی یقینؔ کے گردِ پا کو نہیں پہنچتے۔ پہلی رباعی ہے۔

جس طرح سے لاتے ہیں مضامینِ متیں
اشعار میں ریختہ کے سوداؔ و یقیں

ایسا کوئی نہیں ہند میں، ہرچند کہ ہیں
سجاد و کلیم و میر و درد و تمکیں

دوسری رباعی ملاحظہ ہو:

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سوداؔ
کرے جو فکرِ تتبع یقینؔ کا از دل و جاں

کہے گا معنی باریک و خوب شیریں تر
ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں [۲]

بہرحال سوداؔ کو یقینؔ پر ترجیح دینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ رہے قائمؔ تو چوں کہ انھیں سودا سے تلمذ تھا۔ اس لیے انھوں نے استاد سے عقیدت اور محبت کی وجہ سے لکھ دیا کہ "بالفعل بخطاب ملک الشعراے کہ مہین پایہ سخنوراں است اعزاز و امتیاز دارد" [۳]۔ لیکن قائمؔ نے بھی یہ نہیں بتایا کہ یہ خطاب کس نے دیا تھا۔ صاحبِ تذکرہ مسرت افزا نے لکھا ہے کہ "زباں آوران کامل اورا بہ استادی یادی کنند و شعراے ہند

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خلیق انجم، معارضہ مظہر و آرزو، نقوش (لاہور) مئی ۱۹۶۱ء
[۲] لچھمی نرائن شفیقؔ، چمنستان شعرا، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء، ص ۱۶۲
[۳] مخزنِ نکات، ص ۳۵

بہ آئینِ خود ملک الشعرا قرار دادہ اند"۔[۱] گویا سوداؔ کو کسی نے باقاعدہ یہ خطاب نہیں دیا تھا۔ صرف ہندوستان کے شاعروں نے اپنے قاعدے کے مطابق انھیں ملک الشعرا قرار دے دیا تھا۔ مصحفیؔ کا بیان بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔"بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند، بعضے بہ سببِ دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند"۔[۲] مصحفیؔ کے بیان کے مطابق کچھ لوگ انھیں ملک الشعرا تسلیم کرتے تھے اور بعض کے نزدیک وہ جاہل اور سارق تھے۔ غرض یہ ہے کہ مصحفیؔ کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ خطاب کسی کا دیا ہوا نہیں تھا۔ مزید ثبوت یہ ہے کہ ۱۱۶۶ھ میں تذکرہ گردیزی تالیف ہوا۔ اس میں ملک الشعرائی کا کوئی ذکر نہیں۔ قدرت اللہ قاسمؔ، مردان علی خاں مبتلاؔ، ابراہیم علی خاں اور میر حسن وغیرہ نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو یہ خطاب اتنا بڑا اعزاز تھا کہ ہر تذکرہ نگار اور خاص طور پر میر حسن اور قاسم ضرور اس کا ذکر کرتے۔ کیوں کہ یہ دونوں سودا کے بہت مدّاح ہیں۔

ان تمام دلیلوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سوداؔ کو کسی بادشاہ نے خطاب نہیں دیا۔ یہ صرف میر کا ایک ہتھیار تھا جو انعام اللہ خاں یقینؔ کے خلاف استعمال کیا گیا۔

میر غلام حیدر مجذوبؔ

بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں سوداؔ کا بیٹا لکھا ہے اور بعض نے متبنّیٰ بتایا ہے۔ قیام الدین قائمؔ کی غالباً قدیم ترین روایت ہے۔ چوں کہ وہ سودا کے شاگرد رہے تھے اس لیے انھیں ایک عرصے تک سودا سے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے ان کا پورا

---

[۱] ابوالحسن امیر الدین، تذکرہ مسرت افزا (قلمی)، پٹنہ، ورق ۶۱، الف

[۲] ا: غلام ہمدانی مصحفیؔ، تذکرہ ہندی، دہلی، ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۵

ب: شورشؔ لکھتے ہیں: اگر ملک الشعراے ریختہ گویاں خیال کنم رواست و گر پہلوان الشعرا گویم بجاست"۔ دو تذکرے (شورش)، ص ۳۷۹

اس عبارت میں "خیال کنم" قابلِ غور ہے۔

نام غلام حیدر اور حیدر[1] تخلص لکھا ہے انھیں سودا کا لڑکا بتایا ہے۔[2] میرحسن جو مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں (تذکرہ شعرائے اُردو لکھنے سے قبل) وہ سودا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انھوں نے بھی مجذوب کو خلفِ سودا بتایا ہے۔[3] ابوالحسن امیرالدین تذکرہ مسرت افزا[4] میں اور علی لطف گلشنِ ہند[5] میں انھیں "خلفِ سودا" اور "سودا کا بیٹا" لکھتے ہیں جس سے قائم کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر اس کے برعکس مردان علی خاں مبتلا[6]، مصحفی[7] اور شاہ کمال[8] انھیں "پسرخواندہ" لکھتے ہیں بلکہ قدرت اللہ شوق تو یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ "مجذوب دہلی کے رہنے والے خوب صورت اور وجیہہ نوجوان ہیں۔ مرزا رفیع کے منظورِ نظر اور تربیت کردہ ہیں۔ سودا نے انھیں بچپن ہی سے اپنے لڑکے کی طرح پالا ہے"۔[9]

خود مجذوب کا دعویٰ ہے:

خاطر میں کون لائے میرا سخن کہ مجھ کو
سودا کا سُن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

میر کے ایک شعر سے بھی مجذوب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے:

اے میر سمجھیو مت مجذوب کو اوروں سا
ہے وہ خلفِ سودا اور اہلِ ہنر بھی ہے

---

۱ غالباً بعد میں انھوں نے مجذوب تخلص اختیار کیا۔
۲ مخزنِ نکات، ص ۱۷
۳ تذکرہ شعرائے اُردو، ۱۷۰
۴ تذکرہ مسرت افزا، (قلمی) ورق ۶۱ الف
۵ گلشنِ ہند، ص ۲۲۶
۶ گلشنِ سخن (قلمی) ورق ۹۳ الف
۷ تذکرہ ہندی، ص ۲۰۲
۸ مجمع الانتخاب (قلمی) ورق ۲۳۷ ب
۹ قدرت اللہ شوق، طبقات الشعرا (قلمی)، آصفیہ، ورق ۱۲۶ ب

ان مختلف بیانات کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ قیاس یہی ہے کہ وہ سودا کے لڑکے تھے اور بعد کے کچھ تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی۔

مجذوبؔ غالباً سوداؔ کے ساتھ ہی دہلی سے گئے۔ لکھنؤ میں ان کے قیام کی شہادتیں موجود ہیں۔ لیکن فرخ آباد کے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی۔

مصحفیؔ نے لکھا ہے کہ ''مجذوبؔ خوش خلق اور باحیا انسان ہیں۔ میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ بڑے تپاک سے ملے''۔[۱]

میر حسن نے ان کی دیر آشنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''اگرچہ مجذوبؔ دیر آشنا ہیں لیکن جس سے ملتے ہیں خوب ملتے ہیں۔ سخن دانی کے باوجود فطرتاً خاموش طبیعت ہیں اور بہت کم گو ہیں''۔[۲]

گلشنِ ہند میں علی لطف نے مجذوبؔ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف دردِ دل اور گدازِ طبیعت میں مشہور و معروف، نظم ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں۔ دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انھوں نے کہے اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں رہے۔ غرض بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہیں ساتھ عسرتِ معاش کے لکھنؤ میں جیتے ہیں''۔[۳]

مجذوبؔ کو اپنے والد سوداؔ ہی سے تلمذ تھا جس کا ذکر کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ان کا دیوان دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گیا اور شاید اب اس کا کوئی نسخہ دنیا میں موجود نہیں۔

سوداؔ کا نواسہ

مولانا محمد حسین آزادؔ غالباً واحد تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے سوداؔ کے ایک نواسے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''اُن (سوداؔ) کے بعد کمال بھی خاندان سے نیست و نابود ہو گیا۔

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۲
۲۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۷۰
۳۔ گلشنِ ہند، ص ۲۲۶

راقم آثم ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ گیا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک شخص ملے کہ ان کے نواسے کہلاتے تھے۔ پڑھے لکھے بھی نہ تھے اور نہایت آشفتہ حال تھے'' ۔[۱]

کسی اور تذکرہ نگار نے سوداؔ کے نواسے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ مولانا آزادؔ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

اخلاق

سوداؔ کے عہد میں علم مجلسی باقاعدہ ایک فن تھا۔ مروّجہ علوم کے ساتھ ساتھ اس فن پر بھی پوری توجہ دی جاتی اور شعروشاعری علم مجلسی کا ایک حصّہ تھی۔ لوگ اپنے بچّوں کی تربیت کے لیے گھر پر استاد رکھتے تھے جو انھیں آدابِ مجلس سے واقف کرتے اور اُن کی طبیعتوں میں شعروشاعری سے ایک لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

شگفتہ مزاجی، برجستگی، شعروشاعری سے لگاؤ، محفل میں نشست و برخاست کے آداب و سلیقہ اور بڑوں کا ادب و احترام وغیرہ وہ خصوصیات تھیں جو ہر مہذب انسان کے لیے ضروری تھیں۔

معاصر تذکرہ نگار شاہد ہیں کہ سوداؔ ان تمام خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ میرؔ کو ان سے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> '' جوانے است خوش خلق، خوش خوے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روے'' ۔[۲]

'' باغِ معانی'' کے مولف نقش علی نے سوداؔ کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> '' (سوداؔ) شاعری سے قطع نظر اکثر خوبیوں سے آراستہ ہیں اور بہت سے اوصافِ حمیدہ سے متصف ہیں۔ حسنِ اخلاق اور تازہ

---

۱ آبِ حیات، ص ۱۵۲۔ ذکاؔ نے سلمان نامی ایک شاعر کو ''پسر خواندہ سودا'' لکھا ہے (عیار الشعرا)، ص ۲۱۰)
۲ نکات الشعرا، ص ۳۱

روئی میں طاق اور شیوۂ کوچک دلی اور تواضع میں شہرۂ آفاق ہیں
اور دوستی کا لحاظ کرنے میں عدیم المثال ہیں اگرچہ ان کی عمر پچپن
سال کو پہنچ چکی ہے لیکن ان کی طبع جواں رشکِ نوبہار اختلاط
پھول سے زیادہ شگفتہ'' [۱] (فارسی سے ترجمہ)

حکیم احد علی خاں یکتاؔ کے بیان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سوداؔ کو آدابِ مجلس پر پوری دسترس تھی ۔ وہ تالیفِ قلوب کے فن سے بخوبی واقف تھے ۔ بادشاہوں اور سلاطین کی صحبتوں میں رہنے کا انھیں قرینہ آتا تھا۔ یکتاؔ لکھتے ہیں:

''......ان کمالات اور اوصاف کے متعلق کیا کہوں جو وہ بے بدل (سوداؔ) اپنی ذات میں رکھتے تھے۔ملوک وسلاطین کی صحبت کے آداب......تہذیب و اخلاق،تالیفِ قلوب اور علم مجلس وغیرہ، کیا ہنر تھا جو اس ذاتِ کامل الصفات میں نہیں تھا''۔ [۲]

(فارسی سے ترجمہ)

میر حسن نے بھی ان کی خوش اخلاقی اور یار باشی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مردے ست از مغتنماتِ روزگار، خوش خلق و نیک خو و یار باش......'' [۳]

سوداؔ کثیر الاحباب تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت کافی تھی۔ میرؔ اور میر حسن دونوں نے لکھا ہے کہ وہ ''یار باش'' تھے۔ خان آرزو ، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے مشاعروں میں وہ شریک ہوتے تھے۔ چوں کہ شوخ مزاج تھے۔ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے محفلوں کی جان ہوتے ہوں گے۔ اگرچہ سوداؔ صاحبِ کمال تھے اور بہت کم خوش نصیب فن کاروں کو اتنی شہرت اور مقبولیت ملی تھی جتنی

---

۱ باغ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب
۲ دستور الفصاحت (متن)،ص ۱۷
۳ تذکرہ شعرائے اردو،ص ۸۳

قسام ازل نے سودا کو دی تھی۔ لیکن اس غیر معمولی مقبولیت سے سودا میں خود پرستی اور بے جا اَنا نہیں پیدا ہوئی۔ جن لوگوں کو سودا سے ملاقات کا شرف حاصل ہے ۔ان کی خوش اخلاقی کے مداح اور ان کی کرم فرمائی کے شکر گزار ہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں:

"اکثر فقیر درخدمت آں بزرگواری رسد، بسیار کرم می فرماید"۔[1]

نقش علی کو سودا کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی ۔ وہ سودا کے کردار کی بے انتہا تعریف کر کے لکھتے ہیں:

"بامؤلف ایں اجزا اشفاق بسیار بظاہری نماید"۔[2]

سودا مردم بیزار اور گوشہ نشین نہیں تھے۔ ان کی آمد و رفت صرف دولت مندوں کی محفلوں تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ملنے جاتے تھے۔ لالہ کھیم نرائن رند نے چہار باغ کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا، میر محمد تقی صاحب رفقائے جدّ مرحوم
نے بھی اس خاکسار کے کلبۂ احزاں کو نورِ قدم سے منوّر کیا"۔[3]

سودا ان دوستوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ جو اُن سے سینکڑوں میل دُور تھے۔ لچھمی نرائن شفیق نے لکھا ہے کہ سودا نے فرخ آباد سے غرۂ ربیع الآخر ۱۱۸۳ھ میں اولاد محمد خاں ذکا کے نام ایک خط لکھا تھا، جس میں اپنے ہاتھ سے کچھ فارسی اور ریختہ اشعار بھی نقل کیے تھے۔[4]

سودا کو اپنے شاگردوں سے کتنی محبت تھی اور شاگردوں کو اُن سے کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ ان ہجوؤں سے ہوتا ہے جو سودا کے شاگردوں نے اپنے استاد کے حریفوں کی کہی ہیں۔

۱؎ تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۸۳
۲؎ باغ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب
۳؎ نیا دَور (لکھنؤ) (نومبر ۱۹۶۱ء ، ص ۱۱
۴؎ گلِ رعنا (قلمی)، ص ۶۱۲

سودا نے ہجو گوئی کو ایک فن کی صورت دی۔ یہی فن ان کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری بن گیا۔ لیکن اس کے شواہد موجود ہیں کہ وہ تمام اختلافات کے باوجود بزرگ شاعروں کا ادب کرتے تھے۔ ان میں خاکساری اور انکسار بھی تھا۔ ''عبرۃ الغافلین'' کے دیباچے میں انھوں نے مرزا فاخر مکیں کا بڑے احترام سے ذکر کیا ہے بلکہ اپنی خاکساری کا بھی اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن اُن (اشرف علی خاں صاحبِ تذکرہ) کے دل میں یہ آیا کہ وہ قلم خوردہ اشعار (جنھیں فاخر مکیں نے قلم زد کر دیا تھا یا ان پر اصلاح دی) انصاف کے لیے اس ضعیف العباد کے پاس لائیں۔ بندہ خاکسار محمد رفیع متخلص بہ سودا نے التماس کیا کہ یہ احقر زبانِ فارسی کے امور سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا...... میرے ریختہ کے کچھ قصیدوں اور غزلوں کو جو حسنِ قبول ملا ہے۔ یہ صرف خدا کی قدرت ہے...... مرزا فاخر نے البتہ یہ کام سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ان کے کمالات میں ہرگز شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آپ کا مزاج ایسا ہی انصاف طلب ہے تو یہ نسخہ فنِ فارسی کے سخنوران کے پاس لے جایئے اور انصاف طلب کیجیے''۔[1]
(فارسی سے ترجمہ)

اشرف علی خاں کے اصرار پر سودا کو مرزا فاخر کی ان اصلاحوں اور قطع و برید کا جواب دینا پڑا۔ مگر 'عبرۃ الغافلین' کے دیباچے اور پورے رسالے میں کسی ایک مقام پر بھی سودا نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اکثر تذکرہ نگار شہادت دیتے ہیں کہ سودا ہجو گوئی میں بہت کم پہل کرتے تھے۔ لیکن جب ایک دفعہ شروع ہو جاتے تھے تو پھر شرم و حیا کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور غالباً یہ ہجو گوئی محض شعر و شاعری تک محدود رہتی تھی۔ ذاتی تعلقات پر اس کا بہت کم اثر ہوتا تھا۔ چناں چہ انھوں نے میر کی ہجو کہی تھی۔ جب کہ اُن سے بہت اچھے تعلقات تھے (جیسا کہ نکات الشعرا سے معلوم ہوتا ہے) بعض

---

[1] کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ص ۳۷۶۔۳۷۷

اشعار میں سوداؔ نے میرؔ کو بُرا بھلا کہا۔ ایک ہجو میں ثابت کیا کہ میرؔ "شیخ" ہیں "سیّد" نہیں۔ لیکن ترکِ وطن کے بعد جن لوگوں کی یاد نے مرزا کو پریشان رکھا، اُن میں میرؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔

علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے
کہوں میں کس سے کہ با وصفِ اتحادِ تمام
لکھا نہ پرچہ کاغذ بھی اتنی مدّت میں
کہ بے قراروں میں تا ہوے موجب آرام

ظاہر ہے کہ یہ اشعار اس دور کے ہیں جب سوداؔ اور میرؔ کے تمام ادبی معرکے ختم ہو چکے تھے اور غالباً ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔

سوداؔ کے سب سے اہم ادبی معرکے میر ضاحک کے ساتھ ہوئے۔ جتنی فحاشیت اور ابتذال ان ہجوؤں میں ہے، اُس کی دوسری مثال مشکل ہے۔ لیکن جب ضاحک کے لڑکے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو سوداؔ پر ضاحک سے ادبی معرکوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔

اگر ادبی معرکوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمیں سوداؔ کے وسعتِ اخلاق، سلامتیِ طبع، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے مرّوت و اخلاق، خاکساری و انکساری کا قائل ہونا پڑے گا۔

ظرافت

سوداؔ بہت ظریف، شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ تذکروں میں ان سے متعلق جتنے لطائف ملتے ہیں، ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک سوداؔ دہلی میں رہے۔ ان کی ظرافت تہذیب کے دائرے سے باہر نہ گئی لیکن اودھ کے مخصوص ماحول اور خاص طور پر نواب آصف الدولہ کے مزاج نے ان کی ظرافت میں ابتذال اور فحاشیت

پیدا کر دی۔

قیام الدین قائم نے ' مخزنِ نکات' میں لکھا ہے۔ سودا خود کہا کرتے تھے کہ ایک دن وہ اور خاکسار، مرتضی قلی کے ہاں موجود تھے۔ چوں کہ میر تقی میر اور خاکسار کے تعلقات بہت خراب تھے۔ اس لیے خاکسار نے بے موقع میر کا شکوہ و شکایت شروع کیا اور حاضرینِ مجلس سے درخواست کی کہ وہ میر تقی میر کی ہجو کہیں۔ یہ بات اہلِ محفل میں کسی کو پسند نہیں آئی۔ لیکن سودا نے خاکسار کا لحاظ کرتے ہوئے اسی وقت یہ مطلع کہا اور اُن کے حوالے کر دیا۔

میر کا مکھڑا ہے نقا گُل زنبق کا سا ہے(؟)
پیٹ بھی اس کا جو میں دیکھا سو کچھ بھنبھق سا ہے[1]

مطلع سنتے ہی حاضرینِ مجلس کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا اور خود خاکسار بھی ہنس رہے تھے۔ جب اس بات کو اچھا خاصا وقت گزر گیا اور خاکسار نے دیکھا کہ لوگ ہنسنا بند نہیں کرتے تو خود اپنے پیٹ پر نگاہ ڈالی اور ایک دم کھڑے ہو گئے۔ مرزا سودا اور اُن کے دوستوں کو سخت بُرا بھلا کہا۔ ہر چند لوگوں نے ان کی منت سماجت کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اس دن سے سودا اور خاکسار کی ملاقات ترک ہو گئی۔[2]

میر تقی میر نے ' نکات الشعرا' میں خود اپنے مشاعرے کا ایک لطیفہ لکھا ہے۔ میر صاحب کے ہاں ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اتفاقاً یہ تاریخ ہولی کے زمانے میں پڑی۔ فضل علی دانا اور مرزا رفیع سودا دونوں مشاعرے میں موجود تھے۔ لیکن دانا کا کچھ عجب لباس تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی یک تی پہنے ہوئے تھے جس کا دامن زانو تک تھا۔ اس لباس پر اس کا سیاہ رنگ اور سیاہ داڑھی، کچھ عجب منظر ہو گیا۔ سودا نے جب انھیں دیکھا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی۔ بے ساختہ ایک مصرع کہا:

یارو ہولی کا ریچھ آیا

---

[1] یہ شعر اسی طرح نقل ہوا ہے۔ مخزنِ نکات، ص ۵۲
[2] مخزنِ نکات، ص ۵۲

"ریچھ" میں لطف یہ تھا کہ ہولی کے موقع پر بچے ایک دوسرے کی خوشی کی خاطر ریچھ، بندر، گھوڑا اور شتر وغیرہ بنتے تھے۔[۱]

قدرت اللہ قاسم نے شیخ قائم علی قائم کے متعلق بھی ایک لطیفہ لکھا ہے۔ یہ بزرگ معلم اور اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ نواب احمد خاں بنگش کے عہد میں جب سودا فرخ آباد میں تھے تو یہ انعام اللہ خاں یقین کے صاحب زادے مقبول نبی خاں مقبول کی وساطت سے سودا کی خدمت میں پہنچے۔ چند غزلیں سودا کو سنائیں۔ چوں کہ اس وقت قائم علی کا تخلص امیدوار تھا۔ اس لیے سودا نے فی البدیہہ ایک شعر پڑھا۔

ہے فیض سے کسی کے یہ نخل ان کا باردار
اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

یہ بے چارے اس ارادے سے گئے تھے کہ سودا کا تلمذ اختیار کریں گے۔ مگر اس شعر سے شرمندہ ہو کر واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنا تخلص بدل کر قائم تو کر لیا لیکن پھر کسی کی شاگردی کا خیال نہیں کیا۔[۲]

آبِ حیات میں سودا کے لطیفے

سودا کے ترجمے میں آزاد نے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ انھیں دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جن کی بنیاد کسی تذکرہ نویس کے معمولی سے بیان پر ہے اور جنھیں آزاد کے قلم نے کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ دوسرے وہ جن کے مآخذ کا ہمیں کوئی علم نہیں اور جو ممکن ہے محض اختراعی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ سودا عام زندگی میں بھی ظریف الطبع اور بلا کے ہنسوڑ تھے۔ لیکن اس سلسلے میں آزاد نے بہت سے ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن میں بعض تو صریحاً نہیں مانے جا سکتے اور بعض اُس وقت تک نہیں تسلیم کیے جا سکتے جب تک کسی اور ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ آزاد نے سودا اور شاہ عالم کے

۱۔ نکات الشعرا، ص ص ۱۲۸۔۱۲۹
۲۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۸۱

تعلقات کے بارے میں لکھا ہے:

'' جب کلام کا شہرہ عالم گیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لیے تقاضا کیا۔ انھوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی مرزا کئے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے، دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی ہم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ حضور ویسی بو بھی آتی ہے۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ۔ ہم تمھیں ملک الشعرا کردیں گے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا۔ پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواں ڈول'' [1]

آزاد کے اس بیان میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا شاہ عالم کو سودا سے تلمذ تھا؟ ہمارے خیال سے ایسا نہیں تھا کیوں کہ شاہ عالم تقریباً ۱۱۷۲ھ میں نواب عمادالملک کے خوف سے دہلی سے فرار ہو گئے تھے اور ۱۱۷۴ھ میں سودا نے ترکِ وطن کیا۔ اس کے بعد کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں شاہ عالم اور سودا ایک ساتھ رہے ہوں۔ اگر یہ تلمذ اس زمانے سے قبل تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ میر، گردیزی، قائم اور شفیق اس کا ذکر نہیں کرتے۔ ان سب کے تذکرے قریبی زمانے میں لکھے گئے تھے۔ اب صرف اس کا امکان باقی ہے کہ شاہ عالم کو خط و کتابت کے ذریعے تلمذ رہا ہو۔ لیکن اسے تسلیم نہ کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ حالاں کہ سودا کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ آزاد نے مخمس شہر آشوب کے متعلق بھی جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں۔ کیوں کہ ۱۱۸۶ھ میں جب شاہ

[1] آب حیات، ص ص ۱۴۹۔۱۵۰

عالم دہلی کے قلعہ میں واپس آئے تو سوداؔ فرخ آباد میں تھے اور اس سے قبل شاہ عالم بحیثیت شہنشاہ کے دہلی میں کبھی نہیں رہے۔ ہمارے خیال سے یہ مخمس ۱۱۷۴ھ (سوداؔ کے ترکِ وطن) سے قبل کا ہے۔[1]

محمد حسین آزادؔ نے سوداؔ اور میر جعفر زٹلی کے متعلق بھی ایک لطیفہ بیان کیا ہے:

"جب مرزا رفیع لڑکے تھے۔ اس وقت میر جعفر زٹلی کا بڑھاپا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ رنگین جریبیں جن پر نقاشی کا کام ہوتا تھا۔ اکثر ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے قریب میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے ٹہلنے کو باہر نکلے۔ مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لیے سامنے سے آتے تھے۔ اس زمانے میں ادب کی بڑی پابندی تھی۔ بزرگوں کو سلام کرنا اور ان کی زبان سے دعا لینے کو بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ مرزا نے جھک کر سلام کیا۔ انھوں نے خوش ہوکر دعا دی۔ چوں کہ بچپن ہی میں مرزا کی موزونیٔ طبع کا چرچا تھا۔ میر صاحب کچھ باتیں کرنے لگے۔ مرزا ساتھ ہو لیے۔ انھوں نے نوخیز طبیعت کے بڑھانے کے لیے کہا کہ مرزا بھلا ایک مصرع پر مصرع تو لگاؤ۔ ع

لالہ در باغ داغ چوں دارد؟

مرزا نے سوچ کر جواب دیا ع

عمر کوتاست غم فزوں دارد

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ مرزا دن بھر کے بھوکے تھے "ہ" کھا گئے۔

---

[1] قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ یہ مخمس عہدِ عالمگیر ثانی میں تصنیف ہوا (سب رس، نومبر ۶۰ء ، ص ۹) مگر قاضی صاحب نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔

مرزا نے پھر کہا ع

ازغمِ عشق سینہ خوں دارد

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ بھئی دل خون ہوتا ہے۔جگر خون ہوتا ہے بھلا سینہ کیا خون ہوگا۔سینہ پُرخون ہوتا ہے۔مرزا نے ذرا پھر فکر کیا اور کہا ع

چہ کند سوزشِ دروں دارد

میر صاحب نے کہا کہ ہاں مصرع تو ٹھیک ہے لیکن ذرا طبیعت پر زور دے کر کہو۔ مرزا دق ہو گئے تھے۔جھٹ کہہ دیا ع

یک عصا سبز زیر......دارد

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اٹھا کر کہا۔''کیوں! یہ ہم سے بھی۔ دیکھ، کہوں گا تیرے باپ سے۔ بازی بازی بریشِ بابا ہم بازی'' مرزا لڑکے تو تھے ہی بھاگ گئے۔ [۱]

آزاد کی قوتِ اختراع اور انشا پردازی کے ثبوت میں یہی لطیفہ کافی ہے۔اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔شورشؔ عظیم آبادی نے میر جعفر کے ترجمے میں لکھا ہے۔''لوگ کہتے ہیں کہ نواب ذوالفقار خاں بہادر کے انتقال کے بعد ایک دن انھوں نے (جعفر نے) یہ شعر کہا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر

بادشا ہے تسمہ کش فرخ سیر

اس خبر سے بادشاہ کو غصہ آ گیا اور انھیں (جعفر) جنت بھیج دیا''۔ [۲]

۱؎ آبِ حیات، ص ص ۱۷۴۔۱۷۵

۲؎ دو تذکرے (شورش)، ۱، ص ۱۶۳

شورش کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ جعفر زٹلی عہدِ فرخ سیر میں قتل کیے گئے۔

فرخ سیر ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت سودا کی عمر صرف چھ سال تھی۔ ۸؍ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ کو فرخ سیر کو تخت سے اتار کر اندھا کر دیا گیا۔ اُس وقت بھی سودا کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ علاوہ ازیں میر حسن نے یہ لطیفہ مرزا بیدل اور جعفر زٹلی سے متعلق بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک دن (جعفر) مرزا بیدل کے پاس گئے۔ مرزا ایک مصرع پر فکر کر رہے تھے۔ ملتفت نہ ہوئے۔ (جعفر نے) پوچھا صاحب وقبلہ آپ نے کون سا مصرع کہا ہے؟ کہا! ہاں یہ مصرع ہے ع

لالہ بر سینہ داغ چوں دارد

پھر مسطور نے کہا۔ اس میں کیا تامل ہے۔

چوبکے سبز زیر ......دارد"۔[۱]

آزاد لکھتے ہیں:

خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سودا ان دنوں نوجوان تھے۔ مطلع پڑھا ؎

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

---

۱ (ا) تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۴۲

(ب) قاضی عبدالودود لکھتے ہیں۔ "......انشا نورتن مطبوع نول کشور ص ۱۰۶ میں ہے کہ اکبر نے لالہ بر سینہ الخ کہا۔ امیر خسرو نے یہ مصرع لگایا

عمر کوتاہ غم فزوں دارد

لطائف عجیبہ مصنفہ بشیر الدین احمد دہلوی مرحوم کی کسی جلد میں اس پر یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ بیربل نے تیسرا مصرع...... چوبکے سبز...... الخ کہا۔ ممکن ہے یک عصا...... الخ اس کی جگہ ہو۔ کتاب اس وقت پیش نظر نہیں"۔ نوائے ادب (اپریل ۱۹۵۶ء) ص ۱۲۔

> یا تو لاعلمی سے یا ان کی آتش زبانی کے ڈر سے کوئی نہ بولا۔ مگر خانِ آرزو جن کی دایۂ قابلیت کے دودھ سے مظہر، سودا، میر، درد وغیرہ نوجوانوں نے پرورش پائی ہے۔ انھوں نے فوراً یہ شعر پڑھا کہ قدسی کے مطلع پر اشارہ ہے۔
>
> شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے
> چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک
>
> (قدسی کا مطلع ہے)
>
> آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
> اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را
>
> سودا بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خاں صاحب کے گلے سے لپٹ گئے اور اس شکریہ کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقتاً خاں صاحب نے ان کے کلام کو مثلِ حدیثِ قدسی تسلیم کیا ہے"۔[1]

یہ واقعہ آزاد نے مجموعہ نغز سے لیا ہے مگر قاسم نے صرف اتنا لکھا ہے کہ سودا نے حاجی محمد جان قدسی کی ایک غزل کا اُردو میں ترجمہ کیا اور (خان آرزو کے مشاعرے میں) بڑے شدّ ومدّ سے پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً اہلِ محفل میں سے کسی کا اُس طرف دھیان نہیں گیا اور اگر گیا بھی ہوگا تو خاموش رہے ہوں گے۔ کیوں کہ معمولی سی بات پر (سودا) ہر کسی کی بے محابا ہجو کہہ دیا کرتے تھے۔ خان آرزو نے بہت تعریف کی اور دوران توصیف یہ شعر فی البدیہہ کہا۔ شعرِ سودا...... الخ "۔[2] ع آلودۂ قطراتِ...... الخ اور اس کا ترجمہ آزاد کا اپنا اضافہ ہے۔ یہ شعر قدسی کا نہیں ہے۔ مجالسِ رنگین میں رنگین نے یہ فارسی شعر اور سودا کا اُردو ترجمہ دیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ فارسی شعر کس کا ہے۔[3] آزاد نے

---

1. آبِ حیات، ص ص ۱۷۲۔۱۷۳
2. مجموعہ نغز، ا، ص ۳۶
3. مجالسِ رنگین، ص ۸

ان دونوں کو ملا دیا ہے۔

آزاد نے انشا اور سودا کے متعلق لکھا ہے۔ ''سید انشا کا عالمِ نوجوانی تھا۔ مشاعرے میں غزل پڑھی:

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا:

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو آپ
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

سودا کا عالمِ پیری تھا۔ مشاعرے میں موجود تھے مسکرا کر بولے۔ دریں چہ شک''۔ اس لطیفے کی کسی اور ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اگر آزاد کے ذہن کی اختراع نہیں تو یہ واقعہ فیض آباد میں پیش آیا ہوگا۔ کیوں کہ انشا کے والد شجاع الدولہ کے دربار سے متوسل تھے۔ سودا ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد پہنچے ہیں۔ انشا ۱۱۸۸ھ (وفات شجاع الدولہ) میں فیض آباد سے چلے گئے۔[1] اس لیے یہ واقعہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان کا ہوگا۔

آزاد نے درد اور سودا کے بارے میں ایک لطیفہ لکھا ہے:

> ''ان (درد) کے ہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی۔ اس میں خواجہ میر درد صاحب نالۂ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنا کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سے سرِ راہ ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لیے فرمائش کی۔ مرزا نے کہا۔ صاحب مجھے نہیں بھاتا کہ سو کوے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک پدّا بیٹھ کر چوں چوں کرے۔ اس

---

[1] انشا کے قیامِ فیض آباد کے سلسلے میں ملاحظہ ہو
اسلم پرویز، انشاء اللہ خاں انشا، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ص ۲۳۔ ۲۶

زمانہ کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمل اور برداشت
کرنا لازمۂ بزرگی سمجھتے تھے۔ آپ مسکرا کر چپ ہو رہے۔

مرزائے موصوف نے ایک قصیدہ نواب احمد علی خاں کی تعریف میں کہا ہے اور تمہید میں اکثر شعرا کا ذکر انھیں شوخیوں کے ساتھ کیا ہے جو ان کے معمولی انداز ہیں۔ چناں چہ اسی کے ضمن میں کہتے ہیں۔

درد کس کس طرح ہلاتے ہیں
کرکے آواز منحنی و حزیں
اور جو احمق ان کے سامع ہیں
دمبدم ان کو یوں کریں تحسیں
جیسے سُبحانَ مَن یَرانی پر
لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں
فخر کس چیز کا ہے ان کے تئیں
شعر و تقطیع ان کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقشِ نگیں
اس میں بھی دیکھیے تو آخرکار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں
اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
میخ در......آسمان و زمیں[۱]

---

[۱] آب حیات، ص ص ۱۸۷-۱۸۸

یہ اشعار نواب احمد علی خاں کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے کے ہیں۔ ان سے قبل ایک شعر یہ بھی ہے :

یعنی سودا و میر و قائم و درد
لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

جب اس شعر میں درد کا نام آچکا ہے تو بظاہر دوبارہ نام آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کلیات سودا مطبوعہ نول کشور میں وہ شعر جس میں درد کا لفظ آیا ہے اس طرح ہے۔

درد کس کس طرح ملاتے ہیں
کرکے آواز منحنی و حزیں

جس کا مطلب صاف یہی ہے کہ شعر میں سوز و گداز نہیں ہوتا۔ آواز کو منحنی اور حزیں بنا کر درد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قلمی نسخوں میں "ملاتے" کی جگہ "ہلاتے" ہے۔ جو بظاہر کاتب کا سہو ہے۔ میرا خیال ہے کہ آزاد نے اس سہو سے فائدہ اٹھا کر ایک دل چسپ لطیفہ بنالیا ہے۔

موسیقی دانی

بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے سودا کی موسیقی دانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ میر حسن نے لکھا ہے:

در علم موسیقی نیز ماہر ست۔[1]

عشقی لکھتے ہیں کہ انھیں علم موسیقی اور ستار نوازی میں معقول دستگاہ تھی ۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو، ص ۸۳

در علم موسیقی و ستار نوازی دستگاہے معقولے داشت ۔[1]

مصحفی لکھتے ہیں کہ:

"بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آں نیز قادر"۔[2]

حکیم سید احد علی خاں یکتا لکھتے ہیں کہ سودا علم موسیقی سے آگاہ ہیں اور اپنے کہے ہوئے مرثیوں اور سلاموں کی طرح خود بناتے ہیں۔[3]

کتے پالنے کا شوق

سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا اور غالباً یہ شوق آخری عمر تک قائم رہا۔ جب عہد نواب شجاع الدولہ میں مصحفی اُن سے ملنے گئے تو ان کا یہ شوق بدستور تھا۔ چناں چہ مصحفی لکھتے ہیں۔ "فقیر عہد نواب شجاع الدولہ بہادر میں اس بزرگ (یعنی سودا) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں ابریشم پشم کے کتے پالنے کا بہت شوق تھا"۔[4]

کلیات میر میں ایک ہجو "ہجو عاقل نام نا کسے کہ بہ سگان انسے تمام داشت"۔ کے نام سے ہے۔ یہ ہجو غالباً سودا پر کہی گئی ہے۔ کیوں کہ کلیات سودا میں اس کا جواب ہے۔ میر نے اپنی ہجو میں لکھا ہے کہ سودا کتوں کے پیچھے دیوانے رہتے ہیں۔

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
چچڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی و لطافت وہ برطرف (کذا)
کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہرطرف

---

[1] دو تذکرے (تذکرہ عشق)، ص ۳۸۰
[2] تذکرہ ہندی، ص ۱۲۶
[3] دستور الفصاحت، ص ۱۷
[4] تذکرہ ہندی، ص ص ۱۲۵-۱۲۶

سوداؔ کو کتے اتنے عزیز تھے کہ اگر کوئی ان کتوں کو کچھ کہتا تو انھیں سخت ناگوار ہوتا۔

دنکارو کتے کو تو لہو اپنا دہ پیے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لیے

وہ کتوں کی تلاش میں اس طرح مارے مارے پھرتے کہ دین اور دنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

انھوں نے دہلی میں تین کتیاں پالی تھیں، جن سے انھیں بے انتہا محبت تھی۔ ان کتیوں کی خاطر ہمسایوں کی گالیاں بھی کھانا پڑیں۔ جب یہ کتیاں مریں تو سوداؔ کو بہت افسوس ہوا۔

دلّی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں
ہمسایوں کی جنھوں کے لیے کھائیں گالیاں
وہ مر گئیں تو دیر رہا روتا غم زدہ
پستی کے پیچھے پھر نہ ہنسا ٹک ستم زدہ
لونگی کا گرم غم جو رہا سوکھ بخ ہوا
برنی کی تعزیت میں سگِ روئے بخ ہوا

ظاہر ہے کہ میرؔ نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سوداؔ کو کتوں سے بہت محبت تھی۔ اپنے اس شوق کا ذکر انھوں نے ہجوِ فدوی میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

سن بے الّو پہنچ کے بنگالے

مادہ سگ آپ کو تو بنوالے
میرے تئیں گو ہے بسکہ ذوق بہ سگ
سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے

میرؔ کی ہجو کا جواب دس بندوں کی ایک مخمس میں دیا ہے جس کے دو بند یہ ہیں:

اکثر تو مرے خبث میں کہتا ہے یہی بات
کتوں میں فلانے کی شب و روز ہے اوقات
خود اس کی نجاست کا نہیں کتے پہ اثبات
لازم ہے مسلماں نہ کرے اس سے ملاقات
یہ چاہیے صحبت سے رکھے ایسے کے اکراہ

کتے سے شب و روز جو رکھتا ہوں میں صحبت
دیتا ہے مجھے یادِ وفا اور قناعت
دنیا کے وہ جیفے کو سمجھتا ہے نجاست
اک پارچۂ نان پر مرے ساتھ رفاقت
کس طرح بتا اس کی مرے دل میں نہ ہو چاہ

ترکِ وطن

نادر شاہ کے حملے نے دہلی کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ بعض لوگوں نے دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ لیکن سوداؔ ثابت قدم رہے کیوں کہ ان کے سرپرست اور مربّی دہلی میں موجود تھے۔

سودا کے علاوہ کچھ اور اہلِ ہنر بھی دہلی سے نہ گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شجاع الدولہ کے مسند نشین ہونے تک پورے ہندوستان میں فرخ آباد کے علاوہ کوئی دوسرا مقام ایسا نہیں تھا، جہاں اہلِ فن کو پناہ مل سکتی تھی۔ برہان الملک کا نادر شاہی حملے کے دوران انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے وارث صفدر جنگ کو دشمنوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ شجاع الدولہ کے حالات البتہ کچھ بہتر تھے۔ مگر ابتدائی دورِ حکومت میں وہ بھی ملکی سیاست میں اتنا مصروف رہے کہ انھیں ''طاؤس و رباب'' کی فرصت نہیں ملی۔ اس وقت مشہور و معروف شاعروں میں خانِ آرزو ایسے شاعر تھے جنھیں شجاع الدولہ کی سرکار سے تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ وفات سے کچھ سال قبل جب شجاع الدولہ کے اکثر دشمن تہِ خاک ہو چکے تھے اور انگریزوں کی دوستی حاصل ہو گئی تھی۔ اُس وقت شجاع الدولہ نے فیض آباد میں مستقل قیام کا ارادہ کیا۔ شہر کی تعمیر میں دل چسپی لی اور بزم آرائیوں کے سامان کیے۔ فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ ادبی مرکز بن گیا۔ جہاں ہندوستان کے اکثر نامور شاعر اور ادیب اپنی متاعِ ہنر کا صلہ پانے کے لیے پہنچے۔

اودھ کے باقاعدہ ادبی مرکز بننے سے پہلے فرخ آباد ایک ایسا مقام تھا جہاں نواب احمد خاں بنگش کے دیوان مہربان خاں رندؔ کی فیاضیوں نے کچھ شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ان میں مرزا رفیع سودا اور میر سوز جیسے نامور شعرا بھی تھے۔

دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے حملے (۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۶ء) نے ایک عظیم سیاسی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ابدالی نے نادر شاہ کی تاریخ دُہرا دی۔ اس لیے اکثر لوگ ہراساں و پریشاں دہلی سے نکل کر شہر شہر مارے پھر رہے تھے لیکن سودا اب بھی دہلی ہی میں رہے۔ ان کے مربی عماد الملک کا ستارہ گردش میں ضرور تھا۔ لیکن ابھی تک ان کا سیاسی اقتدار برقرار تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے انھیں درّانی فوج اور دو شہزادوں مرزا ہدایت بخش اور مرزا بابر کے ساتھ روانہ کیا تھا تاکہ وہ صوبۂ اودھ سے روپیہ وصول کریں۔ عماد الملک پہلے فرخ آباد میں وارد ہوئے۔ جہاں نواب احمد خاں بنگش نے ان کا استقبال کیا اور نذر گزرانی۔ قائمؔ نے لکھا ہے کہ مرزا رفیع سودا، وزیر المملکت نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد پہنچے۔ نواب مہربان خاں رندؔ نے عماد الملک سے

درخواست کی اور سوداؔ کو اپنی رفاقت میں لے لیا۔[1] جس کا مطلب یہ ہوا کہ سوداؔ ۱۱۷۰ھ میں فرخ آباد وارد ہوئے۔ لیکن صاحبِ نشترِ عشق کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے دوبارہ دہلی آنے پر جو تباہی و بربادی ہوئی، اس سے پریشان ہوکر سوداؔ نے ترکِ وطن کیا اور فرخ آباد آگئے۔[2]

ابدالی کے دوبارہ دہلی آنے کی مختصر داستان یہ ہے کہ ۱۱۷۰ھ میں ابدالی نے عماد الملک کو امیر الامرائی کے منصب پر فائز کیا۔ جب عماد الملک ابدالی کے حکم سے اودھ کی طرف گئے تو عالم گیر ثانی اور نجیب الدولہ کے بہکانے پر یہ منصب نجیب الدولہ کو عنایت کر دیا گیا۔ عماد الملک نے سورج مل جاٹ کی مدد سے دہلی پر حملہ کر دیا۔ نجیب الدولہ کو بے سروسامانی کی وجہ سے صلح کرنی پڑی اور اپنے علاقے کی طرف چلے گئے۔ عماد الملک نے ۱۱۷۳ھ میں عالم گیر ثانی اور نواب انتظام الدولہ کو قتل کرادیا۔ شاہ جہاں ثانی کو تخت نشین کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے یہ خبر سن کر پھر دہلی کا رُخ کیا۔ عماد الملک نے دہلی سے فرار ہوکر سورج مل جاٹ کے قلعوں میں پناہ لی، جس کا ذکر صاحبِ مقالات الشعرا نے بھی کیا ہے۔[3]

اس کا امکان بہت کم ہے کہ سوداؔ ۱۱۷۴ھ کے بعد بھی دہلی میں رہے ہوں۔ کیوں کہ جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ/جنوری ۱۷۶۱ء (پانی پت کی لڑائی) کے بعد احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کے منصب پر سرفراز کیا تھا اور اس کے بعد لگ بھگ دس سال تک نجیب الدولہ کی حیثیت ایک ڈکٹیٹر کی رہی۔ نجیب الدولہ عماد الملک کے جانی دشمن تھے۔ اس لیے بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ نجیب الدولہ کے عہد میں سوداؔ جو عماد الملک کے خیر خواہ تھے، دہلی میں رہے ہوں گے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ دہلی سے نکل کر عماد الملک کے پاس پہنچ گئے اور عماد الملک کے ساتھ ۱۱۷۴ھ۔ ۱۱۷۶ھ

---

1. مخزنِ نکات، ص ۵۵۔
2. نشترِ عشق (قلمی)، ص ۲۶۶۔
3. قیام الدین حیرتؔ، مقالات الشعرا (قلمی)، رام پور، ورق ۱۰ ب

کے درمیانی زمانے میں فرخ آباد گئے۔[1] بہرحال ۱۱۷۶ھ میں سودا فرخ آباد میں موجود تھے۔ کیوں کہ انھوں نے مہرباں خاں رند کی شادی کا جو قطعہ تہنیت کہا ہے اس کا مادۂ تاریخ ہے:

ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا

اس مادہ سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا خیال ہے کہ سودا ۱۱۷۶ھ میں فرخ آباد پہنچے۔[2]

صاحبِ خزانہ عامرہ کا بیان ہے کہ عماد الملک ۱۱۷۶ھ تک سورج مل کے ساتھ مقیم رہے۔[3] تاریخ فرخ آباد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ تقریباً اسی سال عماد الملک فرخ آباد پہنچے۔[4] نواب احمد خاں بنگش نے ان کے لیے اچھی خاصی جاگیر مقرر کردی تاکہ اُن کا گزر ہوسکے۔ تاریخ فرخ آباد ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہ عالم بادشاہ الٰہ آباد سے دہلی کی طرف جانے لگے تو عماد الملک وہیں موجود تھے۔ انھیں جب یہ خبر ملی کہ شاہ عالم فرخ آباد کے قریب سے گزریں گے تو وہ فرخ آباد سے روانہ ہوگئے۔ کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ شاہ عالم اپنے والد عالم گیر ثانی کا بدلہ نہ چکالیں۔ شاہ عالم کا یہ سفر ۱۱۸۴ھ میں ہوا تھا جس کا مطلب ہے کہ عماد الملک ۱۱۷۶ھ۔۱۱۸۴ھ تک

---

[1] (الف) شیخ چاند نے فرخ آباد میں سودا کا سالِ ورود ۱۱۶۷ھ بتایا ہے جو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب احمد شاہ درانی کے مشورے سے ۱۱۶۷ھ میں عماد الملک دو شہزادوں کے ساتھ فرخ آباد گئے تو سودا بھی ہمراہ تھے۔ سودا، ص ۵۰۔

(ب) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ "شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ان کی شاعری عروج پر تھی۔ کئی رؤسا کے ہاں ان کی قدر ہوتی تھی۔ خصوصاً بسنت خاں خواجہ سرا مہربان خاں زیادہ مہربان تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں سے دہلی تباہ و برباد ہوگئی تو سودا نے باہر کا رُخ کیا۔ دلّی کا دبستانِ شاعری، ص ص ۱۵۰۔۱۵۱۔ شاہ عالم اگرچہ ۱۱۷۴ھ میں تخت نشین ہوئے تھے لیکن تقریباً دس سال تک وہ الہ آباد میں رہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کا بیان درست نہیں۔ بسنت خاں محمد شاہی دور کا امیر تھا اور مہربان خاں رند وہی ہے جو نواب احمد خاں بنگش کا دیوان تھا۔ بظاہر یہ غلط فہمی آزاد کی پیدا کردہ ہے۔

[2] حکیم سید احمد علی خاں یکتا، دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، حواشی ص ص ۵۷۔۵۸

[3] خزانۂ عامرہ، ص ۱۵۳

[4] میر ولی اللہ، تاریخ فرخ آباد (قلمی)، رام پور

فرخ آباد میں رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سودا کب ان کے ساتھ فرخ آباد آئے۔ ۱۱۷۰ھ میں سودا کے آنے کا کوئی سوال نہیں۔ احمد شاہ ابدالی دوسری بار ۱۱۷۴ھ میں دہلی آیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ سودا نے اُس سال ترک وطن کیا ہے اور عماد الملک کے پاس سورج مل جاٹ کے قلعوں میں پہنچ گئے۔ مرزا مظہر جانجاناں نے کئی خطوط عماد الملک اور ان کے کسی عہدے دار غلام عسکری خاں کو لکھے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عماد الملک خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ وہ دہلی پر حملہ کرنے اور منصب امیر الامرائی حاصل کرنے کے لیے برابر کوششیں کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ روہیلوں، مرہٹوں اور جاٹوں سے مدد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرخ آباد بھی گئے تھے۔ تاکہ نواب احمد خاں بنگش سے مدد چاہیں۔ سودا اُن کے ساتھ تھے اور مہربان خاں رند کی فرمائش پر وہیں مقیم ہو گئے۔

فرخ آباد میں سودا نواب مہربان خاں رند کی سرکار سے منسلک رہے اور نواب احمد خاں بنگش سے کوئی قابلِ ذکر تعلق نہیں رہا۔ کلیاتِ سودا میں چند قطعات ہیں جو نواب احمد خاں کی سالگرہ اور غسلِ صحت کے موقعوں پر کہے گئے ہیں۔ ان میں کم سے کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ پانچ اشعار کے قطعات ہیں، جن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کے نواب احمد خاں سے براہِ راست تعلقات نہیں تھے۔ ورنہ یہ قطعات اتنے مختصر نہ ہوتے۔ غالباً نواب مہربان خاں رند کے تعلق سے یہ اشعار کہے گئے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا نواب احمد خاں بنگش کی سرکار میں ملازم تھے۔ مگر یہ درست نہیں۔[1]

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ نواب مہربان خاں رند کو سودا سے تلمذ تھا۔ مگر یہ بھی درست نہیں۔ سودا اس کے دربار سے ضرور متوسل تھے۔ لیکن اس کے استاد میر سوز تھے۔

فرخ آباد کے دورانِ قیام میں محمد یار خاں امیر نے سودا کو بلایا۔

بقول مصحفی ''جن دنوں حکیم کبیر سنبھلی کے ترغیب دلانے پر ہندی شاعری نے نواب محمد یار خاں امیر کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچا تو انھوں نے میر سوز اور مرزا رفیع سودا کو خط

---

[1] مثلاً: سعادت خاں ناصر لکھتے ہیں۔ ''بعد برہمی سلطنت شاہ جہاں فرخ آباد تشریف لائے اور نواب احمد بنگش کی سرکار میں نوکر رہے''۔ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)۔ جتلا نے بھی یہی لکھا ہے کہ چندے...... نزد نواب احمد خاں بنگش گزرانید۔ گلشن سخن (قلمی) ورق ۵۶ ب

لکھ کر طلب کیا۔ چوں کہ ان دنوں یہ دونوں بزرگ مہرباں خاں رند کی سرکار میں صیغۂ شاعری میں عزوامتیاز رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا فرخ آباد سے ٹانڈہ (کہ نواب کی بودوباش کا موضع تھا) آنا نہ ہوسکا۔ آخر میاں محمد قائم کہ ان دنوں بسولی میں تھے حسب الاشارہ ٹانڈہ آئے اور والا جناب کی ملازمت حاصل کی''[۱] (فارسی سے ترجمہ) [تذکرہ ہندی، ص ۱۴۳]

فرخ آباد کے سیاسی حالات خراب ہونے پر سودا کو مجبوراً فیض آباد جانا پڑا۔ یہ یقینی امر ہے کہ سودا ۱۱۸۳ھ تک فرخ آباد میں تھے۔ کیوں کہ لچھمی نرائن شفیق لکھتے ہیں کہ سودا نے غرّہ ربیع الآخر کا لکھا ہوا ایک خط اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے کچھ اُردو اور فارسی اشعار دکن میں میر اولاد محمد خاں ذکا بلگرامی کو فرخ آباد سے بھیجے تھے۔[۲]

مردان علی خاں مبتلا لکھتے ہیں کہ نواب احمد خاں بنگش کی وفات کے بعد سودا فیض آباد چلے گئے۔ نواب کا انتقال ۲۸ ربیع الاوّل ۱۱۸۵ھ کو ہوا جس کی وجہ سے غالباً رند کے حالات خراب ہوگئے اور سودا کو ۱۱۸۵ھ کے اواخر میں فیض آباد آنا پڑا۔ سودا نے مہربان خاں رند کے دیوان واشعار کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے، جس میں چند اشعار ایسے بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سودا نواب احمد خاں بنگش کی زندگی ہی میں فرخ آباد سے چلے گئے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

لیکن اس نظم سے نہ سمجھیو تو
کچھ صلہ سے غرض ہے سودا کو

اس سے رکھتا ہے یہ دلِ مہجور
مہرباں دوستی تری منظور

---

[۱] قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: ''احمد خاں بنگش سے متعلق سودا کی نظمیں ہیں۔ مگر فرخ آباد میں مہربان خاں رند سے توسل رکھتے تھے۔ میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں، جسے ریختہ گو کی حیثیت سے احمد خاں بنگش نے فرخ آباد آنے کی دعوت دی ہو''۔ قاضی عبدالودود، دلّی کا دبستانِ شاعری، ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۲

[۲] لچھمی نرائن شفیق، گلِ رعنا (قلمی)، ص ۶۱۲۔

کرچکا میں دعاپہ ختم کلام
پہونچے رخصت کا میرے تجکو سلام

حشر تک زیرِ سایۂ نواب
رہیو جوں آفتابِ عالمتاب [۱]

ان اشعار کی روشنی میں شیخ چاند نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سوداؔ نواب کی زندگی ہی میں فرخ آباد سے چلے گئے تھے اور چوں کہ ۱۱۸۳ھ میں ان کا فرخ آباد ہونا ثابت ہے اس لیے وہ ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان فیض آباد پہنچے۔[۲] ہمارے خیال سے بظاہر کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جس سے بتلا کا بتایا ہوا سن غلط ثابت ہو۔[۳]

مولانا عبدالحیٔ نے بھی یہی لکھا ہے کہ "۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہوگیا۔ یہ برداشتہ خاطر ہوکر فیض آباد چلے آئے"۔[۴]

---

۱ ہمارا خیال ہے کہ نواب کی زندگی میں سوداؔ نے فرخ آباد سے جانے کا ارادہ کیا ہوگا مگر بعد میں ملتوی کردیا۔

۲ سوداؔ ، ص ۵۶

۳ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیق ہے۔ "اب عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ سودا ۱۱۷۳ھ اور ۱۱۷۵ھ کے درمیان فیض آباد پہنچے"۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص ۸۹

۴ (ا) گلِ رعنا، ص ۱۳۵
(ب) محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "......کئی برس کے بعد وہ قدردان مرگئے زمانے بدل گئے۔ سوداؔ بہت گھبرائے۔ اس عہد میں ایسے تباہی زدوں کے لیے دو ٹھکانے تھے۔ لکھنؤ یا حیدر آباد، لکھنؤ پاس تھا اور فیض و سخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ اس لیے جو دلّی سے نکلتا تھا، اُدھر ہی رُخ کرتا تھا اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف خیال نہ جاتا تھا۔ اس وقت حاکم بلکہ وہاں کے محکوم بھی جو یائے کمال تھے۔ نکتہ کو کتاب کے مول خریدتے تھے۔ غرض ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دلّی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ اس کی تعریف میں بھی کئی قصیدے موجود ہیں۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ آبِ حیات، ص ص ۱۵۰۔۱۵۱۔ یہاں آزاد کو کئی غلط فہمیاں ہیں۔ سودا جب دہلی سے نکلے ہیں تو ان کی عمر تقریباً ۵۵ سال تھی۔ وہ فرخ آباد میں چند روز نہیں تقریباً دس سال رہے تھے اور ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ نہیں فیض آباد پہنچے تھے۔ کیوں کہ ان دنوں اودھ کا دارالحکومت فیض آباد تھا۔

سعادت خاں ناصر نے سودا کے فیض آباد جانے سے متعلق ایک دل چسپ داستان بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد آیا ہے۔ شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا۔ سبحان اللہ کیا وضع داری تھی کہ نواب کے شقہ کے جواب میں یہ رباعی لکھی :

سودا پئے دنیا تو بہ ہرسو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

حضور پرنور اس رباعی سے نہلیے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین تخلص ضاحک کہ نمکِ مجلس تھے واسطے رفع ملال یوں بول اُٹھے۔ اگر وہ حضور پرنور کے شقہ سے نہیں آتا ہے۔ غلام بے طلب کھینچ لاتا ہے۔ قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سودا کا کہا ہوا تھا۔ تمام اسی مصنف کی مذمت میں الٹا۔ چناں چہ یہ شعر:

پاؤں کھڈّی پہ رکھو ہاتھ میں لو آئینہ
..........ناک پہ دھر کر عینک

جب وہ مزخرفات سودا نے سنی بہ حکم آنکہ دیوانہ راہ ہوئے (کذا) روانہ لکھنؤ کو ہوا۔ میر سابق الذکر نے کہ دلیری و شوخ چشمی ان پر ختم تھی۔ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجہ کیا۔ اسی فروتنی سے غبار عناد کا سودا کے دل سے مطلق صاف ہو گیا۔ موافق قاعدۂ ہندوستان عطر و پان کے واسطے اندر تشریف لے گئے۔ اس عرصے میں کہ برآمد ہوں اس ٹھٹھول نے قلمدان کھولا اور یہ مطلع ایک پرچے میں لکھ دیا:

رستم سے تو کہہ پیارے سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

اس کے برابر یہ مطلع لکھ دیا:

سودا نے اٹھا چوتڑ جب پاد دیا پڑدے
یہ ان ہی سے ہوتا ہے ہر کارے دہر مردے

بعد دو چار گھڑی کے جب وہ صحبت برہم ہوئی۔ سودا نے قلم دان کھولا اور وہ مطلع پڑھا یقین کلی ہوا کہ یہ سید ناسید اور مرد نا معتمد ہے۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر گزرا:

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے پلٹ نکلا ہے میر''[۱]

سودا اودھ میں

۱۱۸۵ھ میں جب سودا اودھ پہنچے تو نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا اور اودھ کے دار الخلافہ فیض آباد میں قیام کیا اور نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں معقول تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔[۲] مصحفی نے لکھا ہے کہ نواب ان کی بہت عزت کرتے تھے[۳]۔ نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو سودا ان کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ (جمادی الاول ۱۱۸۹ھ) جنوری ۱۷۷۵ء کے آس پاس آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔ غالباً لکھنؤ میں سودا کی مالی حالت اچھی نہیں رہی۔ اگرچہ کچھ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آصف الدولہ کی سرکار سے انھیں چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر ہوئی تھی۔ علی لطف لکھتے ہیں:

---

۱ (الف) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)
(ب) ناصر کا یہ بیان کہ شجاع الدولہ نے جب سنا کہ سودا فرخ آباد آئے ہیں تو انھیں بلایا۔ جب نہیں آئے تو ضاحک نے ہجو لکھ کر فیض آباد آنے پر مجبور کر دیا۔ درست نہیں۔ سودا فرخ آباد میں تقریباً دس سال رہے ہیں۔

۲ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)

۳ مصحفی کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ''غرضیکہ شخص جامع الکمالات بود، ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت۔ نواب مرحوم و مغفور نیز بودن او در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند''۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۲۶۔

"جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہاں آباد کے نقل و حرکت کا اتفاق میرزائے مذکور کو اس سے ہوا۔ تو اور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طور سکونت کا اختیار کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی اور چھ ہزار سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی"۔[۱]

علی لطف شاید پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے چھ ہزار کی جاگیر کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے متعلق ان کی معلومات بہت محدود تھیں۔ سودا پہلی بار لکھنؤ نہیں فیض آباد پہنچے تھے۔ وہ آصف الدولہ کی بجائے نواب شجاع الدولہ کے عہد میں آئے تھے۔ ان غلط فہمیوں کے پیشِ نظر سودا کی آمدنی سے متعلق بھی ان کا بیان قابلِ یقین نہیں۔ اشپرنگر نے بھی یہی لکھا ہے کہ سودا کو آصف الدولہ نے چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ دیا تھا۔[۲] لیکن اشپرنگر کا ماخذ بھی گلشنِ ہند ہے۔ اس لیے قابلِ اعتماد نہیں۔ آزاد نے آمدنی سے متعلق ایک دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"لکھنؤ میں مرزا فاخر مکیں زبان فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ اُن سے اور مرزا رفیع سے بگڑی اور جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی۔ انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام و اکرام کے چھ ہزار سالانہ وظیفہ ہو گیا اور نواب نہایت شفقت کی نظر فرمانے لگے"۔[۳]

اس سلسلے میں بھگوان داس ہندی کا بیان سب سے زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ لکھنؤ میں سودا سے ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ نے سودا کے دو سو روپے ماہوار مقرر کیے اور خلعت عطا کی۔ جب نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا تو آصف الدولہ کی سرکار سے دو سو روپے ماہانہ ملنے شروع

۱۔ گلشنِ ہند، ص ۱۳۲
۲۔ یادگارِ شعراء ص ۱۱۱
۳۔ آبِ حیات ص ۱۵۱

ہو گئے ر[1] یہ بات اس لیے بھی قریب بہ یقین ہے کہ میر تقی میر کو بھی آصف الدولہ کے دربار سے دو سو روپے ماہانہ ملتے تھے[2] بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ سودا کو پانچ سو روپے ماہوار ملیں اور میر کو صرف دو سو۔

اگر چہ سودا کا ماہانہ مقرر تھا لیکن آصف الدولہ کے عہد میں اس کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان کے عہد میں ملازموں کو مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہوں سے محروم رکھا جاتا تھا۔ آصف الدولہ کی لاپرواہی اور نااہل لوگوں کے اقتدار نے صوبے کی آمدنی کو بہت محدود کر دیا تھا جو تھوڑی بہت آمدنی تھی وہ آصف الدولہ کی عیاشیوں کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ سودا براہ راست درخواست کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اودھ آنے سے قبل کے قصیدوں میں انھوں نے اپنا دامن نہیں پھیلایا۔ ہاں نواب عماد الملک سے ایک طویل قصیدے کے دو اشعار میں یہ درخواست کی تھی۔

اس کے مصرف کے جو دیہات ہیں بس اُن میں سے
اپنے مداح کو بھی کردے مقرر صحنک
تو ہی اب دل میں کر آپ عرض مری کا انصاف
جائے کس در پہ کہو پہونچ کے ایسے درتک

لیکن ایک قصیدے میں سودا نے آصف الدولہ کو اپنا حال ذرا تفصیلی بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ مجھے اپنی تنخواہ لینے کے لیے ایک ایک آدمی کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ مجھے تنخواہ دینے کی بجائے مصرف مطبخ میں سے صحنکِ طعام مقرر کر دیجیے تاکہ ہر روز کی جھک جھک سے نجات پالوں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس نظم سے غرض ہے مجھے عرضِ مدعا
مقصد مرا قلیل ہے پہونچے بانصرام

---

[1] سفینۂ ہندی/ ص ۱۰۵
[2] میر محمد خاں بہادر سرور عمدہ منتخبہ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۶۱ء ص ۵۵۳۔

اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام
انصاف ہے کہ ہو وہ عطا اس جناب کی
اور ان کی میں سماجت و منت کروں مدام
دیہات جو ہیں مصرف مطبخ کے اوس میں سے
اس نفقدی کے عوض ہو مجھے صحنک طعام
اے گنج بخش خلق مرا ہے جو مدعا
کرنا روا حضور ترے کس قدر ہے کام

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ نے سودا کی اس درخواست پر توجہ نہیں کی اور سودا کو مجبوراً اراکینِ حکومت کی خوشامد کرنی پڑی۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر ایک اَن پڑھ شخص تھے، جنھیں جان برسٹو کی عنایت سے آصف الدولہ کی نیابت عطا ہوئی تھی۔[1] وہ کافی عرصے تک حکومت کے سیاہ وسفید کے مالک رہے۔ سودا نے ان کا بھی قصیدہ لکھا، جس میں انھوں نے اپنی مالی بدحالی کا ذکر شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

دیا ہے قوتِ اعضا نے دل کو میرے جواب
سبب ضعیفی کے طاقت ہوئی ہے میری طاق
سپہ گری میں تو گزرا شباب کا عالم
نہیں وہ عمر کہ اب آؤں میں بکار سیاق
جو باندھوں اس پہ کمر اب تو بندھے اس طرح (؟)[2]

---

[1] نجم الغنی، تاریخ اودھ، ۳، ص ۱۳۰۔
[2] یہ مصرع غالباً اس طرح ہوگا: جو باندھوں اس پہ کمر اب تو اس طرح باندھوں

کہ جوں کماں کا قبضہ بندھے مقابل فاق
جو دست و پا میں نہ اس کے رہی ذرا طاقت
لیا میں فنِ سخن کھول کر کمر سے یراق
سو اب میں تیغِ زباں سے لڑوں ہوں بخت کے ساتھ
ہوں فتحیاب مدد کی جو ہووے تیری وفاق
سلامتی میں تو اپنے روا نہ رکھ مجھ پر
ذلیل و خوار نہ ہوں میں بہ چشمِ اہلِ نفاق
پھرا کروں میں لیے مشتِ استخواں اپنے
میانہ میں پئے عمال زیرِ کہنہ رواق
سو اب تو اس سے بھی نوبت گزر گئی ہے مگر
گلے میں کرتہ بپا کفش ہاتھ میں ہو چماق
سپرد تجکو ہے سر رشتہ سب کی حرمت کا
کیا ہے اتنی وہ مخلوق کا ہے جو خلاق
سو طالب اتنے میں حرمت کا اب نہیں جس سے
کروں معاش بسر اپنا میں بہ طمطراق
عوض میں دے مجھے اس نقدی کے تو ایسا گانوں
بسر ہو عمر مری جس سے زیرِ کہنہ رواق
نہ ایسا گانوں کہ جس سے بروے دستر خوان
ہزار طرح کی نعمت ہو نان و خشک رُقاق

نہ شکلِ نور علی خاں ہوں کھاکے میں فربہ
نہ سوکھ کر ہوں طرح میرزا رفیع کے قاق

ان اقتباسات کی روشنی میں یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دورِ آصف الدولہ میں ان کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی انھیں اپنی تنخواہ حاصل کرنے کے لیے آصف الدولہ اور ان کے ملازمین کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔

قیامِ اودھ کے دوران سوداؔ نے بعض لوگوں کی مدح میں قصائد یا قطعات لکھے اور مرزا فاخرمکیں کی ہجو میں ایک مثنوی کہی۔ ان تخلیقات کی پوری تفصیل ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اپنے مقالوں میں دی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

قصائد در مدحِ نواب شجاع الدولہ = ۶ (کلیاتِ سوداؔ حصہ ۱، ص ۱۷۰ تا ۱۸۴)

قطعات در مدحِ نواب شجاع الدولہ = ۷ (کلیاتِ سوداؔ، حصہ ۲، الہ آباد، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۲ تا ۱۶۹)

قصائد در مدحِ نواب آصف الدولہ = ۲ (کلیاتِ سودا، حصہ ۱، ص ۱۸۴ تا ۱۹۴)

قصائد در مدحِ رچرڈ جانسن اسسٹنٹ ریزیڈنٹ اودھ = ۲ (کلیاتِ سودا، نسخۂ رچرڈ جانسن بہ حوالہ ڈاکٹر خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا ص ۵۲۹ تا ۵۳۶)

قطعات در مدح آصف الدولہ = ۶ (کلیاتِ سودا، حصہ ۲، ص ۱۶۳ تا ۱۷۵)

قصائد در مدح سرفراز الدولہ حسن رضا خاں = ۲ (کلیاتِ سوداؔ، حصہ ۱، ص ۱۹۶ تا ۲۰۱)

مثنوی در ہجو مرزا فاخرمکیں = ۱ (بہ حوالہ ڈاکٹر خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، ص ۵۳۶ تا ۵۴۰)

قطعہ در مدح راجا ٹکیت رائے (زمانۂ تخلیق ۱۱۹۳ء) ۱ (کلیاتِ سوداؔ، حصہ ۲، ص ۱۷۴)

میزان = ۳۷

ان تین درجن سے زائد ادب پاروں کے علاوہ سوداؔ کی بعض ایسی اور منظومات کا بھی پتا چلتا ہے جو ان کے قیامِ اودھ کے دوران کہی گئی تھیں مثلاً:

مثنوی در تعریفِ شکار آصف الدولہ (کلیاتِ سودا، حصّہ ۱ ص ۲۶۵ تا ۲۶۶) میں کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے مثنوی عشق شیشہ گر بہ زرگر پسر کو بھی سودا کے قیامِ لکھنؤ ہی کی پیداوار قرار دیا ہے (اردو مثنوی شمالی ہند میں، ص ۱۸۶) ملحوظ رہے کہ یہ سودا کی طویل ترین مثنوی ہے۔

بقول ڈاکٹر کاظم علی خاں ''لکھنؤ میں سودا کے جن شاعروں سے معرکے ہوئے تھے، اُن میں فدوی، جعفری علی حسرت، بقا، میر زاہد اور مرزا فاخر مکیں کے نام شامل ہیں۔ لکھنؤ میں سودا کی کلیات کے کئی نسخے شائع ہوئے تھے، جن کی تفصیل ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اپنے مقالے میں دی ہے۔ ان ہی نسخوں میں ایک نسخۂ جانسن ہے جو برٹش لائبریری (لندن) میں موجود ہے۔ اس نسخے کا سودا کے مستند ترین کلیات میں شمار ہوتا ہے۔[1]

کاظم علی خاں صاحب نے لکھا ہے کہ یہ بتانا تقریباً ناممکن ہے کہ سودا لکھنؤ کے کس محلّے میں رہتے تھے۔ لیکن آصف الدولہ کے زمانے کے ایک قدیم محلّے جنگلی گنج میں ایک ایسی مسجد ہے جو کسی زمانے میں مرزا سودا کی مسجد کے نام سے موسوم تھی۔ مگر ۱۳۶۹ھ (۱۹۴۸-۱۹۴۹ء تک) میں اس مسجد کو شہید کر کے دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اب یہ مسجدِ رحمانی کے نام سے مشہور ہے۔

کاظم علی خاں صاحب نے سید آغا مہدی لکھنوی کی ''تاریخِ لکھنؤ (کراچی، ۱۹۷۶ء ص ص، ۲۷۵-۲۷۶) کا یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

''مولانا آغا مہدی نے مسجدِ مرزا سودا کے ذکر میں یہ بھی بتایا ہے کہ صحنِ مسجد میں داہنے ہاتھ کی طرف بہت پرانی عمارت کے آثار ہیں جو ممکن ہے کہ سودا کے رہنے کا مکان ہو''۔ مولانا آغا مہدی کا بیان ہے کہ

''مسجد میں کتابوں کی الماری پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر یہ عبارت درج تھی:

باب المسجد رحمانی و مدرسۂ رحمانیہ ۱۳۶۹ھ

سابق مسجد مرزا سودا

جنگلی گنج

امین آباد

---

[1] سودا، لکھنؤ میں، کاظم علی خاں، مشمولہ مرزا محمد رفیع سودا مرتبہ، پروفیسر نذیر احمد، نئی دہلی، ص ۲۱۹۔

کاظم صاحب کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سودا کی مسجد میں گنبد اور مینار نہ ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد اپنی نوعیت کے اعتبار سے مسجدِ خانہ رہی ہوگی اور سودا کا مکان اس مسجد سے متصل ہوگا۔

وفات

مصحفی کے ایک شاگرد میر بہادر علی واثق نے اپنی ایک تصنیف ''قصر اللطائف'' میں لکھا ہے کہ ''چوں کہ ان دنوں (آصف الدولہ کا) مزاج عہدِ صاحب زادگی سے ہزل کی طرف بہت راغب تھا اور کوئی بھی کلمہ خواہ ان کا ہو یا کسی دوسرے کا انھیں بہت خوش کرتا تھا اور وہ (بات کہنے والے کو) بے انتہا انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مرزا رفیع سودا نے نواب کے مسند نشین ہونے پر یہ مادۂ تاریخ کہا (.....نواب) (نواب سے پہلے ایک فحش لفظ ہے لیکن اس سے مسند نشینی کی تاریخ نہیں نکلتی) وہ جو مثل مشہور ہے کہ سلاطین و امرا کبھی سلام کرنے سے غصہ ہو جاتے ہیں اور کبھی دشمنی کرنے پر بھی خلعت سے نوازتے ہیں نواب ممدوح اس تاریخ کو سن کر برہم ہوگئے اور سودا کی بے عزتی کا حکم دیا۔ چناں چہ مشہور ہے کہ سودا اسی شرم و غیرت کی وجہ سے چند روز ہی میں جہانِ فانی سے سدھار گئے اور چوں کہ زیادہ آم کھانا ان کی موت کا بہانہ بن گیا تھا۔ اس لیے ایک شخص نے ہندی میں تاریخ وفات کہی۔

انبہ کھاتے کھاتے سودا کی جان نکلی

ایک عزیز نے اسی مضمون کو فارسی میں کہا ہے۔

آہ سودا انبہ خورد و مرد'' [1]

مولف نے نواب کی برہمی کا جو ذکر کیا ہے۔ وہ واقعہ خلافِ قیاس ہے کیوں کہ نواب ۱۱۸۸ھ میں مسند نشیں ہوئے تھے اور سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ سات سال کو ''چند روز'' نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے سودا کلیات میں بہت سے قصیدے آصف الدولہ کی مدح

---

[1] میر بہادر علی واثق کی یہ پوری عبارت نثار احمد فاروقی کے ایک مقالے ''میر بہادر علی واثق'' نقوش، اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۲۲۳ سے لی گئی ہے۔

میں ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ نواب کی مسند نشینی کے بعد بھی سودا کے نواب سے تعلقات بحال رہے۔ البتہ مولف نے جو تاریخ وفات پیش کی ہے۔ وہ درست معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس تاریخ سے ۱۱۹۵ھ نکلتا ہے اور یہی سال وفات ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا آم کھانے سے مرے۔

شاہ کمال الدین کمال نے سودا کی وفات کے واقعہ کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "میر چھجو[1] نامی ایک شخص تھے۔ مہوا ان کی چڑتھی اسی مسخرگی کی وجہ سے آصف الدولہ کی سرکار میں ممتاز تھے۔ ایک دن نواب نے مرزا رفیع سودا سے فرمائش کی کہ ایک غزل برزمین مہوا کہیں۔ سودا گھر آئے اور غزل مہوا کو اس طور سے کہا کہ مہوا کی جگہ لفظ" دوہی" بھی چسپاں ہوتا تھا۔[2] وہ غزل نواب کو بھجوادی۔ اس کے بعد سودا کی کمر میں درد شروع ہوا۔ قصہ کوتاہ دو تین گھڑی میں اسی درد میں انتقال فرماگئے۔[3]

چھمی نرائن شفیق نے سودا کی وفات پر جو قطعۂ تاریخ کہا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ رجب ۱۱۹۵ھ کو سودا کا انتقال ہوا۔ شفیق نے قطعہ کہا:

لکھنؤ بیچ میرزائے رفیع چوتھی رجب کی جان سیں گزرے
جب کہ...... گیاہوئی تاریخ ہائے سودا جہان سیں گزرے[4]

---

[1] غالباً یہ وہی مرزا چھجو ہیں جو نواب آصف الدولہ کے ماموں زاد بھائی اور نواب سالار جنگ کے لڑکے تھے نجم الغنی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ اودھ، ۳، ص ۱۲۲۔

[2] اس غزل کا مطلع ہے:

جگ میں تخم شراب ہے وہ ہی ہرزہ گوئی کا باب ہے دوہی

یہ غزل کلیات سودا میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کلیات میں یہ شعر زائد ہے:

بھونے کوئی جو اس کو گیہوں میں ان کی خاطر کباب ہے دوہی

کمال نے مقطع اس طرح نقل کیا ہے۔

میر چھجو جو گالی دیں سودا پاس اپنے جواب ہے مہوا

کلیات میں مہوا کی جگہ "دوہی" ہے۔

[3] مجمع الانتخاب، ورق ۴۶۵ ب۔ ۴۶۶ الف۔

[4] سودا ص ۷۶

لیکن شاہ محمد حمزہ لکھتے ہیں کہ سودا کا انتقال ماہ جمادی الثانی ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔[1] یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی بتائی ہوئی تاریخ وفات ٹھیک ہے۔[2] مبتلا لکھتے ہیں کہ حالتِ نزع میں سودا کی زبان سے یہ مطلع نکلا

آج سودا جہاں سے اٹھتا ہے
شور و غل ہر مکاں سے اٹھتا ہے[3]

حسین قلی خاں عاشق[4] اور علی لطف[5] نے لکھا ہے کہ سودا کو امام باڑہ امام باقر میں مدفون کیا گیا۔ علی لطف لکھتے ہیں کہ سودا کے لوحِ مزار پر فخر الدین ماہر کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

خلد کو جب حضرت سودا گئے
فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کر پائے عناد
شاعرانِ ہند کا سرور گیا

۱۱۹۵ھ

مصحفی لکھتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں ایک بزرگ کی ایما پر مجھے سودا کے مزار کی زیارت کا اتفاق ہوا۔ لوحِ قبر پر میر فخر الدین ماہر کا قطعۂ تاریخ دیکھا۔ چوں کہ اس تاریخ کا

۱۔ فص الکلمات (قلمی)، ورق ۲۱۷ ب

۲۔ حصن الحصین میں سنِ وفات ۱۱۹۶ھ دیا گیا ہے (بحوالہ دستور الفصاحت ص ۱۶) لیکن یہ درست نہیں۔ صاحب تذکرہ خوش معرکہ زیبا نے لکھا ہے کہ مرزا رفیع کو تخلص سودا ایک فقیر نے دیا تھا۔ اور یہ دعا دی تھی کہ تیری عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی۔ سودا سے اکہتر سال برآمد ہوتے ہیں۔ جب کہ ہمارے حساب سے سودا نے تقریباً ستتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

۳۔ غلام محی الدین مبتلا، طبقات سخن (مائکرو فلم)

۴۔ نشترِ عشق (قلمی) رامپور، ص ۶۶۶

۵۔ گلشنِ ہند، ص ۱۰۴

تعمیہ تاریخ گوئی کے قانون کے خلاف تھا، اس لیے اُسی روز تائیدِ فیضِ ربانی سے مولف کے خامۂ خیال سحرکار سے بےکم وکاست ایک قطعۂ تاریخ ٹپک پڑا۔

مرزا رفیع آنکہ ز اشعار ہندیش
ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان غلو
ناگہ چو در نوشت بساطِ حیات را
گردید مدفنش ز قضا خاکِ لکھنؤ
تاریخ رحلتش بدر آورد مصحفی
سودا کجا و آہ سخنِ دلفریب او[1]

۱۱۹۵ھ

سوداؔ کے شاگرد قیام الدین قائمؔ نے ان اشعار میں تاریخِ وفات کہی:

آہ! مرزا رفیع دنیا سے
جاکے جنت میں جب مقیم ہوا
دردِ فرقت سے اوس کے مثلِ قلم
اہلِ معنی کا دل دو نیم ہوا
سالِ تاریخ کی تھی مجھ کو تلاش
کیوں کہ بس حادثہ عظیم ہوا
اس میں پیرِ خرد نے از سرِ یاس
یہ کہا "اب سخن یتیم ہوا"[2]

۱۱۹۵ھ

۱؎ تذکرۂ ہندی، ص ۱۲۶
۲؎ فص الکلمات (قلمی)، ورق ۴۱۷ ب

عاشقی نے اس شعر کے دونوں مصرعوں سے سالِ وفات نکالا۔

مپرس از من کہ اردو حال چونست
نہ سوداؔ ماند نہ لطفِ سخنِ سوداؔ [1]

شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی نے تاریخ وفات کہی۔

گفتم سالِ وفاتش ناسخ
شاعرِ ہندوستان واویلا [2]
۱۱۹۵ھ

عبدالغفور نساخ نے گنج تواریخ میں سوداؔ کی تاریخ وفات اس شعر سے نکالی ہے۔

پئے ترحیل سوداؔ بے تردد
بگو نساخ سودا جوہر فضل [3]
۱۱۹۵ھ

ایک طویل عرصے تک سوداؔ کا مزار زمین میں اس طرح دبا رہا کہ اوپر کی سطح پر قبر کا نشان بھی باقی نہیں تھا۔ ۱۱ر فروری ۱۸۶۹ء کو جب اس جگہ کی کھدائی کی گئی تو ایک قبر کا تعویذ برآمد ہوا، جس پر سنگِ مرمر کی لوح نصب تھی۔ اس لوح پر یہ عبارت کندہ تھی:

۱؎ نشترِ عشق (قلمی)، رام پور، ص ۷۷۲

۲؎ مہدی علی خاں، تاریخ لطیف (قلمی) رام پور۔ بقول ناصر لکھنوی شیخ ناسخ مغفور نے اس کی یہ تاریخ کہی۔

مضمون تازہ جستن شعر لطیف گفتن — باخویش برد اپوا مرزا رفیع السودا
تاریخ رحلتِ او گفتم بہ ترتیبِ او — امروز مُرد اپوا مرزا رفیع السودا
۱۱۹۵ھ

تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی) لکھنو

۳؎ مولوی عبدالغفور نساخ، گنج تواریخ، لکھنؤ، ۱۸۷۵ء، ص ۲۵۔

تاریخ انتقال

سرورِ شاعرانِ ہند

میرزا محمد رفیع المتخلص بہ سودا

مصرعہ تاریخ: سودا کجاو آں سخنِ دلفریب او (مصحفی)

۱۱۹۵ھ

اس امام باڑے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کاظم علی خاں نے یہ بتایا ہے کہ آغا باقر کا یہ امام باڑہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ اس عزاخانے میں بہت سی مشہور شخصیتیں مدفون ہوئی تھیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے لکھنؤ کی بہت سی عمارتوں کے ساتھ اس امام باڑے کی عمارت کو بھی گرا دیا، جس کی وجہ سے یہاں کی قبریں ملبے میں دب گئیں۔ بعد میں جب امام باڑہ سرکاری قبضے سے واپس ملا تو کسی وجہ سے چار دیواری کے باہر ترکاری منڈی میں شامل ہو گیا۔ ۱۱ر فروری ۱۹۶۹ء کو جب وہاں کی زمین کھودی گئی تو سودا کی قبر باہر نکلی۔ برسوں کی مقدمے بازی کے بعد سودا کی قبر امام باڑے کی حدود میں شامل کی گئی۔ سودا کی قبر پر سیمنٹ کا نیا فرش بنایا گیا اور پرانی قبر پر سنگِ مرمر کی جو لوح لگی ہوئی تھی، وہ اس نئے فرش میں لگا دی گئی۔[1]

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "جب شاہ حاتم نے سودا کے انتقال کی خبر سنی تو بے اختیار ہو کر کہا:

"ہائے ہمارا پہلوانِ سخن مر گیا"

---

[1] کاظم علی خاں، ص ص ۲۲۲-۲۲۳۔

تنقید

اپنے منہ کے نہ کہا کن نے سخن کو گوہر
لعل سوداؔ ہی کو پر ہم نے اُگلتے دیکھا

ادبی پس منظر

سودا میدانِ ادب میں اُس وقت آئے ہیں جب شمالی ہند میں اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کو لگ بھگ نصف صدی گزر چکی تھی۔ شاعروں کی پوری ایک نسل یعنی خان آرزو اور اُن کے تلامذہ کا عہد تقریباً ختم ہو چکا تھا اور دوسری نسل کے شاعروں میں مرزا مظہر کے شاگرد آسمانِ ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ سودا کی زندگی کا اچھا خاصا حصّہ پہلی نسل کے اساتذۂ سخن کی صحبت میں گزرا۔ جہاں اُن کی ذہنی ساخت و پرداخت ہوئی۔ دورۂ ایہام گویان (خان آرزو اور ان کے تلامذہ) ختم ہوگیا اور بساطِ ادب پر نئے مہرے آئے۔ یہ نووارد ایہام گوئی کے خلاف تھے۔ فطری طور پر سودا نہ صرف اس نئی تحریک سے متاثر ہوئے بلکہ انھوں نے "سادہ گوئی" کو رواج اور فروغ دینے میں کسی سے کم حصّہ نہیں لیا۔ اس باب میں اُن ادبی عناصر اور تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جنھوں نے سودا کے ذہن و شخصیت اور شاعرانہ صلاحیتوں کو متاثر کیا تھا۔

فارسی کا عہدِ زوال اور اردو شاعری

ہندوستان میں فارسی شاعری کا زوال اورنگ زیب کے عہد میں شروع ہوا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ طویل عرصے تک دکن میں قیام اور مرہٹوں سے اورنگ زیب کی آویزش نے فنونِ لطیفہ کو درباری سرپرستی سے محروم رکھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اورنگ زیب کے عقائد نے بھی اسے فنونِ لطیفہ کی پرورش سے باز رکھا۔[۱] لیکن فی الواقع یہ

---

۱ خافی خان نے منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے گیارہویں سال میں دربار میں موسیقی بالکل بند کردی اور صرف "نوبت" باقی رہ گئی۔ تمام موسیقار جن کو دربار میں بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا بے روزگار ہوگئے۔ چناں چہ ایک جمعہ کو تقریباً بہت سے موسیقار روتے پیٹتے ایک جنازہ لیے جارہے تھے۔ اورنگ زیب نے اس ماتم اور گریہ وزاری کی وجہ معلوم کرائی۔ انھوں نے جواب دیا۔ اورنگ زیب کے احکامات کی وجہ سے موسیقی کا انتقال ہوگیا ہے اور اسے قبر میں دفن کرنے جارہے ہیں۔ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ان سے کہو کہ "چناں بہ خاک بسپارند کہ باز صدا و ندا از و برنیاید"۔ (منتخب اللباب، ۲، ص ص ۲۱۲-۲۱۳)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ عالم گیر نامہ۔ ص ص ۳۵۴-۳۹۱ - محمد ساقی مستعد خاں مآثر عالم گیری، مرتبہ آغا احمد علی، کلکتہ، ۱۸۷۱ء، ص ص ۸۱-۸۵

دونوں ہی اسباب تھے جنھوں نے اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں شعروشاعری، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو افسردہ رکھا۔ وہ شاعری میں بھی صرف ایسے اشعار کو پسند کرتا تھا جن میں معارف وحکم کے مضامین باندھے گئے ہوں یا جن میں کوئی اچھا اخلاقی نکتہ ہو۔ اس پر اس کے رقعات گواہ ہیں جن میں اس نے اپنے ہی اشعار لکھے ہیں۔ مغل بادشاہوں کی فارسی نوازی نے ہندوستان میں کئی عظیم شاعر، ادیب اور انشا پرداز پیدا کیے تھے بلکہ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی اور ادب نوازی میں مغل دربار کا یہ حال تھا کہ ولایت زادے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اور صفوی دربار چھوڑ کر ہندوستان آتے تھے۔

جاگیرداری دور میں سماجی عزت حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ دربار میں رسائی تھا۔ ہر دور کے کچھ مروج علوم ہوتے ہیں جنھیں علومِ حاضرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغل دربار کی شان وشوکت کا جب شباب تھا تو علومِ معقول ومنقول کی تکمیل کرنا ہی علم وفضل کا آخری درجہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جہاں منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس اور طب وغیرہ کی دید ودانش ضروری تھی وہیں سخن فہمی اور سخن سنجی بھی شرفاء کے محبوب مشاغل تھے۔

چوں کہ دہلی کی مقامی زبان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ دربار کے تکلفات وآدابِ گفتگو کے بوجھ کی متحمل ہوسکتی اس لیے اہلِ قلم جو عام طور پر دربار میں رسائی چاہتے تھے فارسی کا سہارا لیتے اور شاید یہی ہندوستان میں فارسی کی مقبولیت کا سبب ہے۔ اس طرح فارسی اردو کے راستے میں ایک بہت بڑا پتھر بن گئی۔ اس کی مقبولیت اردو کو ادبی حیثیت حاصل کرنے نہیں دیتی تھی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت کی شکست وریخت شروع ہوگئی۔ مغل بادشاہ زوال کے طوفان میں گھر گئے۔ انھیں مصائب وآلام سے نظریں چرانے کے واسطے نظیری اور عرفی کی نہیں، گویوں اور رقاصوں کی ضرورت تھی۔ حزیں جیسا عظیم المرتبت شاعر ہندوستان آیا اور مغل دربار اس کی قدرومنزلت سے قاصر رہا۔ خانِ آرزو جیسا شاعر اور عالم جسے امام المتاخرین کہا جاتا ہے مغل دربار سے کوئی فیض نہ حاصل کرسکا۔ مغل دربار کے اس رویے سے فارسی کا زوال شروع ہوا۔ لیکن اس زوال نے اردو کے لیے فضا کو

سازگار بنا دیا، انسان میں فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ مادری زبان میں اپنے جذبات کا اظہار اور احساسات کی ترجمانی کرے۔ اقتصادی ضرورتیں اور تمنائے جاہ ومنصب اس فطری خواہش کو دبائے ہوئے تھیں لیکن اب اہل علم دربار سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ انھیں دربار سے ''ستائش کی تمنا تھی اور نہ'' صلے کی پروا'' اس لیے یہ حضرات اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔

ایک اہم بات یہ تھی کہ عوام فارسی سے ناآشنا تھے۔ انھیں شعروشاعری سے محروم رہنا پڑتا تھا۔ شاعر اپنی قوم، وطن، مذہب اور فرقے کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ دربار نے ان کے جذبات کے ترجمان چھین رکھے تھے۔ اب شاعر اپنے حقیقی سامعین یعنی عوام کی طرف متوجہ ہوئے اور اب انھیں پسند کرنے اور داد دینے والا ایک محدود طبقہ نہیں بلکہ پورا شہر اور پھر شمالی ہند سے جنوبی ہند تک ہندوستان کا ایک بہت بڑا حصہ تھا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ فارسی زبان کے سلسلے میں ہند ایرانی نزاع اردو شاعری کی مقبولیت کا سبب بنا۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانی شعرا فارسی میں اپنی پوری زندگی صرف کردیتے تھے لیکن ایرانیوں کے معیار تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔'' استعمال ہند'' پر ہمیشہ اہل ایران کو اعتراض رہا۔ آج بھی ہندوستانی شعرا کی فارسی شاعری اہل ایران کی نظر میں سبک ہندی[1] کہلاتی ہے۔ حالاں کہ یہ بات کتنی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز تک کسی ایرانی نے فارسی میں تحقیق کی کوشش نہیں کی، نہ کوئی مستند لغت تیار کی۔ اس کی بہ نسبت فارسی کی بہترین لغات اور قواعد سے متعلق کتابیں ہندوستان میں مدون ہوئیں جن میں 'مصطلحات'، 'غیاث اللغات' اور 'بہار عجم' تک کتنے نام آجاتے ہیں۔ اس پر بھی مستزاد یہ ہے کہ ہندوستان میں فارسی کی بہترین لغات اور

---

[1] اس سبک ہندی کی خصوصیات یہ ہیں:

''دقتِ مضامین۔ دقتِ معانی۔ پیچیدگی خیال۔ باریک اندیشی۔ نازک کاری مشکل پسندی۔ نکتہ آفرینی۔ دور دراز تشبیہات واستعارات کا کثرت سے استعمال۔ صحت وزبان کو قربان کرکے نئے مضامین وجدید مطالب کی بندش۔ تصنع اور تکلف میں افراط استحکامِ زبان وافکار کی طرف سے بے پروائی''۔

سید حسن، ایرانِ امروز میں غالب شناسی، اردوے معلی، غالب نمبر، دہلی، ۱۹۶۰، ص ۶۹۔

عروض و معانی کی کتابیں بیشتر اس زمانے میں لکھی گئیں۔ جسے ہم فارسی کے زوال کا زمانہ کہہ کر تعبیر کرتے ہیں۔

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایرانیوں میں ہمیشہ لسانی تعصب رہا ہے۔ انھوں نے کبھی ہندوستانیوں کی فارسی شاعری کو نہیں سراہا۔ نہ کبھی زبان و قواعد کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

ممکن ہے ایران کا ذی علم طبقہ ہندوستانیوں کی ان خدمات کو جو انھوں نے فارسی زبان و ادب کے لیے انجام دیں، نظرِ تحسین سے نہ دیکھتا ہو لیکن ہندوستان میں کبھی ایسا تھا اور نہ ہے۔

بقول ڈاکٹر منوہر سہائے انور:

> "یہ درست ہے کہ ہندوستانی سخن طراز در و بست الفاظ، اسلوب بیان اور پروازِ خیال میں ایرانی شعرا کی تقلید کو سرمایہ افتخار سمجھتے تھے مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ ایرانیوں سے غلطی سرزد نہ ہونا ان کا جزوِ ایمان تھا۔ عہدِ عالم گیری تک جو اعتراضات ہوئے وہ ایرانی شعرا کے جستہ جستہ اشعار کی حدود سے آگے نہیں بڑھے یعنی یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی ہندوستانی صاحبِ قلم نے کسی جلیل القدر ایرانی شاعر کے کل کلام کو موردِ اعتراض بنانا چاہا ہو"۔[۱]

عہدِ محمد شاہی میں جب خانِ آرزو نے حزیں کے دیوانِ چہارم کے چارسو اشعار کو غلط ٹھہرایا تو خان آرزو کا ساتھ دینے والے اہلِ قلم کی ایک محدود تعداد تھی بلکہ بعض ہندوستانیوں نے تو خان آرزو پر تنقید کی بوچھار کردی۔ مطلع السعدین میں وارستہ مل نے حزیں کی موافقت میں آرزو پر اعتراضات کیے ہیں۔[۲] ۱۲۶۷ھ میں امام بخش صہبائی

---

۱ معارضہ حزیں و آرزو۔ منوہر سہائے انور۔ معاصر، حصہ اوّل، ص ۳۰۔

۲ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وارستہ مل سیالکوٹی نے خانِ آرزو کی تحقیق پر سوجگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ وہ جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے"۔

خط بنام سرور، خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر، ۲، ص ۲۳۹۔

جب ''قولِ فیصل'' پر تبصرہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزیں کی ایرانیت سے مرعوب ہیں۔ حاکم نے آرزو کے بیشتر اعتراضات کو غلط ثابت کیا ہے۔ علی لطف بھی حزیں کا ساتھ دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے (مخزن میں) حزیں پر مضمون لکھا تو آرزو کے بہت سے اعتراضات رد کیے۔[1]

ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو آرزو کے ہم نوا رہے ہیں۔ گویا ہندوستان کے فارسی شعرا اہلِ علم ایرانیوں سے ہمیشہ مرعوب رہے اور ان کو صاحبِ زبان تسلیم کر کے بطور سند پیش کرتے رہے۔ غالب کو قتیل پر یہ اعتراض تھا کہ وہ ہندی نژاد اہل زبان نہیں تھا۔ غالب اپنے ایک اور ترک نسل سے ہونے کے ناطے اور اپنے استاد عبدالصمد کے ذریعے اپنا شمار اہلِ زبان میں کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کے اجداد کو سرزمینِ ہندوستان میں آباد ہوئے ایک صدی گزر چکی تھی اور ملا عبدالصمد کا دنیا میں جسمانی وجود ہونا آج تک ایک دل چسپ مبحث بنا ہوا ہے۔[2]

غالب ہندوستانی شعرا میں خسرو کے علاوہ کسی کو مستند شاعر نہیں مانتے۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحب عالم کو لکھتے ہیں:

> ''میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں''۔[3]

ایک اور مشکل یہ ہے کہ اگر فارسی دشمنی کو اردو کی مقبولیت کا سبب تسلیم کر لیا جائے تو دکن میں اردو کی مقبولیت کا کیا جواز پیش کیا جائے گا۔ دکن میں شمالی ہند سے بہت پہلے دکنی

---

[1] حزیں اور آرزو کے اس معارضہ کے متعلق تمام معلومات معرکۂ قتیل و غالب۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سے لی گئیں (احوال غالب۔ ص ص ۱۹۸-۱۹۹)

[2] قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ عبدالصمد کا خارجی وجود ثابت نہیں۔ یہ غالب کے ذہن کی اختراع تھی۔ ملاحظہ ہو۔ ہرمزدِ ثم عبدالصمد۔ احوال غالب ص ص ۲۳۴-۲۶۵۔ اس مقالے کا جواب مالک رام نے نوائے ادب (جنوری ۵۲ء) میں دیا ہے۔ جس میں عبدالصمد کا خارجی وجود ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

[3] خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، بار دوم، ص ۴۰۰۔

شاعری کا عام رواج ہو گیا تھا اور ہند اور ایرانی نزاع پہلی بار کھل کر خان آرزو اور حزیں کے ہاتھوں سامنے آئی۔

ہمارے خیال سے دکن میں اس کی وجہ ہند ایرانی نزاع کے بجائے بادشاہوں اور صوفیاء کی سرپرستی ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں میں اکثر نے خود بھی مقامی زبان میں شاعری کی اور ایسے دوسرے شعرا کی بھی سرپرستی کی جو مقامی زبان میں اظہارِ خیال کرتے رہے۔

کلیاتِ سودا میں ایک قطعہ ہے جس میں سودا نے ایک فارسی داں کا قول نقل کیا ہے۔ کسی فارسی داں نے اور ہمارے خیال سے خان آرزو نے سودا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ فارسی میں شعر کہنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اہلِ ہند کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے ہند نژاد اپنی پوری کوششوں کے باوجود سعدی اور حزیں نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان میں صرف خسرو، فیضی، آرزو اور فقیر جیسے چند فارسی گو شاعر گزرے ہیں۔ جنھوں نے خود کو مضحکہ سے باز رکھا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان اپنی مادری زبان میں طبع آزمائی کرے۔ اصل چیز فارسی یا اردو زبان نہیں بلکہ ''خوبیٔ مضامین'' ہے۔ جن کا بیان کرنا اہلِ ہند کے لیے اردو میں آسان ہے۔ یہ پورا قطعہ ''مرزا کی ریختہ گوئی کی ابتدا'' کے تحت نقل کیا جاچکا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ فارسی داں کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ فارسی دشمنی کی ترغیب دے رہا ہے۔ اسے فارسی سے محبت ہے۔ ایرانی شاعروں میں وہ سعدی اور حزیں کا احترام کرتا ہے۔ ہند نژاد فارسی شاعروں میں بھی کچھ کی عظمت کا قائل ہے اور وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ غیر ملکی زبان سے بہتر مادری زبان ہے اور خواہ مخواہ اپنا مذاق اڑوانا اچھا نہیں۔

اس لیے آخر میں کہنا پڑے گا کہ اردو کی مقبولیت میں فارسی دشمنی کو دخل نہیں تھا۔ یہ وقت کی آواز اور تاریخی ضرورت تھی۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز

سودا کی ریختہ گوئی یا فنِ ریختہ کی تربیت و تکمیل اور تعمیر و ترویج میں ان کے حصے کا منصفانہ جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو شاعری کے تاریخی ارتقا کو اور اس عہد کے لسانی پس منظر کو سامنے رکھیں۔ اس سلسلے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگرچہ شمالی ہندوستان میں ریختہ کا باقاعدہ آغاز دیوان ولی کے دہلی آنے پر ہوا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہلے یہاں ریختہ گوئی غیر معروف اور اجنبی رہی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ عہدِ محمد شاہی تک فارسی ہی شرفا کی زبان تھی اور اس میں تمام علوم و معارف کے گنجینے پوشیدہ تھے اور فارسی کے بُرے یا بھلے جیسے شاعر تھے ان کا مرکز شمالی ہند ہی بنا ہوا تھا اور اس دورِ زوال میں بھی وہ اپنی فارسی شاعری کی آبرو بنائے اور اس کی بات رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن اس متاعِ ہنر کی قیمت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ادبی حیثیت سے اہل ایران کے آگے ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی۔ مالی حیثیت سے وہ زبوں و خوار تھے کیوں کہ دربار نے ان کی سرپرستی کرنی چھوڑ دی تھی۔ عہدِ عالمگیری میں ولی دہلی آئے[۱] اور ان کی وفات (۱۱۱۹ھ) کے بعد ان کا دیوان دہلی پہنچا تو اس نے گویا ایک تاریخی ضرورت کی تکمیل کر دی اور وہ تکلف دور ہو گیا جو اب تک اردو شاعری کے امکانات سے برتا جا رہا تھا۔ اب ریختہ گوئی کا فن بے اعتبار نہیں رہا اور پچاس برس کے اندر ایک ایسا ذہنی ماحول پیدا ہو گیا کہ ریختہ میں شاعری کرنے والے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں رہے۔ مصحفی نے عقدِ ثریا کے دیباچے میں لکھا ہے:

"ہمین شعر ریختہ کہ در زمانۂ ما بہ سببِ فصاحت و بلاغتِ ایشان

---

۱ میر نے نکات الشعرا میں ولی کے بارے میں لکھا ہے:

"میگویند کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود بخدمت میاں گلشن صاحب رفت۔
واز اشعار خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمود۔ ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار
افتادہ اند، در ریختۂ خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔

(نکات الشعراء، ص ص ۸۹-۹۰)

زبان از فارسی در پلّہ کم ہم نیست"۔[1]

اور اپنے اشعار میں بھی جابجا اس کا اظہار و اعتراف کیا ہے:

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی

~~~~~~

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج

اور اس میں شک نہیں کہ شعرا میں ذہنی تبدیلی اگر کچھ لوگوں کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ سمجھی جائے تو سودا بھی ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے ریختہ کو مقبول بنانے میں اور ریختہ گوئی کی طرف سے احساسِ کمتری دور کرنے میں نمایاں حصّہ لیا۔

اس باب میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شمالی ہندوستان میں ریختہ کے نمونے تیرھویں صدی عیسوی سے ملتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ ریختہ گوئی کا زمانۂ آغاز اور اس کا ایک ادبی و شعری تحریک کی شکل میں اٹھان ولی کے دیوان ریختہ کے آنے پر ہوا۔ ولی ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے تھے۔ لیکن ہمیں تیرھویں صدی عیسوی سے مقامی زبان میں اشعار ملنے لگتے ہیں جن کی تخلیق صوفیاے کرام کی مرہونِ منت ہے۔ ان میں حضرت بابا فرید گنج شکر، حضرت گیسو دراز اور سعدی کاکوروی کے اکثر اشعار تذکروں میں نقل ہوئے ہیں۔ میر حسن نے عہدِ جہانگیر کے ایک شاعر خاکی کا ذکر کیا ہے۔[2]

---

[1] مصحفی ان کی آمد کے بارے میں قائم نے لکھا ہے۔
"ولی.......... در سن چہل و چہار از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ ابو المعانی نام سید پسرے کہ دلش فریفتہ او بود بہ جہاں آباد آمد"۔
(مخزن نکات، ص ۱۰)

ثریا ص ۲۔

[2] تذکرۂ میر حسن، ص ۱۷۶۔
~~~~~~

یقیناً اس زمانے میں اور لوگوں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی کی ہوگی مگر ان کا کلام دست بردِ زمانہ کی نذر ہوگیا۔ امیر خسرو کی چند غزلیں اور دوسری اصناف کے اشعار ملتے ہیں، جن میں فارسی اور اردو کی آمیزش ہے۔ لیکن ان میں بہت سے اشعار الحاقی ثابت ہوئے ہیں اور انھیں قدیم تر سند کے بغیر امیر خسرو کی تصنیف قبول نہیں کیا جاسکتا۔ غزل جس کا مطلع یہ ہے، چندر بھان برہمن کے نام سے منسوب ہے۔

"خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے"[۱]

اس غزل کی زبان سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ عہدِ شاہ جہاں کے چندر بھان[۲] برہمن کی نہیں ہوسکتی۔ اس کا مصنف کوئی بھی ہو۔ قوی امکان ہے کہ اس کی تصنیف ولی کی آمد سے قبل ہوئی ہوگی۔ چند ایسے شاعروں کے نام بھی مل جاتے ہیں جو صرف ہزلیات کے شاعر

---

۱ علامہ کیفی نے "کیفیہ" میں پوری غزل نقل کی ہے۔ باقی اشعار یہ ہیں:

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے ناؤں عاشق کوں قتل یا عجب دیکھے ہوں؟
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
خوباں کی باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاسین
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

برج موہن دِتاتریہ کیفی، کیفیہ، دہلی، ۱۹۴۲ء۔

۲ چندر بھان برہمن کے آباء واجداد کشمیر سے آگرہ آئے تھے۔ برہمن کے والد پنڈت دھرم داس سنسکرت اور فارسی دونوں کے ماہر تھے۔ برہمن ۹۸۲ھ میں آگرے یا لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پاکر شاہجہاں کے دفتر میں خاص منشی ہوئے اور پھر داراشکوہ نے اپنا میر منشی مقرر کردیا۔ داراشکوہ کو ان سے بہت محبت تھی۔ اس کے قتل کے بعد برہمن تارک الدنیا ہوگئے اور بنارس چلے گئے۔ وہیں ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان فارسی اور منشات برہمن ان سے یادگار ہیں۔ (پنڈت برج کشن کول بے خبر وغیرہ، بہارِ گلشنِ کشمیر، ۱، الٰہ آباد ۱۹۳۱ء، ص ص ۱۱۲–۱۳۰) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ چند بھان لاہوری۔ مرزا سلطان احمد، زمانہ (کانپور) مئی و جون ۱۹۲۱ء

ہیں اور ریختہ محض تفننِ طبع کے لیے کہتے تھے۔ جعفر زٹلی[۱] ۔ میر عبدالجلیل اٹل[۲] اور محمد عطاء اللہ[۳] وغیرہ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے۔

میرؔ نے ریختہ گوئی کی مختلف قسمیں بتائی ہیں۔

۱- اوّل آں کہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔

۲- دوم آں کہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی۔

۳- سوم آں کہ حرف و فعل پارسی بہ کاری برند۔[۴]

ولیؔ کی آمد سے قبل کچھ کے علاوہ ہزال اور دوسرے شعرا ان اقسام میں شعر کہتے تھے لیکن

۱؎ "میر جعفر..... جعفر تخلص لقب زٹلی۔ ساکن شاہجہاں آباد..... استعداد درست داشت دریں فن کامل وقت خود گردید۔ ہمہ نجیب و شریف از و ملاحظہ میکردند و خدمت می نمودند..... می گویند کہ روزے بعد انتقال نواب ذوالفقار خاں بہادر ایں شعر فرمودہ۔

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر بادشاہ پے تسمہ کش فرخ سیر

ازیں خبر مزاج بادشاہ برہم گشت۔ ایشان را بہ جنت فرستاد"۔

دو تذکرے (شورش) ص ۱۶۱-۱۶۳

۲؎ "اٹل تخلص میر عبدالجلیل مرحوم است۔ وے از ساداتِ زیدیہ بلگرامی الاصل از اولاد امجاد سید ابوالفرح واسطی بود۔ در شعر عربی و فارسی کہ بسبب رتبہ فضیلت بسیار با متانت شگفتگی می گفت و بیشتر قصائد دریں ہر دو لسان از و یادگار است۔ اسطی تخلص می کرد..... و ضعش با نکہائے حضرت دہلی....."۔

(مجموعہ نغز۔ جلد اول، ص ۴۲)

۳؎ "خواجہ عطا اللہ عطا تخلص۔ شخصے در عہد عالمگیر بود۔ او باش وضع موافق طور خود شعر بلند می گفت ہندی و فارسی ہر دو....."

(تذکرہ میر حسن، ص ۱۰۶)

قاضی صاحب نے تذکرہ ہمیشہ بہار کے حوالے سے ان کا سنِ وفات ۱۱۳۵ھ لکھا ہے۔

(معاصر۔ حصہ ۱۵، ص ۲۳)

۴؎ نکات الشعرا، ص ۱۷۹

ولی کے دہلی آنے کے بعد ایک مصرع تو کجا فارسی کے حرف وفعل بھی لانا معیوب سمجھا جانے لگا۔

آبرو لکھتے ہیں:

جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل وحرف
لغو ہیں افعال اس کے ریختے میں حرف ہے

شمالی ہند والوں کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اردو میں بھی سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا جاسکتا ہے۔ ولی کا جو کلام دہلی میں آیا تھا وہ پونے تین صدی کی ذہنی کاوش کی خراد پر اترا ہوا تھا یعنی دکنی میں سنہ ۸۲۵ھ سے قبل شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز[۱] سے لے کر محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، ابن نشاطی اور پھر ولی تک دکنی شاعروں کو تقریباً پونے تین صدیاں گزر چکی تھیں۔ دکنی میں تصوف، مذہب، فلسفۂ حیات وممات، حسن وعشق، عام زندگی کے واقعات غرض ہر طرح کے مضامین کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ ولی جس دکنی کو لے کر آئے تھے وہ دکنی عناصر زیادہ ہونے کے باوجود بھی منجھی ہوئی، صاف اور سادہ زبان تھی۔ اس میں دکنی محاورے اور الفاظ ضرور تھے۔ مگر وہ شمالی ہند والوں کی زبان سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کا کلام سنتے ہی پہلی بار دہلی والوں کو یہ احساس ہوا کہ اردو شاعری کو بھی ادبی حیثیت دی جاسکتی ہے۔

ریختہ گوئی کا باقاعدہ آغاز کب ہوا۔ اس کے لیے کسی سن کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ مصحفی نے حاتم کے ترجمے میں لکھا ہے:

"روزے پیشِ فقیر نقل می کرد کہ در سنِ دوم فردوس آرام گاہ دیوانِ ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ واشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ۔ با دوسہ کس کہ مراد از ناجی ومضمون وآبرو باشد۔ بنائے شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ......"[۲]

---

[۱] نصیر الدین ہاشمی نے حضرت گیسو دراز کو دکن کا پہلا دکنی شاعر تسلیم کیا ہے۔ دکن میں اردو، ص ۲۱۔
[۲] تذکرۂ ہندی، ص ۸۰۔

مصحفی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز فردوس آرام گاہ (۱۱۳۲-۱۱۴۳ھ) میں ہوا لیکن جیسا کہ ہم پہلے بحث کر آئے ہیں اردو شاعری کا آغاز اس زمانے سے بہت قبل ہو چکا تھا۔ بقول قاضی عبدالودود:

> ''تذکرہ ہندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ ریختہ گوئی کی ابتدا عہد [2] فردوس آرام گاہ ہجری میں ہوئی۔ مصحفی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حاتم کے قول کے مطابق دیوانِ ولی کے دہلی آنے کے بعد انھوں نے ناجی وغیرہ کے ساتھ اردو میں ایہام گوئی کی بنیاد رکھی...... میرا خیال ہے کہ حاتم نے مصحفی سے جو کچھ کہا تھا اس سے یہ مقصود نہ تھا کہ کسی زمانے کا تعین کی جائے ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ وہ آبرو وغیرہ کے ساتھ دہلی میں ریختہ گوئی کے بانیوں میں محسوب کیے جائیں'' [1]

مرزا مظہر کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے:

ہمارے ساتھ سے یہ دل بھی بھاگا لیکے جاں اپنا

ہم اس کو جانتے تھے دوست اپنا مہرباں اپنا

حاتم نے بھی اس زمین میں غزل کہی ہے جو دیوان زادہ قلمی نسخہ رام پور میں موجود ہے۔ حاتم نے عنوان میں لکھا ہے کہ غزل مرزا مظہر کی زمین میں ۱۱۳۰ھ میں کہی گئی۔ گویا مرزا نے یہ غزل ۱۱۳۰ھ سے بھی پہلے کہی تھی اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک ولی کا دیوان دہلی نہیں آیا تھا۔ حاتم نے مضمون کی زمین میں یہ غزل

ع۔ تاریک گھر ہمارا آکر کرے اجالا [2]

---

[1] عیارستان، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۵۷، ص ۱

میر نے بھی حاتم کے بارے میں طنزاً لکھا ہے ''می گوید من با میاں آبرو ہم طرح بودم''۔ (نکات الشعرا، ص ۷۵) اگر یہ طنز نہ ہوتا تو میر حاتم کا قول نقل کرنے کی بجائے خود ہی لکھتے کہ حاتم۔ آبرو کے ہم طرح رہے ہیں۔

[2] سرگزشت حاتم، ص ۱۱۰۔

۱۱۳۱ھ میں کہی تھی۔ حاتم کی ایک اور غزل ہے:

ع۔ تاباں ہے اس نگہ سے مرے دل میں نور آج

یہ غزل بھی ولی کی زمین میں ۱۱۳۱ھ میں کہی گئی تھی۔[۱] قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

"دیوان زادہ کے نسخۂ لندن میں جس کی نقل حال میں ڈاکٹر شادانی نے مجھے دکھائی ہے۔ ۱۱۲۹ھ میں کہی ہوئی دو غزلیں ہیں جن میں سے ایک ولی اور دوسری مضمون کی زمین میں ہے"۔[۱]

عبدالقادر بیدل کے بارے میں قیام الدین قائم لکھتے ہیں:

"بالجملہ بیمن تفول زبان ایشان سخن این بابا چنان حسنِ قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ۔ و ریختہ راقسمے بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آن وقت زراہ ہوش شعرِ ریختہ موزوں می نمودند۔ چنان چہ قدوۃ السالکین و زبدۃ الفاضلین مرزا عبدالقادر بیدل رضی اللہ عنہ نیز درین زبان غزلے گفتہ"۔[۲]

بیدل کا انتقال ۱۱۳۳ھ میں ہو گیا تھا۔[۳] ظاہر ہے کہ یہ غزل اس سے قبل کہی گئی ہوگی۔ ۱۱۲۷ھ میں فائز دہلوی نے اپنا کلیات مرتب کر لیا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس کلیات میں دیوانِ اردو بھی شامل تھا تو غالباً شمالی ہندوستان میں نواب صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو میں دیوان مرتب کیا اور ۱۱۴۲ھ میں نظر ثانی کی۔[۴]

ان تمام شواہد سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی میں دیوانِ ولی کی آمد سے قبل ان کا

۱۔ عیارستان، ص ۱۱۰

۲۔ مخزن نکات، ص ۱۰

۳۔ صدیق حسن خاں، شمع انجمن، بھوپال، ۱۲۹۳ھ، ص ۸۳۔

۴۔ مسعود حسن رضوی ادیب، فائز دہلوی اور اس کا دیوان، دہلی، ۱۹۴۶، ص ۲۶۔

کچھ کلام پہنچ چکا تھا جسے بہت زیادہ مقبولیت ہوئی اور جسے دیکھ کر شمالی ہند والوں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

اردو شاعری کے آغاز سے لے کر بہت بعد تک اچھی خاصی تعداد ان فارسی گو شعرا کی بھی ہے جنھوں نے ریختہ کی مقبولیت دیکھ کر منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اردو میں سخن طرازیاں کیں۔ مرزا عبدالقادر بیدل [۱]، مرزا معز فطرت موسوی [۲] خاں، شرف الدین علی خاں پیام [۳]، مرزا علی قلی ندیم [۴]، ٹیک چند بہار [۵]، میر محتشم علی خاں حشمت [۶]، آنندرام مخلص [۷]، قزلباش خاں امید [۸]، اسدیار خاں انسان [۹]، مرزا گرامی [۱۰]، میر شمس الدین فقیر [۱۱] اور مرزا مرتضیٰ قلی فراق [۱۲]، وغیرہ چند قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ ان میں فطرت کی طرح ایسے شاعر بھی ہیں جن کا ذکر بہت کم تذکروں میں ملتا ہے اور ان میں بھی ایک ہی شعر نقل کیا گیا ہے اور آنندرام مخلص ٹیک چند بہار جیسے شاعر بھی موجود ہیں جن کی کئی کئی غزلیں ملتی ہیں۔

۱۔ نکات الشعرا، ص ۲۔ مخزنِ نکات، ص ۱۰۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۲۵۔ مجموعہ نغز، ۱ ص ص ۱۱۵-۱۱۶

۲۔ نکات الشعرا، ص ۴۔ مخزنِ نکات، ص ۱۲

۳۔ نکات الشعرا، ص ۲۶۔ مخزنِ نکات، ص ص ۲۲-۲۳۔ تذکرہ ریختہ گویاں، ص ۲۶۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ص ۳۳-۳۴

۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۷۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۶۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۲۶۹۔

۵۔ نکات الشعرا، ص ص ۱۳۳-۱۳۴۔ مخزنِ نکات، ص ص ۲۵-۲۶۔ تذکرہ ریختہ گویاں، ص ص ۲۱-۲۴ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۲۶۔

۶۔ نکات الشعرا، ص ۳۷۔ گلشنِ گفتار، ص ص ۱۵-۱۸۔ مخزن نکات، ص ۲۷۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ص ۴۸-۴۹۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ص ۴۸-۴۹۔ تذکرہ ہندی، ص ۸۲۔

۷۔ مخزنِ نکات، ص ۲۷۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۳۵۔ مجموعہ نغز، ۲ ص ۱۷۶۔

۸۔ نکات الشعرا، ص ص ۷-۸۔ مخزنِ نکات ص ص ۳۰-۳۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۰۔

۹۔ نکات الشعرا، ص ص ۱۲۹-۱۳۰۔ مخزنِ نکات، ص ۳۱۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۷۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ص ۵-۶۔

۱۰۔ نکات الشعرا، ص ۸۔ مخزنِ نکات، ص ۳۲

۱۱۔ مخزنِ نکات، ص ص ۳۳-۳۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۱۴۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ص ۷۶-۷۷

۱۲۔ مخزنِ نکات، ص ۵۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۱۴۔

دو اور فارسی شاعر ہیں جن کا اردو شاعری پر بہت بڑا احسان ہے اور وہ ہیں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں۔ یہ دونوں بنیادی طور پر فارسی کے شاعر ہیں مگر انھوں نے اردو شاعروں کی پوری دو نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ شاعروں کی پہلی نسل میں اچھی تعداد ایسے شاعروں کی ہے جو خان آرزو کی شاگرد ہے یا ان کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتی ہے۔ خان آرزو اور ان کے تلامذہ کے عہد کو بعض تذکرہ نگاروں نے ''دورۂ ایہام گویاں'' کہا ہے کیوں کہ اس دور کے بیشتر شاعر ایہام گو ہیں۔ خود خان آرزو نے ریختہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ تاہم ریختہ میں ان کے جتنے بھی اشعار ملتے ہیں۔ ان سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھیں صنعتِ ایہام بہت مرغوب تھی۔ تلامذہ خان آرزو کی فہرست حسب ذیل ہے:

خان آرزو

تلامذہ خان آرزو

شرف الدین مضمون

تلامذہ مضمون

محمد عارف عارف۔ میر فضل علی دانا۔ سید حاتم علی خاں حاتم

نجم الدین عرف شاہ مبارک تخلص آبرو

تلامذہ آبرو

میر سجاد سجاد، عبدالوہاب یکرو، سید شمس الدین ثاقب، شاہ محسن فدوی، سبحان، شہید۔

غلام مصطفٰے خاں یکرنگ[1]

تلامذہ یکرنگ

دلاور خاں بیرنگ۔ محمد اسمٰعیل بیتاب

حسن علی شوق

شہاب الدین ثاقب

میر ناصر سامان

شمالی ہند میں جن شاعروں نے اردو شاعری کی ابتدا کی۔ ان میں شرف الدین مضمون اور شاہ مبارک آبرو جیسے استادانِ فن بھی تھے۔ اسی لیے قاسم نے خانِ آرزو کے بارے میں لکھا ہے۔ ''اگر شعراے ہندی زبان را عیالِ خانِ آرزو گویند می سزد''۔[2] محمد حسین آزاد نے خان آرزو کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ '' خان آرزو کو زبانِ اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے۔ تب تک اہلِ اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے''۔[3]

تلامذۂ آرزو میں مضمون اور آبرو تو ایہام گوئی کے موجد ہیں۔ یکرنگ اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی اچھا خاصا ایہام ملتا ہے۔

۱؎ یکرنگ کو بعض تذکرہ نگاروں نے مرزا مظہر کا شاگرد لکھا ہے۔ مصحفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''بقولے شاگردِ خان آرزو اور بقولے میاں آبرو از فحواے کلامش چنیں می تراود کہ شاگردِ مرزا مظہر خواہد بود''۔

(تذکرہ ہندی، ص ۲۷۸ب)

۲؎ مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۳۔

۳؎ آبِ حیات، ص ۱۲۱

اس دور میں خان آرزو اور ان کے تلامذہ کے علاوہ تین شاعر ایسے بھی ہیں جنھیں بجا طور پر "استادانِ فنِ ریختہ" کہا جا سکتا ہے اور جن کا خانِ آرزو یا ان کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان شعرا کے نام ہیں۔

فائز دہلوی (ان کے یہاں ایہام بہت کم ہے۔)

شاکر ناجی

شاہ حاتم (حاتم نے بعد میں ایہام گوئی ترک کر دی)

ان کے علاوہ اس عہد کے دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کے نام یہ ہیں۔ پیر خاں کمترین۔ احسن اللہ احسن۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق، مرزا امان بیگ رنگین۔ شاہ فتح محمد دل اکبرآبادی۔ موزوں۔ شاہ فضل علی فضلی وغیرہ۔ ان سب کے ہاں بھی ایہام ملتا ہے۔

ایہام گو شعرا کی اس فہرست کو مکمل تو نہیں کہا جا سکتا البتہ اس میں تمام اہم اور نمائندہ شاعر ضرور آ گئے ہیں۔[1]

اعتدال سے بڑھی ہوئی ایہام گوئی نے شعر کو واقعی مرتبۂ بلاغت سے گرا دیا تھا۔ قائم نے احسن اللہ احسن کے ترجمے میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ "تلاشِ لفظ تازہ و ایہام کرد، اما از غایتِ ہجومِ الفاظ معنی شعرش کمتر بہ نظر می آید"۔[2] ہر خوبی اعتدال سے بڑھ کر خرابی ہو جاتی ہے۔ شعرا مختلف المعنی اور پہلو دار الفاظ میں کھو کر رہ گئے۔ صنعت گری، شعبدہ بازی، آرائشگی، تصنع اور بناوٹ کا دوسرا نام شاعری ہو گیا۔ شاعر خیالات کی بجائے ان الفاظ کا پابند ہو گیا تھا جن سے ایہام کا لطف پیدا کیا جا سکتا تھا۔ ایہام کی اس بگڑی ہوئی روش نے ابتذال کو بھی راہ دی۔ الفاظ اور محاوروں کے ایہام سے فائدہ اٹھا کر فحاشیت پیدا کی گئی۔

---

۱ یہ فہرست مرتب کرنے میں اِن تذکروں سے مدد لی گئی ہے۔ نکات الشعراء، گلشن گفتار، تذکرہ ریختہ گویان، مخزنِ نکات، گلزار ابراہیم، تذکرہ شعرائے اردو، گلشنِ ہند، "مجموعۂ نغز"۔ دو تذکرے، گلشنِ بے خار۔

۲ مخزنِ نکات، ص ۲۲۔

اس سب کے باوجود ایہام گو شعرا کے تمام سرمایۂ شعری کو میر کی طرح ''بے رتبہ''[1] اور قائم کی طرح ''ستم''[2] کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شاعروں کی ایک پوری نسل کی ادبی خدمات کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا انھیں میں سے چند بزرگوں کی مرہونِ منت بھی ہے۔ یہ دور قدرِ اول کی شاعری کا دور نہیں تھا۔ ریختہ گو فارسی اور ہندی کے شاعروں کے ذہن سے سوچتے تھے۔ اسی لیے اس دور میں کوئی شاعر انفرادیت پیدا نہیں کرسکا اور نہ ہی کسی کا اپنا ''لب ولہجہ'' بن پایا۔

ان شاعروں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے مختلف زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر اردو کو مالا مال کیا۔ ابھی زبان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ہر خیال کو بے تکلف ادا کرتی۔ کجا کہ ایہام جیسی مشکل صنعت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکتی۔ اس لیے ہندی اور فارسی سے الفاظ، ترکیبیں اور محاورے وغیرہ مستعار لیے گئے۔ ہر لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ ان شعرا نے اس معنوی تنوع کو صنعتِ ایہام کے ذریعہ اُجاگر کیا۔ ترتیبِ الفاظ سے نئے نئے معنی پیدا کرکے زبان کی حدود کو وسیع کیا۔ ان شاعروں کا بنیادی کام مرصع سازی ہے۔ انھوں نے اچھے بُرے سب طرح کے نگینے جڑے ہیں۔ انھوں نے کسی ایسے لفظ کو جو اُن کا مفہوم ادا کرسکتا ہو، ٹکسال سے باہر نہیں سمجھا۔ الفاظ کا مزاج پہچاننا اور ترک وقبول کا عمل بعد میں شروع ہوا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب ایہام گو شعرا نے الفاظ کے انبار لگادیے تھے۔[3]

جب ایہام گوئی اعتدال سے بڑھی تو فطری طور پر اس کے خلاف ردِّ عمل ہونا تھا۔ مرزا

---

1. میر نے احسن کے بارے میں لکھا ہے: ''طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود، ازیں جہت شعرا ادبے رتبہ ماند''۔ نکات الشعرا، ص ۲۷

2. قائم لکھتے ہیں: ''این ستم کہ شاعرانِ ابتدائی زمانہ محمد شاہ باعتقاد خود تلاشِ الفاظِ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند تا بہ معنی چہ رسد، غرض ناگفتہ بہ''۔ مخزنِ نکات، ص ۱۴۔

3. علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی زیرِ طبع جلد دوم میں راقم الحروف نے ''دورۂ ایہام گویان'' پر بہت تفصیلی بحث کی ہے۔

مظہر جانجاناں فارسی کے شاعر تھے لیکن خان آرزو کی طرح انھوں نے بھی اردو شاعروں کی سرپرستی کی اور ان کی تربیت میں نمایاں حصّہ لیا بلکہ مرزا مظہر نے خان آرزو سے زیادہ اردو میں شعر کہے ہیں۔[1] مرزا نے شاعروں کی دوسری نسل کی ذہنی ساخت و پرداخت کی۔ جانجاناں وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے ایہام کے خلاف باقاعدہ آواز بلند کی اور ''سادہ گوئی'' کی بنیاد رکھی۔ دیوان زادہ حاتم میں مرزا مظہر کی جس زمین میں کہی ہوئی حاتم کی غزل ہے۔ وہ ۱۱۳۰ھ میں کہی گئی۔ مرزا مظہر کی غزل کا مطلع ہے۔[2]

ہمارے ساتھ سے یہ دل بھی بھاگا لے کے جاں اپنا
ہم اس کو جانتے تھے، دوست اپنا، مہرباں اپنا

اس پوری غزل کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا نے اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کے وقت ہی ایہام کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ مگر اس وقت ان کی آواز قبل از وقت تھی۔ وہ شعرا کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکے۔ کیوں کہ اس عہد میں خان آرزو اور ان کے شاگردوں، ساتھیوں اور بعض دوسرے ایہام گو شاعروں کا طوطی بول رہا تھا اور ایہام مقبولِ عوام تھا۔ لیکن عام روش کے خلاف مرزا طرزِ سادہ میں شعر کہتے تھے۔ یہ ان کی تنہا کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اتنے بڑے بڑے استادوں کی سرپرستی اور پسند عوام کی حمایت کے باوجود تیس برس کے عرصے میں نہ صرف یہ کہ شاعروں نے ایہام گوئی سے توبہ کرلی۔ بلکہ عوام کا مذاق بھی بدل گیا اور شعرا ایہام سے نفرت کرنے لگے۔ مرزا مظہر کی ریختہ گوئی کا زمانہ وہ ہے جب میر اور سودا کی ذہنی نشوونما بھی نہیں ہوئی تھی اور حاتم، مضمون، آبرو وغیرہ جیسے استادانِ فن کی شاعری شباب پر تھی۔ ان میں صرف حاتم ایسے شاعر ہیں جنھوں نے مرزا مظہر کی اصلاحات کا اثر قبول کیا اور اپنے کلیات میں سے ایہام میں کہے گئے اشعار

[1] عبدالرزاق قریشی نے ان کے ایک چوبیس اشعار (دو مختلف غزلوں کے) مرتب کیے ہیں۔ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، بمبئی، ۱۹۶۱، ص ص ۲۹۱—۳۶۰ مجھے ان اشعار کے علاوہ ۳۸ اشعار اور ملے ہیں جن پر الحاقی ہونے کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ملاحظہ ہو۔ خلیق انجم، مرزا مظہر جانجاناں، تحقیقی مقالہ، دہلی یونی ورسٹی لائبریری۔

[2] آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی دیوان زادہ کا قلمی نسخہ ہے۔ جس میں اس غزل پر ۱۱۳۵ھ لکھا ہوا ہے۔

کو نظر ثانی کر کے ایک انتخاب مرتب کیا، جس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔

یہ مرزا مظہر کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اردو شاعری ایہام کے خارزاروں سے نکل آئی۔ انھوں نے اُس ادب و شعر کے ایوانِ رفیع کی بنیاد گزاری کی جس کے ستون سودا، میر، درد اور قائم وغیرہ ہیں۔ انھوں نے اُس مکتب اور تحریک کا آغاز کیا جس کے شعائر و خصائص میں سوز و گداز، قلبی واردات، فکری عنصر، حسیاتی شاعری، وجدانی پرتو اور غزل کا دھیما لب و لہجہ تیار ہوا، جس نے بعد میں دبستان دہلی کی شکل اختیار کر لی اور جسے ہم دبستانِ لکھنؤ سے ممیّز کرتے ہیں۔

حیاتِ انسانی کے ارتقا کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے کاموں کا آغاز کسی فرد کی بظاہر نہایت معمولی اور ناقابلِ توجہ کوششوں سے ہوا۔ لیکن جب یہ نخلِ مراد برومند ہوگیا اور انسان نے اس کا سُراغ لگانا چاہا تو اس کی بنیاد گزاری میں کوئی بہت ہی خاموش سا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخ ادب اردو میں یہی معاملہ اردو غزل کی طرزِ سادہ کے بانی مرزا مظہر کے ساتھ ہوا۔

کوئی بھی اصلاحی کوشش ہو۔ ادب میں، اخلاق یا سماج میں۔ ایک دن میں بارور نہیں ہوا کرتی، نہ معاشرے کے رجحانات دن اور تاریخوں کے ساتھ بدلتے ہیں۔ یہ تعیّن کرنا تو بہت مشکل ہے کہ مرزا نے ایہام کی مخالفت کس سن میں شروع کی اور اس اصلاحی تحریک کا کب آغاز ہوا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مرزا اپنی طبعی نفاست پسندی اور سادہ مزاجی کی وجہ سے ابتدا ہی سے طرزِ سادہ اور گفتگوے شستہ و رفتہ کے شیدائی تھے اور انھیں یہ رمز معلوم تھا کہ شیریں اور اثر انگیز گفتگو وہی ہوتی ہے جو تکلف کی بناوٹوں سے عاری ہو۔ مرزا نے ۱۱۶۴ھ سے قبل ریختہ گوئی ترک کر دی تھی اور بقول خانِ آرزو اپنے تلامذہ کی تربیت کے لیے چند اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو ایہام کی مخالفت کے لیے تیار کیا۔ خاص طور پر انعام اللہ خاں یقین، احسن اللہ خاں بیان، میر باقر حزیں، محمد فقیہہ صاحب دردمند اور ہیبت قلی خاں حسرت کو اس روشِ خاص کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ دردمند کے علاوہ باقی یہ تمام شاعر صاحبِ دیوان تھے۔ یقین کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے میر اور سودا کے چراغ نہ جل سکے۔

اگر چہ میرؔ اور سوداؔ کو خان آرزو سے تلمذ نہیں تھا۔ لیکن یہ دونوں خانِ آرزو کی ادبی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ خان آرزو سے یہ لوگ متاثر نہ ہوئے ہوں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بہ ظاہر یہ دونوں مرزا مظہر کے مخالف ہیں۔[1] لیکن ذہنی اعتبار سے ان دونوں نے مرزا مظہر کی تحریک کو جتنا فروغ دیا ہے شاید کسی اور شاعر نے دیا ہو۔ تلامذۂ مظہر کے بعد مشعلِ شاعری میر، درد، اور سودا کے ہاتھوں میں آئی۔ اگر چہ سودا کے ہاں ایہام کے چند اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن اوّل تو اتنے بڑے کلیات میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ دوسرے ان میں ایہام "بسیار بہ شستگی"[2] باندھا گیا ہے۔ مثلاً:

پوج مجھے اس دیرِ کہن میں کیا پوجے ہے پتھر کو
مجھ وحشی کو سنا برہمن بتوں نے اپنا رام کیا

لیکن جب سوداؔ محض تفریحِ طبع کے لیے ایہام میں کچھ اشعار کہتے ہیں تو انھیں صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایہام کی ایک غزل کا مقطع ہے:

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
مضمونؔ و آبروؔ کا یہ سوداؔ ہے سلسلہ

ورنہ حقیقت میں سوداؔ ایہام کے کٹر مخالف ہیں۔ انھوں نے کھلم کھلا اعلان کیا ہے:

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
منکرِ سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

۱؎ سوداؔ نے مرزا کی اصلاحِ زبان کی تحریک کا مذاق ایک قطعہ میں اڑایا تھا۔ جو "ہجو گوئی" کے باب میں نقل کیا گیا ہے۔

۲؎ میرؔ نکات الشعرا کے اختتام پر لکھا ہے: "ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت، اکنون طبعہائے معروف ایں صنعت کم است۔ مگر بسیار بشستگی بستہ بشود"۔ (نکات الشعرا، ص ۱۷۹)

سوداؔ کی غزل گوئی

سوداؔ ایک عظیم شاعر تھے۔ لیکن عظیم غزل گو نہیں اگر اُن کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو اہم غزل گو شاعروں میں ہوتا اور بس ان کی شہرت اور مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب نمونے موجود ہیں اور صفِ اوّل کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ اردو غزل میں ''خارجیت''، ''زورِ بیان'' اور ''نشاط آمیز لب ولہجہ'' انہی کی دین ہے۔

غزل میں جہاں تک زبان و بیان اور قدرتِ اظہار کا تعلق ہے۔ سوداؔ کا ایک مخصوص رنگ اور لب ولہجہ ہے جو اُن کی استادی پر حرف نہیں آنے دیتا۔ لیکن غزل کی دوسری شرائط کے اعتبار سے وہ اپنے بعض ہم عصر غزل گو شعرا سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ہر شاعر آسانی سے طبع آزمائی کرسکتا ہے بلکہ اردو شاعری کی تو یہ روایت رہی ہے کہ تقریباً تمام شاعروں کی ادبی زندگی کا آغاز غزل ہی سے ہوا، لیکن یہ بہت کم مزاجوں کو راس آتی ہے۔ اس میں بیشتر مضامین رسمی اور روایتی ہوتے ہیں۔ عام طور پر شاعر حسن وعشق اور شراب ومیکدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن ان رسمی مضامین پر بھی شاعر کی اپنی چھاپ ہوتی ہے۔ ساغر ومینا کے پردوں میں اس کے احساسات، سماج اور دنیا کے متعلق اس کے نظریات، عام زندگی کے تجربات ومشاہدات غرض سب ہی کچھ چھپا ہوتا ہے۔

دوسرے اصنافِ سخن کی طرح غزل کی بنیاد بھی خارجی زندگی پر ہوتی ہے۔ لیکن غزل میں خارجی زندگی براہِ راست نہیں پیش کی جاتی بلکہ مادّی تجربات کو پہلے شاعر کے آتش کدۂ دل میں تپنا پڑتا ہے۔ اصل مسالہ دل کی دنیا سے فراہم ہوتا ہے اور دماغ اسے خوب صورت سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اعلیٰ درجے کی غزل گوئی کے لیے ''دروں بینی'' پہلی شرط ہے۔

سودا کا مزاج اور ذہن غزل کو راس نہیں آسکتا تھا، ان کی شوخ چنچل اور طرارے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس دردمندی، سوز و گداز اور برشتگی و خستگی کی متحمل ہی نہیں ہوسکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجہ میں نرمی اور گھلاوٹ اور اندازِ بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ قدرت نے سودا کو حزن و ملال اور ان کے لطیف احساسات سے محروم رکھا تھا اس لیے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقت یعنی غم کی آتشِ سیّال کو الفاظ کے نرم و نازک سانچوں میں ڈھالنے سے معذور رہے۔

سودا کا ادبی کارنامہ قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی ہے جن میں داخلیت کی بجائے خارجیت کو دخل ہوتا ہے۔ ان سے قبل ہی یہ دونوں اصناف اردو میں رائج تھیں۔ لیکن یہ صرف سودا تھے جنھوں نے ان کو باقاعدہ فن کی صورت دی اور فنی اعتبار سے ان اصناف کو انتہا پر پہنچا دیا۔ یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سودا پہلے قصیدے اور ہجو کے شاعر ہیں اور بعد میں غزل گو۔ ان کی پوری غزلوں میں جتنے نشتر نکلیں گے وہ شاید ان سے کم ہوں جو دوسرے درجے کے بعض معاصر شعرا کے ہاں مل جائیں گے۔ حالاں کہ سودا کے مقابلے میں ان کا سرمایۂ فن بہت مختصر ہے۔

کلیاتِ سودا میں سوز کی سوا سو کے قریب غزلیں اور بیان، قائم، یقین اور شیدا کے بعض اشعار بھی شامل ہو گئے ہیں، جنھیں ہم مدتوں سودا کا کلام سمجھ کر جھومتے رہے ہیں اور بیان، قائم وغیرہ کی مثنویاں الگ ہیں۔

سودا کی زندگی ہی میں بعض اہلِ نظر غزل گوئی میں دوسرے شاعروں کو ان پر ترجیح دیتے تھے۔ لچھمی نراین شفیق نے "چمنستانِ شعرا" میں لکھا ہے:

> "اگرچہ یقین ہے کہ مرزا سودا غزل، رباعی و مخمس و مثنوی و قصیدہ و قطعہ بند وغیرہ میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں...... لیکن یقین کے ریختے

میں جو فصاحت و ملاحت ہے وہ چیزے دیگر ہے"۔ [1]

(فارسی سے ترجمہ)

شفیق نے یقین اور سودا کا موازنہ کرتے ہوئے کسی شاعر کی دو رباعیاں بھی نقل کی ہیں۔ [2] جو سوانحی حصّے میں پیش کی جا چکی ہیں۔

صاحب "نشترِ عشق" نے لکھا ہے کہ:

> "اگرچہ سودا تمام طرزِ کلام پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن مدح و قدح میں کہ جس سے مراد ہجو و قصیدہ ہے انھوں نے معجزہ دکھایا ہے"۔ [3]

شاہ محمد حمزہ نے بھی 'فص الکلمات' میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ:

> "سودا غزل و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی سب خوب کہتے ہیں اور خاص طور پر قصیدہ گوئی میں سحر سامری دکھاتے ہیں"۔ [4]

سودا کے ہم عصر شاعروں میں میر تقی میر عظیم غزل گو شاعر تھے۔ اس لیے اکثر تذکرہ نگاروں نے ان دونوں فن کاروں کا موازنہ کیا ہے۔ اس موازنے سے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میر کی بنیادی خصوصیت بیان کر دی جائے تاکہ ان دونوں کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے میر کی غزل گوئی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "انھوں نے (میر نے) جس درد اور سوز کے ساتھ یہ نغمہ چھیڑا ہے اس کی مثال دنیائے اردو میں نہیں ملتی۔ میر کی فتادگی و دل سوزی، خستگی و برشتگی نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کر دی

---

1. چمنستانِ شعرا، ص ۱۶۲
2. ایضاً، ص ۱۶۲
3. نشترِ عشق (قلمی) ورق
4. فص الکلمات، قلمی

ہے اور ان کے کلام کو سوز و گداز کا آتش کدہ بنا دیا ہے"۔[1]

سوداؔ اور میرؔ کے کلام میں صرف یہی فرق ہے کہ سوداؔ اس خصوصیت سے محروم تھے جو میرؔ کا طرۂ امتیاز ہے اور بیشتر تذکرہ نگاروں نے بھی مختلف الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بھگوان داس ہندی نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اکثر لوگ فنِ ریختہ میں میرؔ اور مرزاؔ کو ہم پلّہ سمجھتے ہیں اور اکثر غزل و مثنوی میں میرؔ کو اور ہجو و قصیدہ میں مرزا کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں"۔[2] (فارسی سے ترجمہ)

حکیم سید احمد علی خاں یکتاؔ کو سوداؔ سے بہت عقیدت اور محبت ہے جس کا اظہار انھوں نے دیباچے میں کیا ہے لیکن وہ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ میرؔ کا فن لاثانی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"میرؔ نے غزل کو اس انداز سے کہا ہے کہ کوئی اور نہیں کہہ سکتا بلکہ اس باب میں ملک الشعرا پر حرف آتا ہے۔ (بظاہر ملک الشعرا سے مراد سودا ہے)...... لیکن میر کی تقلید و پیروی بہت مشکل ہے۔ اگرچہ ان کا کلام فصاحت نظام سعدی کے کلام کی طرح بظاہر آسان نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ممتنع ہے۔ بیشتر شعرا اُن کے مقلد ہیں لیکن یہ شعرا مطلقاً ان کی طرز نہیں پا سکے۔ اس کے برخلاف اگرچہ سودا کے کلام میں کمال پختگی ہے لیکن ہر صاحبِ فہم کے لیے اس کی تقلید ممکن ہے"۔[3] (فارسی سے ترجمہ)

یکتاؔ نے میرؔ اور سوداؔ کے کلام پر بہترین تنقیدی رائے دی ہے۔ دماغ کی شاعری کی تقلید ممکن ہے لیکن دل کی شاعری کی نہیں اور سودا کی غزل گوئی دماغ کی شاعری ہے۔

---

1. میر تقی میرؔ، ص ص ۳۲۱-۳۲۲
2. تذکرۂ ہندی، ص ۲۴
3. دستور الفصاحت، ص ۲۵

قدرت اللہ قاسم نے ان دونوں کے فرق کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "بعض لوگوں کے خیال سے مرزا اچھے غزل گو نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ:

ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا ایک بیکراں دریا ہیں اور میر ایک عظیم الشان نہر۔ جہاں تک فن کی معلومات کا تعلق ہے میر کو مرزا پر برتری اور قوت شاعری میں مرزا کو میر پر سروری حاصل ہے"۔ [۱] قاسم کی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سودا تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ میر صرف غزل گوئی پر قادر تھے۔ مگر اس فن میں بے مثال تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد ان دونوں کے متعلق رائے دیتے ہیں کہ:

"میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز تھی اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لیے ان کی غزلیں ہی ہیں اور خاص خاص بحور و قوافی میں ہیں۔ مرزا کہ طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر، ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ توسن فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا، رُک نہ سکتا تھا، کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی، جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے، باندھ لیتے تھے۔ بے شک ان کی غزل کے اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدے کا رنگ دکھاتے ہیں"۔ [۲]

آزاد نے میر اور مرزا سے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے جس سے ان دونوں کے کلام کی خصوصیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ نہ ہوا ہو لیکن اس سے میر اور مرزا کا فرق بخوبی واضح ہوتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ:

"ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انھیں کے پاس گئے

---

[۱] مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۳۱
[۲] آب حیات، ص ۱۶۴

اور عرض کی کہ آپ فرمائیں انھوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا :

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا:

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے" [۱]

جدید دور کے تذکرہ نگاروں میں رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:

"مختصر یہ کہ وسعتِ نظر، تنوعِ خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگیٔ الفاظ، سلاستِ زبان، عاشقانہ رنگ، دردو اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے"۔ [۲]

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے سودا کے قصیدے اور غزل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ اُن (سودا) کا قصیدہ غزل سے بہتر ہے۔ مہمل بات ہے۔ فقیر (شیفتہ) کے خیال سے اُن کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے"۔ [۳] (فارسی سے ترجمہ) خود سودا کو بھی یہ احساس تھا کہ لوگ انھیں قصیدے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

---

۱ آبِ حیات، ص ص ۱۶۴-۱۶۵
۲ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، مترجمہ، مرزا محمد عسکری، ۱۹۵۲ء، ص ۱۷۴
۳ گلشن بے خار، ص ۱۰۰

لوگ کہتے ہیں کہ سوداؔ کا قصیدہ ہے خوب

ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سوداؔ غزل گوئی میں میرؔ تک نہیں پہنچ پائے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا سودا غزل میں بالکل ناکام رہے؟ کیا ان کا اپنا رنگ اور انداز نہیں تھا اور وہ صرف روایتی مضامین باندھتے رہے۔ شیخ چاند کا یہی خیال ہے کہ سوداؔ کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"سوداؔ کا غزل میں کوئی خاص رنگ نہیں۔ وہ اس میدان میں طرح طرح طبع آزمائی کرتا ہے۔ غزل کی جان سادگیٔ بیان ہے۔ سودا نے غزل میں اس کا بہت کم خیال رکھا ہے"۔

مجھے شیخ چاند کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ غزل میں سوداؔ کا اپنا مخصوص رنگ ہے جس کی بنیاد خارجیت، زورِ بیان اور نشاط آمیز لب و لہجے پر ہے۔

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سوداؔ کا جواب

ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخؔ ہم اس مغفور کا

سوداؔ غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو داخلیت کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر نکالا۔ اگرچہ اس کوشش میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ اُن کا کلام کہیں کہیں بے تاثیر ہو گیا۔ لیکن مصحفیؔ کے ہاں جو داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے وہ سودا کا مرہونِ منت ہے۔ سوداؔ نے غزل کو جو ایک خارجی انداز بخشا تھا۔ مختلف زمانوں میں ان کے نمائندے انشاؔ، جرأتؔ، ناسخؔ، شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ وغیرہ رہے ہیں۔ یہ تمام شعرا اپنے اپنے مزاج کے مطابق سودا سے متاثر تھے۔ سودا کے ہاں جو زورِ بیان، معنی آفرینی، خیال بندی، پروازِ تخیل، جدّتِ بیان، قدرتِ اظہار، نشاط انگیزی اور جوش وخروش ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ سوداؔ کو زبان پر پورا عبور ہے۔ سیکڑوں ہندی اور فارسی محاورے انھیں کی بدولت اردو زبان میں داخل ہوئے۔ الفاظ شدھ ہندی کے ہوں یا ٹھیٹھ فارسی کے، ان کے سامنے ہاتھ

باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ سودا ان کو اس طرح برجستہ استعمال کرتے ہیں کہ وہ الفاظ اردو کے معلوم ہوتے ہیں۔ زبان پر ان کی یہی قادرالکلامی ہے جو سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیتی ہے اور وہ مشکل سے مشکل خیال کو باندھ لیتے ہیں۔ ان کی جدّت پسند طبیعت نے گلستانِ غزل کو دلآویز، حسین اور رنگین استعارات اور تشبیہات کے پھولوں سے سجایا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ سودا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا زورِ بیان ہے۔ وہ معمولی سے مفہوم کو اس انداز اور ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ شعر میں برجستگی، صوتی بلند آہنگی، ترنم اور ایک مخصوص موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میر نے ان کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بسیار خوش گو است، بلا گرداں ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ، در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ، ہر مصرع برجستہ اش را سرد آزاد بندہ پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ''۔[1]

محمد حسین آزاد نے سودا کی جن خصوصیات کا بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے خصوصیت زورِ بیان ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ چناں چہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ شعر مزا ہی نہیں دیتا''۔[2]

---

1. نکات الشعرا، ص ۳۱
2. آبِ حیات، ص ۱۵۸

ان خصوصیات پر تفصیلی بحث آگے کی جائے گی۔

مناسب ہوگا اگر ہم یہاں ان فارسی شاعروں کا ذکر کر دیں، جنھوں نے سودا کو متاثر کیا اور ان کی ادبی شخصیت کے بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔

سودا اور فارسی شاعر

عہدِ محمد شاہ میں فارسی شاعری روبہ زوال تھی۔ لیکن ابھی تک اس کی ادبی حیثیت برقرار تھی۔ شمالی ہند میں ابتدائی دور کے کچھ فارسی شعرا نے اردو میں شعر کہنا شروع کیے یا اردو کی سرپرستی کی۔ دوسرے قسم کے شاعروں میں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں بہت اہم ہیں، جس پر تفصیلی بحث ''ادبی پس منظر'' میں کی جا چکی ہے۔

فارسی میں اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہونا بند ہو گئے تھے۔ لیکن اس دور کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں فارسی ادب کا بہت اچھا مذاق تھا اور پھر وہ لوگ اردو شاعروں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ خود فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اس لیے فطری طور پر اردو غزل فارسی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اردو شاعروں پر فارسی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ابتدائی دور سے لے کر غالب تک بہت کم صفِ اوّل کے ایسے شاعر ملیں گے، جنھوں نے فارسی میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ سودا فارسی میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے خود اپنے ایک قطعہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلیات میں دیوانِ فارسی بھی شامل ہے۔ فارسی ادب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی اور فارسی کے مسلم الثبوت استادوں سے انھیں کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ ''عبرت الغافلین'' سے ہوتا ہے۔ جس میں سودا نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مرزا فاخر مکیں نے امیر خسرو، شیخ سعدی، مولانا روم، مولوی جامی، آسی سبزواری، نعمت خان عالی، مرزا صائب، خان آرزو اور دوسرے فارسی شعرا کے کلام پر کیے تھے اور پھر خود سودا نے فاخر مکیں کے اشعار پر اعتراضات کیے ہیں۔ سند کے طور پر انھوں نے جو فارسی اشعار پیش کیے ہیں وہ بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ انھوں نے فارسی ادب کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے بعض فارسی مصرعوں اور غزلوں کو بھی تضمین کیا ہے۔

سوداؔ نے کسی فارسی شاعر کا مکمل تتبع تو نہیں کیا۔ لیکن اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات سے وہ ضرور متاثر ہیں اور بعض شاعروں کے اندازِ سخن کی چھاپ ان کے کلام پر پڑی ہے۔ چوں کہ وہ غیر معمولی ذہین انسان تھے۔ ایجاد اور جدت کی پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اس لیے فارسی شاعروں سے انھوں نے جو کچھ مستعار لیا۔ اس پر قناعت نہیں کی بلکہ ان تمام پھولوں کو سجا کر خود اپنا گلستاں بنایا ہے۔

اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات کو "سبکِ ہندی" کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی بدنظمی، معاشی بدحالی اور روبہ زوال تہذیب کا اثر فارسی ادب پر یہ پڑا کہ ادب میں جمود آ گیا۔ ایک مخصوص اقتصادی نظام اور تہذیب کی ترقی کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے۔ زندگی ایک منزل پر پہنچ کر رُک گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ادب بھی اس منزل سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ اس ٹھہراؤ اور جمود نے ادب میں جو رجحانات پیدا کیے انھیں اہلِ ایران "سبکِ ہندی" کہتے ہیں"۔ [1]

شاہ حاتمؔ پہلے اُردو شاعر ہیں جو ان رجحانات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے شاگرد سودا کے ہاں ان میں سے تمام نہیں تو کچھ خصوصیات مل جاتی ہیں۔

سوداؔ پر جن فارسی شاعروں کا اثر نظر آتا ہے وہ اسی سبک ہندی کے نمائندہ شاعر ہیں۔

بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے۔ "اگر مثال بندی اشعار غزل میں سوداؔ کو اپنے وقت کا صائب کہا جائے تو ٹھیک ہے"۔ [2] حکیم سید احمد علی خاں یکتاؔ نے بھی سوداؔ پر صائب کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ سوداؔ اس پاکیزگی اور ملاحت کے ساتھ غزل کہتے ہیں کہ اگر صائبؔ موجود ہوتے تو خود اس کی داد دیتے"۔ [3]

سوداؔ کے ہاں جو خارجیت ہے وہ ایک حد تک صائبؔ کا اثر ہے۔ صائب زورِ بیان میں غزل کو قصیدے کی حدوں میں لے آتے ہیں۔ یہی حال سوداؔ کا ہے۔ ان کی اکثر غزلوں پر قصیدے کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ صائبؔ کی طرح ان کے ہاں بھی مثالی شاعری کے اچھے

۱۔ اردوئے معلّٰی، غالبؔ نمبر، ۱۰، ص ۶۹

۲۔ (الف) سفینۂ ہندی، ص ۱۲۵ (ب) تذکرۂ ہندی، ص ۱۳۵

۳۔ دستور الفصاحت، ص ۱۷

خاصے نمونے مل جاتے ہیں۔ سودا نے صائب کے ایک مصرع کو بہت دلچسپ انداز میں تضمین کیا ہے:

سنا نہ ہووے جو سودا یہ مصرع صائب
تو پوچھ خلق سے میں کیا کروں بیاں تنہا
کہ ایک دن میں اُسے راہ میں اکیلا دیکھ
کہا کدھر چلے اے فخرِ شاعراں تنہا
دیا جواب دلم سیر باغ می خواہد
کہا میں ہو متبسم کہ مہرباں تنہا
جو ہووے امر تو میں بھی چلوں رکاب کے بیچ
رکھے ہے لطف بھی کچھ سیر بوستاں تنہا
سنا یہ مجھ سے تو کہنے لگا کہ [illegible]
[illegible] نہ باغباں تنہا

سودا نظیری نیشاپوری سے بھی بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ نظیری کی طرح وہ بکثرت محاورے استعمال کرتے ہیں اور بقول شیخ چاند" حالات و کیفیات اور معشوقانہ اداؤں کو سودا نے مادی اشیاء سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ سب نظیری کا اثر ہے۔ اس کے سوا اس کی تقلید میں مضامین کو جدّت آمیز انداز میں بھی بیان کیا ہے۔[1] نظیری کی طرح سودا نے بھی قطعہ بند غزلیں کہی ہیں جن میں وہ کچھ کم کامیاب نہیں ہیں۔ سودا کا ایک مقطع ہے:

یہ غزل سودا کہی ہے تو نے اس انداز کی
ہند سے پہنچے گی ہاتھوں ہاتھ نیشاپور تک

اس شعر میں سودا نے غالباً نظیری سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

---

[1] سودا، ص ۱۵۶

سوداؔ کے ہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں، جن میں مضمون آفرینی، نازک خیالی، باریک اندیشی اور خیال بندی کے جوہر دکھائے گئے ہیں اور بظاہر یہ اثر مرزا عبدالقادر بیدلؔ اور ناصر علی کا ہے جو اس میدان کے مرد ہیں۔ سودا ناصر علی کو نعمت خاں پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ناصر علی کا ''خیال'' مرغوب تر ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں
اُس سے مرغوب تر ہے اس کا خیال

لیکن سوداؔ پر بیدلؔ کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ انھوں نے بیدلؔ کے مصرعے بھی تضمین کیے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

سوداؔ بقول حضرتِ بیدل بگوئے دوست
خطِ جبین ما ست ہم آغوشِ نقشِ پا

ایک اور غزل کے قطعہ بند اشعار ہیں:

سوداؔ سے کہا میں کہ ترے شہرے کو سُن کر
دیکھا جو تجھے آکے تو اے بے سروپا ہیچ
بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرعِ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

سوداؔ قصیدے اور ہجو کے بادشاہ تھے۔ مولانا محمد حسین آزادؔ لکھتے ہیں۔ ''مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں۔ ''مرزا محمد رفیع سوداؔ در ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد وغیر ازیں کہ زبان ہر دو۔ باہم تخالف دارد۔ فرقے نتواں کرد...... مگر ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم ہے۔ سوداؔ کی مشابہت ہے تو انوریؔ سے ہے کہ محاورہ اور زبان کا حاکم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ ہے''۔ یہ جملہ خوبیاں سوداؔ میں موجود تھیں۔ جو بظاہر اس بات کا ثبوت ہیں کہ انوریؔ کو بھی سوداؔ کے مزاج

میں اچھا خاصا دخل تھا۔ سوداؔ نے ایک قطعہ بند غزل لکھی ہے جس میں الفاظ کی شان و شوکت، زورِ بیان اور محاورں کے برجستہ استعمال میں وہ انوریؔ تک پہنچ گئے ہیں۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے کہ یہ مخصوص اندازِ سخن انوریؔ کا ہے۔ اسی لیے مقطع میں کہتے ہیں:

غرض یہ وہ غزلِ قطعہ بند ہے سوداؔ
کہ اس کی قدر کوئی کیا جز انوریؔ جانے

سلیمؔ اور کلیمؔ فارسی کے مشہور تمثیل نگار شاعر ہیں۔ سوداؔ نے ان کی غزلوں کو تضمین بھی کیا ہے جس سے انداز ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں شاعروں کو پسند کرتے تھے۔ ان شاعروں کی طرح سودا کے ہاں بھی تمثیل نگاری ہے اور غالبًا اس لیے قدرت اللہ شوقؔ لکھتے ہیں "در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گزارد"۔[1]

اب ہم مختلف عنوانات کے تحت سوداؔ کی غزل گوئی کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کریں گے۔

داخلیت

دبستانِ دلّی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہے جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو حکومت کی بنیادیں ہل رہی تھیں، جس پر تفصیلی بحث پہلے باب میں کی جا چکی ہے۔ کچھ لوگ تصوف کے قیش محل میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ کچھ نے عیش و عشرت میں ڈوب کر زندگی کی تلخیوں کو بھلا دیا تھا۔ اس عہد کے صوفیا یا تصوف کے فلسفوں سے دلچسپی رکھنے والے عام طور پر وہ لوگ تھے جو اجتماعی زندگی سے رشتہ توڑ کر انفرادیت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اردو شاعری میں شدید داخلیت انہی سماجی اور سیاسی حالات کی پیدا کردہ ہے۔ ابتدائی عہد کے بعض اردو شاعر خود صوفی تھے اور اکثر شاعروں کو تصوف سے دلچسپی تھی۔ اسی لیے خود میں "گم رہنے کا انداز" اپنی ذات کے علاوہ تمام کائنات کو فراموش

---

[1] طبقات الشعراء (قلمی)

کر دینے کی تمنا، محبت میں محبوب سے بھی بے نیاز ہو جانا داخلیت کے یہ مختلف روپ شاعری میں بہت مقبول ہوئے۔ داخلیت کے شہنشاہ میرتقی میر ہیں جو برباد ہو گئے لیکن ہارے نہیں۔ جنھوں نے ایک زندہ صوفی کی طرح خود کو گم کر کے پوری کائنات کو حاصل کیا۔ سودا کے ہاں بھی داخلیت ہے مگر اس میں میر کا سا سوز و گداز اور خستگی و برشتگی کی بجائے رنگینی اور سرمستی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر اور سودا کی داخلیت اور اظہارِ غم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''مرزا سودا اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے میر اور درد سے مختلف آدمی تھے مگر انھوں نے بھی زمانے کی لاٹھی کھائی تھی۔ انھوں نے متین اور باوقار احتجاج کی بجائے ہزل اور سوقیت کے دامن میں پناہ لی۔ سودا کے انداز کو ہذیانِ غم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے''۔ [۱] ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سودا کے ہاں میر، درد اور قائم اور اثر جیسی داخلیت نہیں ہے۔ وہ خارجی شاعر ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں خارجیت کو فروغ انھوں نے ہی دیا اور ان کی غزل میں جو خارجیت ہے وہ ہزل اور سوقیت سے پاک ہے۔

سید امداد امام سودا کی داخلیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خارجی پہلو کو تو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبانِ اردو میں سوا میر انیس کے کوئی ان کا جواب نہیں ہے۔ مگر داخلی پہلو پر ان کو ویسی قدرت حاصل نہ تھی جس کے سبب سے وہ میر تقی صاحب میر سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں''۔ [۲]

سودا کی داخلیت میں خارجیت کی بھی ہلکی سی چاشنی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں صرف داخلیت ہو چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کہ ہم

---

[۱] سید عبداللہ، نقد میر، دہلی، ص ۲۷

[۲] امداد امام اثر، کاشف الحقائق، ۲، ص ۱۰۶

اتنا کہاں ہے سوزِ طلب دل پتنگ کا
رکھتی نہیں ہے شمع بھی ایسا جگر کہ ہم

بس نہ تھا اک داغ اے دل پھر تو اس سے لگ چلا
اُس دبی آتش کو ڈرتا ہوں نہ سلگائے فراق

سینے سے سوزِ عشق ترا ہاتھ کب اٹھائے
تا پھوٹ کر جگر سے نہ ہو جائے پار داغ

دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر
دل خالی کیا میں آہ بھر کر

کیوں مجھ کو نہ مارا غمِ دوری نے ترے آہ
کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہارِ محبت

تصورِ حسن و عشق

ناممکن ہے کہ سودا قتیلِ غمزہ عشوہ نہ رہے ہوں۔ لیکن ان کا عشق بھی لاکھوں انسانوں کی طرح معمولی عشق تھا جس کی بنیاد ذہنی کیفیات سے زیادہ جسمانی ضروریات پر ہوتی ہے۔

سوؔدا کا دل و دماغ عشق کے معمولی تجربات اور روایتی مضامین تک محدود ہے۔ اس لیے وہ اس مقام سے محروم ہیں جہاں عشق، مادّی کثافت کے پردے چاک کر کے حقیقت کا انکشاف کرتا ہے اور عاشق کے دل میں ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا درد سمو دیتا ہے۔ ان کے ہاں ماورائیت اور روحانی عشق کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ مگر یہ عشق صرف ذہن و فکر تک محدود ہے، جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس عشق کی بنیاد ان فلسفوں پر ہے جو اس روبہ زوال تہذیب میں ذہین انسان کے آخری پناہ گاہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے مادی عشق میں وہ بلندی اور رفعت نہیں جو ذہنی آسودگی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان کا عشق صحت مند نہیں اسی لیے ان کے ہاں وہ درد اور کسک نہیں جو ہمیں تڑپا دیتی ہے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار ہمارے دل کی گہرائیوں کو نہیں چھو پاتے۔

ان کے ہاں عشق کے بیشتر مضامین محض رسمی اور روایتی ہیں اور عشق کا تصور وہی ہے جو اس دور میں مقبول تھا جس میں جنس اور روحانیت، محبوب اور خدا خلط ملط ہو گئے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں مادی عشق کی بہت اہمیت تھی کیوں کہ یہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہ حضرات اپنے مریدوں کو مجازی عشق کی ہدایت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک انسان خود کو مادی عشق میں جلا کر خاک نہ کرے اسے یہ حق نہیں ملتا کہ وہ خدا تک پہنچنے کی تمنا کرے۔ میر تقی میر کے والد میؔر کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ:

> "بیٹا عشق کرو۔ عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے...... بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے"۔[1]

اسی قسم کی نصیحت نقشبندی سلسلے کی ایک برگزیدہ ہستی یعنی مرزا مظہر جان جاناں کو اُن کے والد بھی کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "جس انسان کا دل محبت کے داغوں سے برشتہ نہیں ہوا اور اس کی طبیعت کے خاشاک جل کر خاک نہیں ہوئے اور دل پاک نہیں ہوا اس کی طینت کی زمین خدا کی محبت کے تخم کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیوں کہ مجازی عشق زینہ ہے عشق کا۔ اگر

---

[1] میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، مترجمہ نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۳۳

تم نے عشقِ مجازی کا رشتہ طوقِ گلو نہ کیا اور کوچہ و بازار میں رسوا و خوار نہ ہوئے تو فقیر کی روح تم سے خوش نہیں رہے گی"۔[۱] سودا کے ہاں اس عشق کا تصور تو ملتا ہے مگر صرف رسمی طور پر۔ ان کا شعر ہے:

ناصحا اس عشق سے ہوتا ہے لذت یاب دل
جس میں حرمت کم ہو رسوائی و خواری بیشتر

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

سوداؔ ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دیوانے جب دل دیا تو پھر کیا

اس عشق میں سر پر خاک ڈالنی پڑتی ہے۔ گریبان چاک کر کے خاک و خون میں نہانا پڑتا ہے۔ عشق کی لذت تو اسی میں پنہاں ہے کہ انسان ناکام رہے اور خون جگر کھاتا رہے۔ بقول سوداؔ خضر نے آب حیات صرف اس لیے پیا تھا کہ وہ خونِ جگر کی لذت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

عشق میں خونِ جگر کھانے کی گر لذت نہ تھی
خضر نے حیراں ہو آبِ زندگانی کیوں پیا

عشق میں لطف ہی ناکامی کا ہے۔ اگر عاشق کی آہ و زاری کا اثر محبوب پر ہو جائے تو وہ عشق کی اصل لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔

تاثیرِ عشق نے مزۂ درد کھو دیا
اُن نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا

سوداؔ کو اس کا افسوس ہے کہ "غمِ دوری" میں وہ زندہ رہے۔ گویا ان کی محبت میں ابھی کمی

---

۱ نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، کانپور، ۱۲۷۵ھ، ص ۱۱

تھی۔اب ان کی غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ محبوب کے پاس جائیں اور اظہارِ محبت کریں :

کیوں مجھ کو نہ مارا غمِ دوری نے ترے آہ

کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہارِ محبت

عشق میں وہ دونوں انسان کامیاب ہیں جنھوں نے اپنے محبوب کو پالیا یا جو محبوب کے راستے پر شہید ہو گئے۔سودا کوہکن کی اس لیے تعریف کرتے ہیں کہ وہ اگر" قمارِ عشق" میں شیریں کو نہ پاسکا تو کیا ہوا۔اس نے اپنا سر تو کھودیا اور پھر سودا خود کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور شرم دلاتے ہیں کہ جب اُن سے یہ بھی نہ ہوسکا تو پھر کس منہ سے خود کو "عشق باز" کہتے ہیں:

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھوسکا

کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

اور پھر یہاں سے سودا کے عشق میں ماورایت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔اُن کا عشق افلاطونی بننے لگتا ہے۔شاعر پر محبوب کی آنکھوں کا جادو چلتا ہے اور نہ زلفوں کا سحر۔وہ عشق برائے عشق کرتا ہے:

نہ آنکھوں میں تری جادو نہ ہرگز سحر زلفوں میں

یہ دل جس سے ہے دیوانہ محبت کا ہے وہ لٹکا

عشق ایک فنِ شریف ہے جو ہر بوالہوس کے بس کی بات نہیں۔مرزا مظہر کا ایک شعر ہے:

ہوس عشق مکن اے دلِ بے صبر و قرار

عاشقی فنِ شریفے ست ولے کارِ تو نیست

سوداؔ کہتے ہیں:

گر کہیں عاشق ہے اے سوداؔ تو میں تجھ سے کہوں
وہ عمل میں لائیو جو نیک ہو کردارِ عشق

ایک اور شعر ہے:

عشق سے صاف دلوں کو نہیں تازی نسبت
رہے تھا سنگ میں پہلوے شرر آئینہ

عشق کا وہ مسلک ہے جس میں انسان کے جذبے کی قدر ہے۔ جہاں فلاں ابن فلاں کی کوئی قیمت نہیں۔ عشق کا کوئی حسب ہے اور نہ نسب بقول سودا:

کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سوداؔ
جوں ذاتِ خدا جس کی حسب ہے نہ نسب ہے

عشق کا گھر دیر و حرم کی طرح تنگ بھی نہیں۔ اس میں اتنی کشادگی اور وسعت ہے کہ ہر فرقے، ہر جماعت اور ہر مذہب کے لوگ اس میں آسکتے ہیں۔

عشق وہ گھر ہے جہاں ہفتا دو دو ملت کو ہے راہ
تنگ جوں دیر و حرم کب در ہے اس درگاہ کا

عشق ایک مذہب ہے۔ اسلام میں خلافِ شریعت کام کرنے والے کو دوزخ میں ڈالا جائے گا لیکن مذہب عشق میں گناہ کرنے والے کے لیے بڑی سزا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی دوزخ نارِ عشق کا ایک شمہ ہے:

عشق کے ذرّہ شریعت سے قدم باہر نہ رکھ
سمجھے ہے دوزخ کو اپنا ایک شمہ نارِ عشق

اگر جذبہ صادق ہے اور عاشق سلامت روی سے راہ عشق طے کرتا ہے تو بندگی اپنی انتہا کو پہنچ کر خداوندی ہو جاتی ہے اور بقول سودا :

کمال بندگی عشق ہے خداوندی

کہ ایک زن نے مہ مصر سا غلام لیا

اگر چہ محبوب گوشت پوست کا انسان ہے لیکن حقیقت میں یہ مظہرِ خداوندی ہے۔ خدا کا نور ہے جو خوب صورت انسانوں کے سانچوں میں ڈھل گیا ہے ۔

کفر کی میری تجلّی ہے نظیر شمع طور

پوجوں ہوں جس بت کو میں اک نور ہے اللہ کا

محبوب

سودا کے عشق کا بھرم اُس وقت کھلتا ہے جب وہ اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے ہاں محبوب کا کوئی مکمل اور جامع تصور نہیں۔ انھوں نے محبوب کے جسم، بعض اعضا اور صفات کی ضرور مدح کی ہے۔ مگر پورا کلیاتِ سودا پڑھنے کے بعد بھی ہمارا ذہن سودا کے محبوب کی تصویر بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اور سیرت الفاظ کے گورکھ دھندے میں چھپی رہتی ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ خود سودا کے ذہن میں کوئی حسین تصور نہیں تھی۔ ان کے ہاں ذاتی تجربات مشاہدات اور انفرادی حسیات و تاثرات کی شدید کمی ہے۔ انھوں نے خوبصورتی کو جانچنے کے تمام پیمانے مستعار لیے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ اسی لیے محبوب کی تعریف اور توصیف میں انھوں نے جتنے بھی مضامین باندھے ہیں۔ ان میں کہیں بھی محبوب کی انفرادیت نہیں اُبھرنے پائی۔

اُن کے ہاں وہ معاملہ بندی بھی نہیں جو انشا و جرأت اور بعض دوسرے شاعروں کے ہاں مل جاتی ہے اور جو کم از کم ایک زندہ محبوب کا پتا دیتی ہے۔

سودا کا محبوب امرد ہے ایسے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے، جن میں انھوں نے اپنے

محبوب کے "خط" کے متعلق گل افشانیاں کی ہیں۔ خط کا تعلق جمالیات سے نہیں۔ حسیات اور تاثرات سے بھی بہت کم ہے۔ یہ مضمون صرف شعر کہنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس موضوع پر سودا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جز خطِ سبزِ عارضِ دلدار ہم نشیں
دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو رنگ اور نمک

خط آچکا پہ مجھ سے وہی ڈھنگ اب تلک
ویسا ہی میرے نام سے ہے ننگ اب تلک

خط سبز اس کے سے عارض پر ہوگیا دونی صفا
یہ وہ آئینہ ہے پہونچادے جسے زنگار فیض

کوچ شاہِ حسن کا ہے وہ غبارِ خط نشاں
گرد لشکر سے اٹھی وقتِ سواری پیشتر

ممکن ہے ہیئت کے اعتبار سے اس قسم کے بعض اشعار کا شمار عظیم شاعری میں ہوجائے۔ لیکن جہاں تک مضمون اور مواد کا تعلق ہے یہ تیسرے درجے کی معمولی، سطحی اور ناقص شاعری ہے۔ پہلے شعر کا مضمون "رنگ اور نمک ردیف اور قافیہ کا مرہون منت ہے۔ "نمک" ردیف ہے اور "رنگ" قافیہ۔ دوسرا شعر مطلع ہے اور ظاہر ہے کہ "ڈھنگ" اور "ننگ" کے قافیے اس کی تخلیق کے موجب ہیں۔ تیسرا شعر "خط سبز" "دونی صفا"، "آئینہ" اور "زنگار" جیسے الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ چوتھے شعر میں ایک خوب صورت تشبیہ

ہے۔ان تمام اشعار سے سوداؔ کی قادرالکلامی کا ضرور پتا چلتا ہے۔لیکن ان میں سے کوئی شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کو اپیل نہیں کرتا۔

اب چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سوداؔ نے محبوب کے جسم،خط و خال اور بعض اعضاء کی تعریف کی ہے:

عالم کا قمری آسا ہے طوق بندگی کا
قامت کو تیرے جیسے سرو روا بنایا

لب لعلِ بتاں پر سرخی پاں ہے کہ جادو ہے
بنادی شکلِ طوطی صورتِ سرخاب آتش پر

یہ اس کے رنگ عارض سے ہے دل بیتاب آتش پر
ٹھہرتا ہی نہیں سینے میں جوں سیماب آتش پر

دیکھے اگر صفائے بدن کو ترے صبا
کھولے کبھو نہ شرم سے بندقبائے گل

خال زیرزلف پر مت جی چلا اے مرغِ دل
مان میرا بھی کہا یہ دام بے دانہ نہیں

سوداؔ خرامِ قدکو ترے دیکھ کر کہے
ہے راستی تو یہ کہ ہوا یاں تمام ناز

ہے خوبیٔ دندانِ دہن خوبوں میں لیکن
بتیسی کہوں اس کی کہ موتی کی لڑی ہے

تبسم یوں نمایاں ہے مسّی آلودہ دنداں سے
نہ ہو ابر سیہ میں اس طرح بجلی کی اچپلیاں

دندان ولب پہ سارے تھا نیم جاں میں لیکن
مسّی دو انگلی مل کر کھایا جو پان مارا

ہے سرو سے قامت کے ترے قمری تو والہ
اور کبک دری تک تری رفتار کا عاشق

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سودا بیاں
شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

ان تمام اشعار میں محبوب کے جسم اور اعضا کی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کوئی ایک شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کی آسودگی کا سامان نہیں بن سکتا۔ یہ سب روایتی مضامین ہیں۔ محبوب کی یہ تمام صفات سوفی صدی رسمی ہیں۔ جن پر فارسی اور اردو کے ہزاروں شاعر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ان میں صرف سودا کا طرز بیان اور تشبیہات و استعارات ہیں جنھوں نے

انھیں گوارا کر دیا ہے۔ان اشعار کو پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ سوؔدا کی توجہ زبان و بیان پر تھی۔ وہ محبوب کی خوبیوں سے اتنے متاثر نہیں ہیں کہ ان کے احساسات اور جذبات بے تکلف ،سادہ اور بے ساختہ زبان اور لب ولہجہ میں ڈھل جائیں۔ وہ محبوب کی قامت سے زیادہ ''قمری'' طوقِ بندگی''،''سرِ رواں'' پر توجہ صرف کرتے ہیں۔محبوب کے لب لعلیں اُن کے لیے اتنے اہم نہیں جتنے کہ ''طوطی''،''سرخاب'' اور ''آتش'' ہیں۔

سوؔدا اور ان کے محبوب کے تعلقات بھی بہت عبرت ناک ہیں۔وہ اپنے محبوب کی نظر میں ذلیل وخوار رہتے ہیں۔رقیبوں کو ہمیشہ اُن پر ترجیح دی جاتی ہے۔اُن سے محبت یا ان پر التفات تو بہت دور کی بات ہے۔ان کا ذکر آتے ہی محبوب میلوں دور بھاگ جاتا ہے۔ وہ جب محبوب کو دردِ دل سناتے ہیں تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا ہے۔اس قسم کے مضامین ابتدا سے لے کر آج تک تقریباً تمام غزل گوشعرا کے ہاں ملتے ہیں۔یہ غزل کے روایتی مضامین ہوتے ہیں جو اکثر محض قافیے کی مجبوری سے باندھے جاتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر اور محبوب کے اصل تعلقات کی جھلکیاں بھی ہوتی ہیں جن میں محبت یک طرفہ نہیں ہوتی بلکہ محبوب بھی عاشق پر فدا ہوتا ہے جن سے عاشق کی خودداری اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔دونوں کے قابلِ احترام انسانی رشتے کا پتہ چلتا ہے۔مگر سودا اور ان کے محبوب کے تعلقات ہمیشہ ہی مضحکہ خیز رہتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ڈرتے ڈرتے جو کہا میں کہ ترا عاشق ہوں
قہقہہ مار لگا کہنے وہ طناز، درست

ٹک سادہ دلی پر تو مرے رحم کرائے یار
ہوں تجھ سے ستم گر سے طلب گارِ محبت

باتیں مجھے بھاتی ہیں بآمیزشِ دشنام
ہوں اس لیے اُس شوخ کی گفتار کا عاشق

دیکھے ہے مجھ کو اپنی گلی میں تو پھر مجھے
ویسی ہی گالیاں ہیں وہی سنگ اب تلک

سنتا ہے جس جگہ وہ مرا ذکر ایک بار
بھاگے ہے واں سے لاکھ ہی فرسنگ اب تلک

تصوف

سوداؔ کے ہاں تصوف کے مضامین صرف برائے شعر گفتن ہیں اور بقول محمد حسین آزادؔ ''تصوف جو ایشیا کی شاعری کی مرغوب نعمت ہے۔ اس میں مرزا پھیکے ہیں۔ وہ حصہ خواجہ میر دردؔ کا ہے''۔ سوداؔ شہر آشوبوں اور ہجوؤں کے سہارے زوال پذیر سماج کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے لب و لہجے میں جو تضحیک اور طنز و تلخی ہے انھی حالات کی پیدا کردہ ہے، جنھوں نے بعض لوگوں کو تصوف کی پناہ گاہ میں جگہ دی تھی جس پر پہلے باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ سوداؔ تصوف کو صرف فلسفہ کی حد تک مانتے تھے۔ ان کی عملی زندگی میں اسے کوئی دخل نہیں تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کے جتنے مضامین ملتے ہیں۔ ان کی بنیاد تصوف کے مقبول عام فلسفوں پر ہے۔ سوداؔ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں خدا کا ظہور ہے لیکن نگاہِ دیدۂ تحقیق کی ضرورت ہے۔ وہ موسیٰ تھے جنھیں خدا کا جلوہ دیکھنے کے لیے کوہِ طور پر جانا پڑا۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو ہر سنگ میں اس کے ظہور کا شرار دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سوداؔ نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہرایک ذرہ میں ہے آفتاب کا
ہرسنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیرکروں کوہِ طور کا

جسے بلبل صرف گلستاں میں دیکھتی ہے۔ وہ بیاباں کے ہر خار میں موجود ہے۔ زلیخا کو جو نور صرف مہ کنعاں میں نظر آیا تھا۔ وہ ہر ستارے میں نظر آسکتا ہے بشرطیکہ چشمِ بینا ہو۔

بلبل نے جسے جاکے گلستان میں دیکھا
ہم نے اسے پُرخار بیابان میں دیکھا
روشن ہے وہ ہرایک ستارے میں زلیخا
جس نور کو تونے مہ کنعان میں دیکھا

سوداؔ مذہب کی ان ظاہری رسوم کے خلاف ہیں جو انسانوں میں تفریق اور ایک دوسرے سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔

خدا سے محبت کرنے والوں کے لیے مسجد اور مندر کی کوئی قیمت نہیں ان کے لیے دل سب سے بڑی عبادت گاہ ہے۔

دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی
یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا

شیخ کعبۂ دل کی حقیقت سے بے بہرہ ہے اور خانقاہ و مدرسہ کی الجھنوں میں گرفتار ہے:

کعبۂ دل کی حقیقت کو پہونچ اے شیخنا
خانقاہ و مدرسہ تیرا ٹھکانہ ہے عبث

جس نے ذاتِ باری تعالیٰ کا نشان پالیا ہے۔ وہ پھر رام و رحیم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خدا ہندو یا مسلمان نہیں ہے، یہ مسجد و مندر انسان کی اپنی تخلیق ہیں۔

ہے مبرّا یہ زباں کہنے سے اب رام و رحیم
جن نے پایا ہے نشاں اس کو نہیں نام سے کام

سوداؔ کی نظر میں وہ انسان قابلِ عزت و احترام ہے جو دوسرے انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ ہندو بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمان خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن سوداؔ اس شخص کو پوجتے ہیں جو آشنا پرست ہے۔

ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست

ایک بت خانے کو توڑ کر مسجد بنانے سے اتنا ثواب نہیں ہوتا جتنا برہمن کا دل توڑنے سے گناہ ہوگا۔

توڑ کر بت خانے کو مسجد بنا کی تو نے شیخ
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

خدا کو تلاش کرنا ہے تو انسانوں ہی میں تلاش کرو۔ خدا کے بندوں کی دل جوئی کرو۔ خدا خود مل جائے گا:

شیخ کعبہ میں خدا کو تو عبث ڈھونڈے ہے
طالب اس کا ہے تو ہر ایک کی کر دل جوئی

سوداؔ کے ہاں جو کہیں کہیں انسانی عظمت کا احساس ملتا ہے۔ وہ بھی تصوف کی دین ہے۔ مثلاً:

جو خاک نشیں ہیں نہ سمجھیو انھیں قدر
وہ دانہ ہے خرمن جسے ماٹی میں رلایا

واعظ وزاہد

صوفی حضرات اہلِ باطن ہوتے ہیں جو تصنع، بناوٹ اور دکھاوے سے نفرت کرتے ہیں۔ان کا مقصد خدا تک پہنچنا اور خود کو خدا کی ذات میں گم کرنا ہوتا ہے۔وہ اس کی قطعی پروانہیں کرتے کہ ان کے بارے میں عوام کی کیا رائے ہے۔اس کے برعکس زاہد اور واعظ کی زندگی میں مکر اور ریا کو دخل ہوتا ہے۔ان کے کردار اور گفتار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ان کی تنہائیاں رندِ مشرب کی زندگی کی طرح رنگین اور ہر طرح کے گناہوں سے لبریز ہوتی ہیں۔سودا جیسے ظریف انسان کو اس سے بہتر اور کیا موضوع مل سکتا تھا۔ان کے دیوان میں سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں واعظ کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور اکثر اشعار میں نظریاتی اختلاف سے زیادہ مضحکہ اڑانے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔یہاں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا
الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

مغ نے دی پگڑی پہ زاہد کے مجھے قرض شراب
کام سودا ہی کا ہوتا ہے خدا ساز درست

شیخ اتنا تو جتاؤ نہ تم اپنا تقویٰ
عوضِ مے گرو ہے جُبہ و دستار ہنوز

شیخ صاحب سے مریدوں کو نہیں زنہار فیض
بخشے ہے رندوں کو ان کا جبہ و دستار فیض

کہا تو مان لے سوداؔ کا، توبہ کر اس سے
لب و دہن کے تئیں کر کے شست وشو واعظ

بے ثباتی

صوفی شعرا کا یہ بہت محبوب موضوع ہے۔ بے ثباتی اور قناعت کے فلسفے زوال پذیر سماج میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔ اگر بعض مصلح دماغوں نے حکمراں طبقے کی عیش کوشی اور دنیا پرستی کے خلاف بے ثباتی اور قناعت کے فلسفوں کو پیش کیا تو عوام کی اخلاقی صحت و درستی کے لیے۔ لیکن یہ فلسفے شکست خوردہ انسانوں کے زخموں پر مرہم کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اگر انسان مادّی دنیا میں ناکام رہے تو دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لیتا ہے کہ یہ دنیا ناپائدار ہے۔ یہاں ہمیشہ کس کی بنی رہی ہے۔ دنیا کی مثال اس سورج کی ہے جو صبح پوری تابنا کیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ لیکن شام ہوتے ہوتے جس کا چہرہ زرد پڑ جائے۔ پھر ایسی ناپائدار چیز سے دل لگانے سے فائدہ؟ سودا نے اس موضوع پر بہت شعر کہے ہیں:

رخصت ہے باغباں کہ ٹک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

دور ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشمِ پُر آب
دیکھ سوداؔ گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

مہماں جو کوئی آیا گھرِ آسماں دنی کے
دو دن کھلا کے روٹی اس کو ندان مارا

آراستہ جو بزم ہوئی دورِ فلک میں
واں جام بجز گردشِ ایام نہ آیا
ہے رنگِ تماشائے جہاں صورتِ خورشید
جو صبح کو دیکھا وہ نظر شام نہ آیا

انجام عیشِ جہاں کی جو تو دیکھا چاہے
بزمِ مستاں پہ نگہ غور سے کر آخر شب

اس جامہ پہ اتنا نہ ابھر بلبلے کی طرح
جامہ یہ ترا پوچ ہے تو غیر ہوا ہیچ

کر خانۂ گردوں پہ نظر چشمِ فنا سے
ہے مثلِ حباب اس کی بھی تعمیر ہوا پر

دیوے تجھے وہ کچھ کہ نہ پھر چھین لے تجھ سے
زنہار نہ رکھ یہ طمعِ خام جہاں پر

کچھ اس چمن میں آ کے نہ دیکھا میں جوں حباب
آب رواں کو سیر کیا سو بھی یک نفس

قناعت

اگرچہ سوداؔ ہرگز قانع نہیں تھے۔ ان کی تمام زندگی امیروں اور نوابوں کی قصیدہ خوانی میں گزری۔ مگر ان کے کلام میں قناعت کے موضوع پر جتنے اشعار ملتے ہیں تصوف کے کسی اور فلسفہ پر نہیں ملتے۔ بظاہر اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس دور کے عوام میں قناعت کے فلسفے کو بہت زیادہ مقبولیت تھی جو اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا ردِ عمل تھا۔ مغل تخت پر اتنی تیزی سے بدلتے ہوئے بادشاہوں کو دیکھ کر انسان گوشہ نشینی کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ سودا کا شعر ہے۔

خطرہ ہے تجھ سے مسندِ شاہی کو اے فلک
حاضر ہے پوست تخت مرا پشم تو اکھاڑ

دہلی کی عظیم الشان عمارتوں اور حویلیوں کو اجڑا ہوا اور برباد دیکھ کر انسان سوچتا تھا کہ ان حویلیوں کا مالک بننے سے بہتر ہے کہ وہ کلاہِ فقیر سر پر سجالے۔ بقول سوداؔ:

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں
یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہیں اب اجاڑ

ایسی سجی ہے سر پہ سہارے کلاہِ فقر
جس کے حضور ہو نہ سکے تاجِ شاہ سبز

گھر امن کا اسی کو ملا زیرِ آسماں
جس نے جہاں میں آن کے مسمار کی ہوس

مفلسوں کو نہیں دنیا میں کسی کا خطرہ
خوف ہے ان کو کہ جو دام و درم رکھتے ہیں

گو منتظر دعا کا ہمارے ہے اب قبول
دست و دہن پسارے اپنی یہ خو نہیں

یہ رتبہ جاہِ دنیا کا نہیں کم مالِ زادی سے
کہ اس پر روز و شب میں سینکڑوں ہی چڑھتے آتے ہیں

دیکھی نہ بنا ہم نے وہ قصرِ فریدوں کی
جو اپنے خرابہ کی تعمیر نظر آئی

سوداؔ کے عہد میں تبدیلی اتنی تیزی سے ہورہی تھی کہ قناعت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کل جو تخت پر تھا، آج بھیک مانگ رہا ہے۔

طلب نہ چرخ سے کرنا تو راحت اے سوداؔ
پھرے ہے آپ وہ کاسہ لیے گدائی کا

سیم و زر کے آگے سوداؔ کچھ نہیں انسان کی
خاک میں رہنا بھلا تھا بلکہ اس اکسیر کا

میخانے میں ازل کے مرے دل سے زاہدا
دھویا ہے نقش ساقی نے امید وبیم کا

بیٹھ رہ سوداؔ تسلی دل کو دے
در بدر منت سے کیا حاصل پھرا

حباب آسا کیا ہے کار استغنا تمام اپنا
رکھا محروم میں قطرے سے اس دریا میں جام اپنا

طمع دولت کی بیتاب وتعب مت رکھ زمانے سے
مہوس تانہ جھونکے آگ میں مس زر نہیں ہوتا

مجھ گدا نے بھی کسی شاہ سے ڈالا نہ سوال
گو مجھے بخت نے اسکندر و دارا نہ کیا

دیر بانٹے تھا متاعِ دو جہاں اے سوداؔ
بے نوائی نے مری اس کو اشارا نہ کیا

شاہاں سے سوال اپنی رعونت شکنی ہے
کونین تلک ورنہ ہے پیشِ فقرا ہیچ

نہ دیکھی خوشدلی جز یک تبسم ہم نے غنچے میں
ہوا سے اس چمن کے ہے دلا ترکِ ہوس بہتر

نظر میں ان کے جن کو دولت استغنا نے بخشی ہے
مگس سے ہے ہما بہتر ہما سے ہے مگس بہتر

احساسِ تشنگی

سودا کو اس سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زوال کا شدید احساس ہے، جس نے حکمراں طبقے سے لے کر عوام تک ہر فرد کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ سودا کی ہجو و شہر آشوب، طنز و ظرافت اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان میں سیاسی اور سماجی شعور تھا۔ وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ورثے میں جو مروّجہ علوم ملے تھے اور جن فلسفیوں اور ادیبوں نے ان کی شخصیت بنائی تھی ان میں سے کوئی سودا کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا اور سودا حالات کا تجزیہ نہ کر سکے اور زوال کے گہرے اندھیرے میں دور تک روشنی کی کرن نہ دیکھ سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہاں تشنگی، پیاس اور بے چینی کا احساس پیدا ہو گیا۔ انھوں نے زندگی میں سب کچھ حاصل کیا۔ دولت، عزّت اور شہرت ہمیشہ ان کے غلام رہے لیکن جب سودا اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتے تو انھیں ایسے لوگ بھی نظر آتے جو حوادثِ زمانہ کے شکار تھے، سودا خود کو اس سماج کے اعلیٰ طبقے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ اس لیے اس طبقے کی بربادی خود ان کی بربادی تھی۔ شریفوں کو ذلیل اور ذلیلوں کو شریف بنتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ وہ جاگیرداری نظام کے پروردہ تھے۔ جس میں شرافت کا دارومدار انسان کے خاندان، خون اور حسب و نسب پر ہوتا ہے۔ ذاتی صلاحیتوں پر نہیں۔ سودا اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی زبوں حالی عبرت ناک تھی۔ ان کے سامنے اعلیٰ طبقے کا اقتدار پاش پاش ہو رہا تھا، اور نچلے طبقے کے بعض ذہین افراد اپنی ذاتی کوششوں، سازشوں اور چال بازیوں سے دولت اور طاقت حاصل کر رہے تھے۔ زوال کے اس خطرناک طوفان میں بعض لوگ ایسے ساحل پر اُتر گئے جہاں تصوف کے فلسفوں کی مدد سے انھوں نے زندہ رہتے ہوئے بھی زندگی سے فرار حاصل کر لیا اور وقتی طور پر مصائب و آلام سے نجات پالی۔ مگر سودا کے پہلو میں دل نہیں تھا اور دماغ بہت ہی مشکل سے تصوف سے سمجھوتہ کر سکتا تھا۔ اس لیے حالات کی ننگی تلوار ہمیشہ ان کی گردن پر لٹکی رہی۔ وہ اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے کس حد تک متاثر تھے، انھوں نے

حالات کا کس طرح تجزیہ کیا اور ان پر کس طرح تنقید کی ہے؟ اس پر تفصیلی بحث ''شہرآشوب'' کے باب میں کی گئی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ مالی اعتبار سے سودا تقریباً تمام زندگی آسودہ رہے۔ انھیں اپنے عہد کے امراء و رؤسا اور نوابین کی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن انھیں یہ احساس ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ آسمان ان کے حق میں بخیل ہے۔ انھیں دنیا میں وہ سب کچھ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ سودا نے اپنی ناکامی کا ذکر طرح طرح سے کیا ہے۔ محبت میں ناکامی اور محبوب سے دائمی جدائی بھی دنیوی ناکامی کے استعارے ہیں۔ اس موضوع پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا
کچھ اپنے تئیں جز ثمر خام نہ آیا

اس کا تو گلہ کیا ہے کہ بستانِ جہاں میں
مجھ تک قدح بادۂ گلفام نہ آیا

یوں منہ نہ دھوائے صبح کے آگے مرے سودا
جوں لالہ پر از خونِ جگر جام نہ آیا

کسی کا دین کیا حق نے کسی کی دنیا
سب کا سب کچھ کیا پر تجھ کو ہمارا نہ کیا

برگشتہ نصیب اپنے نہ پھرتے کبھو دیکھے
ہرچند رہی گردشِ ایام جہاں پر

پائے نہ جھانکنے بھی کبھو ہم درِ چمن
رکھتے ہیں دل میں رخنۂ دیوار کی ہوس

آن کر اس میکدے کے بیچ جز چشمِ پُرآب
قسمت اپنی ہم نہ پائے ساغرِ معمور تک

کیا گلا صیاد سے ہم کو یوں ہی گزرے ہے عمر
اب اسیرِ دام ہیں تب تھے گرفتارِ چمن

خرمنِ برق زدہ کا ہوں وہ دانہ کہ مجھے
نہ کوئی مرغ چگے نے کوئی بو دے مجھ کو

غم پرستی

غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔اس کا اثر مزاج پر مختلف ہوتا ہے۔بعض ہستیاں غم کو شکار کر لیتی ہیں اور بعض کو غم۔میر نے انفرادی اور ذاتی غم کو اتنی وسعت دی کہ اس میں آفاقیت پیدا ہوگئی۔ان کے اشعار میں کائنات کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ان کی یاسیت اور قنوطیت کی فضا میں انسانی وقار وعظمت کا احساس بلند حوصلگی،زندگی کی ہلچل،

گرمی، تڑپ اور ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ ملتا ہے، جس سے غم زدہ اور شکست خوردہ انسان میں حوصلہ، عزم اور نبرد آزمائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر سودا کا غم انفرادی اور کسی حد تک روایتی ہے۔ ایک بڑے شاعر کی طرح سودا اپنے غم میں آفاقیت اور ہمہ گیریت پیدا نہیں کر سکے۔ ان کے غم میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکی جو اپنے دامن میں ہر غم زدہ کو پناہ دے سکے اور جو ہر زخم پر مرہم کا کام دے سکے۔ غم کے بیان میں ان کی خارجیت مخل ہوتی ہے۔ ان کا مزاج مفہوم کے بیان کرنے سے زیادہ الفاظ کی مرصع کاری کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اسی لیے ان کی داستانِ غم سن کر بے ساختہ منہ سے ''واہ'' نکل جاتی ہے لیکن ''آہ'' صرف میر کا حصہ ہے۔

سودؔا کے ہاں غم کے بیشتر مضامین رسمی ہیں جن پر ان کے اندازِ بیان کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

سودؔا وصل میں بھی غم ہجر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں کیوں کہ غم ایک مستقل کیفیت ہے اور وصل وقتی :

وصل بھی ہو تو دل مرا غم کو نہ چھوڑے ہجر کے
یہ تو ہمیشہ ہے رفیق وصل ہے گاہ گاہ کا

آنکھوں سے آنسو اس وقت بہتے ہیں جب انسان اپنے غم کی انتہا پر پہنچ جائے اور ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو کسی کے رونے کا ذکر سن کر متاثر نہ ہوں لیکن سودؔا اپنی اشک باری کا ذکر اس طرح اور ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی شاعرانہ صناعی کا تو ضرور قائل ہو جاتا ہے لیکن متاثر نہیں ہوتا۔ مثلاً

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشکِ گرم سے
دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کو الم سے
تھا طفلی میں گہوارہ مرا دامن غم سے

شربت ہے مجھے زہرِ غمِ ہجر کہ میری
گھٹی جو بنی روزِ تولد سو وہ سم سے

غافل غضب سے ہو کے کرم پر نظر نہ رکھ
پُر ہے شرارِ برق سے دامن سحاب کا

پوچھتے ہی پوچھتے گذری ہے مجھ کو روز و شب
چشم ہے یا رب مری یا منہ کسی ناسور کا

سودا سے یہ پوچھا میں دل میں بھی کسی کو دوں
وہ کرکے بیاں اپنا روداد بہت رویا

بعض اشعار میں سوداؔ میرؔ سے قریب آگئے ہیں۔ اس لیے ان اشعار میں تاثیر بھی ہے اور درد بھی۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ چند ملاحظہ ہوں۔

دوستو سنتے ہو سوداؔ کا خدا حافظ ہے
عشق کے ہاتھ سے رہتا ہے یہ رنجور سدا

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہوگیا
دی تھی خدا نے آنکھ پہ ناسور ہوگیا

اس باغ میں اک گل کو خنداں جو کہیں دیکھا
سو غنچہ کی واں صورت دلگیر نظر آئی

زورِ بیان

سوداؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زورِ بیان ہے اور یہی خصوصیت انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اگرچہ دوسرے شعرا کے یہاں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے لیکن اس ہمہ گیری کے ساتھ نہیں کہ اسے ان کے کلام کی خصوصیت کہا جاسکے۔ یہ سودا اور صرف سودا کا حصہ ہے۔ اسی نے سوداؔ کو انفرادیت بخشی ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے سودا کی آواز سب سے علاحدہ ہے۔ ان کی طبیعت میں جو شگفتگی و زندہ دلی، نشاط و سرمستی اور رنگینی ہے۔ اسی نے ان کے وجدان کو نشاط آمیز بنایا ہے اور یہ زورِ بیاں اسی نشاط آمیز وجدان کا عطیہ ہے۔ ان کے کلام میں داخلیت موجود ضرور ہے لیکن اس میں سوز و گداز، درد و غم اور دھیمی دھیمی آنچ کی بجائے شوخی، البیلا پن اور زیرِ لب مسکراہٹ ہے۔ دبستانِ دلّی کے بیشتر شاعروں کے کلام پر یاسیت و قنوطیت، رنج و غم اور شکست خوردگی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس سودا کے ہاں وہ رجائیت ہے جو شکست کھاسکتی ہے لیکن شکست تسلیم نہیں کرسکتی۔ وہ بربادیوں کا ماتم نہیں کرتے، ناکامیوں کا نوحہ نہیں پڑھتے بلکہ ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور ان پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ اسی جذبے اور فطرت نے انھیں ممتاز ہجو نگار بنایا ہے۔

نشاط آمیز وجدان نے ان کے کلام میں ہماہمی اور طوفان کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔ سوداؔ صرف مفہوم ہی پر نہیں بلکہ الفاظ پر بھی توجہ کرتے ہیں۔ میر اور سودا کو زبان پر تقریباً برابر قدرت تھی۔ لیکن میر قلبی واردات کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کردیتے

ہیں۔ ان کے لیے شاعری دردِ غم کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس سوداؔ اسے فن سمجھتے ہیں۔ انھوں نے "عبرت الغافلین" اور "سبیلِ ہدایت" میں جو تنقیدیں کی ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معنی و الفاظ دونوں کو برابر اہمیت دیتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزادؔ نے سوداؔ کی اس خصوصیت کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "اُن کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقتِ کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں، جن سے کلام اُن کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چانپیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ چناں چہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا"۔ حقیقت یہی ہے کہ سودا کو الفاظ کی مرصع کاری پر جو قدرت تھی۔ وہ مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر اشعار بے ساختہ اور برجستہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف آمد ہے شاعر نے دماغ پر زور نہیں دیا خود بخود شعر ہوگیا ہے۔ حالاں کہ ایک اچھا شعر کہنے کے لیے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے
نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے

آئے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب
پروانے ہی کو شمع سے بیزار کر چلے

لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا

چمن میں صبح جب اس جنگ جو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تونے اسے کس آن میں دیکھا

سوداؔ کی جو بالیں پہ کیا شورِ قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

تم جن کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے ان کی
لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں

یہ اشعار زورِ بیان کی بہترین مثال ہیں۔ان کی برجستگی،سلاست،روانی، صفائی اور بے ساختگی کہہ رہی ہے کہ یہ معمولی دماغ کی پیداوار نہیں۔لطفِ بیان نے ان میں شعریت

پیدا کی ہے۔ ان میں زندگی کی ہمہ رنگی ہے خارجیت ہے۔ لیکن وہ خارجیت نہیں جس نے بعد کے شاعروں میں مریضانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ غم ہے، لیکن نبرد آزمائی کے حوصلے کے ساتھ۔ اسلوب بیان میں دریا کا سا بہاؤ ہے۔ یہ فن اکتسابی نہیں، خداداد ہے۔

سوداؔ کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے تکرارِ لفظی سے بھی کام لیتے ہیں۔ میرؔ کے ہاں بھی اس کی اچھی خاصی مثالیں ہیں لیکن دونوں کے ہاں نمایاں فرق ہے۔ سودا کے ہاں تکرارِ لفظی، شوخی، شگفتگی اور رنگینی کو بڑھاتی ہے۔ لیکن میر کے ہاں داخلیت کی کیفیت اور اثر کو۔

بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے
یاں چٹ کیے ہیں اس سے عمامے بڑے بڑے

قامت نے تیرے باغ میں جا خطِ بندگی
لکھوالیا ہے سروِ چمن سے کھڑے کھڑے

بوسہ کی ان لبوں سے یہ سوداؔ ہوس نہ رکھ
جن سے کہ مانگ مانگ میں دشنام رہ گیا

سن سن کے عرضِ حال مرا یار نے کہا
سوداؔ نہ باتیں بیٹھ کے یاں متصل بنا

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے
پھر پھر گل آ چکے پہ سجن تم بھلے گئے

ساقیِ سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

سوداؔ کے ہاں زورِ بیان کی ایک اور صورت ہے اور وہ ہے حروفِ عطف یا حروفِ ربط کے واسطے سے مصرع یا شعر کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا، یا مختلف ہم معنی الفاظ کو حرفِ عطف کے واسطے سے ایک مصرع میں جمع کرنا۔ اس سے ان کے کلام میں جو صوتی بلند آہنگی، ترنم اور موسیقیت اور پُر شور بیان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کی مخصوص انفرادیت کی تشکیل کرتی ہے۔

عزت و آبرو و حرمت و دین و ایماں
روؤں کس کس کو میں یارو کہ گیا کیا کیا کچھ
والہ و شیفتہ و زار و حزیں و مجنوں
اپنے عاشق کو کل اس نے نہ کہا کیا کیا کچھ
ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی
ایک گھٹنے میں جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

نہ تلطف نہ محبت نہ مروّت نہ وفا
سادگی دیکھ کہ اس پر بھی ملا جاتا ہوں

جور و ستم تعدی و اندوہ و درد و غم
مائل ہوئے ہیں اس دلِ ناشاد کی طرف

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام
کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح

مہر و وفا و شرم و مروّت سب ہی کچھ اس میں سمجھے تھے
کیا کیا دل دیتے وقت اس کو ہم نے خیالِ خام کیا

دین و دل و ایمان و حواس و خرد و ہوش
سب کچھ گئے لے کر نہ گئے سینے سے غم کو

صورت میں میں کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے
اک درج ہے سو وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے

صبر و قرار و ہوش و دل و دیں فدا کیا
تس پر بھی میری جان تجھے مجھ سے کیں رہا

نشاط آمیزی

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سوداؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو نشاط آمیز لب ولہجہ دیا ہے اور یہی خصوصیت ہے جو انھیں میر، درد اور دوسرے ہم عصر شعرا سے الگ کر کے ان کی آواز میں انفرادیت اور مخصوص آہنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر چہ سودا اس گہرائی، گیرائی، خود سپردگی اور خستگی سے محروم تھے جو شدید داخلیت کے لیے ضروری ہیں لیکن وہ اس بگڑی ہوئی خارجیت کے بھی شکار نہیں جو فحاشی کی حدوں سے آگے نکل جاتی ہے۔ ان کے ہاں ایک رکھ رکھاؤ، اعتدال اور توازن ہے جسے ان کے مزاج کی شگفتگی اور رنگینی نے حسین تر بنا دیا ہے۔ فراقؔ گورکھپوری نے سودا کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''سودا کے کلام میں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا گہرا رنگ اختیار کرنے کی بجائے شگفتگی، البیلا پن، سرمستی، نشاط اور رنگینی اختیار کر لی ہے۔ کیوں کہ جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو نشاط کی فطری وسعت شاعر کے دل کو دنیا کی رنگا رنگ بزم آرائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صحیح معنی میں خارجی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے''[1] سودا کے کلام میں تڑپا دینے والی تاثیر نہیں ہے لیکن ان کے مضامین میں جدت و ندرت ہے۔ تنوع و نکتہ آفرینی ہے۔ شوخی اور شگفتگی ہے جس کا اثر زبان و بیان پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ سودا کی شاعری صرف ''درد و غم'' کا بیان یا پردۂ سخن نہیں بلکہ وہ ہیئت پر بھی پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ اب سودا کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں انھوں نے غم عشق کا بیان کیا ہے۔

جوں شمع تن ہوا شبِ ہجراں میں صرفِ اشک
پر جس قدر میں چاہوں تھا اتنا نہ رو سکا

----

[1] فراقؔ گورکھپوری، انداز ے، الہ آباد، ۱۹۵۹ء، ص ۴۲

نہ کھینچ اے شانہ ان زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا
اسیرِ ناتواں ہے یہ نہ دے زنجیر کا جھٹکا

داغ تجھ عشق کا جھمکے ہے مرے دل کے بیچ
مہر ذرہ میں درخشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

تاثیر عشق نے مزۂ درد کھو دیا
ان نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا

بوسہ کے ذائقہ کو نہیں شہد و سم میں فرق
ہم پی گئے اسے ہمیں قسمت نے جو دیا

ہے طرفہ تمنا کہ رہوں لب بہ لب اس کے
جس سے کہ کبھو بوسہ بہ پیغام نہ آیا

خبر لے وادی میں سودا کی یوں سنا ہے آج
کہ ایک شوخ کسی بے گنہ کو مار آیا

سینے سے میں دعا کو لایا جو شب لبوں تک
کہنے لگی اجابت کیدھر خیال آیا

جب تیشہ کوہکن نے لیا ہاتھ، تب یہ عشق
بولا کہ اپنی چھاتی پہ دھرنے کو سل بنا

ترے کوچے سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا
جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا

ہے فکرِ وصل صبح تو اندوہ ہجر شام
اس روز و شب کے دھندے میں میں اب تو مر چلا

تو نے سوؔدا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

جب میں گیا اس کے تو اسے گھر میں نہ پایا
آیا وہ اگر میرے تو در خود نہ رہا میں

عجب قسمت ہماری ہے کہ جس کی شمع الفت سے
چراغ دل کیا روشن سو ہے داغ آشنائی کا

جو مذکور اس سے کرتا ہے مرا غم خوار رونے کا
تو کہتا ہے کہ چپ رہ ہے اسے آزار رونے کا

خونِ جگر شراب تر شع بہ چشم تر
ساغر مرا گرو نہیں ابر بہار کا

کس قدر بنت العنب سے دل ہے سودا کا بھرا
زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگذر
سودآ کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

سادگیٔ بیان

یہ ٹھیک ہے کہ سوداؔ کی غزل پر قصیدے کا رنگ ہے لیکن ان کے ایسے اشعار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جن میں سادگیٔ بیان کا اعجاز دکھایا گیا ہے۔ ان اشعار میں سودا نے فارسی ترکیبوں اور فارسی اضافتوں سے دامن بچائے رکھا ہے۔ ان اشعار میں حسنِ بیان بھی ہے اور تاثیر بھی۔ ان کے ہاں سہل ممتنع نہیں ہے۔ لیکن اس سہل بیانی اور سادگی بیان کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں، جس پر ہر شاعر کو قدرت نہیں ہوتی۔ یہ سلاست اور روانی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی۔

حاضر ہے تیرے سامنے سوداؔ کر اس کو قتل
مجرم یہ سب طرح سے ہے پر یک نگاہ کا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

جگر ان کا ہے جو تجھ کو صنم کہہ یاد کرتے ہیں
میاں ہم تو مسلماں ہیں خدا بھی کہتے ڈرتے ہیں

یارو میں کیا عہد اسے مانیو تم سچ
پھر دل نہ کہیں دوں اگر اب کی رہے جی بچ

سوجھی تدبیر نہ تقدیر کو بہلانے کی
جب تجھے قتل پہ عاشق کے مچلتے دیکھا

سرشکِ چشم نہ تھا میں کہ اے فلک تو نے
نظر سے خلق کے گرتے نہ مجھ کو تھام لیا

تیرے کوچہ سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا
جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا

جو عمل چاہیے کیجیے مرے دکھ دینے کا
وہ نہ کیجیے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

پیار و اشفاق و وفا مہر و محبت الطاف
دل کو جس روز لیا کون سا اقرار نہ تھا

غیروں کو دیکھ بیٹھے ہوئے بزم میں تری
جب کچھ نہ بس چلا تو میں ناچار اُٹھ گیا

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس کے کوچے میں نہ چل ساتھ مرے اے سوداؔ
آفت آجائے نہ اے یار کہیں میرے پر

سوداؔ کا حال تو نے نہ دیکھا کہ کیا ہوا
آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز

ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس
تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبح چمن تیرا
گل ایدھر لے گئے گلچیں گئی روتی ادھر شبنم

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

چھوٹی بحروں میں شعر کہنا میرؔ کا فن ہے۔ سوداؔ نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے اور جہاں تک اسلوبِ بیان کا تعلق ہے وہ اکثر میرؔ تک پہنچ جاتے ہیں۔ میر چھوٹی بحروں میں سادگیٔ بیان سے کام لے کر شعر کو تیر و نشتر بنا دیتے ہیں۔ سودا نے بھی چھوٹی بحروں میں گفتگوے سادہ کی ہے۔ رہا سوال تاثیر کا تو وہ صرف میر کا حصّہ ہے۔

دیکھے بلبل جو یار کی صورت پھر نہ دیکھے بہار کی صورت
برق دیکھی ہو جس نے سو جانے مجھ دلِ بے قرار کی صورت

قاصد اشک آ کے خبر کر گیا قتل کوئی دل کا نگر کر گیا
فائدہ اب کیا کرے تریاق وصل زہرِ غمِ ہجر اثر کر گیا

دل میں ترے جو کوئی گھر کر گیا سخت مہم تھی کہ وہ سر کر گیا
وہمِ غلط کار نے دل خوش کیا کس پہ نہ جانے وہ نظر کر گیا

دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر دل خالی کیا میں آہ بھر کر

رنجش کا مرے نہ پوچھ باعث آ جانے دے یار در گذر کر

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں　　ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے　　سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

جب نظر اس کی آن پڑتی ہے　　زندگی تب دھیان پڑتی ہے
جھیل لیتے ہیں عاشق اے فریاد　　جس کے سر جیسی آن پڑتی ہے

دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے　　دین و دنیا سے جی اچٹتا ہے
عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف　　دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

مشکل زمینیں

سودا نے نئی نئی اور مشکل زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی چابک دستی سے ان سنگلاخ زمینوں کو پانی کردیا ہے۔ انھیں الفاظ پر اتنی قدرت ہے کہ خارزار بھی گلستاں بن جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان کی خارجیت اشعار کو سوز و گداز سے محروم کردیتی ہے۔ سودا کی ایسی غزلوں میں محض قافیہ بندی ہوتے ہوئے بھی وہ خارجی فن کا مکمل نمونہ ہیں۔ ان زمینوں میں سے بیشتر سودا کی اپنی ایجاد ہیں۔ یہاں چند زمینیں اور ردیف، قافیے پیش کیے جاتے ہیں جن سے سودا کے عظمتِ فن کا اندازہ ہوگا۔

ع　　ٹک خاک لے تو چھوڑ کے غافل پلنگ و خواب

سنگ و خواب، بنگ و خواب، ننگ و خواب، شلنگ و خواب، لنگ و خواب

ع　　ہمیشہ سے مری چشمِ پر آب در تہ آب

حباب در تہ آب، گلاب در تہ آب، سراب در تہ آب، خراب در تہ آب، کباب

درۂ آب، آفتاب درۂ آب، حجاب درۂ آب، خوشاب درۂ آب

ع ودا بہت ہے جو دے سر کو سنگ و خشت شکست

زشت شکست، کنشت شکست، کشت شکست

ع فندقی انگشت کیا کر رہا ہے رنگ دست

اورنگ دست، مرسنگ دست، زیر سنگ دست، ڈھنگ دست، جنگ دست،

پاسنگ دست، دنگ دست

ع لاگے ہے کس کے منہ پہ بایں زور پشت دست

مغرور پشت دست، دور، بدستور، پور، مقدور، نور، منظور

ع ہستی کو تری بس ہے اک گل کی اشارت

بلبل، بل، تل، کاکل، پل، سنبل، تلقل

ع نالے کا اپنے چمن میں جو کروں ساز درست

آواز، انداز، اعجاز، ناز، طناز، دغاباز، خداساز

ع بنگ پی بنگ خیال اس کا ہے افلاک پرست

خاک، ادراک، تاک، فتراک، ہوسناک، خاک، مسواک، بیباک

ع اشک کو کب ہے شناسائے گہر سے پیوند

نظر، شجر، بحر، اثر، دیدۂ تر، جگر، ہنر

ع کھینچ کر پوست کرے گردش ایام سفید

بادام، انجام، گل اندام، سیہ فام، شام، نیگام

ع   یہ اس کے رنگِ عارض سے ہے دل بیتاب آتش پر

سیماب، آب، تیزاب، اسباب، شب تاب، سرخاب، شراب ناب، گرداب، پیچ وتاب۔

ع   کب لگ سکے اس سے کوئی رنگ اور نمک

نیرنگ، تنگ، سنگ، رنگ، جنگ، ڈھنگ، آہنگ، بنگ، گلرنگ۔

سوداؔ کی مشکل زمینوں کی ان غزلوں میں بھی بیشتر اشعار ایسے ہیں جو صرف قافیہ بندی کے زمرے میں آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی زمینوں میں مضمون کی طرف شاعر کی توجہ بہت کم جاتی ہے۔

شمع رو کہنا اسے سوداؔ ہے تاریکی ٔ عقل
شمع کا عکس اس کے عارض پر کلف ہے ماہ کا

سمور و قاقم و سنجاب سرما میں منعم کو
رکھیں ہیں آسرا غربائے لنج و لنگ آتش کا

کر رکھا ہے کلسِ گنبدِ دستار اُسے
شیخ جی آپ ہیں کس مرتبہ مسواک پرست

جو دیکھے مرغِ ہوا کو وہ دام میں تیرے
تو ہووے رشک سے ماہی کباب در تہ آب

گئی ہے سر سے گذر موج اشک آنکھوں کی
مجھے یہ لے گئی خانہ خراب در تہ آب

بے خوابی سے ہے میرے جو شا کی وہ شمع رو
یارو کہو یہ اس سے کہ ناداں پتنگ و خواب

دل طوطیٔ خط کو نہ دے اس شوخ کے سوداؔ
کھاوے گا اس آئینے کو زنگارِ محبت

دامن ابر نچڑتا ہے جو اتنا شاید
کسو عاشق کے ہوا دیدۂ تر سے پیوند

فریب وعدہ کا شکوہ جو میں رو رو کے کرتا ہوں
تو میری سادہ لوحی پر وہ ہنس دیتا ہے قہہ قہہ کر

جز خطِ سبز عارض دلدار ہم نشیں
دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو رنگ اور نمک

ہر مرغ کو پہچان کے نامے کو تو لینا
نامے کے کبوتر کا ہے میرے جگری رنگ

ایہام گوئی

سوداؔ جب میدانِ ادب میں آئے ہیں تو ایہام گوئی متروک ہو چلی تھی اور اکثر شاعر اس غیر فطری صنعت سے متنفر ہو چکے تھے۔ شاہ حاتم ایہام گوئی سے توبہ کر چکے تھے۔ سودا جیسے ذہین انسان کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ بھی ایہام گوئی سے انکار کر دیں۔ ان کا شعر ہے۔

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکرِ سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

تاہم سوداؔ کے یاں بھی ایہام کی چند مثالیں مل جاتی ہیں۔ لیکن کلیاتِ سوداؔ کی ضخامت کے پیش نظر ان مثالوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اگر سودا ایہام میں شعر کہتے ہیں تو انھیں یہ معذرت پیش کرنی پڑتی ہے۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرا نہیں ہے یہ
مضمونؔ و آبروؔ کا ہے سوداؔ یہ سلسلہ

چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سوداؔ نے ایہام سے کام لیا ہے۔

کس قدر بنت العنب سے دل ہے سوداؔ کا برا
زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

سوداؔ غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا
گل پھاڑیں سن کے جیب کو، دیں بلبلیں صلا

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں

فیروزہ ہووے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا

جب مست چمن سے ہو چلا گھر کو وہ لالا

غنچے نے صراحی لی اٹھا گل نے پیالا

انھوں نے ایک پوری غزل ایہام میں کہی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے

جو کچھ تو چاہے یک شب مجھ پاس آکے سولے

وہ تو پچی کا ہرگز ہم کو لکھے نہ نامہ

گدڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گولے

اس غزل کے مقطع میں بھی سوداؔ نے معذرت پیش کی ہے۔

ہو شاد اس غزل سے روح آبروؔ کی سوداؔ

تو اس زمیں میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

مزاح اور ظرافت

سوداؔ اردو ہجو نگاری کے امام ہیں اور ابھی تک اردو ادب کی پوری تاریخ اس فن میں سوداؔ کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی ہجو نگاری پر علاحدہ باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف اس ظرافت کا جائزہ لینا مقصود ہے جو اُن کی غزلوں میں بکھری ہوئی ہے۔

سوداؔ فطری طور پر ہنسوڑ، زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کا کلیات پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے اردگرد ہونے والے واقعات اور حالات کا گہری نظر سے جائزہ

لے رہا ہے۔ جہاں کہیں اسے بے جوڑ، بے ڈھنگی، بے آہنگ اور مضحکہ خیز چیزیں نظر آتی ہیں۔ وہ ہنس دیتا ہے کبھی یہ ہنسی زیرِ لب ہوتی ہے اور کبھی قہقہہ بن جاتی ہے۔ سودا اپنے کمالِ فن سے ان واقعات کی تصویر اُتار دیتے ہیں اور اگر اصل واقعات میں کچھ کمی ہوتو وہ اپنے زورِ تخیل سے انھیں مکمل اور جامع بنا دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات تمام انسانوں کی ملکیت بن جاتے ہیں۔

بقول مولانا محمد حسین آزادؔ ''ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں بھی ظرافت کا عنصر ہے''۔

غزل میں جہاں کہیں ان کی رگِ ظرافت پھڑکی ہے۔ وہ متانت و سنجیدگی اور تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں آئے۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی طرح اکثر و بیشتر وہ خود ہی اپنے نشتروں کا شکار بنتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اور محبوب کی کمزوریوں کا اس طرح سے مضحکہ اُڑایا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ یہ ظرافت اس عہد کے عاشق اور محبوب کے تعلقات کی مکمل تصویر بھی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس مصیبت سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے
تو کہے آج ہی جا میں کہوں کل جاؤں گا

نواحی میں ترے کوچے کی ہے یہ حال سوداؔ کا
کہ جوں چغد آشیاں گم کر کے بستی میں پھرے بھٹکا

باتیں کرو عدو سے سوداؔ کو گالیاں دو
قرباں ہوں آپ کی میں اس داد اور دہش کا

مجلس سے مجھ کو اٹھتے جلیسوں کے سامنے
عزت کبھو نہ دی یہ کہ پوچھے کدھر چلا
نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھ ان دنوں رقیب
تھوڑے سے دم دلاسے میں کتنا ابھر چلا

مانگا جو میں دل کو تو کہا بس یہی اک دل
جتنے ہی تو چاہے مرے کوچے سے اٹھا لا

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا منہ
طلب رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح

نکالے ہے وہ بے رنج ہو کے اپنے گھر سے یوں مجھ کو
شہ شطرنج کو جس طرح کشتیں دیویں شہہ شہکر

ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آجاتا ہوں
صید خائف کی طرح رو بقضا جاتا ہوں

جب پیر مغاں سے جا میں دخترِ رز مانگی

بولا کہ سعادت ہے پر وہ ابھی بالی ہے

جو یوں لاٹھی دکھاتا ہوں تو دانت اپنے نکوسے ہے

رقیب آگے ترے دے ہے مجھے بندر کی سی گھڑکی

فارسی اور اردو ادب میں شیخ و زاہد کی عیاری و مکاری پر بہت لے دے رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں کے طنز و ظرافت کا حصہ اس موضوع پر ہے۔ سودا نے بہت دل چسپ انداز میں واعظ و شیخ کی گت بنائی ہے۔ اس موضوع پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں چند شعر اور ملاحظہ فرمایئے۔

سچ میں دنیا تو ہم چھوڑیں گے لیکن زاہدا

چھوڑنا تیری طرح داڑھی کا مشکل ہوئے گا

ٹوٹا وضو شیخ تو جورو کے ان کی نیند

اچٹی تو یہ کہا کہ صدائے تفنگ و خواب

واعظا دیکھیو بولا تو اگر سوداؔ سے

بے طرح کا ہے یہ کافر بتِ بیباک پرست

ڈروں ہوں میں نہ کریں رند تیری داڑھی کا
تبرکات میں داخل ہر ایک مو واعظ

ہزار شیشۂ مے اس میں تیں چھپائے ہیں
تری جو پگڑی ہے یہ صورتِ سبو واعظ

دیکھ زاہد کے سر عمامۂ نو
ہاتھ اٹھا رند بولے یا رزّاق

شیخ صاحب کے عقد میں دنیا
آئی تھی کب جو دی انھوں نے طلاق

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے نہ موڑا
الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

غزل کے بعض قطعات ظرافت کی مکمل تصویریں ہیں، جن میں سوداؔ نے مضحکہ خیز واقعات پیش کیے ہیں اور ان واقعات کی ستم ظریفی کا اکثر شکار خود ہیں۔

سوداؔ کو کہتے ہیں کہ ہے اس سے مصاحبت
کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا

اوروں کی نسبت ان دنوں کچھ لگ چلا تھا وہ
دو چار جھڑکیوں میں بدستور ہوگیا

ایک اور قطعہ میں سودؔا نے اردو شاعری کی اس روایتی محفل کا مضحکہ اڑایا ہے جس میں محبوب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے عاشق وہاں پہنچتا ہے۔اس کے ساتھ وہ ہی بے اعتنائی برتی جاتی ہے جو روایتی عاشق کی قسمت میں ہے۔سودا کے قدرتِ بیان اور جزئیات نگاری نے اس قطعہ کو انتہائی دل چسپ بنادیا ہے۔

ترغیب نہ کر مجھ کو واں چلنے کی اے سودؔا
اس یار نے اب ہم سے یہ چہل نکالی ہے
وارد میں ہوا اس کے کل گھر میں تو یہ دیکھا
تیوری سے چڑھا صورت کچھ اور بنالی ہے
ہر بات پہ ہے میری اوروں سے اسے چشمک
مجھ پر وہ کنایہ ہے نوکر پہ جو گالی ہے
غیر اس کے اشارے سے جب کرنے لگے نوکیں
اُٹھا میں یہ کہہ کر تب یاں مرغ کی پالی ہے
ایک ان میں سے یوں بولا کیوں جاتے ہو تم بیٹھو
جاؤ گے تو یہ مجلس پھر لطف سے خالی ہے
اس شوخ نے یہ سُن کر بولا کہ خدا سے ڈر
سر پر سے بلا اپنی جوں توں کی میں ٹالی ہے
پس غور کر اے ناداں جس گھر میں یہ صحبت ہو
واں جا کے خوشی آنا یہ خام خیالی ہے

ایک اور قطعہ میں سودا نے ایک شیخ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ شیخ صاحب قسمت کے مارے ایک شام کو اتفاق سے میخانے سے گزرے۔ رندوں نے کس طرح اُن کا استقبال کیا اور ان کی کیا گت بنائی سودا کی زبانی سنیے:

کوئے میخانہ سے ناگہ شام کو گذرے جو شیخ
کیا کہوں سودا جو رندوں نے سلوک ان سے کیا
کر سلام ان کو کہا جلدی سے لو یارو قدم
ہیں ز قسم اولیا یا از قبیلِ انبیا
کوئی بولے تھام لو منہ سے انھوں کی خاک پا
کوئی کہتا تھا کرو آنکھوں میں اپنے طوطیا
آخر کار اس جگہ کیا دیکھتا ہوں رات کو
وہ مقدس صورت اور ایسے بزرگِ بے ریا
ڈھونڈتے جاتے ہیں پیچھے پیچھے عمامہ کو آپ
اک مرید آگے چلا جاتا ہے دکھلاتا دیا

قطعات

سودا فارسی کے جن شاعروں سے متاثر تھے ان میں نظیری نیشا پوری کا بھی نام آتا ہے۔ نظیری کی طرح سودا نے بھی اکثر قطعہ بند غزلیں کہی ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ جزئیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی اور رہی سہی کسر وہ اپنے تخیل سے پوری کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قطعات منظوم افسانچے بن گئے ہیں۔ اس قسم کے چند قطعات ''ظرافت نگاری'' کے تحت دیے جا چکے ہیں۔ چند اور ملاحظہ ہوں۔ ایک قطعہ میں سودا نے اہلِ دنیا اور اہلِ چمن کا موازنہ کیا ہے۔ انھیں اہلِ چمن پر رشک آتا ہے۔ کیوں کہ خدا نے زندگی کا پورا لطف ان کی قسمت میں لکھا ہے وہ کسی سے حسد کرتے ہیں اور نہ کوئی اُن سے۔ انھیں والیٔ شام بننے کی تمنا ہے اور نہ والیٔ روم، نہ وہ ہوسِ جاہ و منصب میں گرفتار اور نہ کوئی انھیں بخشش کرنے والا ہے۔ یہ اہلِ چمن کبھی تلاشِ دنیا میں

مارے مارے نہیں پھرتے ان کی پوری زندگی عیش و عشرت کا مرقع ہے۔ صبح کو جب بلبل حسین نغمے سناتی ہے تو ہر ایک گُل بہار سے اپنے حصّے کا جام لے لیتا ہے۔ اس قطعہ میں سودا کی تمنا ردِّعمل ہے اُن کے سیاسی و سماجی حالات کا۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

معاشِ اہلِ چمن جائے رشک ہے سودا
کہ زندگی کا انھوں نے مزا تمام لیا
کسی کا ان میں سے محسود ہے نہ والیٔ روم
حسد کسی کو نہ اس پر کہ جن نے شام لیا
کہیں نہ واسطے منصب کے ہیں یہ مجرائی
سلام کر کے کسو سے نہ لاکھ دام لیا
کبھو میں ان کو نہ دیکھا تلاشِ دنیا میں
کبھو نہ فکر و تردد سے کوئی کام لیا
ادھر شروع ہوا صبح نغمۂ بلبل
ادھر بہار سے ہر ایک گُل نے جام لیا

ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو، جس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قطعہ میں بھی بھرپور افسانویت ہے۔

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں
یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں
دل کو جن کے ہے تعلق یہ مکاں کیا جانے
عدم و ہستی انھوں نے کے بگماں ہے کہ نہیں
دیکھا میں قصرِ فریدوں کے در او پر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

اردو میں اس قسم کی قطعہ بند غزلیں بہت کہی گئی ہیں۔ میر تقی میر کے یہاں بھی اس کی اچھی

مثالیں موجود ہیں۔ لیکن سوداؔ نے ان قطعات کو جس مقصد کے لیے استعمال کیا اور جس طرح اپنے مشاہدے اور تجربے سے انھیں مکمل تصویریں بنا دیا اس کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ملیں گی۔

عریانیت

سوداؔ نے ہجونگاری میں فحاشیت اور ابتذال کی انتہا کردی ہے۔ جو ہجویں دہلی میں کہی گئی ہیں ان میں سوداؔ تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں گئے۔ لیکن ضاحکؔ اور فاخر مکیں ہجویں جو اودھ میں کہی گئیں ہیں انھیں دونوں کی ہجوؤں میں سب سے زیادہ فحاشیت ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ اودھ کا ماحول اس فحاشیت کے لیے سازگار تھا۔ غزل میں سودا نے بہت کم فحش، عریاں اور مبتذل شعر کہے ہیں اور وہ بھی انشاؔ اور جرأتؔ کی معاملہ بندی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اگرچہ اردو میں خارجیت کی ابتدا سوداؔ سے ہوتی ہے لیکن سودا معاملہ بندی کی اس کیچڑ میں نہیں گرے جس نے بہت سے دامنوں کو خراب کیا۔ بلکہ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ سودا کے ہاں معاملہ بندی بہت کم ہے اور فحش اشعار کی تعداد حیرت انگیز طریقہ پر مختصر ہے اور اتنے اشعار خواجہ میر درد جیسے بزرگ کے دیوان میں بھی مل جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے ہاں غزل گوئی کے خاص معیار تھے اور انھوں نے غزل پر ہجو کا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔ اس کے برعکس میرؔ صرف غزل کے شاعر تھے مگر ان کے ہاں فحش اشعار کی تعداد سودا کے اشعار سے کہیں زیادہ ہے۔ معاملہ بندی کے چند اشعار سنیے۔

ہوا جاتی رہی وعدوں ہی میں تو شک نہالی کے
جواب بھی سو رہو لی کر تو جاڑا ہے دولائی میں

صورت ملی دو کی زباں کو کرو گے کیا
گو ہم سے تم نے صحبتِ شب کی چھپائی بات

پھولوں کی سیج پر جو نہ سوئے تو کیا ہوا
یہ عیش ہے کہ تو ہو بغل بیچ تنک و خواب

آج تو مل گئے تنہا یہ کہو تو بارے
اب نہ ملنے کی مکافات کروں یا نہ کروں

اب چند اشعار ایسے ملاحظہ ہوں جن میں ہلکی سی فاشی ہے۔ مگر ناگوار نہیں:

چپّی اُٹھ کر میں تجھے رات کروں یا نہ کروں
حق خدمت بھی کچھ اثبات کروں یا نہ کروں

اُٹھ جانے میں ہے زور مزا یار سے لڑ کر
ملتے ہیں تو پھر چھاتی سے چھاتی کو رگڑ کر

واہ وا ہے، تمباکو والے کے
دے ہے تو دھا ہمیں دکھا کے گال

تمثیل نگاری

اس فن میں سوداؔ نے صائبؔ کا تتبع کیا ہے۔ بقول شیخ چاند صائبؔ نے یہ صنعت زیادہ تر اخلاقی اور حکیمانہ مضمون کے لیے استعمال کی ہے۔ لیکن سوداؔ نے اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کے ساتھ ساتھ عاشقانہ مضامین میں بھی اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ اس صنعت میں پہلے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر انسان کی فطرت ہی خراب ہو تو نیک لوگوں کی

صحبت کیا اثر کرسکتی ہے اور مثال یہ دیتے ہیں کہ آب گہر سے کبھی رشتہ تر نہیں ہوسکتا۔ یا پہلے مصرع میں کہتے ہیں کہ روشن دل کبھی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتے اور پھر چراغ کی مثال دیتے ہیں جو کبھی اپنے سائے سے آگے نہیں بڑھتا۔

سوداؔ کے عہد میں اردو ابھی نوزائیدہ تھی۔ یہ سوداؔ کی قادر الکلامی اور استادی کا کرشمہ ہے کہ انھوں نے بعض مشکل مضامین ادا کیے ہیں۔ اس صنعت میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

زینت دلیل مفلسی ہے تنگ کماں کو دیکھ
نقش و نگار چھٹ نہیں کچھ اس کے خانے میں

میں زمانے کی سخاوت کا نہیں ہرگز مقر
چھین کب لیتے ہیں کچھ دے کر کسی کو اہلِ جود

دل بے عشق کی دشمن ہے تحریک نفس ناصح
کرے ہے کام پتھر کا ہوا مینائے خالی سے

امن دو دل کو یک جا بہ بساطِ دوراں
چوٹ کھاتی نہیں وہ نرد جو ہو نرد کے ساتھ

خیال بندی

سوداؔ کے لیے شاعری دردو غم کے اظہار کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ وہ شاعری کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں خارجیت ہے۔ ان کی غزل میں بے شک وہ تڑپا دینے والا اثر

نہیں ہے جو داخلی شاعروں کی خصوصیت ہوتا ہے۔ لیکن غزل کی ہیئت کو جو کچھ انھوں نے دیا ہے، ان کے عہد کا کوئی شاعر نہیں دے سکا۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی صرف ان شاعروں کے کلام میں ملتی ہے جو دل سے نہیں دماغ سے شاعری کرتے ہیں، جن کا مشاہدہ بہت وسیع ہوتا ہے اور جنھیں زبان و بیان پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ یہ جادو دکھانے کا فن ہے۔ اس میں وارداتِ قلبی، انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ صرف شکوہِ الفاظ، استعاروں اور تشبیہات کی مرصع کاری ہوتی ہے۔ معنی یابی اور مضمون آفرینی کے بارے میں محمد حسین آزاد نے بہت جچی تلی رائے دی ہے۔ وہ ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں۔ ''کلام کو رنگین اور استعارہ و تشبیہہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے۔ مگر زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب اس طرح ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو یہ بات بہت مشکل ہے۔ شیخ سعدی کی گلستاں کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے نہ اس میں نازک خیالات ہیں نہ کچھ اعلیٰ مضامین ہیں، نہ پیچیدہ تشبیہیں ہیں نہ استعارہ در استعارہ فقرے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں، صاف صاف باتیں ہیں۔ اس پر آج تک اس کا جواب نہیں۔ مینا بازار اور پنج رقعہ کے انداز میں صدہا کتابیں موجود ہیں۔ اس معاملے میں غور کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بزرگ خیال بندی اور نازک خیالی کے چمن میں ہوا کھاتے ہیں اوّل ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے نئے مضامین نکالیں جواب تک کسی نے نہ باندھے ہوں لیکن جب متقدمین کے اشعار سے کوئی بات بچی ہوئی نہیں دیکھتے تو ناچار انھیں کے مضامین میں موشگافیاں کرتے ہیں اور ایسی ایسی لطافتیں اور نزاکتیں نکالتے ہیں کہ غور سے خیال کریں تو نہایت لطف حاصل ہوتا ہے''۔[1]

فارسی میں ناصر علی، غنی اور بیدل کے کلام کو اور اردو میں ناسخ کی پوری شاعری کو اس معنی یابی اور مضمون آفرینی نے ڈبویا۔ سودا کے ہاں خیال بندی فارسی شاعروں اور خاص طور پر بیدل کے اثر سے آئی۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے یہ اثر ضرور قبول کیا مگر بہت معمولی۔ اس لیے ان کے ہاں اس قسم کے اشعار کی تعداد غزلوں میں بہت محدود ہے۔ البتہ قصائد میں نسبتاً زیادہ ہے اور درحقیقت خیال بندی قصائد ہی کے لیے موضوع بھی ہے۔ اب چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

---

1. آبِ حیات، ص ص ۳۹۰-۳۹۱۔

رطوبت داغ دل میری کی ہے گرداب آتش کا
فسونِ عشق نے زہرہ کیا ہے آب آتش کا

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشکِ گرم سے
دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

گل مرے مشہد پہ کب بھیجے ہیں وہ ابرو کماں
طرح غنچہ کے کھلے جب تک نہ پیکاں تیر کا

بسانِ طائرِ رنگِ حنا قدم لے کر
ہر ایک کبک نے پیارے ترا خرام لیا

دیکھا میں گلے میں تیرے ہار دست غیر
تارِ نگہ میں اشک کا دانہ پرو دیا

لب لعلِ بتاں پر سرخیٔ پاں ہے کہ جادو ہے
بنا دی شکل طوطی صورتِ سرخاب آتش پر

گر نہ ہو پانی دل اس کا خوف سے اے شعلہ خو
لگ اٹھے تیری نگاہِ گرم سے درپن میں آگ

یہ نہیں دریا کہ جس سے گزرے تو پل باندھ کر
موجِ چشمِ عاشقاں دے توڑ پل میں پل کے پل

اڑ لگتی ہے جلوے پہ حسینوں کے مری آنکھ
دید اُن کی سے پہنچے ہے بہم بال و پرِ چشم

بہ معنی آشنا مینائے مے ہے پر ز خاموشی
برائے ہرزہ گو گفتار لا طائل ہے شیشے میں

طائرِ رنگِ حنا کی نمط اب اے صیاد
ہوں تو میں ہاتھ میں تیرے پہ اڑا جاتا ہوں

خیالِ پنجۂ مژگاں میں یہ احوال ہے دل کا
کہ جیسے صید کو شاہین کا چنگل مسلتا ہے

شمع رو کہنا اُسے سوداؔ ہے تاریکیٔ عقل
شمع کا عکس اس کے عارض پر کلف ہے ماہ کا

حُسنِ تعلیل

اس صنعت میں پہلے شاعر کوئی واقعہ یا حقیقت بیان کرتا ہے اور اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی جو علّت پیش کرتا ہے وہ صرف اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً پہلے مصرع میں شاعر اپنے محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ رات تو بے نقاب پھرتا ہے اور دوسرے مصرع میں اس دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے کہ جبھی تو سورج شرم کے مارے پانی میں جا چھپتا ہے۔ حالاں کہ رات کو سورج کے چھپنے کے وجوہ کچھ اور ہیں۔ سوداؔ کو یہ صنعت بہت پسند تھی اس لیے ان کے کلام میں حُسنِ تعلیل کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

چمن نہ تنہا جنھوں کے غم سے ہنوز چھاتی پہ کھائے ہے گل
رکھے ہے اب تک ہزار جا سے روش بھی سینہ فگار اپنا

دلیل ہے تری شب بے نقاب پھرنے کی
چھپے ہے شرم سے جا آفتاب در تہ آب

تارے یہ نہ سمجھو بہ شب تار فلک پر
پہنچی ہے مری آہِ شرربار فلک پر

تنہا نہ شمع روئے ہے سوداؔ کی خاک پر
گل بھی تو لوٹتا ہے گریباں کو پھاڑ پھاڑ

شبنم کرے ہے دامن گل شست و شو ہنوز
بلبل کے خون کا نہ گیا رنگ و بو ہنوز

کلیوں نے دیکھ شوخیٔ گل چیں کو اس قدر
اتنا لہو پیا کہ ہے پر خوں دہن ہنوز

کس کے ہیں زیر زمیں دیدۂ نم ناک ہنوز
جا بجا سوت ہیں پانی کے تہ خاک ہنوز

یاقوت نہیں ہے وہ ترے لعل سے اے شوخ
جا ڈوبی ہے یہ آب میں ہوکر خجل آتش

کہکشاں ہے نام کو لیکن مرے احوال پر
آسماں روتا ہے منہ پہ دھر کے ہر شب آستیں

شب نہ تنہا بے قراری سے مجھی کو کام ہے

نورِ شمع اس شوخ بن جوں برق بے آرام ہے

لالہ خود رو نہیں ہے خون نے فرہاد کے

جوش میں آ کر لگا دی کوہ کے دامن میں آگ

تشبیہات و استعارات

سوداؔ نے تشبیہوں اور استعاروں کو بھی اظہارِ بیان کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ تشبیہوں کے سہارے سے ایک مفہوم ادا کرتے ہیں۔ ایک مفہوم کے سہارے تشبیہہ کا استعمال نہیں کرتے۔ اسی لیے ان کی تشبیہیں بہت سادہ اور پرکار ہوتی ہیں جن کی بنیاد ان کے تجربات اور مشاہدات پر ہوتی ہے۔ سوداؔ تشبیہہ کی مدد سے بے جان الفاظ میں روح ڈال کر ایک جاندار تصویر بنا دیتے ہیں۔ محبوب کی نازک اندامی کے لیے اس سے بہتر تشبیہہ نہیں ہوسکتی کہ جب محبوب کو پسینہ آتا ہے تو اس کے جسم پر ایسے خراش آجاتے ہیں جیسے موم پگھلنے سے شمع پر۔

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سوداؔ بیاں

شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

شاعر محبوب کی گلی سے بغیر آواز پیدا کیے دبے پاؤں آہستہ آہستہ گزرتا ہے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ اس کی اپنی کوئی منزل اور جائے قیام نہیں ہے۔ جس طرف راستہ ملتا ہے وہ بڑھ جاتا ہے۔ دیکھیے سودا نے اس کیفیت کو کیسی خوبصورت تشبیہہ کے ساتھ بیان کیا ہے :

تری گلی سے گذرتا ہوں اس طرح ظالم
کہ جیسے ریت سے پانی کی دھار گذرے ہے

سوداؔ نے ان تشبیہات کے بیان میں زندگی کے عام تجربات اور مشاہدات سے بھی کام لیا ہے۔ جب لشکر روانہ ہونے کے لیے تیاری کرتا ہے تو ہر طرف گرد اٹھتی ہیں۔ سودا اس تشبیہ کا بڑا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔

کوچ شاہِ حُسن کا ہے وہ غبار خط نشاں
گرد لشکر سے اُٹھی وقتِ سواری بیشتر

یہ حقیقت ہے کہ تشبیہوں نے بعض اشعار کو بے مزہ اور پھیکا بھی کر دیا ہے۔ایسی چند تشبیہیں اور استعارے اور ملاحظہ فرمایئے:

بخشے ہے یوں دل کو میرے تقویت دشنام یار
جوں دوائے تلخ سے پاوے کوئی بیمار فیض

دیکھوں ہوں یوں میں اس ستم ایجاد کی طرف
جوں صید وقت ذبح کے صیاد کی طرف

تجھ بن اعضا کا ہے یہ میرے حال
تارِ شیرازہ بن ہوں جوں اوراق

ٹکڑے تو ابھی لعل کے دل بیچ دھرے ہیں
ہم نے تو ابھی موتی ہی آنکھوں میں بھرے ہیں

جن نے نہ دیکھی ہو شفق صبح کی بہار
آکر ترے شہید کو دیکھے کفن کے بیچ

حلقہ میں اس کی زلف کے عارض پہ کر نظر
جوں شب میں رہ گیا ہو گرہ کھا کے نورِ صبح

بزم میں وہ شمع رو یارب کرے گا کب ورود
یوں ہوں آتش زیر پا جس طرح سے مجمر میں عود

دُرِ آویزہ اس کی زلف اور رخسار سے باہم
جھلکتا ہے برنگِ گوہرِ شب تاب آتش پر

قصیدہ نگاری

موضوع کے اعتبار سے قصیدے کا دامن بہت وسیع ہے، اس میں مدح، ستائش اور ہجو کے علاوہ مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی جاسکتی ہے، مثلاً مناظرِ قدرت، مظاہرِ فطرت، پند و نصائح، مذہبی خیالات، معاشی بدحالی، سیاسی انتشار، موسم کی کیفیت، مختلف علوم کا بیان وغیرہ بھی قصیدے کے موضوعات ہیں۔ شہر آشوب بھی قصیدے ہی کا ایک انداز ہے۔

قصیدے کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی، بقول شبلی:

> ''ایران میں جس زمانے میں شاعری کا آغاز ہوا، عرب کی شاعری مدحیہ قصائد پر محدود تھی، اس لیے ایرانی شعرا نے بھی ان ہی کی تقلید کی۔ اس کے ساتھ صلہ اور انعام کی توقع صرف قصیدہ سے ہوسکتی تھی۔ یہ اسباب تھے کہ ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی سے ابتدا کی''۔[۱]

دکنی اردو میں آغاز ہی سے قصیدے ملتے ہیں۔ بہمنی دور میں نظامی، بیدار، مشتاق، لطفی، عادل شاہی دور میں عبدل، قطب رازی، کمال خاں رستمی، ملک خوشنود، نصرتی، اعلیٰ اور ایاغی، قطب شاہی عہد میں غواصی، طبعی اور بعد کے شاعروں میں بحری، نوری، شفیقی اور ولی

۱ شبلی نعمانی، شعر العجم، ۵، ۱۹۲۴ء، ص ۱

اورنگ آبادی وغیرہ نے بھی قصیدہ نگاری کے اچھے نمونے چھوڑے ہیں۔[۱]

اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے قصیدے کے چار حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے کو تشبیب کہا جاتا ہے، بقول شبلی "عرب میں مدحیہ قصائد کا یہ انداز تھا کہ تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے، جن کو تشبیب کہتے ہیں"۔[۲] اہل ایران نے صرف عشقیہ مضامین کی پابندی نہیں رکھی بلکہ طرح طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ عام طور پر نصائح، مذہبی خیالات، صبر اور قناعت، خودداری، انسانی عظمت، دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری، شاعرانہ تعلّی، ہم عصروں پر طعن و تعریض، معاشی بدحالی وغیرہ جیسے مضامین باندھے جانے لگے۔ تشبیب کے بعد گریز ہوتا ہے، یعنی شاعر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اصل موضوع کی طرف آتا ہے، پھر مدح شروع ہوتی ہے اور دعا پر قصیدے کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اردو میں بھی عام طور پر انہی اجزائے ترکیبی کو برقرار رکھا گیا۔

سوداؔ کے معاصرین نے بھی قصیدے کہے ہیں مگر انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی اردو زبان قصیدے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔[۳] سوداؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ سودا کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں صرف ذوقؔ وہ شاعر ہیں جنھیں دوسرا بڑا قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن قصائدِ ذوقؔ میں وہ تنوع، نیرنگی قدرتِ اظہار اور وہ پُرشور اندازِ بیان نہیں ہے جو اچھے قصیدے کے لیے لازم ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے سودا کو انفرادیت بخشی ہے۔۔ قصیدے کا اندازِ بیان دوسرے اصنافِ سخن سے مختلف ہوتا ہے۔ مضمون آفرینی، جوش

---

۱ جلال الدین احمد جعفری کی تحقیق ہے:

"کہ اس عہد کے شعراء میں ہاشمی، نصرتی، وجہی وغیرہ اور بعض سلاطینِ قطب شاہی کا پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں نے سخن گستری کے میدانوں میں اپنی اپنی جولانیاں دکھائی ہیں لیکن ان سب کے ذخائر کلام میں مثنوی، مفردات، قطعات اور مراثی کے سوا قصائد کا وجود اس وقت محقق نہیں ہے"۔

جلال الدین احمد جعفری، تاریخِ قصائدِ اردو، الٰہ آباد، ص ۱۴۔

۲ شعر العجم، ۵، ص ۱۔

۳ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی لکھتے ہیں۔ "متقدمین کے دور میں ہمیں کوئی قابل ذکر قصیدہ نگار نہیں ملتا۔ اس دور میں زیادہ سے زیادہ ولی کے قصائد پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے"۔ نگار اصنافِ سخن نمبر، جنوری، فروری ۱۹۵۷ء، ص ۵۰

بیان، پختگی کلام، مشکل زمینیں، شکوہِ الفاظ، روانی وسلاست اور جدتِ ادا وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے قصائد میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ قصیدے کے لیے خارجیت بہت ضروری ہے۔ سودا کے عہد میں دلّی کے تقریباً تمام شاعر دل کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ سودا پہلے شاعر ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے نکل کر باہر آئے ہیں۔

مولانا سید علی طباطبائی نے میر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قصیدہ کہنا نہیں جانتے تھے۔[1] طباطبائی کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے میر اور سودا کی قصیدہ نگاری کا موازنہ کیا ہے۔ میر اور سودا نے ایک ہی زمین میں قصیدہ کہا ہے۔ دونوں نے قصیدے میں بہاریہ تشبیبیں لکھی ہیں۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ میر کی تشبیب کے مقابلے میں سودا کی تشبیب کچھ بھی نہیں ہے۔[2] اس موازنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ”مولوی عبدالسلام ندوی نے نہ پورے قصیدہ اور پوری تشبیب کو سامنے رکھا اور نہ ان اصولوں کو جو اس زمانہ میں قصیدہ کا معیار تھے، محض چار شعروں کو لے کر سودا کے خلاف اور میر کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ یہ طریقۂ بحث، آئینِ انتقاد کے منافی ہے۔ میر پختہ مشق اور قادرالکلام شاعر تھے، اس لیے انھوں نے قصیدے بھی لکھے، لیکن فن کے لحاظ سے ان کے قصائد سودا و ذوق کے ہم رتبہ نہیں ہو سکے“۔[3]

اردو کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے سودا کو امام فن مانا ہے، بعض لوگ سودا کو بنیادی طور سے قصیدہ گو مانتے تھے اور ان کے قصیدے کو غزل پر ترجیح دیتے تھے۔ خود سودا نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لیے، میں یہ غزل جاؤں گا

---

۱ شرح دیوانِ غالب ص ۹۳- بحوالہ شعرالہند، ۱، ص ص ۶۷-۷۰۔
۲ عبدالسلام ندوی، شعرالہند، ۱، اعظم گڑھ، ۱۹۳۹ء، ص ص ۶۷-۷۰۔
۳ میر تقی میر، ص ۳۱۸

شیفتہ نے بھی "گلشن بے خار" میں یہ لکھا ہے:

" عوام میں جو یہ مشہو ر ہے کہ اس کا (سودا) قصیدہ غزل سے بہتر ہے، مہمل بات ہے۔ فقیر کے خیال سے اس کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے " [1] (فارسی سے ترجمہ)

صاحب "طور کلیم" نے بھی شیفتہ کے الفاظ دہرائے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معدودے چند کو چھوڑ کر سب تذکرہ نگاروں نے سودا کی قصیدہ نگاری اور ہجو گوئی کو ان کی باقی تمام شاعری پر ترجیح دی ہے۔ [2]

سودا نے اپنے فن کی بنیاد فارسی قصیدہ نگاری کی روایات پر رکھی ہے بلکہ ان کے بعض قصیدے فارسی کے مشہور شاعروں کی زمینوں میں ہیں۔ مثلاً

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

اسی زمین میں انوری کا بھی مشہور قصیدہ ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

---

[1] گلشن بے خار، ص ۱۰۰

[2] سودا کے فن قصیدہ نگاری کے متعلق رائیں نقل کی جاتی ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ "اگر در علو مراتب معانی ابیات قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید پیرو و متتبعش خواہد بود"۔ (تذکرہ ہندی، ص ۱۲۵) میر حسن لکھتے ہیں "در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد، قصائد عذب و دل آویز و بیان ہجو بلند"۔ (تذکرہ میر حسن، ص ص ۸۲-۸۳) عاشقی کی رائے ہے "جمیع ریختہ گویانِ ہند، وے را امام فن و پیغمبر سخن می دانستند۔ اگر چہ جملہ طرز کلام استادی بود حادی الا در مدح و قدح کہ مراد از ہجو و قصیدہ اعجاز بکار بردہ، وقصائد ریختہ بر قصائد ملا عرفی شیرازی پہلو بہ پہلو گفتہ"۔ (نشتر عشق، ص ۶۶۵) صاحب تکملۃ الشعرا قصیدہ گوئی میں انھیں بے مثل اور بے بدل بتاتے ہیں۔ "خصوصاً در قصیدہ گوئی بے مثل و بے بدل بود"۔ (تکملۃ الشعرا ص ۲۹۶) نقش علی کا بیان ہے۔ "خصوصاً در مدح و ہجا گوئی یکتا است"۔ (باغ معانی، ورق ۶۲ ب) شاہ حمزہ کا خیال ہے "علی الخصوص در قصیدہ گوئی باز در سحر سامری می کشد، وقصائدش با قصائد عرفی پہلوی می زند"۔ (فص الکلمات ورق ۴۱۷ ب) جتلا لکھتے ہیں "بجوبہ زباں و سر خیل ریختہ گویان ہندوستاں بود۔ در جمیع فنون نظم خاصہ در قصائد وقت بسیار بکار بردہ" (گلشن سخن ورق ۵۶ ب) سحر لکھنوی لکھتے ہیں "در قصیدہ گوئی عرفی عہد و در غزل نظیری وقت خویش بودہ" (بہار بے خزاں، ص ۸۵) آزردہ لکھتے ہیں۔ "در شاعری فیہا در قصیدہ گوئی و ہجا بزبان ریختہ گوئی بہ منزلتے رسیدہ کہ بالا بر از اں ممکن نیست"۔ (تذکرہ آزردہ، ص ۲۸)

جرم خورشید چو از حوت در آید بہ حمل
اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

عرفیؔ کا بھی ایک قصیدہ اسی زمین میں ہے۔

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بہ حمل
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

بلکہ اس زمین کے قصیدے میں سوداؔ نے عرفیؔ کا ایک مصرع بھی تضمین کیا ہے۔

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفیؔ
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

خاقانیؔ کے ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

نثار اشکِ من ہر شب شکر ریز است پنہانی
کہ ہمت را ز ناشوئست با زانو و پیشانی

اسی زمین میں سوداؔ نے آنحضرتؐ کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے، زنار تسبیح سلیمانی

خاقانیؔ کا ایک اور قصیدہ ہے:

ایں کز جہاں علامت انصاف شد نہاں
اے دل کرانہ کن زمیاں خانۂ جہاں

سوداؔ کا مطلع ہے:

منکر خلا سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں
جب شہرہ سے مرے ہو ہلا اس قدر جہاں

بعض تذکرہ نگاروں نے رائے دی ہے کہ سوداؔ کے قصائد عرفیؔ، خاقانیؔ اور انوریؔ کے پہلو بہ پہلو ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ سودا اکثر میدانوں میں فارسی قصیدہ گو شعرا سے آگے

نکل گئے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''اوّل قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عناں درعناں ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں، ان کے کلام کا زور وشور انوری اور خاقانی کو دیا جاتا ہے اور نزاکت مضمون میں عرفی وظہوری کو شرماتا ہے''۔[1]

یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ سودا نے فارسی قصیدہ گو شعرا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سودا اردو قصیدہ نگاروں کے امام ہیں۔

سودا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرتِ علیؑ، حضرت امام کاظمؑ، حضرت امام ضامن، حضرت امامِ عسکریؑ، حضرامام مہدیؑ، حضرتِ فاطمہؓ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت امام باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام تقیؑ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ باقی قصائد میں سودا نے عالم گیر ثانی، شاہ عالم، غازی الدین خاں وزیر آصف جاہ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حکیم میر محمد کاظم، سرفراز الدولہ، حسن رضا خاں، نواب سیف الدولہ احمد علی خاں، بسنت خاں خواجہ سرا، نواب مہرباں خاں رند اور نواب عماد الملک کی مدح کی ہے۔ ایک فارسی قصیدہ در تعریف مسجد نو بھی کلیات میں شامل ہے۔

اب قصائد سودا کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

مطلع: عام طور پر مطلع کی خوبی یا خرابی قصیدے کے باقی اشعار کا پتہ دیتی ہے، اس لیے قصیدہ نگار کوشش کرتا ہے کہ جدّتِ خیال اور جدّتِ بیان سے ایسی ندرت اور شگفتگی پیدا کردے کہ سننے والا اور پڑھنے والا چونک جائے اور اس کی تمام تر توجہ قصیدے کی طرف مبذول ہوجائے۔ سودا نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ان کے اکثر مطلعے اس فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ حضرت امام مہدیؑ کی مدح میں قصیدے کا مطلع ہے۔

---

[1] آبِ حیات، ص ص ۱۵۲-۱۵۳۔

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہرِ عرضِ حال

دیں سو زباں دہن میں ولیکن سبھی ہیں لال

اس قصیدے کا مطلع ثانی ہے۔

چاہے اگر کوئی دو جہاں کا متاع و مال

تیرے گدائے در سے کرے آکے وہ سوال

سرفراز الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے، اس کے مطلع میں جدّت نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

صباح عید ہے، اور یہ سخن ہے شہرۂ عام

حلال دخترِ رز بے نکاح و روزہ حرام

حضرت فاطمہؓ کی مدح میں ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

مکھڑے سے اپنے زلف کے پردے کو تو اٹھا

ابرِ سیہ میں ماہِ درخشاں کو مت چھپا

ایک اور مطلع ہے۔

ہووے جو قطرہ ریز یہ چشمِ تر آب میں

پیدا ہو پھر بجائے گہر اخگر آب میں

چند مطلعے اور ملاحظہ ہوں۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی

نہ ٹوٹی شیخ سے زنّار تسبیحِ سلیمانی

چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام دو
حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو

یار و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک
میں، کتاں، بلبل و پروانہ بہ ہم چاروں ایک

ایک مطلع میں فاخر مکیںؔ کے استاد اکسیرؔ پر کس انداز میں چوٹ کی ہے۔

مستغنی ذاتی نہ مہوس کی ہو تسخیر
معدن ہے جہاں سونے کا واں خاک ہے اکسیر

تشبیب

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ تشبیب قصیدے کی تمہید ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر تشبیب کا مدح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چوں کہ اس میں ہر طرح کے موضوعات کی گنجائش ہے، اس لیے شعرا کو اپنی علمیت، قابلیت کے اظہار اور قادر الکلامی کے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے۔ سودا کی بیشتر تشبیہیں بہت دل چسپ ہیں، بعض میں جدتِ فکر اور ندرتِ بیان نے تشبیب کو فنِ قصیدہ گوئی کا بہترین نمونہ بنا دیا ہے۔ سودا نے بھی ان تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو فارسی قصیدوں میں موجود تھے۔ ایک نعت کی تشبیب میں وہ قناعت کی تلقین کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اگر انسان اپنے میں کوئی ہنر پیدا کرے تو پھر اسے دنیاوی جاہ و جلال کی ضرورت نہیں، دولت جمع کرنے سے پریشانیٔ خاطر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیحِ سلیمانی

ہنر پیدا کر اول ، ترک کیجو تب لباس اپنا
نہ ہو جوں تیغ بے جوہر و گر نہ ننگِ عریانی
فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی
خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی
نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی
کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

ایک منقبت کے تشبیب کے اشعار ہیں۔

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا
تو آب و دانہ کو لے کر گہر نہ ہو پیدا
نہیں میں طالب زرق آسمان سے کہ مجھے
یقیں ہے کاسۂ واژوں میں کچھ نہیں ہوتا
نکل وطن سے غربت میں زور کیفیت
کہ آب بحت ہے جب تک ہے تاک میں صہبا
ہنر کو مفلسی ہرگز ضرر نہیں کہ نہیں
چنار کو تہی دستی سے نقص جوہر کا

تشبیب کا ایک خاص موضوع موسمِ بہار ہے۔ سوداؔ کے صرف ایک قصیدے کی تشبیب

بہاریہ ہے، جس میں اکتیس اشعار میں موسمِ بہار کی عکاسی کی گئی ہے۔ زورِ بیان، تشبیہات، استعارات اور جدّتِ تخیل نے بہت سے اشعار کو انتہائی دل چسپ بنا دیا ہے، لیکن بعض اشعار میں یہی خصوصیات اعتدال سے گزر کر عیب بن گئی ہیں، اس تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرم عزو جل
واسطے خلوت نو روز کے ہر باغ کے بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
تار بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بار سے آبِ رواں عکس ہجومِ گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بے کل
آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پانوں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغرِ لعل میں جوں کیجیے زمرد کو حل

اس بہاریہ تشبیب کے ایسے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں مبالغہ آرائی کی وجہ سے

عیب پیدا ہو گیا ہے، جن کا بہار کی عکاسی سے کوئی تعلق نہیں اور جو صرف ذہنی مشق کی مثال ہیں۔ یہ اشعار ہم کو بالکل متاثر نہیں کرتے۔

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہونچی ہے
شمع ساں گرمیٔ نظارہ سے جاتی ہے پگل
جوشِ روئیدگیٔ خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمیں کے ہے جو پھوٹے کونپل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل
کشت کرتے ہیں ہر اک تخم سے از فیض ہوا
گرتے گرتے بہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل
سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گلرو
خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزند مغل

سوداؔ نے بعض تشبیہوں میں تعلی بھی کی ہے۔ ایک منقبت کی تشبیب میں اپنے فن کی تعریف کی ہے اور ایک ایسے شاعر کو برا بھلا کہا ہے جس نے ان پر سرقہ کا الزام لگایا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نام آوری کے واسطے حاسد نہ کر تلاش
جا گہ کسی کے نام کو اس عہد میں کہاں
گریاں کہے تو ریختہ ایراں میں فارسی
چاہے جگہ جو شہرہ کو ہو تو نہ یاں نہ واں
عالم کی السنہ پہ مرا اس قدر ہے شعر
گویا ورق بیاض کا ہر منہ میں ہے زباں
میں نے سنا کہ تجھ کو مرے ایک شعر پر

دزدی کا اپنے معنی کے ہے وہم مہرباں
شاید بہ اتفاق توارد ہو پر مجھے
لفظوں کا اپنے غم کہ ہوئے کس پہ رائگاں
ازراہ دوستی میں کہوں تجھ سے ایک بات
طبعِ شریف پر جو نہ آوے ترے گراں
زنہار ہم سری کا مرے تو نہ کر خیال
ہوگا غریب مضحکہ نزدیکِ شاعراں

تشبیب کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی جائے جو ممدوح کی حیثیت کے مطابق ہوں، یعنی تشبیب میں جو کچھ کہا جائے وہ موقع محل کے بالکل ہی خلاف نہ ہو۔ سودا نے اکثر قصیدوں میں اس کا خیال رکھا ہے، لیکن بعض میں ان کا قلم بہک گیا ہے، انھوں نے حضرت علیؓ کے قصیدے کی تشبیب میں جو غزل شامل کی ہے اس کے چند اشعار یہ بھی ہیں۔

چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام دو
حسنِ بتاں کے دَور میں ہے سحر ایک شام دو
میرے تیرے یہ ربط ہے جیسے بیان بحر و موج
واقعی میں تو ایک ہیں گو کہ ہوئے بنام دو
ابروئے یار کا خیال دل میں رہے ہے روز و شب
ہووے جو تیغ آبدار کیوں نہ کرے نیام دو

ایک اور قصیدہ حضرت علیؓ کی شان میں ہے، اس کی تشبیب میں بھی ایسے ہی اشعار شامل ہیں جو کسی طرح بھی جائز نہیں۔

غازی الدین خاں وزیر کے قصیدے میں سودا نے خوشی کو ایک حسینہ تصوّر کر کے اس کا سراپا لکھا ہے۔ سراپا لکھنے کا اچھوتا انداز ہے، ایک صبح سودا کی آنکھ جھپک گئی، تو خوشی نے درِ دل پر دستک دی، شاعر نے پوچھا، کون؟ جواب ملا کہ خوشی! شاعر نے آنکھ کھولی تو دیکھا

کہ ایک توبہ شکن حسینہ کھڑی ہے، اس کے حسن و جمال نے پہلی ہی نظر میں سوداؔ کو دیوانہ کر دیا۔ اس کے بعد سراپا شروع ہوتا ہے، جس میں سودا نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔

گریز

تشبیب کے بعد شاعر اصل موضوع یعنی مدح پر آتا ہے، چوں کہ تشبیب اور مدح دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں اس لیے ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک یا ایک سے زیادہ شعر کہا جاتا ہے۔ ان اشعار کو گریز یا مخلص کہا جاتا ہے۔ گریز کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بے ساختگی اور برجستگی ہو۔ یہ نہ معلوم ہو کہ شاعر نے زبردستی مدح کا ذکر چھیڑا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہو کہ باتوں باتوں میں ذکرِ ممدوح آ گیا ہے جو بالکل فطری ہے۔ قصیدے کے حسن و کمال کا اچھا خاصا دار و مدار گریز پر ہوتا ہے۔ سودا نے گریز کے اشعار پر پوری توجہ صرف کی ہے، ان کے اکثر گریز بے تکلف اور بدیع ہیں جن میں فن کی پوری مہارت دکھائی گئی ہے۔ بعض قصیدوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کا ذکر باتوں باتوں میں آ گیا ہے اور بعض میں ممدوح کا ذکر اس طرح آتا ہے جیسے تشبیب کا لازمی نتیجہ ہو، ایک نعتیہ قصیدے میں سودا دنیاوی عشق میں اپنی ناکامی اور سیہ بختی کا ماتم کر کے خود کو اس طرح سمجھاتے ہیں۔

خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی
نظر رکھنے سے حاصل ان کے چشم و زلف کے اوپر
مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی
نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی
زہے دینِ محمد پیروی میں اس کے جو ہوویں
زہے خاکِ قدم سے اس کی چشمِ عرش نورانی

اور پھر آنحضرتؐ کی شان میں اصل مدح شروع ہوتی ہے، حضرت علیؓ کے قصیدے میں سودا اپنے محبوب کے جور و ستم اور بے وفائی کا گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فریاد کروں کس سے رواداری کی تیرے
کہنے کے لیے گبرو مسلماں ہے برابر
نالش کروں اب واں کہ جہاں حق بطرف ہیں
مور و ملخ و دیو و سلیماں ہے برابر

اب گریز کے بعد حضرت علیؓ کی شان میں مدح شروع ہوتی ہے۔ حضرت امام مہدیؑ کی منقبت میں سودا کسی ایسے شاعر کی خبر لیتے ہیں جس نے ان پر سرقہ کا الزام لگایا تھا، پھر شاعرانہ تعلّی کے بعد اس طرح اصل موضوع پر آتے ہیں۔

نام اپنے سے کوئی جو مرے شعر کو پڑھے
بولے فصاحت اس کا نہیں یہ لب و دہاں
اس کا یہ شعر ہے کہ قلم جس کی روز و شب
ایسے جناب کی ہے ثنا میں مدح خواں

اور یہاں سے سودا اصل موضوع پر آجاتے ہیں۔ حکیم میر محمد کاظم کی شان میں کہے گئے قصیدے میں سودا فن طبابت کا بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسان کا جسم کن کن چیزوں سے مرکب ہے، بیماریوں کے مختلف وجوہ بیان کر کے تشخیص مرض کے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

قاعدہ یوں ہے پھر آگے ہے شفا اس کے ہاتھ
جس کے ہے قبضۂ قدرت میں علاجِ عالم
سو تو ان باتوں میں ہے خوض طبیبوں میں کسے
اس زمانے میں بجز میر محمد کاظم

کہیں کہیں سودا نے ڈرامائیت پیدا کر کے گریز کو بہت دل چسپ بنا دیا ہے۔ غازی الدین کے قصیدے میں خوشی سودا کو جگاتی ہے اور کہتی ہے کہ "اب تو شیشۂ اندوہ کا پتھر سے پٹک" آج خوشی کا دن ہے، لوگوں کو محتسب کا خوف نہیں ہے، ہر گھر میں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں مگر تو آج بھی حزن و ملال میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہاں سے گریز شروع ہوتا ہے۔

سن کے میں نے یہ کہا اس سے کہ اے مایۂ ناز
خیر ہے بات سمجھ کر تو کہہ اتنا نہ بہک
بے سبب کیوں کہ میں اندوہ کی الفت چھوڑوں
کس طرح دوستیٔ غم کروں دل سے منفک
کر کے دریافت یہ مجھ سے کہا اس نے کہ مگر
سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک
آج اس شخص کی ہے سالگرہ کی شادی
کہ بصورت ہے وہ انسان و بہ سیرت ہے ملک
یعنی نواب سلیماں خرد نام آصف جاہ
عید میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

سودا نے گریز کی اس ٹیکنک کو خطابیہ قصائد میں زیادہ دل چسپ انداز سے استعمال کیا ہے، عماد الملک کی مدح میں قصیدے کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

کہے ہے کاتب دوراں سے منشیٔ تقدیر
سمجھ کے دفترِ قسمت کیا کر اب تحریر
یہ روز و شب تو بنائے گا تا کجا اس طرح
کہ جام مہر میں آتش دے مہ کو کاسۂ شیر

مختلف مشورے دے کر کاتب دوراں اصل وجہ بتاتا ہے۔

سنا نہیں ہے کہ غازئ دیں عماد الملک
جو میر بخشی تھا واں کا سو اب ہوا ہے وزیر

آصف الدولہ کے قصیدے کی ابتدا بالکل ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے۔

سوداؔ پہ جب جنوں نے کیا خواب وخور حرام
لائے گھر اس طبیب کے ہے عقل جس کا نام

طبیب نے سوداؔ کا حال دیکھ کر کہا کہ اس کے لیے فصد و مسہل بہت فائدہ مند ہوں گے۔ سودا نے سُن کر جواب دیا کہ میرے جسم میں تو خون کی ایک بوند بھی نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ میرے جسم میں جتنا لہو تھا وہ اس سال خیرآباد کے عامل نے پی لیا اور مسہل تو وہ انسان لے جس نے زیادہ کھایا ہو، میرے لیے تو عید کا مہینہ بھی رمضان ہی رہا اور قرض لے کر علاج کرنے سے فائدہ؟ یہ سُن کر عقل مشورہ دیتی ہے۔

تب اس نے یوں کہا کہ بتاؤں میں وہ علاج
اس درد سے تو پا کے شفا ہو جو شاد کام

اس کے حضور عرض یہ کر جس کے سایہ میں
مورِ ضعیف پیل سے لے اپنا انتقام

اور پھر آصف الدولہ کی مدح میں اشعار ہیں۔

نواب بسنت خاں خواجہ سرا کے قصیدے میں سوداؔ نے تمثیل نگاری سے کام لیا ہے۔ قصیدے کے ابتدائی دو شعر ہیں۔

کل حرص نام شخصے سوداؔ پہ مہرباں ہو
بولا نصیب تیری سب دولتِ جہاں ہو

گر اشرفی روپے کی خواہش ہو تیرے دل میں

ظاہر ترے پہ ہر جا گنجینۂ نہاں ہو

''حرص'' چھ اشعار میں سوداؔ کو دعائیں دیتا ہے۔ سوداؔ جواب دیتے ہیں۔

سن کر یہ حرف بولا سوداؔ کہ قدر و رتبہ

کب اشرفی روپے کی نزدیک عاقلاں ہو

اور پھر سوداؔ صبر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ زر و جواہر آنے جانے والی چیز ہے، دولت سے انسان کا دل کالا ہو جاتا ہے، اہلِ دانش کبھی ہوسِ جاہ و منصب نہیں کرتے۔ گریز کا آخری شعر ہے۔

جو کچھ کہا ہے تو نے یہ تجھ کو سب مبارک

میں اور میرے سر پر میرا بسنت خاں ہو

گریز کے بعد اصل موضوع یعنی مدح شروع ہوتی ہے۔ مولانا شبلی نے مدح کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''(قصیدہ)...... جس کا اصلی موضوع مدح ہے، بڑے کام کی چیز ہے، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ (۱) جس کی مدح کی جائے در حقیقت مدح کے قابل ہو (۲) مدح میں جو کچھ کہا جائے سچ کہا جائے (۳) مدحیہ اوصاف اس انداز سے بیان کیے جائیں کہ جذبات کو تحریک ہو۔ فارسی قصائد میں یہ شرطیں کبھی جمع نہیں ہوئیں، اولاً تو اکثر ایسے لوگوں کی مدحیں لکھی گئیں جو سرے سے مدح کے مستحق نہ تھے، یا تھے تو ان کے واقعی اوصاف نہیں لکھے گئے، بلکہ تمام قوت مبالغہ اور غلو میں صرف کر دی گئی اکبر، خانخاناں، شاہجہاں کے سینکڑوں معرکے تاریخی یادگار ہیں، جن کے بیان

سے مردہ دلوں میں جنبش پیدا ہوسکتی ہے۔ عرفی، نظیری، فیضی وغیرہ نے ان لوگوں کی مدح میں سینکڑوں پر زور قصائد لکھے لیکن ان معرکوں کا کہیں نام تک نہ آیا۔ اس کے مقابلے میں عرب کی شاعری پر نظر ڈالو عرب اولاً تو کسی کی شاعرانہ مدح کرنا عار سمجھتے تھے اور مدح کرتے تھے تو کبھی صلہ اور انعام لینا گوارا نہیں کرتے تھے، پھر جو کہتے تھے، سچ کہتے تھے۔ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا کہ میری مدح لکھو، اس نے کہا۔ "افعل اقول"۔ یعنی تم کچھ کرکے دکھاؤ تو میں کہوں"۔[۱]

یہ اقتباس طویل ضرور ہے، لیکن سودا کے قصائد کو سمجھنے کے لیے مفید ہے۔ اگر مولانا کی ان تین شرطوں کو مدح کا معیار مان لیا جائے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ سودا نے (مذہبی قصائد کو چھوڑ کر) ان شرائط کا بہت کم خیال رکھا ہے۔

انھوں نے قصائد میں اس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کہ سننے والے کے ذہن پر ممدوح کی شخصیت کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی قادر الکلامی اور مبالغہ آرائی نے نواب شجاع الدولہ جیسے بہادر اور دلیر سپاہی اور احمد علی خاں کو برابر کردیا ہے۔ مدح کرتے ہوئے شاعر کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ممدوح کی کچھ نہ کچھ ذاتی خصوصیات بغیر مبالغے کے پیش کرے تاکہ انفرادیت اُبھر سکے۔ سودا نے ایسا نہیں کیا ان کے یہاں ایک اچھے انسان کا مخصوص تصوّر ہے، یہ وہ انسان ہے جو جاگیرداری دور میں آئیڈیل ہوسکتا تھا۔ اس کی خصوصیات ہیں: عدل و انصاف، ایمانداری، فیاضی، مروّت، حلم، نیکی و بزرگی، خداترسی، وغیرہ۔ بزرگانِ دین کی علمیت و قابلیت کی مدح کررہے ہوں یا کسی بادشاہ و نواب کی یا کسی امیر کی، سودا اس انسان میں یہی خوبیاں دیکھتے ہیں۔ چوں کہ سودا کے مدح کے مضامین محدود ہیں۔ اس لیے ان کے قصائد میں ایک بزرگ دین اور عام ممدوح میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے، حضرت علیؓ اور آصف الدولہ کی شجاعت، بہادری، عدل و انصاف وغیرہ پر کہے گئے اشعار کا اگر موازنہ کیا جائے تو کوئی فرق نہیں ملتا اور ہرگز یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک دنیائے

۱۔ شعرالعجم، ۵، ص ص ۲۱-۲۲۔

اسلام کا ہیرو ہے اور دوسرا ایک چھوٹی سی ریاست کا نواب اور پھر شجاعت و بہادری میں آصف الدولہ کا جو حال تھا اس سے کون واقف نہیں۔ جاگیرداری دور کے انسان کی خصوصیات کو سودا کے قصائد میں ملاحظہ کیجیے۔

عدل و انصاف

حضرت علیؓ کے عدل و انصاف کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

رکھا جب سے قدم مسند پر آ اون نے شریعت کا
کرے ہے موج بحر معدلت تب سے یہ طغیانی
اگر نقصان پر خس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو
گرہ کو آگ کے دو ہیں کرے غرق آن کر پانی
یہ کیا انصاف ہے یارو کہ طیر و وحش تک جگ میں
اس امن و عیش سے اپنی بسر اوقات لے جانی
پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا
شباں نے گرگ کو گلہ کی سونپی ہے نگہبانی

ایک اور قصیدہ میں کہتے ہیں۔

طبع انساں میں ترے عدل سے رکھتے ہیں اثر
حنظل و آب بقا شربت و سم چاروں ایک
آفت و قہر و بلا و غضب آفاق کے بیچ
ہو کے آپس میں ترے تیغ کا دم چاروں ایک

یہ اشعار بھی حضرت علیؓ کی مدح میں ہیں۔

ہیبت عدل یہ بڑی ہے کہ ہر دشت میں شیر
واسطے دردِ سر آہو کے گھسے ہے صندل
سامنے بز کے یہ کیا دخل کہ نکلے آواز
گرگ کے پوست کو منڈھوا کے بجائیں جو دہل

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی مدح سرائی اس طرح کی ہے۔

از بس اب ان کے عدل سے معمور ہے جہاں
پہونچا ہے کار خلق اس امن و اماں تلک
بچہ جو گوسپند کا گم ہو تو گرگ و شیر
پہونچا دیں تا نہ ڈھونڈ کے اس کو جہاں تلک
دہشت سے اس خیال کے زہرہ ہو ان کا آب
پہونچیں نہ ہم مباد کسی کے گماں تلک
گلچیں کی کیا مجال جو توڑے چمن میں پھول
صورت سے گل کے لرزے ہے بادِ خزاں تلک
بہ جائے ایک خس کھور ہلے میں موج کے
زنجیر سے بندھا پھرے آبِ رواں تلک

عالم گیر ثانی کی مدح میں سودا نے جو قصیدہ کہا ہے اس میں یہ اشعار بھی ہیں۔

جہاں پناہ ترے درگہِ عدالت میں
کسی کو دیوے اذیت کوئی معاذ اللہ

جلے جو شام کو پروانہ بزم میں تیری
تو صبح شمع کے آتا ہے سر پہ روزِ سیاہ
شرار سنگ سے خاشاک کو جو پہونچے ضرر
لے آوے کھینچ کے دیوان کوہ کو پرکاہ

غازی الدین خاں کے عدل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عدل یہ عصر میں اس کی ہے کہ ہر ایک طبیب
شعلۂ تپ کو بھی تبرید لکھے خار خسک
کرنے دیوے نہ رفو چاک کتاں کو انصاف
تا نہ رشتہ کے لیے ماہ کی کھولے پہک

شجاع الدولہ ایسے عادل اور منصف تھے کہ بقول سودا۔

تو وہ عادل ہے جہاں میں کہ قلمرو میں ترے
چیونٹی بھی دست تعدی سے نہ ہووے پامال

ایک اور قصیدے میں وہ کہتے ہیں۔

کیا بیاں اس کی عدالت کا زباں پر لاؤں
سحر ہے صولت عدل اس کے تئیں کر اعجاز
بازو گنجشک کی کھینچے جو مصور تصویر
رعب گنجشک سے پرواز کرے صورت باز
پیشِ خس تاب نہ آتش کو بجز خاموشی
نہ یہ طاقت کہ زباں اپنی کرے شعلہ دراز

آصف الدولہ کے انصاف وعدل کا بیان اس طرح کیا ہے۔

جا سے بے جا ترے قلمرو میں   کب توانا سے ناتواں ہووے
ذرہ ٔ خاک کی حفاظت کوں   باد تند آکے پاسباں ہووے
سنگ اس عہد میں ہو واں پانی   شیشہ گر کی جہاں دکاں ہووے

سرفراز الدولہ کے عدل کی داد ان الفاظ میں دی ہے۔

بروز جمعہ سدا ہاتھ میں لے ناخن گیر
پھرے ہے شیر کو بیشے میں ڈھونڈتا حجام
اسی امید پہ تا قصر کرکے ناخن شیر
برائے ہیکلِ اطفال دے کے لے انعام

ان اشعار میں سوداؔ نے حضرت علیؓ، حضرت امام موسیٰ کاظمؑ، حضرت امام ضامنؑ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حسن رضا خاں کے عدل وانصاف کی مدح کی ہے۔ اس موضوع پر سوداؔ کے مخصوص مضامین ہیں، جسے وہ مختلف الفاظ میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اب طاقتور کمزوروں کو پریشان نہیں کرتے، بلکہ شیر بھی بکریوں سے ڈرتے ہیں۔ شیر، گرگ، اژدر، باز وغیرہ نے اپنی خونخواریت چھوڑ دی ہے، آگ، شمع، حنظل، سم، سنگ وغیرہ نے اپنے منفی اثرات ترک کردیے ہیں۔ سوداؔ کے جدّتِ بیان نے ان مضامین کو ثقافتی تشبیہوں اور استعاروں کے سانچوں میں ڈھالا ہے، یہ اشعار حسنِ تخیل، زورِ بیان، حسنِ تعلیل اور جدتِ فکر کا بہترین نمونہ ہیں، مگر ان کی بنیادی خرابی صرف یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور عالم گیر یا آصف الدولہ کے مدحیہ اشعار میں قطعی فرق نہیں ہے، پھر کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ ہو، بالکل یہی حال دوسرے اوصاف کا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت یہ اوصاف بھی ملاحظہ کیجیے۔

شجاعت و بہادری:

کیا بتاؤں جس قدر اس کی برش کا ہے صفا
کیا کروں میں زور یاں پر اپنے مولا کا بیاں
روز میداں سامنے آوے گر اس فن کا عدو
کوئی نہ گردوں سا جس کے سر کا ہووے استخواں
جب کمر سے کھینچ کر مارے وہ اس کے فرق پر
موئے سر سے ناخن پا تک نہ ٹھہرے درمیاں

(قصیدہ در مناقب حضرت علیؑ)

دعوائے بندگی ہو جسے اس جناب میں
اس کے تئیں ہے فنِ شجاعت میں یہ کمال
مستک میں فیل مست کے مارے اگر وہ تیر
گردن میں استخواں کے کبھو بند ہووے بحال
سو فار اس طرح سے نمودار ہو رہے
جوں اژدھا پہاڑ سے جھانکے ہے سر نکال

(قصیدہ در منقبت امام مہدیؑ)

رستم کو خبر ہو کہ ترا اس پہ ہے آہنگ
جیوے بھی جو یہ سُن کے تو کھایا نہ لگے انگ
بل چیونٹی کا پاوے تو کرے چھپنے کا واں قصد

بھن پہ تجھے دیکھ کے عرصہ ہو نپٹ تنگ
طائر کے جو تو صید پہ لے تیر و کماں ہاتھ
ارجن کے وہیں چہرے سے پرواز کرے رنگ
حربے سے یہ دہشت پڑے ساونت کے دل میں
بچ جائے اگر جان سے کھا کر تر سر چنگ
ہاتھ اس کے میں دے کر کبھو شمشیر برہنہ
اک آئینہ دکھلاؤ تو بھاگے وہ دو فرسنگ

(قصیدہ در مدح شجاع الدولہ)

تجھ نعرۂ غضب کی یہ صولت ہے گر سنیں
فیصل ہوں بر و بحر کے باشندگاں تمام
زہرہ ہو آب سینہ میں، ہیبت سے شیر کا
تڑپے نہنگ پیاس سے ماہی ہو جوں بدام
اشجع تو اس قدر ہے کہ میداں میں روز جنگ
کیا تاب روبرو ہوں ترے رستم اور سام
قالب تہی کریں وہ قلم اس کی دیکھ کر
تصویر تری تیغ کی کھینچے جو بے نیام

(قصیدہ در مدح آصف الدولہ)

فیاضی

چاہے اگر کوئی دو جہاں کا متاع و مال
تیرے گدائے در سے کرے آکے وہ سوال
برسے ترا جو ابرِ کرامت زمین پر
پیدا بجائے دانہ گہر ہوں ہر ایک سال

(قصیدہ در مدح امام مہدیؑ)

کسی کے آگے کوئی ہاتھ پسارے کیا دخل
مٹھی باندھے ہوئے پاتا ہے تولد کو دک

(قصیدہ در مدح غازی الدین خاں)

گہر فشاں ہے سدا دست فیض کا اس کے
تگرگ بار نہ ہو جس کے ابر عشر عشیر
غنی ہوا ہے یہ اس کے کرم سے ہر محتاج
کہ فرق ہو نہیں سکتا بہم امیر و فقیر
تمیز کیا کہوں اجزائے کار کی اس کے
کہ جس کے رمز کو پہونچے نہ آسماں کا دبیر
دوام زلفِ بتاں سے کرے اسے تنخواہ
جو مانگے فرقۂ عشاق سے کوئی جاگیر

(قصیدہ در مدح آصف جاہ)

سخا میں حاتمِ طائی کو تجھ سے نسبت کیا
مرے سخن کو یقیں کر وہ ہے زباں زد عام
بزیرِ سقفِ فلک شہرۂ سخا اوس کا
طنین پشہ صدا فیل کی ہے در حمام

(در مدح سرفراز الدولہ)

گلشنِ دہر میں چہار طرف
ایک مفلس جو ڈھونڈیے تو نہیں
غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا
اس کی بخشش نے مشتِ زر کے تئیں

(قصیدہ در مدح نواب احمد علی خاں)

مروّت:

رائج اتنی ہے مروّت کہ غزالوں کو پلنگ
اس طرح سمجھے ہے فرزند گویا لے پالک

(قصیدہ در مدح نواب غازی الدین خاں)

جس جگہ تیری مروت کا زباں پر ہو ذکر
شعلہ واں خس کی اذیت کو سمجھتا ہے وبال
پدری کی ہے انھوں کی جو ترے دامن تک
مادرِ گیتی کی بے مہری سے پہونچے اطفال

(قصیدہ در مدح شجاع الدولہ)

ان کے علاوہ سودا نے فہم و ادراک، حلم، عفو و کرم، نیکی و بزرگی، شرافت و پاکیزگی، خدا ترسی، علمیت و قابلیت وغیرہ جیسی خصوصیات کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے مہرباں خاں رند کے دیوان و اشعار کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ ممدوح کی شخصیت اور اس کی ذات کے علاوہ سودا نے اس کے ساز و سامان کی بھی مدح کی ہے۔ مثلاً اکثر قصیدوں میں گھوڑا، ہاتھی، تلوار، تیر، کمان، سپر، نیزہ، پالکی اور نالکی وغیرہ کی تعریفیں کی گئی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو مرثیوں میں جو ان اشیا کی تعریفیں ملتی ہیں، اس کی روایت سودا ہی نے قائم کی تھی تو غلط نہ ہوگا، کیوں کہ سودا سے قبل اردو مرثیوں میں یہ انداز نہیں تھا۔ سودا نے ایک قصیدے میں شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں روہیلے کے معرکے کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ سودا حافظ رحمت خاں کے ساتھیوں سے پوچھتے ہیں کہ تم تو جاں گسار تھے۔ ایک ہی قوم اور ایک ہی گرد کے تھے، پھر یہ کیسے ہوا کہ تم میدانِ جنگ میں حافظ کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ وہ لوگ سودا کو جواب دیتے ہوئے شجاع الدولہ اور اس کی فوج کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے جاں باز بہادروں کے مقابلے میں کون ٹھہر سکتا تھا، ہم تو خیر ساتھیوں میں تھے، خود حافظ کا لڑکا باپ کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس قصیدے میں سودا نے میدانِ جنگ کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ معمولی تفصیلات بھی بیان کر دی جائیں، یہ قصیدہ اردو رزمیہ کا بہترین نمونہ اور شجاع الدولہ کی مدح کا بہت ہی خوب صورت انداز ہے۔

دعا یا حسنِ طلب

مدح کے بعد بزرگانِ دین سے دعا مانگی جاتی ہے اور اگر قصیدہ اہلِ دول کی شان میں ہے تو حسنِ طلب سے کام لے کر اپنے لیے کچھ مانگا جاتا ہے۔ سودا کا حسنِ طلب بہت کمزور ہے۔ اگرچہ وہ قصیدہ نگار ہیں لیکن دستِ طلب دراز کرتے ہوئے انھیں بہت شرم آتی ہے اور جب تک وہ بالکل ہی مجبور نہیں ہو جاتے اپنے لیے کچھ نہیں مانگتے۔ سودا نے صرف غازی الدین خاں وزیر، آصف الدولہ اور سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہے، باقی قصیدوں میں ممدوحین کے اقبال کی بلندی کی دعائیں مانگی ہیں۔

کچھ کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قصائدِ سودا اردو نظم کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں، سودا الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے اور وہ ہر لفظ کے مزاج اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ طرح طرح کی تشبیہات اور استعارات کے سہارے ایک ہی بات کو سو انداز سے کہہ سکتے ہیں، مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا سودا ہی کا کام تھا، بعد کے تمام قصیدہ نگار سودا سے متاثر ہیں اور اکثر شعرا نے ان کی زمینوں میں قصیدے لکھے ہیں۔

ہجو گوئی

ظرافت نگار جب ناہموار، بے آہنگ، بدصورت اور ناقص چیزیں دیکھتا ہے تو اپنی تخلیقی قوتوں کو روبکار لاکر انھیں اور بھی مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ اس عملِ تخلیق کے پیچھے مختلف جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار بے ڈھنگے، بے تناسب اور بے محل عناصر پر خود بھی ہنستا ہے اور اپنی صناعی اور خلاقی کی قوتوں کا استعمال کر کے دوسروں کے لیے بھی ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ اخلاقی مصلح نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا ہے۔ اس کے برعکس طنز نگار کی مسکراہٹ میں نشتر بھی ہوتے ہیں، جن کا استعمال سماج اور زندگی کے ناسوروں پر کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ایک تعمیری کام یعنی انسان کی اصلاح ہوتا ہے۔ ہجو نگاری کے محرکات بھی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو ظرافت نگاری کے ہیں۔ بقول کلیم الدین احمد ''ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھ کر مسکرا اٹھتا ہے۔ لیکن کسی اور قسم کا جذبہ اس کے دل میں نہیں اُبھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجو گو کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجو گو بے ڈھنگے، ناقص، بدصورت مناظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ ناانصافی، بے رحمی اور ریاکاری کی مثالیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات اُبھرنے لگتے ہیں۔ وہ بھی صناع ہے اس لیے وہ اپنے جذبات کو محض سیدھے سادے طور پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات سے ان کی شدت کے باوجود علاحدگی اختیار کرتا ہے اور ان سے الگ تھلگ ہو کر اور انھیں قابو میں لاکر ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے۔ اس صنعت کارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدت میں کمی نہیں

زیادتی ہوتی ہے۔ ہجوگو انسانی کمزوریوں، خامیوں، فریب کاریوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ لیکن ہجوگو انسان ہے اور انسانی حدود میں گھرا ہوا ہے۔ اس لیے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس کی ہجوؤں کی ابتدا کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے فن کی اہمیت اور اس کی ضروریات سے آگاہ ہے تو وہ اپنے ذاتی جذبے سے علاحدگی اختیار کرتا ہے اور اسے ایک قسم کی عالمگیری عطا کرتا ہے۔ بہرکیف ہجوگو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ ہمدردی، ترحم، انصاف اور فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، بغض اور حقارت کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلے میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع اور کشادہ ہے"۔[1]

جیسا کہ کلیم الدین صاحب نے کہا کہ ہجوگوئی میں فنکار کی ذات اور شخصیت کو براہِ راست دخل ہوتا ہے۔ اس لیے ہجو کی بنیاد عام طور پر کسی ذاتی جذبے پر ہوتی ہے۔ لیکن اس فن کا کمال یہ ہے کہ فنکار اپنے فن میں اتنی وسعت، ہمہ گیریت اور عمومیت پیدا کر لے کہ اس میں کسی فرد، جماعت یا اداروں کے نام کی حیثیت محض ایک نشان یا اشارہ کی رہ جائے اور فنکار کا جذبہ یا اس کی شخصیت اتنی دب جائے کہ پہچانی نہ جاسکے اور ہجو انسانی کمزوری، ظلم و ستم، ناانصافی، عیاری و مکاری، خود پرستی اور خود فریبی، جھوٹی عزّت اور وقار کے خلاف ایک بلند آواز بن جائے۔

ظرافت نگاری اور ہجوگوئی میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ عام طور پر ظرافت نگار تہذیب اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ اس کے برعکس ہجوگو کے ہاں حقارت اور نفرت کے جذبات کی اتنی شدّت ہوتی ہے کہ وہ پھبتی، تمسخر، استہزا اور مضحکہ اڑانے سے آگے بڑھ کر فحش نگاری اور ابتذال پر بھی اتر آتا ہے۔

اردو شاعری میں ہجوگوئی کی ابتدا بھی فارسی ہی کے اثر سے ہوئی۔ فارسی میں اس کا آغاز عہدِ سامانی کے شاعر رودکی سے ہوتا ہے لیکن ان کے ہاں ہجویہ اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی عہد کے ایک اور شاعر دقیقی نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ابھی یہ فن ابتدائی مدارج میں تھا۔ دورِ سلجوقی میں انوری، خاقانی اور سوزنی نے اسے بہت ترقی

---

[1] نقوش طنز و مزاح نمبر، ص ۵۱۔

دی۔ ان کے بعد کمالؔ اصفہانی کا نام آتا ہے۔ کمالؔ ہر شاعر کے لیے ہجو گوئی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال سے جو شاعر اس پر قدرت نہیں رکھتے ان کی مثال ایسے شیر کی ہے جو حریفوں سے مقابلہ کرنے کے لیے چنگال اور دنداں نہ رکھتا ہو۔ پروفیسر محمد علیم الدین سالکؔ نے ان کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔

ہجا گفتن ہر چہ پسندیدہ نہ بود (؟)
مبادا کسے کالت آں ندارد
ہر آں شاعرے کو نہ باشد ہجا گو
چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد
خداوند امساک را ہست دردے
کہ الا ہجا ہیچ در ماں ندارد
چو نفریں بود بو لہب ز ایزد(؟)
مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد
اگر ہجو گوئی تو، در گردن من
کہ ہرگز زیانے بہ ایماں ندارد [1]

عبید زاکانی کے کلام میں بھی ہجویہ شاعری کی اچھی خاصی مثالیں مل جاتی ہیں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز ہی سے ہجو گوئی کی ابتدا ہوئی۔ اس سلسلے میں غالباً پہلا نام میر جعفر زٹلی کا ملتا ہے۔ لیکن ان کا مزاج ہزل گوئی کی طرف زیادہ راغب نہ تھا۔ انھوں نے باقاعدہ ہجویں نہیں کہیں۔ البتہ ان کے کلام میں ہجویہ اشعار اچھے خاصے مل جاتے ہیں۔

---

[1] نقوش طنز و مزاح نمبر، ص ۱۲۸۔

ابتدائی عہد کے بیشتر اردو شاعروں نے ہجویہ اشعار کہے ہیں۔ بڑی بڑی برگزیدہ ہستیاں بھی اس سے دامن نہ بچا سکیں۔ حاتم، آبرو، میر، شاکر ناجی اور کمترین وغیرہ کے یہاں تو اس قسم کے اشعار مل ہی جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ مرزا مظہر جانجاناں جیسے ثقہ بزرگ بھی خاموش نہیں رہے۔

سودا نے ہجوگوئی کو باقاعدہ فن کی صورت دی۔ وہ اس فن کے امام ہیں اور خاتم بھی۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد اردو میں کوئی اتنا بڑا ہجوگو نہ پیدا ہو سکا۔[1] انشا اور مصحفی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ مگر ان کی ہجویں تیسرے درجے کی ہیں، جن کی بنیاد محض ذاتی عناد و بغض پر ہے۔ انشا میں وہ تمام صلاحیتیں تھیں جو انھیں ایک عظیم ہجونگار بنا سکتی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو معمولی ادبی معرکوں میں ضائع کر دیا۔ مصحفی اس مزاج کے آدمی نہیں تھے۔ انھیں تو انشا نے خواہ مخواہ اس میدان میں کھینچ لیا تھا۔

سودا کے ہاں رچا ہوا سماجی شعور تھا۔ ان کے اکثر مربّی وہ لوگ تھے جو صاحبِ اقتدار تھے۔ ان صحبتوں میں رہ کر سودا نے ملکی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔

ان کی ہجوؤں کو بہ غور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا اپنے زمانے سے شدید ناآسودگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی ناآسودگی اور غم حقارت اور نفرت کے جذبے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن یہی جذبہ ان کی ہجونگاری کا سرچشمہ ہے۔

رشید احمد صدیقی نے سودا کی ہجوگوئی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''سودا کو ہجو و ہجا میں نہ صرف فضلِ تقدم حاصل ہے بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے۔......... بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اُترتیں۔ تاہم اس خارستان میں بھی طنز و مضحکات کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا ہمیں پوری طرح معترف ہو جانا پڑتا

---

[1] آزاد لکھتے ہیں۔ مگر اس وقت تک اردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دل کا غبار نکال لیتے تھے۔ یہ طرز خاص کہ جس سے ہجو ایک موثر تہنا اس باغ شاعری کا ہو گئی۔ ان ہی (سودا) کی خوبیاں ہیں۔ عالم، جاہل، فقیر، امیر، نیک، بد کسی کی داڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی۔ آبِ حیات، ص ۱۵۴۔

ہے"۔[1] میرے خیال سے کوئی ایک طنز بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا محرک ذاتی جذبہ نہ ہو۔ ذہن وفکر کی ایسی برہمی اور شگفتگی کا تصور ہی ناممکن ہے، جس کی بنیاد ذاتی عناد و تعصب اور ذاتی جذبے پر نہ ہو لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ہجونگار کے کمال کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور شخصیت کو زیادہ سے زیادہ چھپانے اور فن میں ہمہ گیری اور عمومیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

سودا نے ہجوگوئی کے لیے تقریباً تمام اصناف سخن استعمال کیے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ غرض ہر صنف میں ہجویں موجود ہیں۔

سودا کی ہجوؤں کو پانچ مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ ہجویں جن کی بنیاد محض ذاتی بغض وعناد پر ہے یا جس کا مقصد کسی سے چھیڑ چھاڑ کرنا ہے۔

۲۔ اخلاق کی اصلاح کے لیے لکھی جانے والی ہجویں۔

۳۔ مذہبی اختلاف پر لکھی جانے والی ہجویں۔

۴۔ وہ ہجویں جو ادبی اختلاف یا معاصرانہ چشمکوں کی وجہ سے لکھی گئیں۔

۵۔ وہ ہجویں جن میں اپنے دور کے سیاسی حالات کی ابتری اور مالی بدحالی کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔

ہجوؤں کا مختلف عنوانات کے تحت جائزہ لینے سے قبل مناسب ہے کہ سودا کی ہجوگوئی کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے۔

سودا کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جب کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں ان کا ذہن منظر کی معمولی سے معمولی تفصیل کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی لیے جب وہ اس منظر کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے پاتا۔ اصل منظر میں جو کچھ کمی رہ جاتی ہے، سودا اسے اپنے زورِ تخیل سے پورا کر دیتے ہیں۔ جو مصوری اور شاعری کا حسین ترین

---

[1] رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، اردو، الٰہ آباد، ص ۴۶۔

امتزاج ہے۔اس جزئیات نگاری کے لیے اعتدال اور توازن اساسی شرط ہے۔سودا جب اعتدال کی حدوں میں رہتے ہیں تو ان کی تصویریں فن کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔لیکن کبھی کبھی وہ توازن کھو بیٹھتے ہیں۔سودا نے راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو کہی ہے۔ہاتھی بہت کمزور اور لاغر ہے۔سودا اس کے پورے جسم کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں۔

خداوندا یہ آرا ہے کہ خرطوم
یہ ظالم چیرتا ہے جس سے مظلوم
غرض ہوئی تھی باقی ماندوں کی خیر
بسانا تھا خدا کو کعبہ و دیر
بدن پر اب نظر آتی ہے یوں کھال
طناب ست سے خیمہ کا جوں حال
نمودار اس طرح ہر استخواں ہے
گویا ہر پسلی اس کی نردباں ہے
نہ بیڑی ہے نہ کٹ بندھن نہ لکڑا
رکھے ہے ناتوانی اس کو جکڑا
ضعیفی نے کی اس کی فربہی گم
گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دُم
سمجھنا فیل اسے دیوانہ پن ہے
کسی مدت کا یہ بامِ کہن ہے
ستوں اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار
رہے دو دانت آگے سو ہیں اڑوار
جو بیٹھے یہ تو اُٹھنا ہے اسے دور

لگیں جب تک نہ اس کو راج و مزدور
ہلاتا یوں ہے یہ کانوں کو ہر بار
کہ دھونکیں پنکھوں سے کویلوں کا انبار
یہ عالم چلنے میں خرطوم کا ہے
کہ دستِ کور میں گویا عصا ہے

سوداؔ پڑھنے والے کے سامنے اس ہاتھی کی جو تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں، اُس میں کامیاب ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل اور تشبیہات و استعارات کے سہارے ہاتھی کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے اور معمولی سی معمولی تفصیل کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن یہی جزئیات نگاری کبھی کبھی اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والا اکتا جاتا ہے اور ہجو بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ سوداؔ کے کلام میں ایسی ہجویں بھی ہیں جن کی دل چسپی اور حُسن طوالت کی نذر ہو گیا ہے۔

ہجو کی ایک خصوصیت مبالغہ آرائی بھی ہے۔ بعض واقعات، مناظر یا تصویریں ہماری توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتیں۔ ہجو نگار ان واقعات وغیرہ کے پیش کرنے میں مبالغے سے کام لیتا ہے تا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ تصویر کے بعض حصّوں کو نمایاں کرنے کے لیے مصوّر کو تیز اور شوخ رنگ استعمال کرنے پڑتے ہیں ہجو نگار شوخ اور تیز رنگوں کا کام مبالغے سے لیتا ہے لیکن یہاں بھی اعتدال شرط ہے۔ سوداؔ اکثر اعتدال کی حدوں سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کا مبالغہ غلو کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور ہجو حقیقت کم اور جن اور پری کی کہانی زیادہ بن جاتی ہے۔ ہجو میر ضاحک میں ضاحک کے زیادہ کھانے کا بیان اس طرح کیا گیا ہے۔

گھر میں اب جس کے دیگچہ کھڑکے
در پر اس کے یہ بیٹھے یوں اڑ کے
گور سے پھر جو رستم اُٹھ کر آئے
میت اس کی اٹھائے یا نہ اٹھائے

آگ لگ کر کسی کے گھر سے دود
ایک ذرہ بھی گر کرے ہے نمود
لوگ تو دوڑے ہیں بجھانے کو
دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو
ہر کسی بنیئے کی دکاں پر جا
اپنی باتوں میں اس کو لے ہے لگا
کام ہر وجہ اپنا کر لیوے
کلّے بندر کی طرح بھر لیوے
توڑ کھاتا ہے جاکے پاخانے
یہ بواسیر اپنی کے دانے

اگر ضاحک کسی کی شادی میں جاتے ہیں تو وہاں کی تقریبوں اور سامان عیش وعشرت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ

یہی پوچھے ہر ایک سے بے شرم
پوڑی کا آٹا سخت ہے یا نرم
صاحبِ خانہ اس میں گر جھنجلائے
اپنے نفروں سے جوتیاں لگوائے
اس کو ہرگز نہیں حیا سے لگاؤ
جائے تو یہ کہے پلاؤ پلاؤ

اس قسم کا بے اثر اور بے کیف مبالغہ سوداؔ نے عام طور پر ادبی معرکوں میں کہی جانے والی ہجوؤں میں کیا ہے۔ بعض دوسری ہجوؤں میں مبالغہ نے بہت زیادہ حسن پیدا کر دیا ہے اور ہجو کے اثر کو بہت بڑھا دیا ہے۔ شاہ جہاں آباد کے ایک کوتوال فولاد خاں کی ہجو میں سوداؔ

کہتے ہیں کہ فولاد خاں نے چوروں سے رشوت لے رکھی ہے۔ اس لیے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کے جتنے ملازم ہیں وہ ایک سے ایک بڑھ کر چور ہیں اور حالت یہ ہے کہ اگر فولاد خاں کی نظر بچ جائے تو یہ چور اُس کے مال پر بھی ہاتھ صاف کر دیں۔ فولاد خاں ان کی حرکتوں سے تنگ آ گیا اور ایک دن اُن سے کہا۔

ایک دن اس نے سب سے طنز کی راہ
کہا تم ہو مرے نپٹ دل خواہ
چیز میری جو اب چراؤ تم
چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم
قیمت اس کی جو کچھ مشخص ہو
اتنے کو تم اسے مجھی کو دو
ایک ان میں سے یہ سخن سن کر
لگا کہنے کہ اس سے کیا بہتر
کیا جب آپ تم نے یہ انصاف
میں بھی کرتا ہوں عرض رکھیے معاف
آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے
دو خریدار اس کے ہیں درپے
دس روپے وہ مجھے دلاتے ہیں
کہیے اب آپ کیا لگاتے ہیں

ان خصوصیات کے علاوہ سوداؔ کی ہجوگوئی کی ایک خصوصیت فحش نگاری بھی ہے۔ لیکن سوداؔ نے فحاشی اور ابتذال سے کام اکثر ان ہجوؤں میں لیا ہے جو ادبی معرکوں میں کہی گئیں۔ باقی ہجوؤں میں ابتذال شاذ و نادر ہی ہے اور وہ بھی اعتدال اور توازن کے ساتھ۔ میر ضاحک

خاص طور پر ان کی فحش نگاری کے شکار ہوئے ہیں۔ ان معرکوں میں سودا اپنے حریف سے آگے بڑھ کر اس کے لائق احترام لواحقین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میر ضاحک کی بیوی اور ندرت کشمیری کی دختر پر سودا کی ہجویں موجود ہیں جو کسی طرح بھی مناسب نہ تھیں۔

ادبی معرکے

سودا کی ہجوگوئی کا یہ حال تھا کہ لوگ ان سے خائف رہتے تھے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ ''خان آرزو کے مکان پر جن ایام میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ سودا بھی وہاں حاضر ہوا کرتا تھا۔ جب سودا غزل پڑھا کرتا تھا تمام شعرا حاضرین مجلس مشاعرہ اس کی مدح کیا کرتے تھے۔ اس مدح کے دو سبب ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ شاعر واقع میں اچھا شعر کہتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سب شاعر ہجو سے ڈرا بھی کرتے تھے۔ اگر اُس کی تعریف نہ کریں گے وہ ہجو کرے گا۔ اس خوف سے سب کو واہ واہ کرنا پڑتا''۔[1] قدرت اللہ قاسم نے بھی ''مجموعۂ نغز'' میں تقریباً یہی بات لکھی ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے ان ادبی معرکوں میں سودا کو بے قصور بتایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ سودا کے مخالفین نے پہلے ہجو کی اور پھر سودا نے جواب دیا۔ قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں کہ محمد بقا اکبرآبادی، فدوی پنجابی اور ضاحک دہلوی نے رکیک ہجویں کہہ کر سودا کو اشتعال دلایا۔[2] فدوی کے ترجمے میں حکیم سید احد علی خاں یکتا لکھتے ہیں۔ ''فدوی قوت شاعری اور معمولات فن کے غلط زعم میں مرزا سودا سے مقابل ہوگئے۔[3] حسرت کا ذکر کرتے ہوئے یکتا لکھتے ہیں۔ ''طنطنۂ شاعری اور معلومات فن کی وجہ سے سلطان الشعرا (سودا) سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔[4] مرزا علی لطف نے فدوی اور سودا کے معرکے میں سودا کو بے قصور بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ ''فدوی برخود غلط انسان تھے۔ مرزا محمد رفیع سودا سے

---

۱ طبقات الشعرا۔ کریم الدین، ص ۱۰۵
۲ مجموعۂ نغز، جلد ۱، ص ۳۰۴
۳ دستور الفصاحت، ص ۷۶
۴ ایضاً، ص ۴۷

مباحثہ کرنے فرخ آباد آئے اور ذلت اٹھائی۔[1] مردان علی خاں مبتلاؔ بھی فدوی کو ''خود پسند اور برخود غلط'' [2] بتاتے ہیں۔ غرض نہ صرف تذکرہ نگاروں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ اکثر ابتدا دوسری طرف سے ہوتی تھی بلکہ خود سوداؔ کی ہجوؤں میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں۔ ایک ہجویہ غزل کے اشعار ہیں۔

بعضے ایسے بھی ہیں نامعقول ہے جن کا سخن
اپنی شہرت ہونے کی سمجھیں ہیں وہ تدبیر جنگ
پوچ گوئی سے نہیں ہٹتے بہ میدانِ سخن
کرتے ہیں گویا وہ جڑ کر پاؤں میں زنجیر جنگ
یکدگر ہوتا ہی ہے سقم سخن پر اعتراض
اس پہ کیا لازم جو کیجیے ہو گریباں گیر جنگ
ابرو و مژگاں کے مضموں میں کرے جوان کے دخل
کرنے یہ اُس سے لگیں ناداں بہ تیغ و تیر جنگ
میں تو ہوں حیران اب ان شاعروں کی وضع پر
کرتے پھرتے ہیں جو پڑھ پڑھ شعر بے تاثیر جنگ
ایک ان میں سے لگا سوداؔ کے آگے پڑھنے شعر
واسطے اتنے کہ تا کیجیے بایں تزویر جنگ
سن کے یہ بولا خدا کے واسطے کیجیے معاف
میں تو ہوں شاعر غریب اور آپ ہیں شمشیر جنگ

کسی نے سوداؔ کی ہجو کہی۔ سوداؔ اسے جواب دیتے ہیں۔

---

[1] گلشن ہند، ص ۱۹۰
[2] گلشنِ سخن، ورق ۴۸ ب

گر ہجو میری کہنے سے اس پر ہو نگاہ
تا یہ بھی کہے جانے مجھے خلق اللہ
سو وہم تمھارا ہے میں اور آپ کی ہجو
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

میر تقی ناؔمی دہلی میں ایک مرثیہ گوشاعر تھے۔ انھوں نے سوداؔ پر اعتراضات کیے۔ سوداؔ نے ''سبیل ہدایت'' میں ان اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔

آپ کے ہوتے جب کسی کے حضور
مرثیہ کہنے کا ہوا مذکور
واں یہ بولی زبانِ سحر طراز
حق میں اس بے زباں کے بندہ نواز
ریختے کی جو وہ کہے ہے غزل
لفظ و معنی میں اس کے کم ہے خلل
مرثیوں کے سنے جو کتنے بند
بندش ان کی نہ آوے اپنے پسند
معنی ان کے تب آویں فہم کے ہاتھ
شرح لکھدے جو مرثیہ کے ساتھ

ظاہر ہے کہ سوداؔ کب اعتراضات برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اگرچہ میر تقی کی ہجو نہیں کہی لیکن اُن کے مرثیہ پر بھرپور تنقید کر کے انھیں نااہل ثابت کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اکثر و بیشتر پہلے زیادتی دوسری طرف سے ہوتی تھی۔ لیکن ایسی بھی مثالیں

موجود ہیں جن میں سوداؔ نے ابتدا کی۔ ضاحکؔ اکثر لوگوں کی ہجو کرتے تھے۔ یہی بات سوداؔ کو ناگوار تھی۔ انھوں نے ضاحکؔ کی ہجو لکھی اور پھر ضاحکؔ نے بھی جواب دیا۔ میر علی ہاتفؔ نے حکیم آفتاب کی ہجو کہی تھی۔ سوداؔ کو یہ بات بھی ناگوار گزری اور انھوں نے میر علی ہاتفؔ کی ہجو کہہ دی۔

ایک بار انشاء اللہ خاں انشاؔ کے والد ماشاء اللہ خاں مصدرؔ سے ملنے گئے۔ کچھ بات ناگوار گزری اور سوداؔ نے ان کی ہجو کہہ دی۔

سوداؔ اور قیام الدین قائمؔ

قائمؔ کو سوداؔ سے تلمذ تھا۔ اسی لیے قائمؔ نے اپنے تذکرے میں سوداؔ کا ذکر بہت ادب اور احترام سے کیا ہے بلکہ سوداؔ کو حضرتم لکھا ہے۔ بقول قاضی عبدالودود قائمؔ سودا کا عقیدت مند شاگرد تھا۔ سودا کی مدح میں جو قصیدہ قائمؔ نے لکھا ہے۔ اس کے دیوان (نسخہٗ انڈیا آفس) میں موجود ہے۔ سودا کی وفات کے بعد قائم نے ایک غزل کہی تھی جس کی ایک بیت ہے۔

پڑھیے کس کا سخن کہ دل سے مٹے
داغ مرزا رفیع سوداؔ کا [1]

لیکن کلیاتِ سوداؔ میں ایک مثنوی ہے جس کا عنوان ہے مثنوی بطور ساقی نامہ در ہجو میاں فوقی۔

قدرت اللہ قاسمؔ نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی سوداؔ نے قائمؔ پر کہی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ قائمؔ پہلے ہدایت اللہ ہدایت کے شاگرد تھے۔ کسی بات پر ان بن ہوگئی۔ قطع تعلق کرلیا اور استاد کی ہجو کہی۔ قاسمؔ نے قائمؔ کے تین شعر بھی نقل کیے ہیں۔ قائمؔ سودا کے شاگرد ہوگئے اور بقول قاسمؔ خباثتِ اصلی کی وجہ سے ان کی شاگردی سے بھی پہلو تہی کی۔ سوداؔ نے ان کی ہجو میں ایک ساقی نامہ کہا۔ بعد میں قائمؔ کے معافی مانگنے پر ہجو پر ایک فرضی نام فوقیؔ ڈال

[1] اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۳

دیا گیا۔[1]

اس مثنوی کے مطالعہ سے یہی پتا چلتا ہے کہ زیادتی قائم کی تھی۔ انھوں نے ہی پہل کی تھی۔ سودا نے صرف جواب دیا ہے اور ظاہر ہے کہ سودا جیسا قادر الکلام شاعر جب جواب دینے پر آئے گا تو کیا کچھ نہ کہے گا۔ چند تمہیدیہ اشعار کے بعد سودا اصل موضوع پر اس طرح آتے ہیں۔

ٹک میاں فوقی کے گھر تک اے صبا
کہہ سلامِ شوق تو جاکر مرا
بعد ازاں کہیو کہ اتنا بھی غرور
شاعری کے فن میں کرنا کیا ضرور
اوروں کو بکری کہو شیر آپ کو
بکری بھی گر کچھ کہے پھیر آپ کو
بات بکری کی لگے تم کو بُری
دوڑو تم اس پر قلم کی لے چُھری

ان اشعار سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا قائم کی طرف سے ہوئی تھی۔ سودا کہتے ہیں کہ عام زندگی میں وہ بکری ہی سہی لیکن میدان سخن کے وہ مرد ہیں۔ جس میں قائم کی حیثیت مبتذل بند اور ایک عالم کے چور کی ہے۔

گرچہ میں بکری ہوں تم شیر جری
پر قلم کی تیغ کاغذ کی پھری

---

1 مجموعۂ نغز، ۲، ص ص ۸۲-۸۳۔

پاس اس عاجز کے بھی ہر آن ہے
دیکھ لو یہ گو ہے یہ میدان ہے
کیا قصیدہ کیا غزل کیا قطعہ بند
جو ردیف و قافیہ کیجیے پسند
آپ کہہ کر مجھ کو بھی فرمایئے
جس کو جی چاہے اسے دکھلایئے
گھر میں شیخی کرنی کچھ رکھتی ہے مول
کُلھیا میں گڑ پھوڑنے سے کیا حصول

اس کے بعد سوداؔ نے قائمؔ پر الزام لگایا ہے کہ قائمؔ نے سارے مضامین دوسرے شاعروں کے چرائے ہیں۔

ہوگیا ظاہر جو کچھ تھا تم میں زور
مبتذل بند اور اک عالم کے چور

آخر میں سوداؔ نے قائمؔ کی ایک غزل کے کچھ اشعار پر تنقید کی ہے۔ پوری مثنوی میں سوداؔ نے کہیں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

سوداؔ اور ندرتؔ کاشمیری

ندرتؔ فارسی کے شاعر تھے۔ ناصرؔ لکھنوی نے لکھا ہے۔'' مولوی ندرت کاشمیری کہ فاضل اور علامہ عصر تھا۔ اُس (سوداؔ) کے مقابلے میں ایسا شرمندہ ہوا کہ ترک دہلی کے سوا کچھ بن نہ آیا۔ ایک شعر مولوی ندرتؔ کی غزل کا کہ سودا کی خدمت میں ہے، لکھا جاتا ہے۔

خود بخود در جنگ باشد آں رفیع پست قدر

سر بسر سودائے خود از جہل صفرا ریختہ''[1]

سودا نے اسی غزل کو مخمس میں تضمین کر کے ندرت کی ہجو کر دی۔ یہ ہجو کلیات سودا میں موجود ہے۔ اس مخمس کے پہلے بند میں سودا نے ندرت پر الزام لگایا ہے کہ ان کے شعر ناموزوں ہوتے ہیں۔ دوسرے بند سے پتا چلتا ہے کہ ان دونوں کا اختلاف کسی حسین کی وجہ سے تھا۔ بند یہ ہے۔

قاضی اور کوتوال سے لے جاتے ہیں تا بصدر

جنگ کا مبدأ ہے تیرے گھر وہ رشک ماہ بدر

پھر مجھے کہتا ہے اے بھڑوے تو یہ از راہِ عذر

خود بخود در جنگ باشد آں رفیع پست قدر

سر بسر سودائے خود از جہل صفرا ریختہ

مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ہجو میں خواہ مخواہ بھی اس قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ سودا کا اشارہ دخترِ ندرت کی طرف ہو۔ ایک مخمس اور ایک مسدس اور ہیں۔ مخمس ندرت کی ہجو میں اور مسدس ندرت کی دختر کی۔ ندرت کی ہجو میں سودا نے طرح طرح کے مشورے دیے ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے۔

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو انصرام ہو

بحر میں جس کی ہر طرح شبۂ خاص و عام ہو

تقطیع اس کی جس کئے صبح سے تا بہ شام ہو

اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو

گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنگ لگام دو

---

[1] تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)۔

مسدس میں سوداؔ نے دخترِ ندرتؔ کے حسن و شباب کی تعریف کی ہے۔ کلیاتِ سوداؔ میں ایک رباعی بھی ہے، جس میں سودا نے ندرت پر وہی الزام لگایا ہے کہ شعر ناموزوں کہتے ہیں۔ رباعی ملاحظہ ہو۔

گر ہجو پہ سوداؔ کے اسے رغبت ہے
ہونے دو کہ گیدی کے تئیں رجعت ہے
موزوں نہ کرے شعر کو اپنے احمق
کرتے پھرے ہجو لوگوں کی یہ ندرت ہے

مرزا مظہرؔ

مرزا مظہرؔ نقشبندی سلسلے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے بہت ادب اور احترام سے ان کا ذکر کیا ہے۔ خود سودا نے ان کی وفات پر قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ لیکن سوداؔ نے ان کی بھی ہجو کہی ہے۔ غالباً مرزا مظہرؔ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سودا کی ہجو چار شعر کی ہے، جس میں مرزا مظہر پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کا شعر فارسی ہے نہ اردو بلکہ باٹ کا روڑا ہے۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سوداؔ یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہِ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شہ کی لاٹ کا

القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتّا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا[۱]

بقا[۲] اور سودا

بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ بقا نے پہلے سودا کی ہجو کہی۔ بقا نے میر اور مرزا دونوں کی ہجویں ایک ساتھ کہی ہیں۔ اُن کا پانچ اشعار کا ایک قطعہ ہے۔

عیب ہے گرچہ کثرت یک لفظ
سخن فارسی سے تا ہندی
پر جُدا ہے تمام عالم سے
طرزِ سودا و وضع میر تقی
یعنی واں لفظ تو ہے بر گن شعر
ہے ہے سے یاں کلام کی بھرتی
کھول دیوان دونو صاحب کے
اے بقا ہم نے بھی زیارت کی

---

۱ آخری مصرع کے محاورے سے فائدہ اٹھا کر آزاد لکھتے ہیں۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی۔ (آبِ حیات، ص ۱۴۳) یہ نکتہ یقیناً آزاد کے ذہن کی اختراع ہے۔ اس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا۔

۲ کمال نے ان کا نام محمد بقا (تذکرہ کمال، ورق ۱۰۰ ب) اور ذکا نے محمد بقا اللہ خاں لکھا ہے (عیار الشعرا، ورق ۳۱ الف) غالباً ذکا کا بیان درست ہے کیوں کہ بقا کے والد کا نام حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر آبادی تھا (خوش معرکہ زیبا۔ قلمی) ذکا نے لکھا ہے کہ تلاشِ روزگار میں شاہجہاں آباد سے لکھنؤ چلے گئے ہیں (عیار الشعرا، ورق ۳۱ الف) ۱۲۰۶ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ (تذکرہ کمال ورق ۱۰۰ ب)۔ ناصر لکھنوی کے بیان کے مطابق آخری عمر میں دیوانے ہو گئے تھے۔ جب حالت ٹھیک ہوئی تو زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ ناصر ہی کا بیان ہے کہ ان کا پہلے قسمیں تخلص تھا۔ شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے تو انھوں نے بقا تخلص قرار دیا۔ خوب چند ذکا لکھتے ہیں کہ فارسی میں انھیں محمد فاخر مکیں اور اردو میں شاہ حاتم سے تلمذ تھا۔

شعر سوداؔ و میرؔ کے دیکھے
وہ تو توتو کریں ہیں یہ ہی ہی[1]

قدرت اللہ قاسمؔ، ناصرؔ لکھنوی وغیرہ نے دو شعر نقل کیے ہیں جو بقاؔ نے میرؔ اور مرزا کی ہجو میں کہے تھے۔

مرزا و میرؔ دونوں باہم تھے نیم ملا
فنِ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقاؔ اب ہجووں کی ریسماں سے
دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا[2]

مگر حیرت ہے کہ کلیاتِ سوداؔ میں بقاؔ پر کوئی ہجو نہیں۔ شاید سوداؔ نے بقاؔ کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا یا ممکن ہے کہ سوداؔ کی کہی ہوئی ہجو دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئی ہو۔ میری نظر سے کلیاتِ سودا کے قلمی نسخوں میں بھی بقاؔ پر کوئی ہجو نہیں گزری۔ یہ معرکہ لکھنؤ میں ہوا تھا جیسا کہ مصحفیؔ نے ''تذکرۂ ہندی'' میں لکھا ہے۔

میرتقیؔ اور سوداؔ

میرتقیؔ کا ذکر سوداؔ کی ہجوگوئی کے تحت نہیں آنا چاہیے تھا کیوں کہ سوداؔ نے ان کی ہجو نہیں کہی بلکہ اُن کے ایک مرثیے پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہ اعتراضات ایک مثنوی بسبیل ہدایت

---

[1] یہ اشعار تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تذکرہ کمال اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا دونوں میں موجود ہیں۔ البتہ تیسرا شعر تذکرہ کمال میں نہیں ہے۔

[2] شاید بقا کو میر اور مرزا کی شہرت اور مقبولیت ناگوار گزرتی تھی۔ کمالؔ نے بقاؔ کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ جس میں وہ اپنے ریختہ کو رشکِ غزلِ سودا بتاتے ہیں:

مرا ریختہ رشکِ غزلِ سوداؔ ہے
لیکن اس پر بھی بقاؔ کو یہ گماں ہے کہ نہیں
بس مجھی کو نظر آتا ہے یہ کعل بے جرم
تم بھی ٹک دیکھیو صاحب نظراں ہے کہ نہیں

کی شکل میں ہیں۔ چوں کہ یہ ادبی معرکہ تھا۔ اس لیے اس کا ذکر یہاں کیا گیا۔
میر تقی دہلی کے رہنے والے تھے اور بحیثیت مرثیہ گو انھیں اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔ سبیل ہدایت سے پتا چلتا ہے کہ پہل انھوں نے کی تھی۔ بقول سودا:

سو زبانی تمھاری اے مخدوم
ہوا اپنے تیئں کو یوں معلوم
مرثیہ وہ جسے عوام الناس
روئیں سُن سُن پڑھیں جب ان کے پاس
اور سوداؔ کا مرثیہ سُن کر
چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھن کر
کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے
لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے
بارہا یہ سخن ہوا ظاہر
حق میں بندے کے غائب و حاضر

سوداؔ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی نہیں تھے۔ انھوں نے میر تقی کا ایک مرثیہ حاصل کیا اور اس کے ایک ایک شعر پر دل کھول کر تنقید کی۔ پہلے ہی شعر پر سودا نے انتیس اشعار میں تنقید کی ہے۔ پہلے ان کے مرثیے کا شعر پیش کیا ہے اور پھر اس پر تنقید کی ہے۔ (اسی مثنوی کے درمیان میں سودا نے اردو نثر بھی لکھی ہے)

میر تقی کا ایک شعر ہے۔

اے تصدق یہ پدر یہ مادر اور یہ جدِ پاک
ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السّلام

سوداؔ اعتراض کرتے ہیں۔

گر نہیں جانتے تو سن لو اب
ساتھ اوس کے ہے جس کا نام و نسب
گر تعلق کمال کا ہوتا
پسرِ نوح باپ سا ہوتا
منحصر کچھ نہیں نسب پہ کمال
جس پہ ہو فضل ایزدِ متعال
بندش الفاظ کی غلط اس کی
بری ہے معنی کی نمط اس کی
پیش مصرع میں لفظ "یہ" سے مراد
آپ کو ہے بزرگی اجداد
پر نکلتا ہے اس سے یوں بیکد
سب تصدق پدر سے لے تا جد

میر تقی کا شعر ہے۔

ہے گریباں گیر گردوں تیرے لشکر کا لہو
تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السلام

سوداؔ اعتراض کرتے ہیں۔

خوں سوا ایسی جا میں لفظ لہو
نہیں آتا محاورے میں کبھو

اور لالی کا حرف کردو حک
ہو نہ ثابت شفق سے یہ جب تک
تا نہ تشبیہ ہو شفق کی یہاں
معنی جو چاہو اس میں تم سو کہاں

میر تقی کا شعر ہے۔

اے ہُوَ الاوّل ہُوَ الآخر کے مالک یا یقیں
دے ہُوَ الظاہر ہُوَ الباطن کے والی السلام

سوداؔ معترض ہیں۔

کیا ہوالاوّل و ہوالآخر
کیا ہوالباطن و ہوالظاہر
حق کی جانب پھرے ہے ان کی ضمیر
اس سوا جس پہ کہیے ہے تکفیر
کیا یہ خاطر میں آپ کے آیا
مالک اس کا حسینؓ ٹھہرایا

اس طرح سوداؔ نے میر تقی کے صرف چند اشعار پر اعتراضات کیے ہیں اور عام طور پر سوداؔ حق بجانب ہیں۔

میر تقی میرؔ اور سوداؔ

میرؔ نے ''نکات الشعرا'' میں سوداؔ کی بہت تعریف کی ہے۔ اُن کے متعلق لکھا ہے......خوش

خلق، خوش گو، گرم جوش، یار باش، شگفتہ رو نوجوان ہے..... غزل وقصیدہ ومثنوی وقطعہ و مخمس و رباعی، سب خوب کہتا ہے۔ وہ سرآمد شعرائے ہندی ہے۔ بہت خوش گو ہے..... چناں چہ ریختہ کا ملک الشعرا اسی کو ہونا چاہیے۔[1] انھوں نے نہ صرف نثر بلکہ نظم میں بھی سودا کی فنی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میرؔ دیوانہ رہا سوداؔ سو مستانہ

میرؔ کی ایک ہجو ہے جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چنانچہ میرؔ و مرزاؔ کا ہے دور

سوداؔ نے بھی میرؔ کی استادی تسلیم کی ہے۔

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

سوداؔ نے ایک مثنوی میں بھی میرؔ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب
لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میرؔ و مرزا رفیع و خواجہ میر
کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

لیکن ان دونوں کے کلام میں ایک دوسرے کے خلاف بھی اشعار ملتے ہیں اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ابتدا کس نے کی۔ سودا کا شعر ہے۔

---

[1] نکات الشعرا، ص ۳۱۔

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے

وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

میر کا شعر ہے۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں

یوں ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

بات صرف شعروں تک نہیں رہی بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کی باقاعدہ ہجویں بھی کہیں اور اس کی ابتدا غالباً میر ہی کی طرف سے ہوئی۔ سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ میر کو یہ بات بہت ناگوار تھی۔ انھوں نے سینتیس اشعار کی ایک ہجو کہی، جس میں سودا کو بہت برا بھلا کہا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک جو لچر کو رزق کی وسعت سی ہوگئی

تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہوگئی

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش

چچڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں

کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں

آواز دے دے کتوں کو توڑے ہے اپنی جان

مر جائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے ندان

اس ہجو پر سودا کا نام نہیں ہے بلکہ کلیات میر مرتبہ آسی میں اس ہجو کا عنوان ''ہجو عاقل نام ناکسے کہ بسگان انسے تمام داشت'' ہے۔ کلیات سودا میں اس کا جواب شامل ہے اور اس کے عنوان میں میر تقی میر کا نام بھی موجود ہے۔ اصل عنوان ہے ''مخمس در جواب طعن

میر تقی کہ فی الحقیقت میر شیخ بودہ است''۔ مخمس میں میر کو شیخ بتایا گیا ہے۔ میر نے سودا کو جو برا بھلا کہا تھا۔ اس سب کا جواب دیا گیا ہے اور آخر بند میں سودا نے الزام لگایا ہے کہ میر کو علتِ مشائخ ہے۔ تین بند ملاحظہ ہوں۔

کر شیخ زباں اپنی مری خبث سے کوتاہ
نے گل ہوں میں اس باغ میں نے خار سرِ راہ
خوبی سے نہ شہرہ نہ بدی سے ہوں بافواہ
مستے برہ میکدہ ہر شام و سحرگاہ
واقف نہ کسی سے میں نہ مجھ سے کوئی آگاہ

یہ سچ ہے جو کہتا ہے تو مجھ پر بھی یقیں ہے
کتے کو کہے پاک سو وہ دشمنِ دیں ہے
لیکن وہ سگِ نفس نجس اس سے کہیں ہے
تجھ پر جو ہر اک لحظہ و ہر آن تعیں ہے
تو اس کا نہ کہنا کرے تب پاک ہے واللہ

سودا بزبان جز سخن راست نہ لاوے
احمق ہو جو تجھ سا کوئی تو اس کو نہ بھاوے
کتے کا ملوث تو نہا پاک ہو آوے
علت کی مشائخ کے جو دھوئے سے نہ جاوے
خالی کریں دھو دھوا سے زمزم کا اگر چاہ

سودا نے میر کی ایک اور ہجو کہی ہے، جس میں سودا کا فنِ ہجو گوئی معراج پر ہے۔ نو اشعار

کے اس ہجو یہ قطعہ میں سوؔدا کہتے ہیں۔ ایک دن میں ایک مشفق کے گھر گیا۔ ان کے ہاں ایک بزرگ کاتب تھے۔ بے چارے بہت پریشان تھے۔ انھوں نے سودا کو اپنی مصیبت کا حال ان الفاظ میں سنایا۔

ایک مشفق کے گھر گیا تھا میں
سنو ٹک نقل یہ عجائب ہے
ان کے گھر میں ہے ایک مردِ بزرگ
خوشنویسی کے فن سے کاسِب ہے
راقم سرنوشت کا اس کو
ہے بجا گر کہوں کہ نائب ہے
کہنے لاگا وہ آ کے مجلس میں
آہ یہ نفسِ شوم غالب ہے
ورنہ لکھنے سے ہاتھ اٹھاؤں میں
کیا کروں فکر قوت واجب ہے
میں جو پوچھا سبب کہا مت پوچھ
بات کہنی یہ نامناسب ہے
لیکن اس واسطے میں کہتا ہوں
درد سننے کا تو جو طالب ہے
ہے جو کچھ نظم و نثر عالم میں
زیرِ ایرادِ میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میؔر کی اصلاح
لوگ کہتے ہیں سہوِ کاتب ہے

معلوم ہوتا ہے کہ میر اور سودا کی معاصرانہ چشمکیں بہت معمولی رہیں۔ کیوں کہ ترکِ وطن کے بعد جب سودا کو اپنا وطن اور اہلِ وطن یاد آتے ہیں تو میر صاحب کی یاد انھیں خاص طور پر پریشان کرتی ہے۔ ان کے اشعار ہیں۔

ہمیں لے آئی ہے شہرِ غریب جس دن سے
کبھو انھوں کی طرف سے نہ نامہ و پیغام
علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے
کہوں میں کس سے کہ باوصفِ تمام (کذا)
لکھا نہ پرچۂ کاغذ بھی اتنی مدت میں
کہ بے قراروں کو تا ہووے موجبِ آرام

میرے خیال سے میر اور سودا نے ایک دوسرے کی ہجو اسی وقت تک کہی جب تک سودا دہلی میں تھے۔ میر کی ہجو کا ایک مصرع ہے۔

دلّی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں

بعض محققین نے اس مصرع کے پیش نظر یہ ثابت کیا ہے کہ ہجو سودا کے ترکِ وطن کے بعد کہی گئی۔ حالاں کہ اس مصرع سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔

فدوی اور سودا

اکثر تذکرہ نگاروں نے اس معرکے میں فدوی کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔ علی لطف نے لکھا ہے کہ ''فدوی برخود غلط آدمی تھا۔ مرزا محمد رفیع سودا سے مباحثہ کرنے فرخ آباد آیا اور ذلّت اُٹھائی''۔[1] اس معرکے میں سودا کے ساتھ ان کے ایک شاگرد فتح علی شیدا بھی شریک تھے کلیاتِ سودا میں ان کی ایک مثنوی ''در ہجو فدوی متوطن پنجاب کہ دراصل بقال بچہ بود'' بھی شامل ہے۔ سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ سودا نے فدوی کی ہجو ''قصہ بوم اور بقال کا'' لکھی ہے۔ حالاں کہ یہ ہجو سودا کی کہی ہوئی نہیں بلکہ ان کے

---

[1] گلشن ہند، ص ۱۹۔

شاگرد فتح علی شیدؔا کی ہے۔ اس کا ثبوت اوّل تو مثنوی کے بعض اشعار ہیں اور دوسرے بعض تذکرہ نگاروں مثلاً میر حسن، قدرت اللہ شوقؔ اور علی لطفؔ نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف شیدؔا ہیں۔[1] اس مثنوی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ پہلے فدوؔی اور شیدؔا میں معرکہ ہوا تھا اور سوؔدا بعد میں میدان میں آئے ہیں۔ فدوؔی کی عادت تھی کہ ہر ایک کے شعر پر اعتراض کرتے تھے اور اپنی بیاض کو جامؔی کے دیوان سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ شیدؔا لکھتے ہیں۔

شعر پہ ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض
جامی کے دیواں سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض
سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں
شعر پہ میرے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

شیدؔا نے کسی شعر میں "شیخ اور برہمن کو دین سے نسبت لکھا تھا"۔ اس پر فدوی نے اعتراض کیا کہ شیخ کا دین ہوتا ہے اور برہمن کا دھرم۔ شیدؔا اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شعر وہ میرا سنا جا کے انھوں نے کہیں
شیخ و برہمن کو ہے جس میں کہ نسبت بہ دیں
اپنی سخن فہمی پر کہتے ہیں یہ ہو کے گرم
دین تو ہے شیخ کے اور برہمن کے دھرم

شیدؔا اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سن کے غرض میں یہ بات بولوں جو جل بھن کے اب
کھول کے ٹک گوشِ فہم سن لیں یہ احباب سب
میری زبانی انھیں یہ جو ہیں قرآن خواں
پوچھے تو اتنا کوئی تم میں سے اے مہرباں
آیۂ قرآں کو کیوں دھوئے ڈالو ہو تم

---

[1] قاضی عبدالودود اسے سوؔدا کی تصنیف مانتے ہیں۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ اسی کتاب میں "سوؔدا کا الحاقی کلام"۔

کافروں کو ہے خطاب جس میں لکم دینکم
دونوں پہ اطلاق دیں ازروئے قرآن ہے
خواہ برہمن کوئی خواہ مسلمان ہے
شیخ ہی سے سمجھے ہو دین کی نسبت فقط
اپنی زلیخائی پر کتنے ہو برخود غلط
دین اگر ہووے ایک جمع نہ ادیان ہو
دوہی نہ سمجھے اسے ان سا جو نادان ہو

اس کے بعد شیدا نے ایک نقل بیان کی ہے، جس میں ایک بچے اور الّو کا قصہ بیان کر کے فدوی کو الّو بتایا ہے۔ کلیاتِ سودا میں اس مثنوی کے بعد پانچ اشعار کی ہجو ہے، جس میں سودا نے لکھا ہے کہ فدوی کو شعر و شاعری سے تو کوئی سروکار ہے نہیں۔ استادانِ فن سے خواہ مخواہ لڑتا بھڑتا ہے۔ حسرت سے دھول دھپا کرتا ہے۔ اس قطعہ کا آخری شعر ہے۔

گر شاعری یہی ہے دھولیں تو کیا ہیں اک دن
پاپوشیں کھا کسو سے تڑوادے گا یہ کلا

کلیاتِ سودا میں ایک اور ہجو "ہجوِ فدوی" کے نام سے ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ سودا کے فرخ آباد چھوڑنے کے بعد تک یہ معرکہ جاری رہا۔ کیوں کہ ایک بند میں سودا کے فیض آباد پہنچنے کا ذکر ہے۔

سن بے الّو پہونچ کے بنگالے
مادہ سگ آپ کو تو بنوالے
میرے تئیں گو ہے بسکہ ذوق بہ سگ
سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے
اتنے شاگرد ڈھونڈتا ہے عبث
سگ سے اک آکے تو گرہ کھالے
ایسے شاگردوں سے کہیں بہتر

نکل آویں گے بھونکنے والے
صورتوں میں پڑیں گے رنگا رنگ
لال طوسی سفید اور کالے
چاہے اُلو ہی تو رہے بن کر
خلق شاگرد اپنے کر ڈالے
کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

اس ہجو کے پہلے بند سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل جھگڑا فدوی اور سوداؔ کے شاگرد شیداؔ کا تھا۔ سودا لکھتے ہیں۔

فدویا بولے ہے میں ہوں استاد
میں کیا فنِ شاعری ایجاد
آکے شیداؔ جو ہو مرا شاگرد
گوشِ دل سے سنے مرا ارشاد
مرتبہ اس کے شعر کا ہو یہ
سخن اس کا سخن کے ہو استاد
رفتہ رفتہ سُنا یہ شیداؔ نے
کہا اس نے کہ خانماں برباد
معنی کے گھر کو تو نے ویراں کر
پھینک دی اس کی کھود کر بنیاد
کس طرح سے میں ہوں ترا شاگرد
بیت سعدیؔ کی یہ مجھے ہے یاد
کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

سوداؔ نے نو بندوں کا ایک اور مخمس لکھا ہے، جس میں فدوی کو طرح طرح سے "اُلّو بنایا ہے کا"

ثابت کیا ہے۔ اس مخمس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

کیا ہے چرخ بنانے میں اس کے میں یہ ہنر
نہیں ہے اصلی و نقلی میں فرق ذرّہ بھر
جو اور بوم ہو سو مادہ یہ لگے وہ نر
جو راہ باٹ میں آتا ہے صبح و شام نظر
کہے ہے خلق وہ جاتا ہے اُلو بیٹے کا

نظر کرو تو کہ ذرّہ بھی بھڑوے میں ہے شعور
جو ملنے سے کس وناکس کے ہووے ہے مغرور
کسی کو صحبت شعراس سے کچھ نہیں منظور
ہوئی ہے بسکہ یہ صنعت گری مری مشہور
ہر ایک دیکھنے آتا ہے اُلو بیٹے کا

فدوی نے سودا اور شیدا کی جو ہجویں کہی تھیں، وہ اب نہیں ملتیں۔ البتہ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں تین مصرعے نقل کیے ہیں جو بقول آزاد فدوی نے سودا کی ہجو میں کہے تھے۔

کچھ کٹ گئی ہے پٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دُم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا
بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے

جعفر علی حسرت اور سودا

ان دونوں کا کوئی باقاعدہ معرکہ نہیں ہوا۔ جن دنوں سودا فرخ آباد میں تھے شاید حسرت بھی وہاں تھے۔ کیوں کہ سودا نے فدوی کی ہجو میں ایک شعر یہ بھی کہا تھا۔

حسرت سے دھول دھپا لڑتا ہے شاعری پر
یاں تک کہ فخر اپنا کرتا ہے یہ بلّا

ناصر لکھنوی نے "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" میں لکھا ہے کہ" جب تمام ہندوستان میں سودا

کی شہرت ہوئی اور حسرت کا بازار ٹھنڈا رہا تو اس نے مرزا رفیع پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ سودا نے نواب شجاع الدولہ بہادر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے۔

نورِ خورشید ہو جس طرح سے شب کو زائل

بہ سبب ریاضی دانی کے اوس پر یہ اعتراض کیا کہ نورِ خورشید کا شب کو زائل نہیں ہوتا۔ اس مکابرہ میں تفصیل حسین خاں مدعی اور مدعا علیہم ہوئے خاں صاحب نے کہا نورِ خورشید کا زائل ہونا تاریکیٔ شب سے اور ثابت اور فروغ کوکب اس پر حجت ہے۔ ایک دن میر سوز نے مرزا رفیع سودا سے کہا ہم حسرت کو آپ کی طرف ناصاف اور ہر بات میں خلاف پاتے ہیں۔ شکنجۂ ہجو سے اوس کو مالش دیا چاہیے اور معترف اپنے قصور کا او سے کیا چاہیے۔ سودا نے فرمایا میں اوس کی ہجو کرتا ہوں جو شاعر ہو نہ کہ ایسے شاعر کی۔ یہ رباعی تمھارے نام سے کہی جاتی ہے۔ اوس کی تنبیہہ کو کافی ہوگی۔

کیوں سوز یہ حسرت کا نہ دل ہووے سپند
ہے شعر کی گرمی کا دھواں اس کی بلند
حسرت او سے کیوں نہ ہووے شاعر بے سوز
عطار کا لونڈا ہے وہ ماٹھو گل قند[1]

میر سوز اور سودا

بعض شواہد سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سوز اور سودا کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ جب سودا نے فرخ آباد سے عزمِ سفر کیا تو میر سوز کے سرپرست اور شاگرد مہربان خاں رند کے دیوان اور اشعار کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے۔

شعر کی بحر میں ترا استاد
کشتیٔ ذہن کو ہے بادِ مراد

---

[1] تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی)۔ سودا نے حسرت کی ہجو میں غزل کہی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔
بھدانے کا آندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر
ہر مرغ اسے کھا کے ہوا سیر ہوا پر

لیک خدمت میں تیری اتنی عرض
کرنی اس خیرخواہ کو ہے فرض
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان
پھر ملے گا نہ سوز سا انسان

میں نے دیوانِ سوز کے تین چار قلمی نسخے دیکھے ہیں مگر کسی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سودا کی ہجو میں کہا گیا ہو۔ خود کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں بھی سودا کا ایسا کوئی شعر نہیں۔ البتہ بعض تذکروں میں یہ شعر ملتا ہے۔

سودا یہ سُن کے تیرا نظم کلام
کہتی ہے سوز کی استادی ہائے ہائے (؟)

مرزا فاخر مکیں اور سودا

سودا کے ایک شاگرد نے ایک ہجو میں لکھا ہے۔[1]

سودا و مکیں میں پڑی اوس سے ہے لڑائی
تھے ورنہ بہم پیش ازیں جوں شکر و شیر

اس شعر سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے ان دونوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ''عبرت الغافلین'' سے اس معرکہ کے بیشتر حالات کا علم ہوتا ہے۔ اشرف علی خاں ایک بااخلاق، مہذب اور عمدہ گھرانے کے فرد تھے۔ انھوں نے طویل عرصے کی محنت سے فارسی شاعروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا اور تصحیح کے لیے فاخر مکیں کے پاس لے گئے۔ مکیں نے کہا کہ "مارا

---

[1] مطبوعہ کلیاتِ سودا میں ایک طویل ہجو ہے۔ جس کا مطلع ہے۔
کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر
کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر
بعض محققین اور ناقدین کو دھوکا ہوا کہ یہ قصیدہ خود سودا کی تصنیف ہے۔ حالاں کہ اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سودا کے شاگرد کا کہا ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ شاگرد کون تھا۔ قاضی عبدالودود نے مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ سودا کے شاگرد مرزا حسن کی تصنیف ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ص ۱۵۳-۱۷۹۔

دماغ نیست خوب ایں کار را برائے خاطرِ شما بشرطے قبول کنم کہ اشعار تمام شعرائے ہند را از فیضی و عُرفی و ناصر علی و بیدلؔ و سراج الدین علی خاں آرزو و میر شمس الدین فقیرؔ گرفتہ یک قلم خط بکشم مگر تصحیح و انتخاب اشعار شعرائے اہل ولایت خواہم نمود"۔

اشرف علی خاں کو یہ منظور نہیں تھا، وہ تذکرہ واپس لے آئے اور شیخ آیت اللہ ثنؔا کے پاس لے گئے۔ شیخ مذکور نے چند جزو کی تصحیح کی تھی کہ انھیں لکھنؤ سے فیض آباد جانا پڑا۔ اشرف علی خاں مجبور ہوکر پھر مرزا فاخر کے پاس گئے۔ مرزا نے کہا میں اس نسخے کی تصحیح اُس وقت کروں گا جب تم تحریری درخواست لکھ کر دوگے۔ اشرف علی خاں نے وہ تحریر لکھ کر دی۔ مرزا نے غصّے سے وہ تحریر پھینک دی اور کہا جو کچھ میں کہوں وہ لکھو۔ چناں چہ اشرف نے مجبوراً وہ تحریر لکھی۔۔ جس کی عبارت تھی کہ میں پہلے بھی یہ تذکرہ مرزا فاخر کی خدمت میں لایا تھا مگر مصروف ہونے کی وجہ سے وہ تصحیح نہ کرسکے۔ مجبوراً تذکرے کے تیس جزو شیخ آیت اللہ ثنؔا کے پاس لے گیا کیوں کہ میں ان کی استادی تسلیم کرتا تھا۔ انھوں نے عرصے تک یہ تذکرہ دیکھا۔ انھوں نے غلطیوں کو صحیح سمجھا اور بعض غلطیوں کو اور بھی غلط کردیا۔ اس لیے مجبوراً دوبارہ مرزا فاخر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیوں کہ آج کل اس شہر میں ان سے بڑا صاحبِ کمال کوئی نہیں ہے اور اُن سے تصحیح کی پھر درخواست کی۔[۱] (فارسی سے ترجمہ) اشرف علی خاں نے مجبوراً یہ عبارت لکھ کر دے دی۔ مرزا فاخر نے اکثر اساتذہ کے اشعار قلم زد کردیے بلکہ بعض کی اصلاح بھی کی۔ اشرف علی خاں نے جب یہ خبر سُنی تو بہت پریشان ہوئے اور وہ تذکرہ واپس لے آئے اور کچھ دن بعد سودا کے پاس آئے۔ سودا نے کہا کہ مجھے فارسی سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں۔ آپ کسی اور کے پاس لے جایئے۔ مگر وہ تذکرہ چھوڑ گئے۔ کچھ دن بعد سوداؔ نے تذکرے کا مطالعہ کیا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ اکثر مشاہیرِ فن کے اشعار قلم زد تھے یا ان پر اصلاح کی گئی تھی۔ سودا کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انھوں نے مرزا فاخر مکیں کی بددماغی اور خودسری کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کیا۔ "عبرت الغافلین" مکیںؔ کی اصلاحوں کا جواب ہے۔ مکیںؔ نے امیر خسرو، سعدی، مولانا روم، مولوی جام، آہی سبزواری، مولانا افسری، نعمت خاں عالی،

۱؎ کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ص ۳۷۵-۳۷۶۔

مرزا صائبؔ، امتیاز خاں خالصؔ، خان آرزوؔ، محمد قلی سلیم طشتری وغیرہ کے اشعار قلم زد کیے۔ سودا نے "عبرتؔ الغافلین" میں یہ تمام اشعار پیش کیے ہیں۔ فاخر مکیں نے جو اصلاحیں دی تھیں۔ سودا نے ان کا جائزہ لے کر اعتراضات کا جواب دیا ہے اور پھر خود فاخر کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں۔

مرزا احسن نے جو مصحفیؔ کی ہجو لکھی ہے۔ اس میں سوداؔ اور مکینؔ کے ادبی معرکے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اشرف علی خاں نامی باخلاق مہذب
تھے عمدہ گھرانے سے وہ ایک مرد بہ توقیر
تھا شعر کا شوق ان کو جوانی سے نہایت
مصروف اسی میں رہے جب تک کہ ہوئے پیر
اک عمر کے عرصہ میں بہت شوق و شغف سے
ان خاں نے کیا تھا غرض اک تذکرہ تحریر
مذکور سنا فارسی گوئی کا مکیںؔ کے
اشرف علی خاں نے جو بافواہ جماہیر
اس تذکرہ کو لے گئے القصہ وہ اوس پاس
تا دیکھے وہ اس تذکرہ کے شعر بتاخیر
دکھلایا جب اوس تذکرہ کو خاں نے مکیں کو
تب عذر دماغ اپنا بیاں کردہ بہ تکریر
تصحیح رکھی اوس کی کئی شرط پہ موقوف
جو جو اسے منظور تھا لا اوس کو بہ تقریر
ہاتھ اپنے سے اک بند پہ لکھ اوس نے وہ شرطیں
جو باتیں کہ پائیں تھیں قرار اوس کی بہ تدبیر
پھر اوس نے کہا کیجیے مہر اپنی اب اس پر
تا ہووے با سناد تزین بہ تحاریر

اشرف علی خاں کی یہ تحریر اپنے پاس رکھ کر مکینؔ نے تذکرہ کی اصلاح شروع کی۔ کچھ دن میں اشرف علی خاں کو خبر ملی کہ مکینؔ نے اپنی شمشیرِ قلم سے بڑے بڑے مشاہیر کی گردنیں اُڑا دی ہیں۔ اُن کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور:

پاس اوس کے سے القصہ وہ پیش آ بہ خشونت
اوس تذکرے کو لائے اوٹھا سخت ہو دل گیر
لا گھر میں جو اوس تذکرے کے حال کو دیکھا
سوداؔ کنے لا اوس کو لگے کرنے یہ تقریر
اس ظلم کا انصاف کرو، دو میری تم داد
میں ورنہ گریباں کو ڈالوں گا ابھی چیر

سوداؔ نے انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا کہ آپ واقعی انصاف کے طالب ہیں تو اُن لوگوں کے پاس جایئے جو فارسی کے استاد ہیں۔ میں تو ریختہ گو ہوں۔ سوداؔ کا جواب سُن کر اشرف آزردہ ہو کر واپس چلے گئے لیکن تذکرہ وہیں چھوڑ گئے۔ مجبور ہو کر سوداؔ اس تذکرے کی طرف متوجہ ہوئے تو انھیں معلوم ہوا کہ فاخر مکیں نے اساتذۂ فارسی کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

دیکھی تو عجب طرح کا ہے قتل مچایا
ہاتھ اپنے میں لے اوس نے قلم کا تبر و تیر
اوستادوں کے وہ شعر کہ ہر حرف جنھوں کا
دیوان فصاحت کے کتابہ کی ہے تحریر
اوس کے تئیں کاٹا ہے بنایا ہے بگاڑا
ہر شعر کے معنی کو کیا ہے زبر و زیر

کاٹا کوئی مصرع کوئی مصرع ہے بنایا
بے معنی کوئی لفظ کہہ اوس کی لکھی تقریر
ٹھہرایا ہے بے معنی کوئی مصرعۂ اوستاد
مصرع کوئی بے معنی کہہ اس میں کیا تسطیر

اس کے بعد سوداؔ کے اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مئی ۱۹۶۴ء کے ''معاصر'' میں '' معارضۂ سوداؔ اور مکینؔ پر کچھ نئی روشنی'' کے عنوان سے افسر الدولہ فیاض الدین حیدر کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ ان میں مکینؔ کے ایسے تین خطوط کا تعارف کرایا گیا ہے جن سے اس معرکے پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ مکینؔ نے قاضی لطف اللہ خاں ناطقؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

دریں ایام عجب مکروہے روزے شد، مجملاً اینکہ یکے از ہندی گویان کہ بہ سودائے خام خود را رفیع القدر در مراتب کلام می داند از دو سہ سال اکثر آمدہ اظہار ہزار گونہ رسوخ و خلوص می کرد، درخواست تغیر و تبدل کلام فارسی خود می نمود آخر کار بجائے رسید کہ ہیچ قسم در تائید درستی اعتقاد باقی نگذاشت، قبول نکردم، ارادہ مجلس ضیافت مع یاران ظاہر کرد بلطائف الحیل گذراندم و گفتم شما در کار خود ثانی ندارید و مانندِ من در کوچہ و بازار ہزار کس ہر طرف پیدا می شود دست بردار از خیال خود بظاہر نبود، یکا یک سلب ماہیت چنیں شد کہ قول دیوانہ،

مصرع   شاگرد ہمہ عالم و استاد حزینم

بہ عمل آورد---   و حال آنکہ اوّل چنیں گفتہ بود مصرع

استاد ہمہ عالم و شاگردِ حزینم

> ایں مصرع ظاہراً والہ درحق شیخ علی حزیں علیہ رحمتہ گفتہ، القصہ حالا باوجود تجاہل و تغافل مخالفت ہای کند۔ چنانچہ روزے پیشِ مختار الدولہ بہ واسطہ عزیزے استغاثہ کرد، باآنکہ روے ندیدنی فقیر را نواب معزاللہ ندیدہ بود۔ جواب داد کہ برما ثابت است کہ فلانے با ہیچ احدے سروکار ندارد برخود شباشاں حکومت ناسزاوار نیست......" [۱]

اس خط میں مکین نے اشرف علی خاں کے تذکرے کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ سودا پر الزام لگایا کہ وہ مکین کا تلمذ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چوں کہ انھیں منظور نہیں تھا۔ اس لیے سودا ناراض ہوگئے۔ میرا خیال ہے کہ مکین نے حقیقت چھپائی ہے اور یہ محض الزام تراشی ہے کہ سودا ان کا تلمذ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ یہ واقعہ سودا کی آخری عمر کا ہے۔ اس وقت سودا جیسے مشہور شاعر کو شاگرد بنانا کسی کے لیے بھی قابلِ فخر تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فارسی میں سودا کو شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن اردو میں تو انھیں جو مقام حاصل تھا۔ وہ صدیوں میں دو چار ہی کو ملتا ہے۔

بہر حال اس معارضہ نے اتنا طول کھینچا کہ مکین کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وہ محمد راغب خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> " آتش در خانہ نا ہنجار افتد کہ دریں تازگی خیلے بامن کج باخت، بتاریخ دوازدہم شہر ذی قعدروز سہ شنبہ خود را از دست کشمکش عزیزاں اینجا خلاص نمودہ، ارادہ گرم روی کردم، آخر روز درعین ہوائے ابر بہ خانہ دوستے نقل مکان کردم باوجود یکہ شب بہ شدت بارش شد و صبح کمال برودت و ابر بود روانہ شدہ بہ بجنور رسیدم و گوشہ گزیدم۔ شب از کوفت راہ و تنہائی و عدم رفیق مزاج داں انچہ گذشت صبر برآں کرد۔ چہاردہم روز پنجشنبہ بوقت طلوع آفتاب بہ سینڈی کہ چہار پنجم کردہ بود تا آخر روز آہستہ آہستہ رسیدہ۔ طرفہ خلل در خود

---

۱ مکین کے خطوط کے حوالے معاصر حصہ ۱۹، مئی ۱۹۶۴ء سے لیے گئے۔

محسوس کردم......روزِ جمعہ ازآں جا بہ ہماں حال قدم در راہ گذاشتیم بعد دو پہر بہ سدھولی کہ چہار کردہ بود وارد شدہ منزل گرفتیم، سامعہ و باصرہ معطل شد و حواس دیگر مختل، سقوطِ اشتہا بدرجہ ای کہ رغبت ہیچ چیز نبود، چنانچہ اصلاً نخوردم"۔ [1]

مکینؔ کے اس خط سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ سوداؔ کے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اکثر بیدلاں در آتش زبانہا سوختہ و آتش فساد برائے خود افروختہ ایں است کہ دریں ایام خانہ اش سوخت و آب از دیدہ بریخت فایدہ نیند دخت اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا"۔ [2]

اگر سوداؔ نے فاخر مکین کی ہجو کہی ہے تو مکینؔ نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ انھوں نے بھی سوداؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مذاق اڑایا ہے۔

نہ دید از خود فروشی دشمنِ ما جنس بہبودے
بیازار جہاں دارد عبث سودائے بے سودے
دکانے چیدہ بہر گرمی بازار از سوداؔ
ندارد گرچہ غیر از آہ محرومی دم و دودے
بایں بے مایگی جوش خریداران طمع دارد
خیال باطل او را تماشی کاش می بودے
ملمع گوئی از گفتار صاحب مایگاں گیرد
کند ابلہ فریبی تا کہ از قلب زر اندودے

---

[1] معاصر، حصہ ۱۹، ص ۷۵

[2] معاصر، حصہ ۱۹، ص ۷۶

متاع روے دست اوست قصد روکشی با من
بجز رو ساختن ہرگز نہ بیند روے مقصودے
بدل با وعدہ نقد وفا جنس جفا کردہ
نمی داند کہ در پیش است آخر روز موعودے
مرا ارزاں نماید خود گراں قیمت شود لیکن
نمی ارزد پشیزے نرخ خود چنداں کہ افزودے
براہ وصف گاہے یک وجب رہ طے نمی کردے
بگاہ طعنہ دریک گام صدگز راہ پیمودے
سخن باہر کس از بیش وکم من درمیاں دارد
ز دلالی دل او ہیچ آیا شرم نہ نمودے [1]

غلام حسین ضاحک اور سودا

ضاحک ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جنھیں سودا کی ہجووں نے زندۂ جاوید کیا ہے۔ سودا اور ضاحک دونوں ایک دوسرے کی ہجو گوئی میں فحش نگاری کی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ عام طور پر یہی خیال تھا کہ ضاحک کا دیوان مرتب ہی نہیں ہوا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا تھا کہ ''میر حسن مرحوم ان کے صاحب زادے سودا کے شاگرد تھے۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لیے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یادہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کیے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بہ مقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان

---

[1] معاصر، حصہ ۱۹، ص ص ۷۳-۷۴۔

کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں''۔ ۱؎ اب آزاد کا بیان ایک دل چسپ حکایت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اوّل تو میر ضاحک کا دیوان مل گیا ہے ۲؎ اور دوسرے ضاحک کا انتقال سودا کی وفات کے بعد ہوا۔ ۳؎ دیوان میں سودا کی ہجویں موجود ہیں۔

ان دونوں کے معرکے کی ابتدا کب ہوئی؟ اور کس نے کی؟ اس سے متعلق ناصر لکھتے ہیں۔ ''جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سُنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد میں آیا ہے شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا سبحان اللہ کیا وضع داری تھی کہ نواب کے شقہ کے جواب میں یہ رباعی لکھی ع سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک (پوری رباعی دی ہے) حضور پُرنور اس رباعی سے خیلے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین بہ تخلص ضاحک کہ نمک مجلس تھے۔ واسطے رفع ملال یوں بول اُٹھے اگر وہ حضور پُرنور کی شقہ سے نہیں آتا ہے غلام بے طلب کھینچ بلاتا ہے۔ قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سودا کا کہا ہوا تھا تمام اس مصنف کی مذمت میں الٹا۔ چناں چہ یہ شعر۔

پاؤں کھڈّی پہ رکھو ہاتھ میں لو آئینہ
بال......کے چنو ناک پہ دھر کے عینک

جب وہ مزخرفات سودا نے سنے بحکم آنکہ دیوانہ را ہوئے بس است روانہ لکھنؤ کو ہوا۔ میر سابق الذکر نے کہ دلیری و شوخ چشمی ان پر ختم تھی۔ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجہ کیا۔ اس فروتنی سے غبار عناد کا سودا کے دل سے مطلق صاف ہوگیا۔ موافق قاعدہ ہندوستان عطر و پان کے واسطے اندر تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں کہ برآمد ہوں اس ٹھٹول نے قلمدان کھولا اور یہ مطلع ایک پرچہ پر لکھا دیکھا

رستم سے تو کہہ پیارے سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

۱؎ آبِ حیات، ص ص ۱۸۲-۱۸۳۔

۲؎ یہ دیوان بتیا راج۔ بہار کے محافظ خانے میں محفوظ تھا۔ قیام الدین احمد صاحب نے معاصر (جولائی ۱۹۶۲ء) میں اس کا تعارف کرایا ہے۔ میں نے اصل دیوان نہیں دیکھا۔ اسی مقالے سے استفادہ کیا ہے۔

۳؎ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۳۔

اس کے برابر یہ مطلع لکھ دیا:

سوداؔ نے اُٹھا چوتڑ جب پاد دیا پڑدے
یہ ان ہی سے ہوتا ہے ہر کارے و ہر مردے

بعد دو چار گھڑی کے جب وہ صحبت برہم ہوئی۔ سوداؔ نے قلمدان کھولا اور وہ مطلع پڑھا۔ یقین کلی ہوا کہ سید نا سید اور مرد نا معتقد ہے بے اختیار یہ شعر زبان پر گزرا۔

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے اُلٹ نکلا ہے میر [1]

اوّل یہ ترجیع بند کہا بعد اس کے یہ قصیدہ۔

ضحاکا کیوں نہ وہ پرواز کرے زیرِ فلک
پہنچی پشمین سے ہو نطفہ کی حلت جس تک [2]

بعد خرابی بسیار باستدعائے میر حسن یہ ہجو مولوی ساجد شاہ آبادی کے نام پر ہوئی۔ باقی ترجیع بند اور مخمس و مثنوی ہنوز بدستور''۔ [3]

محمد حسین آزادؔ لکھتے ہیں۔ ''سوداؔ نے جوان کے حق میں گستاخی کی ہے اس کا سبب یہ ہوا کہ اول کسی موقع پر انھوں نے سوداؔ کے حق میں کچھ فرمایا۔ سوداؔ خود ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ بزرگ میں خرد آپ سید میں آپ کے جد کا غلامِ عاصی اس قابل نہیں کہ آپ اس کے حق میں کچھ فرمائیں۔ ایسا نہ کیجیے کہ مجھ گنہگار کے منہ سے کچھ نکل جائے اور قیامت کے دن آپ کے جد کے سامنے روسیاہ ہوں۔ تلامیذِ الٰہی کے دماغ عالی ہوتے ہیں۔ ان

---

[1] ناصر نے پورا ترجیع بند نقل کیا ہے۔

[2] قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ ''ناصر نے جس کا فیہ قصیدے کے بارے میں لکھا ہے کہ دراصل ضاحکؔ کی ہجو میں تھا۔ یہ قابلِ قبول نہیں، یہ ہجو ساجد ہی کی ہے''۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۲۷۔

[3] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، قلمی، آزاد لائبریری، علی گڑھ۔

کی زبان سے نکلا کہ نہیں بھئی یہ شاعری ہے اس میں خردی و بزرگی کیا۔ سوداؔ آئیں تو کہاں جائیں۔ پھر جو کچھ انھوں نے کہا خدا نہ سنوائے۔[۱] لیکن یہ تمام بیانات درست نہیں۔

سوداؔ نے ضاحکؔ کی ہجو میں جو ترجیع بند کہا تھا، جس کا مطلع ہے۔

جا صبا ضاحکؔ سے کہہ بعد از سلام
کیوں کیا کرتا ہے ہجوِ خاص و عام

اس کے بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضاحکؔ ہر شخص کی ہجو کرتے تھے۔ ان میں بعض لوگ سوداؔ کے ملنے والے بھی تھے۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری اور انھوں نے ضاحکؔ کی ہجو کہہ دی۔ اس معرکے کی ابتدا غالباً اسی ترجیع بند سے ہوئی۔ چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آپ کو کہتا ہے تو سیّد ہوں میں
جد مرا پوچھو تو ہے خیرالانام

پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں
ہو اگر ختم رسالت کا کلام

ہجو کرتا کیوں تو ان اشخاص کی
وہ جو ہیں ممتاز زیرِ آسماں

----

[۱] آبِ حیات، ص ۱۸۲۔

کہہ معالج[1] خاں نے تیرا کیا کیا
شعر ان کا اپنے منہ میں گہہ بھرے
میرنواب اور ان کے بھائی کی
ہجو تو کرتا ہے وہ ہیں منگرے
میرزا بہلو سے تا مرزا علی[2]
نظم میں آئے ترے سب سے پرے

کچھ میری ہجو تو اے بھڑوے نٹ
تو سہی دوں بانس سے تجھ کو الٹ

آخری شعر بتا رہا ہے کہ ضاحکؔ نے ابھی تک سوداؔ کی ہجو نہیں کہی تھی اور ضاحکؔ نے میرِ نواب، ان کے بھائی، مرزا بہلو، مرزا علی اور معالج خاں وغیرہ کی جو ہجویں کہی تھیں، وہ سودا کو ناگوار گزریں اور یہی ناگواری ہجو گوئی کی ابتدا کا سبب بنی۔ سوداؔ نے ایک اور مخمس لکھا تھا۔ کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں یہ "مخمس درہجو اہلیہ میر ضاحکؔ" کے عنوان سے شامل ہے۔ مگر اس کے صرف پانچ بند دیے ہیں جب کہ قلمی نسخوں میں ۴۵ بند ہیں۔ مخمس کا پہلا بند ہے۔

---

[1] دیوان ضاحکؔ میں معالج خاں کی ہجویں موجود ہیں۔ دو شعر یہ ہیں۔

طرفہ ہے یہ کوئی معالج خاں   کھودے ہے سب کی ذات اور ایماں
ہے معالج کہ یا ہے یہ دجّال   پڑے سب سیدوں کا اس پہ وبال

(معاصر جولائی ۱۹۶۲ء، ص ص ۱۱۶-۱۱۷)

[2] کلیاتِ سوداؔ مرتبہ آسی میں یہ نام مرزا رفیع ہے لیکن اکثر معتبر قلمی نسخوں میں مرزا علی ہے۔ مطبوعہ کلیاتِ سودا میں مرزا علی کی ہجو کے ایک مخمس کے تین بند موجود ہیں۔ "اک قصہ میں سنا تھا مردم سے یہ قضارا"۔ نو بند کا یہ مخمس دیوانِ میر حسن کے قلمی نسخے (رضا لائبریری رام پور ص ص ۳۰۸-۳۱۰) میں موجود ہے۔ غالباً یہ سودا کا نہیں ہے کیوں کہ کلیاتِ سوداؔ کے اکثر قلمی نسخوں میں نہیں ہے۔

ضاحکؔ کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا
بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا
تب شیخ سدّو اُس پر امساک کھا کر آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحکؔ بکرا کوئی منگایا

سوداؔ نے ضاحکؔ کی ہجو میں ایک مثنوی بھی کہی تھی۔ جس کا مطلع ہے۔

عجیب و غریب زیر سما
ایک یاں صورت آشنا اپنا

اس مثنوی میں ضاحکؔ کی بسیار خوری کا طرح طرح سے مضحکہ اڑایا ہے۔

محمد حسین آزادؔ نے سکندرؔ مرثیہ گو اور ضاحکؔ سے متعلق ایک دل چسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''سوداؔ کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا: یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر۔ تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام میر مہدی حسن فراغؔ...... کو خدا مغفرت کرے انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسبِ معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا و شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحکؔ تشریف لائے۔...... اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمایئے...... سوداؔ نے کہا۔ میں نے تو ان دنوں میں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا کیا؟ سوداؔ نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اُٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ سکندر بیچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آ گئی۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سوداؔ کو دیکھیے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں''۔[۱] اس مخمس کا پہلا بند ہے۔

---

۱ آبِ حیات، ص ص ۱۸۳-۱۸۴۔

یا رب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر
ضاحکؔ...... کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچۂ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر
روٹی تو کما کھاوے کسی طور مچھندر

دیوانِ میر حسن میں ایک مخمس شامل ہے جو اس کا جواب ہے۔ اس کا پہلا بند ہے۔

ضاحکؔ نہ خوف کر تو اب کیا ہے یہ مچھندر
بکرے کا ہے وہ ......اور زادۂ قلندر
باندھے ہے جب نہ تب وہ بکرے کو باہر اندر
لکڑی کے بل نچا تو اس کو مثالِ بندر
......ڈرے ہے تیرا...... یہ ہے سکندر

سکندر کی ہجو میں جو مخمس ہے وہ سوداؔ ہی کی تصنیف ہے۔ کیوں کہ کلیاتِ سوداؔ کے اکثر معتبر قلمی نسخوں میں شامل ہے۔[۱] لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کا جواب کس نے لکھا تھا۔ دیوان ضاحکؔ میں یہ مخمس شامل نہیں ہے اور مخمس میں جتنی فحش نگاری کی گئی ہے اور جس طرح کے مشورے دیے گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میر حسن کی تصنیف نہیں کیوں کہ ایک بیٹا اپنے باپ کو اس طرح کے مشورے نہیں دے سکتا۔ غالباً یہ مخمس ضاحکؔ کا کہا ہوا ہے اور ان کے دیوان میں شامل ہونے کی بجائے دیوان میر حسن میں شامل ہو گیا ہے۔

دیوان ضاحکؔ میں سوداؔ کی ہجویں موجود ہیں۔ ایک غزل کے دو شعر ہیں:

---

[۱] پہلے قاضی عبدالودود صاحب اسے سکندر کی تصنیف بتاتے تھے (علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۳) لیکن اب وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سودا کی کہی ہوئی ہے (سویرا، خاص نمبر، ۲۹، ص، ۵۷۔)

اتنا آگے کبھی سودا نہ ہوا تھا سو ہوا
بنگلے میں بیٹھ کے رسوا نہ ہوا تھا سو ہوا
گو کہ در ماہہ ہوا بیش و لے عزت کم
شاعروں بیچ چو تھیلا نہ ہوا تھا سو ہوا

ایک ہجو میں ضاحکؔ نے سوداؔ کے کتوں کے شوق کو بُرا بھلا کہا ہے۔ تین شعر ملاحظہ ہوں۔

اوس کا سارے سگوں سے ناتا ہے
ایک سفرہ پہ ساتھ کھاتا ہے
کلوا اور جھبرا لینڈی اور تازی
سب شریک طعام اور ہم بازی
کلوا کلہ چبائے جاتا ہے
اوجھڑی جھبڑا ساتھ کھاتا ہے

ایک دوسری ہجو کے دو اشعار یہ ہیں۔

ناصر الملک کا وہ سالا ہے
چاہے گھڑنے میں کھیلا کالا ہے
سلف سب شاعروں میں سوداؔ ہے
ایک سر میں ہزار سودا ہے

مذہبی ہجویں

سوداؔ کی مذہبی ہجویں صرف تین ملتی ہیں۔ کسی مجتہد نے یہ فتویٰ دے دیا کہ کوا حلال ہے۔

اس مضحکہ خیز بات پر سودا کی رگِ ظرافت پھڑک گئی اور انھوں نے مجتہد اور ان کے حامیوں کی ہجو کہہ ڈالی۔ ہجو کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے
کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
یوں دخل امرونہی میں کرنا محال ہے
جو فقہ داں ہیں سب کا یہ اُن سے سوال ہے
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

مسخرے کے ساتھ اس کے حامی چاند خاں اور اک مہربان بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

حامی انھوں کے قول کا ہووے ہے چاند خاں
اور دوسرے میں کیا کہوں اک اپنے مہرباں
کچھ شک رہا ہے کوّے کی حلت کے درمیاں
ہم سے جو کوئی پوچھے تو ہم بھی کہیں کہ ہاں
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

اس کے بعد سودا نے ایک دل چسپ قصہ بیان کیا ہے۔ ایک مجتہد نے اپنے نوکر سے کہا۔ ''کوّا حلال چیز ہے میرے لیے پکا''۔ نوکر نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن آقا کے اصرار سے تنگ آکر پکانے پر مجبور ہوگیا۔ بہ مشکل تمام کوّا پکا۔ تو مجتہد بولے۔ ''گھی پی لیا ہے تو نے تو کوّا رہا ہے خام''۔ نوکر نے جواب دیا میاں خدا کا نام لو۔ میرے لیے تو یہ سوٗر سے بھی زیادہ حرام ہے۔ آقا کو غصہ آگیا۔ انھوں نے ملازم کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ نوکر بھی خاموش نہ رہا اور آخر نوبت یہ پہنچی۔

جس وقت بڑھ پڑی غرض آپس میں دوت وات
ایدھر سے دھول چلنے لگی اور ادھر سے لات

پگڑی انھوں کی ان کنے جیب ان کی ان کے ہات

مبدا جو اس فساد کا پوچھو تو اتنی بات

اک مسخرا یہ کہتا ہے کو احلال ہے

لوگوں نے بیچ میں پڑکر ان دونوں کو چھڑایا۔

مطبوعہ کلیاتِ سودا میں ایک ہجو ہے جس کا عنوان ہے۔ "قصیدہ در ہجو شخصے کہ متعصب بود"۔ لیکن بہت سے قلمی نسخوں میں شاہ ولی اللہ کا نام موجود ہے۔ ہجو کی ابتدا میں سودا نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے۔

کروں چمن میں اگر جاکے میں غزل خوانی

تو بلبلیں ہوں مرے چہچے کی دیوانی

موا نہیں وہ مرے صیت شعر کو سُن کر

زمیں میں شرم سے اب گڑ گیا ہے خاقانی

یقیں تو جان کہ زانو ادب کے اس فن میں

کرے ہے تہ مرے آگے عبید زاکانی

اس کے بعد سودا اصل موضوع پر آتے ہیں۔

نہ ہووے کیونکہ مرا رتبہ شعر میں یاں تک

میں کیسے پیر کی کرتا ہوں اب ثنا خوانی

انھوں کی ذاتِ مبارک میں یہ تعصب ہے

کریں نہ چشم میں سرمہ ہو گر صفاہانی

کوئی جو اس کا سبب جاکے پوچھے ہے اون سے

تو کہتے ہیں کہ ہے یہ بھی کوئی مسلمانی
لگانا سرمہ کو واں کے جہاں رہیں شیعہ
بھلی ہیں اس سے تو یہ آنکھیں کور ہو جانی
علی کا نام لے کوئی جو آکے مجلس میں
کہیں ہیں قتل کرو اس کو ہے یہ ایرانی

اس کے بعد سترہ اشعار میں سوداؔ نے تقریباً یہی باتیں کہی ہیں اور شاہ ولی اللہ پر ان کے مذہبی تعصب کی وجہ سے لعن طعن کی ہے۔

ایک اور ہجو مولوی ساجد کی ہے۔ مطبوعہ نسخے میں اس ہجو کا عنوان ہے۔

''قصیدہ در ہجو مولوی ساجد در بیان آنکہ یزید علیہ اللعنۃ را اولی الامر گفتہ بود''۔

اس ہجو میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک رافضی عالم سنی بن کر مولوی ساجد کے پاس گیا اور پوچھا۔

کہ دیکھ ماہ محرم نبی کی اُمت میں
درست ہے کہ یہ دیں یکدگر مبارکباد
پہن لباس مکلّف بروز عاشورہ
کریں معانقہ آپس میں ہو کے خرم و شاد

رافضی عالم کو سنی سمجھتے ہوئے مولوی ساجد نے

دیا جواب کہ ہم سنیوں کے مذہب میں
عمل یہ ان دنوں کرتے نہیں ہیں کچھ ایجاد
یہ بات ہوتی ہی آتی ہے عہد حضرت سے

ہزار جا ہے کتب بیچ اس کا استشہاد
حنا کو ہاتھوں سے ملنا لگانا سرمے کا
لباس پہن کے پڑھنا وظیفہ و اوراد
بڑا ثواب ہے اس کا کہ ہے یہ روزِ عید
کریں نہ گو یہ عمل شیعیان ز راہِ عناد

یہ باتیں سن کر رافضی عالم نے مکابرہ شروع کردیا اور ایسی ایسی دلیلیں پیش کیں کہ بقول سودا:

غرضکہ رافضی بے ادب نے ازرہِ جہل
خموش مولوی صاحب کو کرکے حد سے زیاد
یہ کہہ کے اُٹھ گیا ظاہر ہے اس حمایت سے
خسر یزید کا تو ہے وہ ہے ترا داماد

اس ہجو کا آخری شعر مطلع کی شکل میں ہے۔

مکن تو لعن بہ شمر و یزید و ابنِ زیاد
بگو بہ مولوی ساجد مدام لعنت باد

دیگر ہجویں

اس عنوان کے تحت سوداؔ کی بعض اخلاقی اور سماجی ہجوؤں کا ذکر کیا جائے گا۔ مطبوعہ کلیاتِ سوداؔ میں بخیل لوگوں پر دو ہجویں ہیں۔ پہلی ہجو کا عنوان ہے ''مثنوی در ہجو امیر دولت مند بخیل''۔ مثنوی کی ابتدا خدا کی تعریف سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک دل چسپ نقل بیان کی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اتفاقاً اک آشنا میرے
گئے تھے ایک عمدہ کے ڈیرے
جو ہیں وارد ہوئے یہ واں ناگاہ
اٹھا چاروں طرف سے ابر سیاہ

بارش کے آثار دیکھ کر صاحب خانہ بہت پریشان ہوئے۔اس نے مہمان سے پوچھا کہ بارش ہونے والی ہے۔تمھارے پاس واپس جانے کا کوئی سامان ہے۔مہمان نے جواب دیا۔مجھے کیا پتا تھا ورنہ میں کچھ نہ کچھ لے آتا۔اتنے میں بارش شروع ہوگئی۔صاحب خانہ نے کہا میری بدنصیبی ہے کہ آپ تشریف لائے۔بارش میں بھیگتے ہوئے واپس جائیں گے۔مہمان نے جواب دیا۔

بولے یہ سادگی سے کیا ہے ضرور
بھیگتا جاؤں گا میں اتنی دور
رکھے خالق سلامت آپ کی ذات
نہ کھلے گا تو میں رہوں گا رات

یہ جواب سن کر صاحب خانہ کی تو جان نکل گئی۔مگر اب صبر کے سوا کیا چارہ تھا۔کھانے کا وقت ہوا تو مہمان نے بکاول سے کہا کچھ تیار ہے تو لاؤ۔اتفاق سے صاحب خانہ وہاں موجود نہیں تھا۔بکاول نے آقا کے بخل کی داستان تقریباً ۴۷ اشعار میں بیان کی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔چوں کہ صاحب خانہ کا مطبخ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا تھا۔اس لیے بکاول مطبخ کا حال بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے۔

بسکہ مطبخ میں سردی رہتی ہے
ناک باورچیوں کی بہتی ہے

اون کے مطبخ سے دود اوٹھے اگر
سقّے لے دوڑتے ہیں مشکیں بھر
لگے ہے دینے کوئی اوٹھکے اذاں
کوئی دکھلاوے ہے کھول کر قرآں

بکاول صاحب خانہ کے لڑکے کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک دن اُس لڑکے نے اپنے کسی دوست کی دعوت کردی۔ بھلا یہ فضول خرچی کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ وہ آگ بگولا ہوگیا اور جو کچھ نہ کہنا تھا اس نے کہا۔ اپنے لڑکے پر ناراض ہوتے ہوئے صاحب خانہ فرماتے ہیں۔

یارو مجھ سے تو لاولد بہتر
میرا بیٹا اور اس قدر ابتر
اس کا دادا بھی گرچہ تھا عیّاش
اس سلیقے سے پر کرے تھا معاش
جو کوئی اس کے گھر میں نوکر تھا
رات کو اس پہ یہ مقرر تھا
پھرتا وہ ٹکڑے مانگتا گھر گھر
لاتا آقا کے آگے جھولی بھر
اچھے چُن چُن کے آپ کھاتے تھے
برے تنخواہ میں لگاتے تھے

ایک اور بخیل پر ہجو ہے جو اس ہجو کے مقابلے میں غیر دل چسپ ہے۔ مطبوعہ کلیات میں

صرف دو بند ہیں۔ ممکن ہے کسی قلمی نسخے میں اور بند مل جائیں۔

بخیل کی طرح سوداؔ اس آدمی کو بھی پسند نہیں کرتے جو بڑھاپے میں شادی کرتا ہے۔ اس موضوع پر سودا کی تین ہجویں ملتی ہیں۔ ایک ہجو کا عنوان ہے۔ "قطعہ تاریخ ہجو شیخ صنعت اللہ کہ کتخدا شدہ بود"۔ اس نو اشعار کی ہجو میں کسی نے ایک بوڑھے کی جوان بیوی سے پوچھا کہ تیری عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے تھے جو تو نے اس "مٹی کے تھوے" سے شادی کی۔ یہ سن کر بیوی نے

دیا جواب کہ اے بھڑوے خبر ہے تجھ کو
فرشتے نے مرے دامن کو آج تک نہ چھوا
سو ایسے خرس سے میں بیاہ کرنے بیٹھوں گی
کہ جس کی داڑھی کا ہر بال جیسے ہووے سوا
میں پیرزادی کر اس کی جہاں میں ہوں مشہور
جو کہتی ہوں اسے بھائی تو وہ کہے ہے بوا

ایک شیخ صاحب نے "بارہ برس کی چھوکری" سے شادی کر لی۔ پہلے تو سوداؔ نے ان کی شادی کا حال بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ پھر میاں بیوی کے تعلقات بیان کیے ہیں۔ کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

تھے بسکہ شیخ بات سے دنیا کی پاک و صاف
مسواک لے کے جورو سے کرنے لگے زفاف
چوٹی سے اپنی کھول کے اُن نے وہیں موباف
مشکیں جکڑ انھوں کی کہا کیجیے معاف

مجھ کو تو کچھ ولی نظر آتے ہیں شیخ جی

لایا غضب میں شیخ کو جورو کا بند دست
مشکیں توڑا پلچ گئے جو رو سے کرکے جست
بال اس کے ان کے ہاتھ تھے ریش ان کی اسکے دست
عہدے سے بر نہ آئے تھے از بس ضعیف و پست
پاپوشیں تب سے جورو کی کھاتے ہیں شیخ جی

جورو سے شیخ جی کو یہ صحبت ہے اب مدام
بھڑوا و مسخرا و مچھندر ہے ان کا نام
خلوت میں جب بلاتے ہیں اس کو بوقتِ شام
دیتی ہے تب وہ بھیج کے لوگوں سے یہ پیام
بیٹی کو اپنی کیوں یہ بلاتے ہیں شیخ جی

ایک اور مخمس ہے جو کسی شیخ جی کی شادی پر کہا گیا ہے۔ اُس میں بھی دولھا کی اسی طرح گت بنائی گئی ہے۔

سودا کی اور بھی کئی دل چسپ ہجویں ہیں۔ مثلاً "مثنوی در ہجو طفلِ ضائع روز گار لکڑی باز" اس ہجو میں کہانی کے ذریعے اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ "مثنوی در ہجو حکیم غوث" میں حکیم صاحب کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ نجف خاں سے نواب ضابطہ خاں کی شکست پر بھی ایک ہجو یہ قطعہ لکھا ہے۔ اس طرح اور بھی چند ہجویں ہیں جو کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخے میں شامل ہیں۔

ہمیں ان ہجوؤں میں نہ صرف اس عہد کی معاشرت، تہذیب اور سیاسی اور سماجی حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ ایسا بھی مواد حاصل ہوتا ہے جس سے سودا کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان ہجوؤں سے بآسانی سراغ لگایا جاسکتا ہے کہ سودا کن اخلاقی اور انسانی

قدروں پر ایمان رکھتے تھے۔ خود ان کے عہد کے انسان کا اندازِ فکر کیا تھا۔ کسی شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ضروری یہ ہے کہ ادبی محقق اس شاعر کے عہد کا گہرا مطالعہ کر کے تخیل کی مدد سے خود کو اس ماحول میں پہنچا دے تا کہ شاعر کے ماحول اور اس کے اندر کے انسان کو قریب سے دیکھ سکے۔ اس سلسلے میں ہجویاتِ سودا کا مطالعہ خاص طور پر اہم ہے۔

سودؔا کے بعد متعدد شعرا نے ہجویں کہیں۔ لیکن سودؔا اس فن کو جس بلندی پر پہنچا گئے تھے، اس سے آگے اور کوئی نہ جا سکا۔ سودؔا قصیدہ کی طرح اس فن کے بھی امام اور خاتم قرار پاتے ہیں۔

مصحفیؔ اور سودؔا [1]

ان دونوں کی عمروں میں اتنا فرق تھا کہ جب مصحفیؔ پیدا ہوئے ہیں تو سودؔا مقبولیت اور شہرت کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ مصحفیؔ کی سودا سے ملاقات بھی صرف ایک بار ہوئی تھی۔[2] اس وقت سودا لکھنؤ میں تھے۔ چوں کہ مصحفیؔ کے لکھنؤ میں قیام کی کوئی صورت نہیں نکلی اس لیے وہ دہلی واپس آ گئے اور ۱۱۹۸ھ میں جب دوبارہ لکھنؤ پہنچے تو سودؔا کی وفات کو تین سال گزر چکے تھے جس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے مدِ مقابل نہیں ہوئے۔ نیز یہ کہ مصحفیؔ کی کوئی تصنیف سوؔدا کی وفات سے قبل اشاعت پذیر نہیں ہوئی۔ ان کا سب سے پہلا تذکرہ ''عقدِ ثریا'' ہے جو سوؔدا کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔ اس میں مصحفیؔ لکھتے ہیں۔

> ''اگرچہ مردِ کم علم بود اما ذکاوت و روانیِ طبعش از کلامش پیداست، در زبانِ ریختہ علم یکتائی برافراشتہ و ہمیشہ با امرا صحبت داشتہ۔ قصائد و غزلے در جوابِ بعضے قصائدِ عرفیؔ تصنیف نمودہ و ماسوائے ایں در گفتنِ ہجو ہا قدرتِ شاعری خود را نمودہ، غرضکہ ہمہ باتفاق بہ سبب

---

[1] مصحفیؔ اور سودا کے موضوع پر قاضی عبدالودود کا مقالہ اردو ادب اکتوبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اسی مقالے سے استفادہ کیا ہے۔ (خ۔ا)

[2] مصحفیؔ لکھتے ہیں۔ ''فقیر در عہدِ نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدن ایں بزرگ بہ خدمتش رسیدہ بود''۔ تذکرۂ ہندی، ص ص ۱۲۵-۱۲۶۔

شہرت بسیار و خوبی کلام استاد مسلم الثبوتش میدانند، والحق کہ چنیں نامش در ہندوستان رد زبان بازاریان و غزلیات دیوانش بہر اطراف و جوانب و ہر جاہل و امی را برزبان باایں ہمہ شہرت کہ در ریختہ تصیبش بود آخر آخر عنانِ (کذا) شعر فارسی ہم سربیدرد را بہ دردآورد۔ اگرچہ ایں حرکت مناسب شانش نہ بود۔"[1]

گویا مصحفی نے سودا پر اعتراض کیے ہیں کہ وہ

۱- کم علم ہیں۔
۲- ان کی شہرت بازاریوں میں ہیں۔
۳- ہر جاہل اور امی کی زبان پر اُن کے اشعار ہیں۔
۴- اس کے علاوہ مصحفی نے سودا کی فارسی گوئی کو ناپسند کیا ہے۔

مصحفی کی دوسری تصنیف "تذکرۂ ہندی" وفاتِ سودا کے تقریباً ۱۴ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"(سودا) ......در عصر خویش سرآمد شعرائے ریختہ گو گزشتہ۔ بعضے اورا دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند۔ بعضے بہ سبب دریافتِ اغلاطِ صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند۔ غرض ہرچہ بود در روانی طبع نظیر خود نہ داشت......دیوانش بہ فرنگ و صفاہاں رسیدہ، دیگرے ایں شہرت درخواب ندیدہ۔ اگر در مثال ہندی اشعار غزل صائب و قتش گویم بجااست۔ و اگر در علوِ مراتب معانی ابیاتِ قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست۔ حالا ہر کہ گوید پیرو و متبعش خواہد بود"[2]

یہاں مصحفی اعتراض کرتے ہیں کہ:

---

۱ عقدِ ثریا، ص ۳۳
۲ تذکرۂ ہندی، ص ۱۲۵

۱۔ بعض لوگ کلامِ سودا میں اغلاطِ صریح اور توارد ِصاف کو سودا کے جہل اور سرقہ سے نسبت دیتے ہیں۔

سودا کے متعلق یہ باتیں صرف وہ شخص کر سکتا ہے، جسے اُن سے کوئی بغض ہو۔[۱] سودا یقیناً کم علم نہیں تھے۔ ان کا اردو، فارسی کلام، عبرۃ الغافلین اور سبیلِ ہدایت اس کا ثبوت ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ اُن کی شہرت صرف بازاریوں میں تھی اور صرف جاہل اور امّی لوگوں کو ان کے اشعار یاد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سودا کو خواص اور عوام دونوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ اس کا ثبوت لاتعداد کلیاتِ سودا کے قلمی نسخے ہیں جو ہندوستان اور غیر ممالک کی لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ فارسی میں ممکن ہے بہت اچھے شعر نہ کہہ پائے ہوں لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس دور کے ہندوستانی فارسی شعرا کے مقابلے میں بہت کم درجے کے ہوں سودا پر توارد کا الزام بے جا ہے۔ اردو کا کوئی شاعر اس الزام سے بری نہیں۔ خود مصحفی بھی۔ رہا سوال اغلاطِ صریح کا تو یہ بھی مصحفی کی زیادتی ہے۔ سودا کے کلام میں زبان کی صرف وہ غلطیاں ملتی ہیں جنھیں اس عہد میں جائز سمجھا جاتا تھا۔

نہ صرف نثر میں بلکہ مصحفی نے نظم میں بھی سودا پر اعتراضات کیے ہیں یا خود کو ان سے بہتر شاعر بتایا ہے۔[۲]

مصحفی نے دیوانِ اوّل میں سودا کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ دیوانِ دوم لکھنؤ میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں یہ دو اشعار ہیں۔

مصحفی ریختہ پہنچا ہے مرا رتبے تک
شور یاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

----

۱ مصحفی نے بڑی ہوشیاری سے سودا پر اعتراض کیا ہے۔ خود تو ان کی بہت تعریف کی ہے۔ اور اعتراضات دوسروں کی زبانی کرائے ہیں۔

۲ یہ تمام اشعار مصحفی اور سودا، قاضی عبدالودود، اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء سے لیے گئے ہیں۔

سوداؔ کا بھی سرد ہوچکا ہے بازار
اب بزمِ سخن ہے مرے دم سے گلزار

دیوانِ چہارم میں یہ دوشعر ہیں۔

غرورِ شاعری اے مصحفی اچھا نہیں اتنا
تجھے کیا میرومرزا سے ہے چپ اے مصحفی نسبت

میر و مرزا کے جو طالع نہ ملے ہم کوتو کیا
مصحفی اپنا زمانہ بھی میر اچھا گذرا

دیوانِ ہفتم میں یہ اشعار بھی ہیں۔

مسند نشینِ ریختہ جب تک ہے مصحفی
جیتا ہے میر درد بھی سودا نہیں موا
کچھ میں جرأت نہیں ہوں مصحفی سحر بیاں
میرومرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤں گا

دیوانِ ہشتم کا ایک شعر ہے۔

کلام میرؔ کا ہو مصحفی کہ مرزا کا
نہ پاسکے گا مرے انتخاب سے پیوند

قصائد میں بھی مصحفی نے سوداؔ کا ذکر کیا ہے۔ایک قصیدے میں مصحفی نے سوداؔ کا تفوق تسلیم کیا ہے۔

بھلا میرے مرقع کا بھی عالم اک ذرا دیکھو
اگر ہے ہاتھ میں سوداؔ کے یارو خامۂ مانی

قصائد میں مرے اور اس کے چنداں فرق تو کیا ہے
میں عرفیؔ ہی سہی اس فن کا گر گزرا وہ شروانی

ایک قصیدے میں سودا کو پورا شاعر تسلیم کیا ہے۔

کیوں کے دلی کے بیچ گزرے ہیں
ڈھائی شاعر سر آمد شعرا
اس کی تفصیل یہ کہ کہتے ہیں
میر و مرزا و درد وا وردا

غزل اور قصیدے کے ان اشعار میں مصحفی نے کبھی سودا کو خود سے بڑا شاعر مانا ہے۔ کبھی ان پر اپنا تفوق ظاہر کیا ہے۔ کبھی ان کو شروانی (خاقانی) تسلیم کیا ہے اور کبھی پورا شاعر۔

لیکن ایک قصیدے میں مصحفی نے سودا کو بہت زیادہ بُرا بھلا کہا ہے۔

یہ گوئے یہ میداں یہ زباں اور یہ بیاں ہے
دعویٰ ہو جسے شعر کا آئے نہ کہاں ہے
سودا کے تئیں کہتے ہیں شاعرِ مغلق
سو شاعری اس کی بھی بلیغوں پہ عیاں ہے
مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو
سچ پوچھو تو ارد کی فقط صاف زباں ہے
سو اس میں بھی تو غور سے دیکھے تو بہت جا
معنی ستم لفظ سے فریاد کناں ہے

سوال یہ ہے کہ آخر مصحفی کو سودا سے کیا عناد تھا۔ ان دونوں کے ذاتی تعلقات کبھی نہیں رہے جو کسی متنازعہ کا امکان ہوتا۔ مصحفی صرف سودا کی شہرت اور مقبولیت سے آزردہ خاطر تھے۔ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

مصحفی اک میں رہا ہوں یادگارِ رفتگاں
جان تو قائم مقامِ میرؔ اور مرزاؔ مجھے

مرزاؔ و میرؔ کا تو نہ کر ذکر مصحفی
اشعر ہیں اب تو کشورِ ہندوستاں میں ہم

اس شعر میں تو مصحفی نے بالکل صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام ان کا
کہ اپنے وقت کے مرزا و میرؔ ہم بھی ہیں

مصحفی کے اس رویے کے خلاف تلامذۂ سوداؔ کا صف آرا ہونا ایک فطری بات تھی۔ مصحفی نے ایک قصیدہ لکھا[1] ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ کوئی شخص مصحفی کے نام سے تلامذۂ سودا کی ہجو لکھتا ہے۔ حالاں کہ:

جو لوگ آج ہیں قائم مقام سوداؔ کے
کروں گا ہجو میں ناحق انھوں کی نام بہ نام
خدا نخواستہ کچھ سر پھرا نہیں میرا
ولے جو چاہے کرے یوں یہ گردشِ ایّام
کہ دوست اپنے جو ہوں وہ بھی پھر بنیں دشمن
یہی تو چاہے ہے البتہ آسماں کی خرام

اس کے بعد تلامذۂ سوداؔ میں مرزا احسنؔ، میر فخر الدین ماہرؔ اور محمد رضا کی تعریف کی ہے اور

---

[1] قاضی عبدالودود نے یہ قصیدہ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ص ۱۶۷-۱۶۹ پر نقل کیا ہے۔

لکھا ہے کہ میں تو ان سب کی عزت کرتا ہوں۔اس کے بعد مصحفی لکھتے ہیں کہ ان کے ایک شاگرد گرم یہ خبر لائے ہیں کہ تلامذہ سودا نے مصحفی کی ہجو لکھی ہے۔

میں گوشہ گیر ہوں مدت سے پر یہ قہر سنو
کہ جب گیا ہے کبھی گرم اُس طرف ناکام
لکھے ہیں ہجو میاں مصحفی بہم یہ لوگ
دیا ہے بس یہی شاہِ کمال نے پیغام

پھر مصحفی نے تلامذہ سودا کو ان الفاظ میں ڈرانے کی کوشش کی ہے۔

نہیں یہ ہجو کے قابل پر اُن کی خدمت کو
جو یوں بھی چاہیں تو کافی ہیں بس مرے خدام
اگرچہ ہیں وہ نواخواں ولیکن ان میں سے
بلا ہیں منتظر و گرم جوں برہنہ حسام

اس قصیدے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مصحفی کو یہ اطلاع ملی کہ تلامذہ سودا نے ان کی ہجو کہی ہے تو انھوں نے کوشش کی کہ اُس ہجو کی اشاعت نہ ہو۔اگر وہ یہی قصیدہ ہے۔

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر
کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

تو اس کی اشاعت ہو کر رہی۔ یہ ہجو کلیاتِ سودا، مطبوعہ مطبع مصطفائی اور کلیاتِ سودا مرتبہ آسی دونوں میں موجود ہے۔اس ہجو یہ قصیدے میں مصحفی کے تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ قصیدہ کس نے لکھا تھا۔یہ پتہ نہیں چلتا کیوں کہ کسی کلیات میں مصنف کا نام نہیں ملتا۔قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ مرزا احسن کی تصنیف ہے۔میرے

خیال سے یہ بھی ممکن ہے کہ فخرالدین ماہرؔ، محمد رضا اور مرزا احسن تینوں اس کے مصنف ہوں۔ کیوں کہ مصحفی کا یہ شعر قابل غور ہے۔

لکھے ہیں ہجو میاں مصحفی بہم یہ لوگ
دیا ہے بس یہی شاہِ کمال نے پیغام

اس شعر میں "بہم یہ لوگ" غور طلب ہے۔ اس زمانے میں ہجو نگاری اتنی عام تھی کہ اگر یہ کسی ایک شاعر کا ہوتا تو اسے اپنا نام چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چوں کہ کم از کم تین لوگ شریک تھے۔ اس لیے کسی ایک کے نام سے منسوب نہیں کیا جا سکا۔

مرثیہ نگاری

مرثیہ اردو شاعری کا بیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں غزل کی سادگی و سوز و گداز۔ قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا اندازِ بیان، رزم و بزم کی مرقع کشی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں اور تعلقات کی ترجمانی، حق اور باطل کی جنگ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے۔

اردو میں مرثیہ نگاری کی ابتدا محمد قطب شاہ کے عہد میں ہوئی اور دکنی شاعروں نے اس صنفِ سخن پر کافی توجہ دی۔ دکن کے مرثیہ گو شاعروں کی فہرست اچھی خاصی طویل ہے۔ البتہ شمالی ہند میں سودا سے قبل مرثیہ کہنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ ان میں غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ [۱]، میرا مانی [۲]، خواجہ برہان الدین عاصی [۳]، اعلیٰ علی [۴]، سید محمد تقی [۵]، نذر علی خاں گماں [۶]، میرزا علی قلی ندیم [۷]

---

[۱] میر نے ان کے مرثیے کے تین اشعار نقل کیے ہیں۔ نکات الشعرا، ص ۱۹۱۔
[۲] میر امانی ولد میر آثمی (عاصی)...... بافقیر بسیار آشنا بود۔ بیشتر فکر مرثیہ می نمود۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۵
[۳] خواجہ برہان الدین عاصی (آثمی)... متوطن شاہجہاں آباد...... مرثیہ ہم خوب می گوید۔ نکات الشعرا، ص ۱۱۸
[۴] میر اعلیٰ علی از سادات علی شان... ابن میر ولایت اللہ خاں...... مرثیہ نیز کی می گوید تذکرہ شعرائے اردو، ص ۲۰
[۵] سید محمد تقی۔ سید نجیب الطرفین از مرثیہ گویان حضرت عبداللہ الحسین... مولدش شاہجہاں آباد الحال بطرف فرخ آباد استقامت وارد۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۲۷۔ سودا نے سبیل ہدایت میں انھیں کے مرثیے پر اعتراضات کیے ہیں۔
[۶] سردے ست سپاہی پیشہ از یاران کوکہ خاں فغاں۔ اصلش از شاہجہاں آباد ست، مرثیہ و منقبت و غزل ہمہ می گوید۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۴۰-۱۴۱
[۷] شعر فارسی و مرثیہ در ریختہ بہ خوبی می گفت۔ چنانچہ اکثر مرثیہ ہائے او مشہور اند۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۷

میر عبداللہ مسکین [1]، حزیں [2]، غمگین [3] وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ شمالی ہند کے یہ شعرا مرثیے کو مغفرت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اکثر ان کے مرثیے فنِ شاعری کے عام اصولوں سے آزاد ہوتے تھے۔ سودا نے سید محمد تقی کے مرثیے پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا تھا۔

آپ ~~کے مرثیے کا~~ ہوں قائل
خون جس سے عوام کا ہے دل
سن کے بُکا سے جس پہ بدھو تک
شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس
یہی آتا ہے بار بار افسوس
بدھو بُکا سمجھ جسے رووِیں
معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہووِیں

سودا کو بنیادی اعتراض یہ تھا کہ مرثیہ گو شاعر فنِ شاعری کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتا۔ سید محمد تقی پر اعتراض کرتے ہوئے سودا نے اردو نثر میں لکھا تھا۔

"پس لازم ہے کہ مرتبہ درنظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہے کہ عقلا جو نہ سمجھیں اور ضبط تضحیک وقصد بکا میں رہیں اس کا سیاق وسباق جہلا

---

[1] سودا نے ایک شہر آشوب میں مسکین کا ذکر کیا ہے۔

استاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا　　　پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

محمد عتیق صدیقی صاحب نے ان کا اسی بندوں کا ایک مرثیہ نقل کیا ہے۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۲۴۱۔۲۶۱

[2،3] حزیں اور غمگین دونوں مسکین کے بھائی تھے۔ درگاہ قلی خاں ان تینوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "وے بزبان ریختہ مرثیہ گفتن مہارتے تمام دارند۔ در ہمہ شہر کلام لنہا شہرت دارد۔ ودر واقع ہر سہ کس بسیار خوب مرثیہ می گویند"۔ مرقع دہلی، ص ۵۱

دریافت کریں اور پھوٹ بہیں''۔

معنی لفظوں سے ہوتے ہیں روپوش
یاں تلک رتبۂ سخن پہونچا[۱]

یہ حال صرف سید محمد تقی ہی کا نہیں تقریباً اکثر مرثیہ گوشعرا کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ادب اور احترام کی وجہ سے کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوسکتی کہ ان کے مرثیوں پر اعتراض کریں۔ لیکن سودا کب چوکنے والے تھے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سوداؔ نے کب مرثیہ نگاری کی ابتدا کی۔ میرؔ، خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی اور قیام الدین قائمؔ نے سودا کے مرثیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ غالباً لچھمی نرائن شفیقؔ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے ''کلیاتِ سودا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''کلیاتش متضمن بر قصائد و مثنوی و...... مخمس و ترجیع بند و قطعہ و رباعی و مرثیہ قریب دو ہزار بیت بہ نظر امعان رسیدہ''۔[۲]

چمنستانِ شعرا کا سنہ تالیف تقریباً ۱۱۷۵ھ ہے۔ گویا ۱۱۷۵ھ سے قبل جو کلیاتِ سوداؔ مرتب ہوا تھا۔ اس میں مرثیے بھی تھے۔ لیکن شفیقؔ کے الفاظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک سودا نے مرثیہ نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ رواجِ زمانہ سے متاثر ہوکر چند مرثیے کہہ لیے ہوں گے۔ شیخ چاند لکھتے ہیں۔ ''سنہ ۱۱۷۵ھ سے قبل سودا کے مراثی کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔ سب سے پہلی مرتبہ اس کے مرثیوں کا ذکر شفیقؔ نے اس کے کلیات کے بیان کے سلسلے میں کیا ہے۔ یہ ابھی تک نہیں معلوم ہوا کہ سودا نے دہلی میں مرثیہ کہنا شروع کیا تھا یا وہاں سے جانے کے بعد ۱۱۷۵ھ تک کے مرتبہ کلیات میں اس کے کسی مرثیے کا پتا نہیں چلتا۔ معلوم نہیں کہ شفیقؔ کے پیشِ نظر کس سنہ کا کلیات تھا''۔[۳]
ہمارا خیال ہے کہ سودا نے دہلی ہی میں مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے۔ لیکن فرخ آباد

---

۱ کلیاتِ سودا، ص ۴۳۴۔
۲ چمنستانِ شعرا، ص ۳۲۷
۳ سودا، ص ۲۸۸

میں مہربان خاں رندؔ کے مذاق نے سوداؔ کو مجبور کردیا کہ وہ سنجیدگی سے اس فن کی طرف متوجہ ہوں۔

اردو مرثیہ نگاری کے ارتقا میں سوداؔ کی حیثیت اُس سنگ میل کی ہے جو ایک واضح اور صاف راستے کے تعین میں مددگار ہوتا ہے۔[۱] سودا نے مرثیہ نگاری کی ابتدا کی اور نہ ہی اسے انتہا پر پہنچایا۔ لیکن اس صنفِ سخن کی ہیئت اور مواد میں ان کے تجربات بہت اہم اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضمیرؔ، خلیقؔ اور بعد کے عظیم مرثیہ گو شعرا انیسؔ اور دبیرؔ نے سودا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ سوداؔ کے ابتدائی مرثیے فن کے کچھ اچھے نمونے نہیں تھے۔ اس لیے بعض لوگ سودا کے مرثیوں پر اعتراض کرتے تھے اور بعض انھیں مرثیہ گوئی کا اہل ہی نہیں سمجھتے تھے۔[۳] خود سودا نے ''سبیلِ ہدایت'' میں اس کا ذکر کیا ہے کہ سید محمد تقی ان کے مرثیوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شعر کے قاعدے کے موجب ہم
کہنے لاگے تھے مرثیہ کم کم
سو زبانی تمھاری اے مخدوم
ہوا اپنے تئیں کو یہ معلوم
مرثیہ وہ جسے عوام الناس
روئیں سُن سُن پڑھیں جب ان کے پاس

---

۱ اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں، مرزا سودا کے مرثیے ایک سنگ میل کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اردو مرثیہ، ص ۳۱۵۔

۲ دبیر نے سودا کی زمین میں ایک مرثیہ کہا۔ جس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

بس اے دبیر سینہ ہے بریاں جگر کباب — سودا کے مرثیے کا تو ممکن نہیں جواب
پر فضلِ حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب — کافی ہے تجھ کو بخششِ محشر کے واسطے

۳ سودا کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

''مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں۔ اس زمانے میں مسدس کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چو مصرع ہیں۔ مگر مرثیہ گوئی کی آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید انھیں مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں''۔ آبِ حیات، ص ۱۵۶

اور سودا کا مرثیہ سن کر
چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دُھن کر
کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے
لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے
بارہا یہ سخن ہوا ظاہر
حق میں بندے کے غائب و حاضر
سچ ہے یہ مجھکو مرثیے کا ڈھب
نہیں آتا وہ جس سے رودیں سب

بعض لوگ سودا سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ مرثیوں کے علاوہ کچھ اور سنائیں سودا ان کو جواب دیتے ہیں۔

جو مجھ سے کہتے ہیں کہ مرثیے سوا کچھ اور
وہ چاہتے ہیں زباں سے مری سنا کچھ اور
کبھو نہ میں تو کہوں اس کے ماورا کچھ اور
الم سے آل محمد کے ہے بھلا کچھ اور

لیکن کچھ ہی عرصے میں سودا نے اس فن پر کمال حاصل کرلیا اور اپنے تمام معاصر مرثیہ گو شعر پر سبقت لے گئے۔ سودا سے قبل مرثیے غزل کے انداز پر مربع یا چومصرعے کہے جاتے تھے۔ سودا نے مرثیے کی تکنیک میں گوناگوں تجربات کیے۔ ان کے ہاں مرثیے کی حسب ذیل صورتیں ملتی ہیں۔

۱-منفردہ ۲-مستزاد منفردہ ۳-مثلث ۴-مثلث مستزاد ۵-مربع ۶-مربع مستزاد ۷-مخمس ترکیب بند ۸-مخمس ترجیع بند ۹-مسدس ۱۰-مسدس ترکیب بند ۱۱-دہرہ بند ۱۲-مرثیہ دوازدہ مصرع معہ دہرہ۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پہلی بار جس نے مسدس کی شکل دی وہ سودا ہیں اور

بعد میں مرثیہ کی یہی فارم سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ شبلی کا بیان ہے کہ "اس وقت تک مرثیے عموماً چومصرعے ہوتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا"۔[۱] سودا کے معاصرین میں سکندر[۲] ایک مرثیہ گو شاعر تھے۔ چوں کہ وہ صرف مرثیہ کہتے تھے۔ اس لیے انھیں مرثیہ گوئی کے میدان میں بہت شہرت اور مقبولیت تھی۔ ان کے متعلق سید افضل حسین ثابت رضوی نے لکھا ہے۔

"سب سے پہلے جن بزرگوار نے مرثیہ مسدس کیا وہ سکندر پنجابی مرثیہ گو شاعر ہیں اور سب سے پہلا اس طرز کا یہ مشہور و مقبول مرثیہ ہے۔

ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول[۳]

یہ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھیں کی طرف سے مرزا سودا نے میر ضاحک مرحوم کی ہجو کہی تھی جس کا مفصل ذکر آب حیات میں ہے......ایک مسدس مختصر سودا مرحوم کے کلیات میں بھی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

---

۱ موازنہ انیس و دبیر، ص ۱۹۔ اثر لکھنوی لکھتے ہیں"۔ جہاں تک تحقیق ہوسکا ہے سودا ہی پہلا شاعر تھا جس نے صنفِ مسدس میں مرثیہ کہا۔ انیس کی مرثیہ نگاری، ص ۶۔

۲ پورا نام خلیفہ محمد علی، سکندر تخلص (مجموعہ نغز، جلد ۱، ص ۲۹۹) اور عرف میاں گھسیا تھا (تذکرہ شعرائے اردو، ص ۹۲، دو تذکرے، عشقی، ص ۳۳۸، شورش نے ان کا نام شیخ سکندر لکھا ہے (دو تذکرے، شورش، ص ۳۳۷) جو غلط ہے۔ سکندر پنجابی الاصل تھے۔ لیکن ان کی نشو ونما دہلی میں ہوئی تھی۔ (مجموعہ نغز) محمد شاکر ناجی کے شاگرد تھے (تذکرہ کمال، ورق ۶۲ ب، تذکرہ شعرائے اردو، مجموعہ نغز) ادبی زندگی کے آغاز میں قصہ خوانی کرتے تھے۔ بعد میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے (تذکرہ ہندی ص ۱۱۶) شاہ کمال نے فیض آباد کے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے سودا کے ساتھ سکندر کا بھی نام ہے (تذکرہ کمال دیباچہ) جس کا مطلب ہے کہ سکندر فیض آباد بھی گئے تھے۔ کمال مدعی ہیں کہ لکھنو میں ان کی سکندر سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اور لکھنؤ ہی سے سکندر حیدرآباد آئے (تذکرہ کمال) سکندر ہر وقت شراب پیے رہتے تھے (تذکرہ سرور، ص ۳۵۰۔ تذکرہ شعرائے اردو مجموعہ نغز) مصحفی نے تذکرہ ہندی (تالیف ۱۲۰۰-۱۲۱۰ھ) میں لکھا ہے کہ ان کی عمر پچاس سے متجاوز ہوگی (تذکرہ ہندی) حیدرآباد میں انتقال کیا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ حیدرآباد میں ان کی قبر زیارت گاہ عوام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان شہر کے لوگوں نے اُن کی لاش کربلائے معلیٰ بھیج دی (مجموعہ نغز) سرور نے بھی یہی لکھا ہے کہ اس کی لاش کربلائے معلیٰ بھیج دی گئی تھی (تذکرہ سرور) انھوں نے ایک قصہ ملاح و ماہی و بادشاہِ دل خوار بھی لکھا تھا۔ اکثر پنجابی پوربی، بنگالی اور مارواڑی میں مرثیے کہے تھے (تذکرہ شعرائے اردو)

۳ امیر احمد علوی نے دس بندوں کا یہ مرثیہ یادگار انیس میں نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول — ایک جگہ شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول
جس محلے میں کہ رہتے تھے حسین ابن بتول — ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیمار و ملول

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی

مگر وہ کتاب میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔ فقیر تک گلیوں میں پڑھتے پھرتے ہیں۔[1] سودا سکندر کے معاصر ضرور تھے مگر سکندر صرف بحیثیت مرثیہ گو مشہور تھے۔ ان وجوہ سے مرثیہ کو بطور مسدس کہنے کا سہرا میرے نزدیک سکندر کے سر ہے یا کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے کہ دو معاصرین میں سے اول کس نے کہا تو سکندر اور سودا دونوں کو موجد ماننا چاہیے۔[2]

مطبوعہ کلیاتِ سودا میں مرثیوں کی تفصیل یہ ہے۔ مربع ۶۱، مربع مستزاد ا، منفردہ ۸، منفردہ مستزاد ا، مسدس ا، مسدس ترکیب بند ۲، مسدس ترجیع بند ا، مثلث ا، مثلث مستزاد ا، مخمس ا، مخمس ترجیع بند ۴، مخمس ترکیب بند ۲، مسدس دہرہ بند ۲، مسدس مع دوہرہ پنجابی ا، مسدس مع دوہرہ پوربی ۲، منفردہ بزبان دکھنی ا، دوازدہ مصرع مع دوہرہ ا، کل مرثیے = ۹۱

ان میں تیرہ مرثیوں کے مقطع میں مہربان تخلص آیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ مہربان خاں رند کے مرثیے ہیں اور غلطی سے اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ مہربان کے مرثیے نہیں۔ کسی اور نے ان کے نام سے لکھے تھے۔ مہربان خود شاعر نہیں تھے جسے عام طور پر مہربان کا دیوان سمجھا جاتا ہے، وہ کلکتہ میں موجود ہے مگر اس میں تمام غزلیں میر سوز کی ہیں۔ میں نے یہ نسخہ خود نہیں دیکھا۔ مجھے یہ اطلاع اپنے دوست صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب سے حاصل ہوئی ہے۔[3]

قاضی عبدالودود مرانی سودا پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ ''دیوانِ ہفتم (کلیات سودا مطبوعہ مطبع مصطفائی) دیوان مرثیہ ہے، جس کا آغاز ایک فارسی دیباچے سے ہوتا

---

[1] خط لیے کہتی تھی پردے سے لگی زار و نزار☆ ادھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار (یادگارِ انیس، ص ۱۶)
اثر لکھنوی بھی سکندر کے اس مرثیے کی مقبولیت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
قدیم مرثیہ نگاروں میں ایک میاں سکندر تھے۔ ان کا ایک مرثیہ، بہ روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول، پیکر سوز و گداز ہے اور کچھ برس ادھر تک اتنا مقبول تھا کہ فقیر اسے پڑھتے ہوئے پھیری لگاتے تھے۔
(انیس کی مرثیہ نگاری، ص ۶)

[2] حیاتِ دبیر، ص ۱۱۵۔
[3] دیوانِ رند کے نسخہ...... کا یہ حال ہے کہ غالباً اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوز کے کسی نسخے میں نہ ہو۔
سویرا، ۲۹، ۱۹۶۱ء، ص ۵۵)

ہے۔ جو عجب نہیں کہ اصلح الدین کا لکھا ہوا ہو۔ اس کے بعد سوداؔ کی مثنوی ''سبیل ہدایت'' ہے جس میں سید محمد تقی اکبرآبادی (میرؔ نہیں) کے ایک سلام پر اعتراضات ہیں۔ مثنوی کے بعد اسی شاعر کے ایک مرثیے کی تنقید مربعات کی شکل میں ہے۔ جس سے پیشتر سوداؔ کی اردو نثر بطور تمہید ہے۔ خود سودا کے مرثیے اور سلام اس کے بعد آتے ہیں۔ کلیاتِ سوداؔ کے بہت کم مخطوطات میں مراثی اور سلام شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک الگ مجموعہ تھا، جس کا ایک نسخہ بقول دتاسی سراج الدولہ (حیدرآباد) کے کتب خانے میں تھا (تاریخ جلد ۶، ص ۷۰)......وہ مراثی جن میں ''مہربان'' یا ''مہربان خاں'' بطور قافیہ آیا ہے۔ یقیناً جس نے بھی لکھے ان (مہربان خاں رند) کی طرف سے لکھے۔ وہ بھی، جن میں نام بطور قافیہ نہیں، ممکن ہے کہ انھیں کے نام سے کہے گئے ہوں......شواہد اس پر دال ہیں کہ مہرباں خاں خود شعر نہیں کہتے تھے، دوسروں کے اشعار اپنی طرف منسوب کرلیا کرتے تھے۔ یہ مراثی سودا کے ہیں یا کسی اور شاعر کے؟ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات اس وقت نہیں کہی جاسکتی''۔ [1]

سوداؔ کو مرثیہ نگاری سے اظہارِ فن مقصود نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ فن کے تمام اصولوں کو نظر انداز کردیا جائے۔ وہ مرثیہ گوئی کو آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں بنانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے۔

یہ روسیاہ تو ایسا نہیں جسے ہووے
تلاش مرثیہ گوئی سے دام و درہم کا

ان کا عقیدہ تھا کہ اگر کربلا کے دردانگیز اور غم ناک واقعات کی یاد دلا کر وہ اپنے سامعین کو رُلا سکیں تو یہ کارِ ثواب ہے۔ اس کا اجر قیامت کے دن انھیں ملے گا۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں۔

زیادہ اس سے نہ کر اب تو سوداؔ طول کلام
درود بھیج شہیدوں پہ کر سخن کو تمام

---

[1] سویرا، ۲۹، ۱۹۶۱ء ص ص ۵۷-۵۸۔

جزا بہر دو جہاں اس کی تجھ کو دیں گے امام
سخن تو تیرا رولاتا ہے شکل ابر مطیر

ایک اور مرثیہ کا آخری بند ہے۔

سوداؔ اب چشمِ محبّاں کو ہے یہ نظم جلا
پاوے گا اس کا محمد سے تو محشر میں صلا
تجھ کو جنت میں ہر اک بیت پہ گھر دیں گے ولا
سننے سے جس کے یہ اشک آنکھوں سے آتا ہے چلا
سن کے اس مرثیے کو بزم میں جو رووے گا
آبِ چشم اس کا گناہوں کو ترے دھووے گا

سوداؔ کو شہدائے کربلا سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ انھوں نے واقعاتِ کربلا کے بیان میں غمناکی اور دردانگیزی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے مگر وہ ایک دردمند دل نہیں رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد دلسوزی اور خستگی پر نہیں بلکہ ہنرمندی پر ہے۔ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ اس لیے ہر طرح کے مضامین کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن کلام میں اثرانگیزی کے لیے کچھ اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے جن سے سوداؔ محروم تھے۔ اگرچہ میرؔ نے سوداؔ کے مقابلے میں بہت کم مرثیے کہے ہیں (غالباً مراثی میرؔ کی تعداد اکتالیس سے زیادہ نہیں) لیکن میرؔ کے مرثیوں میں وہ نشتریت ضرور ہے جو عقیدت مندوں کو رونے پر مجبور کردے۔ شیخ چاند سوداؔ کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس میں شبہ نہیں کہ سوداؔ کے مرثیوں میں مرثیت بڑی حد تک مفقود ہے۔ مرثیے کی بڑی غرض و غایت غم انگیز مضامین کو رقت خیز پیرائے میں بیان کرکے رلانا ہے۔ سوداؔ کے مراثی میں یہ جوہر نہیں''۔[۱] سید صفدر حسین میرؔ اور سوداؔ کے مرثیوں کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ''سوداؔ کے برخلاف میرؔ کا مرثیہ سوز و گداز سے لبریز ہے۔ میرؔ کی دل برشتگی وہ میدان ہے

۱۔ سودا، ص ۲۸۹۔

جہاں سودا گرد ہو جاتے ہیں'' [1] سودا کے مرثیوں پر مزید بحث کرنے سے قبل بہتر ہے کہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی بیان کر دیے جائیں تا کہ ان کی روشنی میں مراثی سودا کا جائزہ لیا جا سکے۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں۔

۱- چہرہ۔صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے کے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت، مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر۔

۲-سراپا۔مرثیے کے ہیرو کے قد وقامت، خط وخال وغیرہ کا بیان۔

۳-رخصت۔ہیرو کا امام حسین سے جنگ کی اجازت لینا اور میدانِ جنگ میں جانے کے لیے عزیزوں سے رخصت ہونا۔

۴-آمد۔ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان وشوکت کے ساتھ رزم گاہ میں آنا، آمد کے سلسلے میں ہیرو کے گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔

۵-رجز۔ہیرو کی زبان سے اپنے نسب کی تعریف، اپنے اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فنِ جنگ میں اپنی مہارت کا اظہار۔

۶-جنگ۔ہیرو کا کسی نامی پہلوان سے یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑنا۔جنگ کے ضمن میں ہیرو کے گھوڑے اور تلوار کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

۷-شہادت۔ہیرو کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا۔

۸-بین۔ہیرو کی لاش پر اس کے عزیزوں، بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا۔[2]

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جو ان اجزائے ترکیبی کی جملہ شرائط پوری کرتے ہوں۔عام طور پر مرثیوں میں یہ اجزا پائے جاتے ہیں لیکن بعض مرثیوں میں ان میں سے کچھ اجزا نہیں ہوتے اور بعض میں ترتیب مختلف

---

۱ نگار (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ص ۱۰۵۔
۲ (الف) یہ تفصیل روحِ انیس (ص ص ۲۰، ۲۱) سے لی گئی۔
(ب) مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو۔اردو مرثیہ، ص ص ۲۱-۶۷۔

ہوتی ہے۔اردو میں اور خاص طور پر سوداؔ کے ہاں ایسے مرثیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جن میں صرف حضرت امام حسین کی شہادت پر اظہارِ غم کیا گیا ہے۔

چہرہ: سوداؔ سے قبل عام طور پر چہرے یا تمہید کا رواج نہیں تھا۔ مرثیہ گو براہِ راست واقعاتِ کربلا بیان کرنا شروع کر دیتا۔ مگر سوداؔ نے اکثر مرثیوں کی ابتدا تمہید سے کی ہے۔ مثلاً ایک مربع مرثیے کے ابتدائی چار بند بطور تمہید کہے گئے ہیں۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

نہیں ہلال فلک پر مہِ محرم کا
چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا

دل اس طرح سے یہ گھائل کریگا عالم کا
کہ واں نہ لگ سکے ٹانکا نہ پھاہا مرہم کا

ایک اور مرثیے کا صرف پہلا بند تمہید کا ہے۔

احوالِ روزگار مورخ لکھا کیا
کوئی پڑھا کیا اسے کوئی سنا کیا

تحریر جب سے واقعۂ کربلا کیا
ملحد کہیں ہیں پڑھ کے ملاعین نے کیا کیا

سوداؔ نے ایک مرثیے کی جو تمہید باندھی ہے وہ ''چہرے'' کی جملہ شرائط پر پوری اترتی ہے۔ انھوں نے موسم گرما کا حال، حضرت امام حسین کے سفر کی دشواریاں چھ بندوں میں بیان کی ہیں۔ یہاں تین بند نقل کیے جاتے ہیں۔

کہا اساڑھ نے یوں جیٹھ کے مہینے سے
طپش یہ پوچھ نبی کے سرور سینے سے

کیا ہے بادیہ پیما فلک نے کینے سے
جسے نکال کے اس دھوپ میں مدینے سے

جو چار پایہ ہے جنگل میں ہپ ہپاتا ہے
پنکھیرو یاتوں میں روکھو نکے منہ چھپاتا ہے

گھر ان دنوں کوئی چیونٹی سے بھی چھڑاتا ہے
ہوا ہے کیا یہ عمل سرزد اس کمینے سے

غرض میں کیا کہوں اس شکل سے شہ مظلوم
کرے تھا قطع منازل کٹانے کو حلقوم

وہ رو رو واں گیا آخر جہاں رہا محروم
تن اُس غریب کا چالیس دن دفینے سے

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سودا کے ''چہرے'' ان کے تمام معاصرین سے بہتر ہیں۔

پتا نہیں شبلی نے کیسے لکھ دیا کہ ''چہروں'' کی جدت ضمیر کی ہے۔[۱] حالاں کہ سودا سے قبل مرثیہ گو شعرا کے ہاں ''چہرے'' کے محض ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور سودا نے مکمل چہرے لکھے ہیں۔

سراپا: سودا نے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ ایک مرثیے میں حضرت امام حسینؑ کے متعلق لکھتے ہیں۔

بڑا کیا تھا محمد نے جس کو گود میں پال
پھرے تھا ساقیٔ کوثر کے دوش پر مہ و سال

ایک اور مرثیے میں حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

راکب دوش کا محمدؐ کے
آج نوکِ سناں پہ سر ہے سوار

---

۱ موازنہ انیس و دبیر، ص ۲۰۔

دھوتے جن گیسوؤں کو پیغمبر
سو وہ آلودہ ہیں بگرد و غبار

آج فرزند ساقی کوثر
تشنہ دریا کے جا موے بکنار

آہ افسوس آج صید حرم
ہوگئے رن میں شامیوں کے شکار

جن کی خاطر بنا ہے ارض و سما
دو جہاں چشم میں ہے ان کی تار

خاک و خوں میں پڑا ہے میرا لال
کہیں ہیں فاطمہ پکار پکار

بدن نازنیں پہ اس کے آج
لگے تیغ ستم کے وار پہ وار

ہوے وہ گیسو برچھی کے جھبا
جن کو دھوتی تھی میں سنوار سنوار

رخصت: بعض مرثیوں میں سوداؔ نے دردانگیز اور غمناک الفاظ میں رخصت کا منظر پیش کیا ہے۔ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ شدید گرمی کا موسم ہے۔ حرم کے تمام افراد کا پیاس سے بُرا حال ہے۔ تمام کوششوں کے باوجود جب پانی فراہم نہیں ہوسکتا تو حضرت عباس حضرت امام حسین سے رخصت طلب کرتے ہیں تاکہ پیاسے مرتے ہوئے بچوں اور عورتوں کے لیے پانی لاسکیں۔ اس واقعہ کو سودا کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

طلب کی رخصت آ بھائی سے کر میداں کی تیاری
کیا عرض اب جسے چاہو اسے سونپو عملداری

یہی آئی ہے دل میں لہرن عورات کی زاری
دیا سر یا تو میں دریا پہ جایا مشک بھر لایا

سنا عباس سے جب اس کو شاہ دین و دنیا نے
کروروں در کروروں اشک آنکھوں سے لگے آنے
کہا جانِ برادر اپنے جیتے جی نہ دوں جانے
کہے گی خلق سر بھائی کا آگے دے کے کٹوایا

غرض رخصت پہ یک دیگر میں یہ الحاح وزاری تھی
کبھو جوں ابر باہم منہ پہ منہ رکھ اشکباری تھی
کبھو مانند برق آپس میں ان کو بے قراری تھی
مرخص اس طرح سالار دین نے اس کو فرمایا

آمد: سوداؔ کے ہاں آمد کے مضامین بہت کم ہیں۔ حضرت عباس گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کا رخ کرتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی دشمن کی فوج صف آرا ہو جاتی ہے۔ سوداؔ لکھتے ہیں۔

چلا عباس جب قربوس زیں پر مشک کو دھر کر
تو لائے رو بہ میداں کافر اس کے قصد پر اکثر
رکھا جن نے قدم تک آگے اپنا چھوڑ کر لشکر
جہنم کو اسے دو ہیں اجل کے ہاتھ بھجوایا
جگہ سے اپنی کوئی خوف کے مارے نہ ہلتا تھا
چلے تھا نیزہ اس جا سے جہاں سے تیر چلتا تھا

اگر چہ یہ بند آمد کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ لیکن مراثی سوؔدا میں اس سے بہتر اور کوئی مثال بھی نہیں۔

رجز: رجز کے مضامین سوؔدا کے ہاں بالکل نہیں ہیں۔

جنگ: سوؔدا کو رزمیہ لکھنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جس کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے نواب شجاع الدولہ بہادر کی شان میں کہا تھا۔ اس قصیدے میں سودا نے جنگ کا مکمل نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ لیکن مرثیوں میں انھوں نے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے اسی لیے شبلی نے مرثیوں میں رزمیہ کا سہرا بھی ضمیؔر کے سر باندھا ہے۔[1] لیکن ہمارا خیال ہے کہ رزمیہ کے ابتدائی نقوش سودا کے ہاں مل جاتے ہیں۔ حضرت عباس فرات سے مشک بھر چکے ہیں اور اب اہلِ بیت کے خیمے کی طرف آنا چاہتے ہیں کہ دشمنوں نے انھیں گھیر لیا۔ اس موقع پر حضرت عباس اور دشمنوں کی جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

نہ مانا جب تو پیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم
لگی تب صف بہ صف لشکر کی ہونے درہم و برہم
جدھر کو رخ کیا کشتوں کے پشتے واں ہوے اس دم
ادھر خوں کے بہے نالے جدھر اس کا پڑا سایا

کہوں کیا جس طرح چھایا تھا ابر آہن کا اس جا پر
سناں پر تیغ برسے تھی پڑی اور تیغ پر خنجر
نہ جانے آہ واویلا کہ اس میں کن نے واں آکر
حوالے تیغ کی اس کے کہ دستِ چپ لٹک آیا

بعد کے مرثیہ نگاروں نے اہلِ بیت کے گھوڑوں، تلواروں، نیزوں وغیرہ کی تعریف میں جو زورِ بیان صرف کیا ہے۔ اس کی مثال کسی اور صنفِ سخن میں نہیں ملتی۔ اردو قصیدوں

[1] موازنہ انیس و دبیر، ص ۲۰۔

میں اس قسم کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔لیکن حقیقت میں وہ اس جوشِ بیان، فنی مہارت اور جزئیات نگاری سے محروم ہیں۔ سودا کے قصیدوں میں بھی اس قسم کے بیشتر مضامین ملتے ہیں۔انھوں نے اپنے ممدوحین کے آلاتِ حرب، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ کی تعریف کی ہے۔مثلاً سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر کے قصیدے میں سودا کہتے ہیں۔

سید میں کیا بیاں کروں تیری کماں کا زور
سینہ عدو کا توڑ کے نکلے ہے جب خدنگ
بیٹھے زمین پر تو اسے پھر نہ پایئے
گر سو کروڑ کوس تلک کھودیے سرنگ
خلقت کا بروبحر کی ہیبت سے ہو یہ حال
شمشیر گر علم کرے اپنی تو روز جنگ
رہنے نہ دے صفاے برش اس کی تیغ کی
باقی کسو ہی طرح سے ضارب کے دل میں زنگ
گر پشت آسماں پہ وہ آئے تو بہرِ حکم
ہو خرق و التیام فلک دیکھ کرکے دنگ

روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ میں جنگ ہوئی، جس میں حافظ رحمت خاں مارے گئے۔سودا نے ایک قصیدے میں اس جنگ کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ یہ قصیدہ اردو کا بہترین رزمیہ ہوگیا ہے۔شکست خوردہ فوج کا ایک سپاہی جنگ کے حالات سنا رہا ہے۔

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہراولی
ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ و سوار
سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی
سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار
ایدھر سے بان و رہکلا و توپ متصل
پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگزار
بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے
اس پلے پر جہاں سے جزائر کے ہووے مار
تھیں کرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار
تھا دود توپ ابر سیاہ تگرگ بار
توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن
رنجک مثال برق چمکتی تھی بار بار
گنجال مثل رعد کے کڑکے تھی دمبدم
آواز شترنال تھی طاؤس کی جھنگار
بارود و گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی
جن نے کہ قوم عاد اُڑائی تھی جوں غبار
ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو
گھوڑا ادھر جو تڑپے ہے اودھر پڑا سوار

لیکن مرثیے میں اس قسم کے مضامین نہیں ہیں۔ یہ ضمیر اور ان کے بعد کے مرثیہ گو شعرا کی جدّت ہے۔

شہادت:۔سودا نے جہاں کہیں بھی شہادت کے مضامین باندھے ہیں، بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ کبھی ایک بند اور کبھی صرف ایک شعر ہی پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ چند مرثیوں میں واقعۂ شہادت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضرت امام حسین کی شہادت کا ذکر ملاحظہ ہو۔

یہ کہہ کے شہِ دیں نے کیا گھوڑے کو رخصت　　　خیمے کی طرف کو
من بعد نصیب اس کے ہوا جام شہادت　　　از دستِ جفا جو
واں سے جو گیا اسپ سوئے پردۂ عصمت　　　مل چہرے میں لہو
پھر کیا کہوں تھا حق ہی اس احوال سے محرم　　　گزرا جو انھوں پر

آیا جو نظر خانۂ زیں شاہ سے خالی　　　میں کیا کہوں اس آں
وحشت ہوئی اک وحشتِ محشر سے نرالی　　　از نالہ و افغاں
خاک اتنی سر و شکل پہ ہر ایک نے ڈالی　　　کر بال پریشاں
پہچانے تھا کوئی نہ کسی کے تئیں باہم　　　از عترتِ اطہر

حضرت عباس کی شہادت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جو تھا می مشک دانتوں سے تو کی بوچھار تیروں کی
لگی چاروں طرف سے ہونے مارا مار تیروں کی
ستم کیشوں نے کی پیکان اپنی پار تیروں کی
کہ اس کو مشک سے اک پل میں کر غربال دکھلایا

سبب زخموں کے حالت اس پہ جب طاری ہوئی غش کی
ندا کرتے ہوئے کی یا اخا ادرکنی اورکنی(؟)
صدا جو ہیں یہ شاہِ کربلا کے کان میں پہونچی
بسانِ ابر گریاں آپ کو اُس پاس پہونچایا

پر اس احوال کو راوی نے یوں اخبار میں لکھا
کہ جب تک پہونچے ہی پہونچے سرور سینۂ زہرا
بہ طعن نیزہ تن کا گوشت اس کے لے گئے اعدا
نشاں جز استخواں اس کا نہ شاہِ دیں نے کچھ پایا

کہیں کہیں سودا نے تخیل کی مدد سے "شہادت" کو اور بھی دردانگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک مرثیے میں حضرت امام حسین کی شہادت کے وقت ان کے اور شمر کے خنجر کے مکالمے دکھائے ہیں۔

قضا کی تیغ کا جب سب کو کھا چکا جوہر
رہا نہ اُس شہِ مظلوم کا کوئی یاور
زباں نکال کے بولا یہ شمر کا خنجر
کہ میں ہی اب تو ہوں اک آشنا ترے دم کا

کہے جو تو تجھے جد کے کنے میں لے جاؤں
جو مرضی ہووے تو والد کے پاس بٹھلاؤں
ترا اخی جو ہے کہہ اس کے ساتھ ملواؤں
ملاپ چاہے جو تو اس شہِ مکرم کا

سخن یہ سُن کے لگا کہنے وہ شہِ آفاق
انھوں کا دل کو مرے اس قدر نہیں ہے فراق
رضائے حق کی ملاقات کا ہوں میں مشتاق
جو ہووے ایسے میں تو ہو ملاپ باہم کا

بین: — یہ سودا کا اصل میدان ہے۔ ان کے اکثر مرثیے صرف ''بین'' ہیں جن کا مقصد لوگوں کو واقعاتِ کربلا یاد دلا کر رلانا ہے۔ سودا نے تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر ان واقعات کو شدید درد انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اہلِ حرم کے مصائب سودا کے موضوعِ سخن ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسین، حضرت عباس وغیرہ کی شہادت پر بھی اظہارِ غم و افسوس کیا گیا ہے لیکن نسبتاً کم۔ حضرت امام کی شہادت پر ''بین'' ملاحظہ ہو۔

کریں نہ اہلِ جہاں کس طرح سے شیون و شین
سروں کو اپنے نہ پیٹے سو کیوں وہ کرکے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسینؓ
یہ تعزیہ ہے رموزِ خدا کے محرم کا

بڑا کیا تھا محمدؐ نے جس کو گود میں پال
پھرے تھا ساقیِ کوثر کے دوش پہ مہ و سال
گیا جہاں سے پیاسا وہ فاطمہ کا لال
عطش ہے تن سے ہوئی روح کی سبب رم کا

ایک مرثیے میں سودا حضرت عابدؑ کی زبانی ان اندوہ ناک واقعات پر بین کرتے ہیں۔

عابدیں کہتے ہیں اے پروردگار
ایک بھائی کو بھی رکھتا روزگار
یکدگر اس وقت ہوتے غمگسار
روتے آپس میں گلے لگ زار زار

لے برادر تا پدر عم ابن عم
غرق لو ہو میں پڑے ہیں یک قلم
بہہ گئی دریائے خوں میں ہے ستم
کشتئ آل نبی آ ما نجھ دھار

جا چچا نے برلبِ آبِ فرات
آب کی خاطر کیا قطعِ حیات
باپ کے تئیں نے کاٹے پاؤں ہات
پانی کی تو بھی نہ پہونچی منہ میں دھار

باپ کو میرے محمد یک زماں
دیکھتے تنہا نہ زیرِ آسماں
ذبح کر ڈالا یہ بیکس کر کے واں
جس جگہ کوئی نہ یاور ہے نہ یار

بین دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو اہلِ بیت میں سے کسی فرد کی شہادت پر اس کے اعزہ بین کرتے ہیں اور دوسرے تمام مخلوق۔ یعنی حیوانات، جمادات اور نباتات اس ظلم و ستم پر اظہارِ غم کرتے ہیں۔ سودا کے ہاں بین کی دونوں قسمیں ملتی ہیں۔ اگرچہ دوسری قسم کی

مثالیں بہت کم ہیں۔ایک مرثیے کے ابتدائی تین بند یہ ہیں۔

میں تم سے کیا کہوں یارو یہ کیا سحر ہے آج
کہ زیرِ چرخ جسے دیکھو چشم تر ہے آج
ہر ایک سمت جہاں میں یہی خبر ہے آج
سیوم نبی کے جگر کا نگر نگر ہے آج

جو پھول باغ میں ہیں آج سو ہیں اس کے پھول
ہے نرگس آج پیالے کا ارگجی کے اصول
صلواۃ بھیجے ہے بوٹی بھی اس پہ ہو کے ملول
چمن میں جو کوئی بلبل ہے نوحہ گر ہے آج

روئے ہے سنگ سے سرمار آبشار چمن
جگر کے خون سے لبریز ہے کلی کا دہن
سوائے نالہ نہیں باغباں کے لب پہ سخن
ثمر نہالِ محمد کا خاک پر ہے آج

دعا: عام طور پر مرثیے کے آخر میں مرثیہ نگار خدا سے کچھ دعا مانگتا ہے۔ بعد کے مرثیہ نگاروں کے اکثر مرثیے دعا پر ختم ہوتے ہیں۔ سوداؔ ایک مرثیے کا اختتام اس طرح کرتے ہیں۔

اس ارادے پہ تو کر ختم اے سوداؔ یہ کلام
کہ تجھے حشر میں بخشائے وہ مظلوم امام
شام سے صبح تلک، صبح سے لے کرتا شام
سن کے عالم میں اسے عالمیاں روتے ہیں

ان کے علاوہ بھی اور بہت سے موضوعات ہیں جو مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔ان میں اہلِ حرم کے مصائب، حضرت عابد کی بیماری اور حضرت قاسم کی شادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ان موضوعات پر جو کچھ مرثیہ گو شعرا نے کہا ہے۔ان میں سے بیشتر کی تصدیق تاریخ سے نہیں ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر کے ذہن اور تخیل کی پیداوار ہیں۔شاعر نے ایک معمولی سی بات پر واقعات کی پوری عمارت تعمیر کرلی ہے۔چوں کہ اردو شاعر عرب کی پہلی صدی ہجری کی تہذیب وتمدن سے ناآشنا تھے،اس لیے مرثیہ کے تمام افراد اپنے لباس،طور طریق اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ان کے اسلحۂ جنگ بھی اکثر وہی ہیں جو اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں تھے۔سودا بھی اس عیب کا شکار ہیں۔انھوں نے حضرت قاسم کی شادی پر بہت سے مرثیے کہے ہیں۔ان مرثیوں میں شادی کی جتنی رسوم بیان کی گئی ہیں۔وہ سوفی صدی ہندوستانی ہیں مثلاً مشاطہ کا رقعۂ نسبت لانا، دلھن کے مہندی لگانا، منگنی کا نشان آنا، ساچق چوتھی، شادی پر شہنائی کا بجنا، آتشبازی، آرسی مصحف، پان کھانا وغیرہ۔

سودا نے بعض مرثیوں میں جدت سے کام لیا ہے۔ مثلاً ان کا ایک مرثیہ ''محرّم کی چاندرات'' پر ہے۔پندرہ اشعار کے اس مرثیے میں وہ تاثرات بیان کیے گئے ہیں جو محرّم کی چاندرات کو ہی پیدا ہوتے ہیں۔ایک مرثیے میں مسلمان اور نصاریٰ کے مکالمے ہیں، جن میں نصاریٰ کربلا کے واقعات یاد دلا کر مسلمانوں کو شرم دلاتا ہے اور شکر ادا کرتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ایک مرثیہ میں حضرت امام حسینؓ کی لاش اپنے اعزہ کو وصیت کرتی ہے اور کربلا کے واقعات پر تبصرہ کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سودا کا کوئی مرثیہ ایسا نہیں ہے جس میں مرثیے کے مذکورہ بالا تمام اہم اجزا یک جا ہوں۔لیکن یہ عیب سودا کا نہیں تمام مرثیہ گو شعرا کا ہے۔انیس و دبیر کے ہاں بھی مرثیے کے یہ سارے اجزا نہیں ملتے۔ان کے صرف چند مرثیے ہی ہر اعتبار سے مکمل کہے جاسکتے ہیں۔مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سودا کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے سراپا، تمہید، رزمیہ وغیرہ کی۔ابتدا کی مرثیہ کو مسدس کی شکل میں مقبول بنایا۔سودا سے قبل یہ فن ایسے شاعروں تک محدود تھا کہ ذی علم طبقہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔سودا اور میر تقی

میر ہی نے اس فن کو آبرو بخشی اور یہ ثابت کیا کہ ہر مرثیہ گو کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بڑا شاعر بھی ہو۔

شہر آشوب

ہیئت کے اعتبار سے شہر آشوب کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی عہد میں کوئی پابندی نہیں رہی۔ رباعی، مخمس، مثنوی اور مسدس وغیرہ سب ہی میں شہر آشوب ملتے ہیں۔ شمالی ہند کے ابتدائی شاعروں نے جو شہر آشوب کہے ہیں۔ ان میں مختلف طبقات کی اقتصادی بدحالی کا بیان ہے۔ کسی سیاسی حادثے کا ذکر کیا گیا ہے یا ماضی کی خوش حالی، عیش و عشرت، مالی آسودگی اور ذہنی سکون کا ماتم ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ شہر آشوب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''دراصل کسی نظم کا شہر آشوب کی صف میں شامل ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس میں چند بنیادی اوصاف اور شرائط موجود ہوں۔ اولین شرط اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں کسی شہر (یا ملک) کے مختلف طبقوں کا تذکرہ ہو۔ علی الخصوص کاری گروں اور پیشہ وروں کا ذکر، دوسری صفت اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں اقتصادی اختلال یا کسی حادثے کی وجہ سے سیاسی اور مجلسی پریشانی کا ذکر ہو، ابتدائی زمانے کے شہر آشوبوں پر پہلی صفت غالب تھی۔ مگر بعد میں دوسری صفت بھی شہر آشوب کے ساتھ لازم سی ہوگئی۔ [1]

فارسی میں ابتدائی شہر آشوب رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں لکھے گئے جن میں مختلف طبقوں اور پیشوں کے لڑکوں کے حسن و جمال کی تعریف کی جاتی تھی۔ مسعود سعد سلمان کے کلیات میں ایسے بانوے قطعے موجود ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال ہے کہ سلمان کو شہر آشوب کے موجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مسعود صاحب نے ''نقوش'' لاہور (شمارہ ۱۰۲) میں شہر آشوب کے ارتقا پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت میں جو زوال آیا تھا جس نے عوام کی زندگی کو

---

[1] سید عبداللہ، بحث و نظر، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ص ۲۸-۲۹۔

اجیرن کردیا تھا اور جس پر تفصیلی بحث پہلے باب میں کی گئی ہے۔ سوداؔ کے شہر آشوب اس زوال کی مکمل تصویر ہیں۔ ایک شہر آشوب میں سودا نے مختلف پیشہ وروں اور امرا و رؤسا کی اقتصادی بدحالی کی عکاسی کی ہے۔ بقول سوداؔ کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے جس میں آمدنی کی صورت ہو۔

سپاہ گری معزز ترین پیشوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس عہد میں اس پیشے کا بہت برا حال تھا۔ اگر سپاہی گھوڑا لے کر کسی کا ملازم بھی ہو جائے تو گھوڑے کے کھانے کے لیے کہاں سے لائے۔ گھوڑے کو ہر حال میں خوراک چاہیے۔ سپاہی اپنے ہتھیار گروی رکھ کر علف و دانہ حاصل کرتا ہے۔ تنخواہ کبھی نہیں ملتی۔ اس لیے وہ ہتھیار واپس نہیں آتے۔

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی

تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے

گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر

شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

امرا اور رؤسا کی خود مالی حالت خراب ہے۔ وہ تنخواہ دیں تو کیسے؟ لیکن جن ملازموں کے جسم میں جان ہے، وہ دھونس دیتے ہیں اور مختلف حربے استعمال کرتے ہیں اور تنخواہ وصول کر لیتے ہیں۔ لیکن بے چارے کمزوروں کی کوئی نہیں سنتا۔ اگر انسان کسی کی مصاحبت کر لے تو اور مصیبت ہے۔ وہ امیر اگر رات بھر جاگے تو مصاحب کو بھی جاگنا پڑتا ہے۔ نیند کے مارے بُرا حال ہے مگر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ طبابت کے پیشے میں بھی کچھ اور پریشانیاں ہیں۔ نواب جو چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ پیٹ میں تکلیف ہونے پر طبیب موردِ الزام ہوتا ہے۔ اگر نواب کو چھینک آجائے تو اس کی ذمہ داری بھی طبیب ہی پر عائد ہوتی ہے۔ گویا ان امرا کے طبیب علاج کرنے والے نہیں بلکہ موت سے لڑنے والے سپاہی ہیں۔ انسان اگر سوداگری کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ:

سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل
ہر شام بہ دل وسوسۂ سودوزیاں ہے
لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنیے تو عجب طرفہ بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدیکا گماں ہے

غرض بڑی مشکل سے بھاؤ تاؤ ہوتا ہے۔امیر ایک پروانہ عامل کے نام لکھ کر دے دیتا ہے۔نگران کے خزانے میں پیسے ہی کہاں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیز واپس ملتی ہے اور نہ پیسہ۔اگر کھیتی باڑی شروع کی جائے تو ہروقت بارش نہ ہونے کی فکر اور قرقی کا خوف کھائے جاتا ہے۔مختلف پیشوں کی تباہی کے ذکر کے بعد سودا شاعروں کا حال بیان کرتے ہیں۔

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکرو تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس
ملنا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جاکے دوگانہ
نیت قطعۂ تہنیت خانِ زماں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

شہرآشوب کے آخر میں سوداؔ کہتے ہیں کہ انسان اگر بالفرض ہفت ہزاری بھی ہوجائے تو ذہنی آسودگی اور سکون ممکن نہیں بلکہ دنیا ہی کیا عقبیٰ میں بھی آسودگی نہیں مل سکتی۔

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری
یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحت جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال
چھاتی پہ کڑکے بجلی ہے اور شیر دہاں ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تونے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گوینده ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں، نہ وہاں ہے

دوسرے شہرآشوب میں سوداؔ نے مغل حکومت، اس کے بادشاہ، شہزادے، امرا اور رؤسا کی

زبوں حالی کا مرثیہ کہا ہے۔ ان کے سیاسی اقتدار کے کھو جانے، جھوٹی عزت و وقار اور اقتصادی بدحالی کا ماتم کیا ہے۔ سودا زندگی بھر جاگیردار طبقہ سے متوسل رہے۔ اس لیے ان کی ہمدردیاں سماج کے اس طبقے کے ساتھ ہیں۔ انھیں اس طبقے کی بربادی کا بہت صدمہ ہے۔ انھوں نے اس طبقے کے مختلف افراد اور اشیا کا مضحکہ اڑایا ہے اور اپنے طنز کے تیز نشتر ایک ایک ناسور پر چلائے ہیں۔ سودا خود کو اس طبقے کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہ ناسور خود ان کی زندگی کے ناسور ہیں۔

مخمس کے پہلے بند میں سودا بے روزگاری کی شکایت کرتے ہیں۔ اگر انسان گھوڑا خرید بھی لے تو ملازمت کس کی کرے۔ نوکری ڈھیریوں یا تول تو بکتی نہیں جو بازار جاکر خرید لی جائے۔ پہلے امیر، دولت، مند نوکر رکھتے تھے اب جاگیر سے ان کی آمد بند ہو چکی ہے۔ مدتوں سے ملک میں سرکشوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ پہلے جو ایک شخص بائیس صوبوں کا خاوند تھا۔ اب وہ کول (علی گڑھ) کا فوجدار بھی نہیں رہا۔ کئی بندوں میں سودا نے جاگیردار کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ طبقہ جو صاحب حل و عقد تھا، جس کے دم سے ملک کی سیاست چلتی تھی۔ سیاست سے بیزار ہو گیا اور بقول سودا:

جو کوئی ملنے کو ان کے انھوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
انھوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

مغل زوال کا اثر فوج پر براہ راست پڑا تھا۔ وہ سپاہی جن کی جاں بازیوں کے کارنامے سنہرے لفظوں سے لکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ اب تلوار بھی اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سودا نے سپاہیوں کی بزدلی کو ذرا مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو موتے بھری لڑائی سے

پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چار پائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

مغل خزانہ خالی پڑا تھا۔ تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ خالصہ بہت مختصر تھا اور جو تھا اس سے بالکل آمدنی نہیں تھی۔

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

شہزادے قلعہ معلی میں فاقوں مر رہے تھے۔ لیکن کوئی ان کی چیخ پکار سننے والا نہیں تھا۔ قلعہ کا خزانہ خالی تھا۔ قیمتی اشیا نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں کی نذر ہو چکی تھیں اور مغل شہنشاہ کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں تھا کہ شہزادوں کو صرف ایک وقت ہی کھانا کھلا سکتا۔

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آوے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائے ہیکی پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول

شہر دہلی جو کبھی عالم میں انتخاب تھا، اجڑا پڑا تھا۔ جہاں کبھی عیش و عشرت کی محفلیں سجتی تھیں، اب وہاں گیدڑ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ جس شہر کی حسین اور خوب صورت عمارتوں پر جنت کو بھی رشک آتا تھا۔ جہاں ایک ایک گھر چمن اور سبزہ زار تھا۔ آج وہاں کمر کمر گھاس ہے۔ عمارتیں شکستہ پڑی ہیں۔ کہیں کہیں مکان کا ستون نظر آتا ہے اور کہیں مرغول۔ جس شہر کے چراغاں کو دیکھ کر آسمان کے مہ و انجم حسد سے جلے مرتے تھے۔ آج وہاں کی تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا :

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چغد کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمرکمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کن نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سروصنوبر وہاں اوگے ہے زقوم
مچے ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

یہ حالات تھے جن سے تنگ آکر اربابِ فن اور اہلِ شہر نے ترکِ وطن کیا۔

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا

تو کوئی قصد کرے نوکری کا بھیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تادہ چھوڑ کر ڈیرا

کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

گھوڑا دراصل فوجی طاقت کا نشاں ہے۔ کیوں کہ اس عہد میں فوج کی شکست وفتح کا بہت زیادہ دارومدار گھوڑے پر تھا۔ انوری نے فارسی میں گھوڑے کی ہجو کہی ہے۔ سودا نے بھی اس زمین میں گھوڑے کی ہجو کہی۔ دراصل یہ ہجو گھوڑے کی نہیں بلکہ مغل حکومت کے فوجی نظام کی ہے جو افسانوی انداز میں کہی گئی ہے۔ سودا نے اس ہجو یہ قصیدے کا نام تضحیکِ روزگار رکھا ہے۔

سودا نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدے کا تضحیکِ روزگار

سودا کے ایک دوست تھے جو سو روپے کے ملازم تھے۔ چوں کہ ایماندار تھے اس لیے اوپر کی آمدنی نہیں تھی۔ ان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑے کو دانہ اور گھاس نہیں ملتی تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہونچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد

امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زِ روے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
اک دن گیا تھا مانگے پہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اوس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخِ باردار
پہونچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گذار

سودا نے چالیس اشعار میں طرح طرح سے گھوڑے کی حالت بیان کی ہے اور اس کی کمزوری اور لاغری کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس تعریف کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ ایک دن نقیب نے مالک سے آکر کہا مرہٹے دہلی تک آپہنچے اور تم ابھی تک آرام سے بیٹھے ہو۔ اُن کو بہت شرم آئی۔ اس لیے فوراً میدانِ کارزار کی تیاری کی۔ تمام ہتھیار سے لیس ہوئے اور اسی گھوڑے پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بیان کرنے میں سودا نے کمال کر دکھایا ہے۔ وہ صرف اپنے زورِ تخیل سے ایک واقعہ پیدا کرتے ہیں اور بہت ہی ظریفانہ انداز میں اس واقعہ کی تمام تفصیلات سناتے ہیں۔ اس ظرافت میں طنز کے تیز نشتر بھی چھپے ہوتے ہیں جو ہمارے ناسوروں پر کام کرتے ہیں۔ سودا نے گھوڑے کے پردے میں اس فوج کا مذاق اُڑایا ہے جو دہلی کو حملہ آوروں کے ہاتھوں مٹتے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کرسکی۔ نادرشاہ، ابدالی، روہیلے، جاٹ اور سکھ دہلی کو لوٹ رہے تھے قتل و غارت گری کر

رہے تھے۔ تمام مال و دولت جمع کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے مگر مغل فوج بے بس اور لاچار بنی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی۔ اب اُن کے میدانِ جنگ میں جانے کا قصہ سنیے۔

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
تک تک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے تو بڑا اوسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

بہر حال خدا خدا کر کے میدانِ جنگ پہنچے۔ وہاں جو حال ہوا، وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعد بجنگ
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار
گھوڑا تھا بسکے لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں پر جوں طفلِ نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

اس سلسلے کی چوتھی ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کی ہے جس میں سوداؔ نے دہلی کی بدانتظامیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان بدانتظامیوں کا ذمہ دار فولاد خاں ہے جو چور اچکوں سے ملا ہوا ہے۔ فولاد خاں [۱] اور اس کے دولڑکے ڈاکہ اندازی میں خود حصہ لیتے تھے جس شہر کے کوتوال کا یہ حال ہو، اُس کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ بدانتظامی اور کوتوال کی دیدہ دلیری مغل بادشاہ کی کمزوری اور لاچاری کی وجہ سے تھی۔ سوداؔ نے حسب عادت ان واقعات کو مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہجو کی ابتدا میں سوداؔ اُن دنوں کو یاد کرتے ہیں جب شہر میں نظم و نسق تھا۔ لیموں کے چور کا بھی ہاتھ کاٹا دیا جاتا تھا۔ جب

۱؎ فولاد خاں دہلی کا کوتوال تھا۔ ۴ ربیع الثانی کو فولاد خاں کسی سبب سے گرفتار کیا گیا۔ اور وزیر الممالک (عماد الملک) کے دیوان خانہ خاص میں محبوس ہوا۔ کوتوالی اس کی جگہ سیدی بلال کو ملی۔ اسی ماہ کی ساتویں کو ''تشدد بسیار'' کے بعد بند زنداں سے نجات پائی۔ اور پچاس ہزار روپے بطور مال اماں مقرر ہوئے۔ لیکن ''موکلان وزیر الممالک'' کی کشاکش سے نہ چھوٹا تھا کہ تیرھویں شعبان کو راہی عدم ہوا۔ فولاد خاں نے ۱۱۷ سال کی عمر پائی۔ لیکن دیکھنے میں پچاس ساٹھ سال سے زیادہ کا نظر نہ آتا تھا۔ سلک ونداں باہم چناں منتظم بود کہ اصلا احتیاج بہ خلال میفتاد۔ روشنی چشم بدستور و خواب و خورش بے فتور و قوت رجولیت برقرار و پشکش بآئین جوانان نوخواستہ استوار بود و ایں خوارق روزگار است، (خانِ مذکور حبش کا رہنے والا تھا۔ اس نے سات بار حج کیا تھا) چندے بامر تجارت اشتغال ورزیدہ و پس از آنکہ وارد ہندوستان شدہ۔ در سلک ملازمان...... محمد شاہ...... منتظم گشتہ، پیوستہ برفاہ و فراغت اوقات بسری برد۔ مدت سی و چہار سال بخدمت کوتوالی رکاب سعادت قیام ورزیدہ نظم و نسق شائستہ پدید آورد۔ تاریخ شاہ عالم گیر ثانی (مصنف نامعلوم۔ قلمی) بحوالہ معاصر، حصہ ۲، ص ۱۱۶ (قاضی عبدالودود نے ایک قلمی تاریخ سے فولاد خاں کا حال نقل کیا ہے۔ یہ تاریخ مجہول الاسم ہے۔) ''دریں ولا حاجی فولاد خاں بلفعت کسے بطور خود زاہد بیگ و صالح بیگ مغلاں را کہ سرخیل ڈاکہ اندازاں بودند قابو دیدہ دستگیر کردہ آوردہ در چبوترہ بہ حبس سخت محبوس نمودہ، حکم پادشاہ حاصل نمودہ، گشت۔ چوں وقت بجیے می گذرد ورفقائے او بہ وزیر الممالک عرض کردند کہ دریں شہر مگر ہمیں دو کس ڈاکہ اندازی می کردند دیگرے نیست...... فولاد خاں خود ڈاکہ ہا میزند و ہر دو پسرانش آنچہ افعال عارتیدن از ڈاکہ اندازی و وزد افشاری وغیرہ دارند در ہمہ عالم ظاہر است۔ ازیں معنی وزیر الممالک مردم خود بکثرت نزد فولاد خاں فرستاد کہ بیارند۔ سوم ربیع الاول یک پاس گذشتہ بذلت تمام پیادہ پا بدستور گنہ گاراں کشیدہ بردند۔

معاصر، حصہ ۲، ص ۱۲۷

کوتوال کو رشوت سے کوئی سروکار نہ تھا اور اس لیے شہر میں چور اچکے نہیں ہوتے تھے اور اب تو یہ حال ہے۔

دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی
پشم ہے رہزنی تلاوڑی کی

فولاد خاں جب سے کوتوال ہوا ہے۔ شہر سے امن وامان مفقود ہو گیا ہے۔

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال
شیدی فولاد اب جو ہے کوتوال
چور کب اُس کا زور مانے ہے
بال کالا وہ اس کو جانے ہے
ان سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے
اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
بعضوں کا مفسدوں کے زور ہے یہ
چور کا بھائی گٹھی چور ہے یہ

شہر کے تمام چور فولاد خاں سے ملے ہوئے ہیں جو روز صبح کو اس کا حصہ بھیج دیتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف خوف و ہراس ہے۔ لوگوں نے رات کو سونا بند کر دیا ہے۔ محفل عیش وطرب ہو یا میخانہ، عبادت گاہ ہو یا بزم ہاؤ ہو۔ ہر جگہ لوگ ہوشیار بیٹھے رہتے ہیں۔

بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں
بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں
شام سے صبح تک یہی ہے شور
دوڑیو گٹھری لے چلا ہے چور

بے خطر ڈر سے اب کوئی نہ رہا
اہلِ میخانہ میں بھی ہے ہو ہا
نہ عبادت کو جاگتا ہے شیخ
ڈر یہی چور آ نہ مارے میخ

لطف یہ ہے کہ ان چوروں نے خود فولاد خاں کا بھی یہی حال کر رکھا ہے۔

خلق جب دیکھ کرکے یہ بیداد
کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار
گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول
میری پگڑی کا میرے سر پر مول

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ سوداؔ کے یہ شہر آشوب اس عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کا آئینہ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سودا کے زورِ بیان اور قوتِ متخیلہ نے ان میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ آمیزی کی ہے۔ لیکن ہجو گوئی کی بنیاد اسی مبالغہ پر ہوتی ہے۔

مثنوی نگاری

اصطلاح میں اُن اشعار کو مثنوی کہتے ہیں جن میں دو دو مصرع باہم مقفّٰی ہوں۔ [1] اگرچہ لفظ ''مثنوی'' عربی ہے لیکن بحیثیت صنفِ سخن اس کی ایجاد فارسی میں ہوئی۔ اردو نے اسے فارسی ہی سے مستعار لیا۔ ان دونوں زبانوں میں مثنوی ایک اہم صنفِ سخن ہے، اس میں جن پریوں کے قصّے اور مافوق الفطرت واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن و

[1] نجم الغنی، بحر الفصاحت، لکھنو، ۱۹۲۶ء ص ۱۰۴۔

عشق کی وارداتوں، خوشیوں اور غموں، میدانِ کارزار کے ہنگاموں، بزمِ طرب کی دلآویزیوں، شادی اور موت کی رسموں، اخلاقی قصّوں، تصوّف کے مسئلوں اور مذہبی تعلیم کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں غزل کی سادگی، سوز و گداز، قصیدے کا جوش و خروش، ہجو کی ظرافت نگاری، مرثیے کا نوحہ و غم وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ کسی عہد کے سیاسی و سماجی حالات، معاشرت، رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے، لباس و زیورات وغیرہ کے مطالعے کے لیے اس دور کی مثنویوں کا مطالعہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔

فارسی میں شاہ نامہ، سکندر نامہ، حملۂ حیدری، یوسف زلیخا، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں اور مثنوی مولانا روم ایسی مثنویاں ہیں جنھوں نے اپنے مصنفین کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلائی ہے۔

اردو میں مثنوی نگاری کی ابتدا دکنی ہی سے ہوگئی تھی۔[1] نویں صدی ہجری میں میراجی شمس العشاق کی مثنوی ''شہادت التحقیق'' یا شہادت الحقیقت، خوش نامہ، خوش نغز، مرغوب القلوب ملتی ہیں۔ ان تمام مثنویوں میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اسی دور کے ایک شاعر نظامی کی عشقیہ مثنوی پدم راؤ کدم بھی دریافت ہوئی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے شروع میں سید شاہ اشرف بیابانی نے مثنوی ''نوسرہار'' تصنیف کی۔ اسی زمانے میں برہان الدین جانم نے ارشاد نامہ، وصیت الہادی، حجت البقا، نسیم الکلام اور منفعت الایمان مثنویاں لکھیں۔ ایک اور شاعر فیروز بھی اسی عہد کا ہے۔ اس نے ایک مثنوی توصیف نامہ میراں محی الدین لکھی۔

گیارھویں صدی ہجری کی مثنویوں میں عبدل کی ابراہیم نامہ، وجہی کی مثنوی قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، طوطی نامہ اور چندا اور لورک، نصرتی کی گلشنِ عشق، ابنِ نشاطی کی پھول بن وغیرہ مشہور ہیں۔

بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوا اور ہمیں ابتدا ہی

---

1. دکنی مثنویوں سے متعلق معلومات دکنی مثنویاں، محمد اکبر الدین صدیقی مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر ۱۹۶۳ء-۶۴ سے لی گئی ہیں۔

سے اچھی مثنویوں کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ جعفر زٹلی کے کلیات میں ظفر نامہ اور رنگ زیب اور طوطی نامہ مثنویاں موجود ہیں۔ نواب صدرالدین فائز دہلوی کے کلام میں بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں مل جاتی ہیں۔ شاہ مبارک آبرو نے بھی ایک مثنوی کہی تھی۔ شاہ حاتم کے دیوان زادے میں پانچ مثنویاں بھی شامل ہیں۔

سودا اور میر دونوں اساتذۂ فن نے اس طرف توجہ دی۔ لیکن یہ صنفِ سخن سودا کو راس نہ آسکی۔[۱]

میر نے اگرچہ مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھی ہیں مگر شہرت اور مقبولیت عشقیہ مثنویوں کو سب سے زیادہ ملی۔ قائم، مصحفی اور راسخ عظیم آبادی نے میر کی عشقیہ مثنویوں ہی کی تقلید کی، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میر کی غزل میں جو دروں بینی، سوز و گداز، خستگی و برشتگی، درد و غم کی دھیمی دھیمی آنچ ہے وہی کچھ مثنوی میں بھی موجود ہے۔ سودا اس شدید داخلیت سے محروم رہے تھے۔ اس لیے وہ کوئی قابلِ تقلید مثنوی تصنیف نہ کر سکے۔[۲]

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے سودا کی مثنوی نگاری کے بارے میں رائے دی ہے۔ ''مرزا از اقسامِ شاعری در مثنوی فکر معقول نداشت''۔[۳] تقریباً یہی بات عبدالغفور نساخ نے ان الفاظ میں لکھی ہے۔ ''سوائے مثنوی کے جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے''۔[۴]

سودا کی مثنویاں مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

ہجویہ:-

۱۔ مثنوی در ہجو پیل راجہ نرپت سنگھ

۲۔ مثنوی در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہ جہاں آباد

---

[۱] امیر احمد علوی لکھتے ہیں۔ ''مرزا رفیع سودا نے چوبیس مختصر مثنویاں لکھیں۔ لیکن وہ قصیدہ گوئی اور ظرافت نگاری کے بادشاہ تھے۔ مناظر کی مصوری، جذبات کی نقاشی میں ناموری نہ حاصل کر سکے''۔ نگار، جنوری فروری ۱۹۵۷ء، ص ۶۳۔

[۲] سید عبداللہ لکھتے ہیں۔ ''اگر میر کی مثنویوں میں خلوص، سچائی اور الم انگیزی کے یہ نقوش نہ ہوتے تو ان کی مثنویوں اور سودا کی مثنویوں میں کچھ فرق نہ ہوتا''۔ نقدِ میر دہلی، ص ۲۴۱۔

[۳] گلشنِ بے خار، ص ۱۰۰۔

[۴] سخن شعرا، ص ۲۲۳۔

۳-مثنوی در ہجو امیر دولت مند بخیل

۴-مثنوی در ہجو میر ضاحک

۵-مثنوی در ہجو حکیم غوث

۶-مثنوی بطور ساقی نامہ در ہجو میاں فوقی

۷-مثنوی حکایت ڈومنی

۸-مثنوی در ہجو کوکی یعنی دختر دایہ

کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں آخری دو کے علاوہ باقی سب شامل ہیں۔ غالباً آسی نے اپنے کلیات میں ان دو مثنویوں کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ یہ ضرورت سے زیادہ فحش ہیں۔ لیکن یہ مطبع مصطفائی کے نسخے میں شامل ہیں۔ ہجو دختر دایہ ۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

واسطے طفل کے جو بہتر ہے
شیر اگر ہے تو شیر مادر ہے
نہ کہ ہر ایک کنجڑی بھٹیاری
ایک خصم جس کا سو جگہ یاری

مزید چار شعروں میں تمہید بیان کر کے سودا اصل موضوع پر آتے ہیں۔

ایسی ہی ایک چنانچہ دائی ہے
خام پارہ ایک اس کی جائی ہے
جب وہ لڑکوں میں کھیلنے جاتی
اس کی ماں ڈھونڈ کر پکڑ لاتی

پیٹ کر سر وہ تب یہ کہتی تھی
یہی کہہ کہہ کے چپ ہو رہتی تھی
بیاہی جب یہ چھنال جاوے گی
آگ سسرال میں لگاوے گی
لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جاکے ڈنڈ پیلے[۱]

یہ تو اس لڑکی کے بچپنے کا ذکر تھا۔ اب سوداؔ اس کی جوانی کا بیان کرتے ہیں۔

بچپنے میں تو اس کا تھا یہ حال
اب جوانی کا سنیے قال و مقال
نہ جوان چھوڑے ہے نہ یہ بالا
کام کے دیو نے اسے پالا

---

[۱] اس شعر سے فائدہ اُٹھا کر مولانا محمد حسین آزادؔ نے ایک لطیفہ بنا دیا۔ لکھتے ہیں۔ ''آصف الدولہ مرحوم کی انا کی لڑکی خورد سال تھی۔ نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عموماً تحمل اور بے پروائی تھی۔ دوسرے اس کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اس کی شوخی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نواب سوتے تھے۔ ایسا غل مچایا کہ بدخواب ہو کر جاگ اُٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب صاحب کو غصہ آیا ہے خدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بلاؤ۔ مرزا اسی وقت حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ بھئی مرزا اس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے۔ تم اس کی ہجو کہہ دو۔ یہاں تو ہر وقت مسالہ تیار تھا۔ اسی وقت قلمدان لے کر بیٹھ گئے اور مثنوی تیار کر دی کہ ایک شعر اس کا لکھتا ہوں۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے   نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڑ پیلے

بعض بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ دلّی میں نالہ پر ایک دوکان میں بھٹیاری رہتی تھی۔ وہ آپ بھی لڑاکا تھی مگر لڑکی اس سے زیادہ چنچل ہوئی۔ آتے جاتے جب دیکھتے لڑتے ہی دیکھتے۔ ایک دن کچھ خیال آ گیا۔ اس پر یہ ہجو کہی تھی۔ (آبِ حیات، ص ۱۷۰)

پوری مثنوی پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں واقعات آزادؔ کے ذہن کی اختراع ہیں۔ مثنوی اتنی فحش اور مبتذل ہے کہ اُس معصوم بچی کی ہجو نہیں ہو سکتی۔ جس کی ماں کا آصف الدولہ نے دودھ پیا تھا۔ ابتدائی اشعار میں صاف طور پر دائی اور اس کی دختر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے بھٹیاری والا قصہ بھی غلط ہے۔ (خ-۱)

اس کے بعد سودا فحش باتوں پر اُتر آتے ہیں۔ دوسری مثنوی ''حکایت ڈومنی'' چھ شعر کی ہے۔ ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

حکایت یہ ایک ڈومنی سے ہے یاد
بڑھاپے میں اوس کو ہوئی چھل زیاد
جواں کوئی کرتا نہ تھا اوس کو یار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

بعد کے چار شعر بہت فحش ہیں۔ باقی ہجویہ مثنویوں پر تبصرہ ''ہجو گوئی'' کے تحت کیا گیا ہے۔

مدحیہ:۔

مثنوی در تعریف دیوان و اشعار مہربان خاں

مثنوی در تعریف شکار کردن نواب آصف الدولہ بہادر مثنوی در مدح

پہلی مثنوی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

صاحبا سیر کے ہیں یہ ابیات
فکر عالی کی آپ کی کیا بات
یہ سفینہ ہے رشکِ ابرِ بہار
ہر ورق اس میں قطعۂ گلزار

اس کے بعد دیوان کی جلد اور شیرازہ کی تعریف بہت ہی انوکھے انداز میں کی ہے۔

اس کے پٹھوں پہ جلد کی یہ بہار
در باغِ بہشت کے ہیں کوار
صرف شیرازہ جو ہوا تیار
ہے رگِ جانِ عاشقانِ زار

مہربان خاں کے کلام کی تعریف میں سوداؔ نے حسب معمول مبالغے سے کام لیا ہے۔
چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لعلِ سفتہ لب و دہن تیرا
در شہوار ہے سخن تیرا
ہر غزل ہے تری کمالِ سخن
نمکِ شوخی غزالِ سخن
پڑھے دنگل میں جب رباعی تو
چوکڑی بھول جائے شاعر کو

اسی مثنوی میں سوداؔ نے مہربان خاں کے استاد میر سوزؔ کی تعریف کی ہے۔

شعر کے بحر میں ترا اوستاد
کشتیٔ ذہن کو ہے بادِ مراد
ایک خدمت میں تیری اتنی عرض
کرنی اس خیرخواہ کو ہے فرض
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان
پھر ملے گا نہ سوزؔ سا انسان

مثنوی کے اختتام پر سودا نے مہربان خاں کو دعا دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اس مثنوی کے لکھنے سے ہرگز یہ مدعا نہیں ہے کہ انھیں کچھ صلہ چاہیے۔

مثنوی شکارنامہ فنی لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ میر کے شکارنامے اس سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ سودا کا شکارنامہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تصنیف زبردستی کی ہے۔ پوری مثنوی میں کہیں شکار کا کوئی منظر نظم نہیں ہوا۔ صرف اس انداز کی مبالغہ آرائی ہے۔

جہاں تو لے وہ اپنی شمشیر کو
تو روباہ سمجھے ہے وہ شیر کو
بجز زیرِ تیغ اس کے پائے نہ اور
ہرن پاڑھے چیتل چکارے نے ٹھور
ہوئے شیر بیشوں میں اتنے شکار
کہ باہر پڑے تھے زحد بے شمار
درندوں سے جب صاف جنگل کیا
تو خیمے میں تشریف فرما ہوا
رہے دیکھ حیراں صغیر و کبیر
جب آگے سے اٹھ بھاگے قالی کے شیر

نواب اس شکار میں کچھ زندہ ہاتھی گرفتار کر کے لائے تھے۔ یہ سب ہاتھی بہت خوب تھے۔ لیکن بقول سودا :

پر اک پیل کا ان میں ایسا جمال
زباں وصف میں جس کے میری ہے لال

کبھو پیل ایسا بچشم جہاں
نہ آیا نظر زیرِ نُہ آسماں
وہ ہے قدوقامت میں اتنا بلند
لگا کہنے دیکھ اس کو ہر ہوش مند
بدانست اپنے یہ ہاتھی نہیں
ہوا دیکھ اس کو مجھے بالیقیں
رہے جب نہ واں صید سو سو کروہ
تو زنجیر کو کھینچ لائے ہیں کوہ

تیسری مثنوی میں سوداؔ نے کسی کی انگوٹھی کی تعریف کی ہے، جس پر مہر بنوائی گئی تھی۔ سات شعروں کی اس مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پہلا شعر یہ ہے۔

کھدا تیرے خاتم پہ جب تیرا نام
سند اس سے پانے لگے خاص و عام

اخلاقیہ:۔

مثنوی در ہجو طفل ضائع روزگار لکڑی باز
مثنوی (اس کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا)

پہلی مثنوی میں سوداؔ نے ایک لڑکے کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ جھونپڑی میں رہتے ہوئے خواب محلوں کا دیکھتا تھا۔ ایک دن اپنے باپ سے کہنے لگا۔

موٹے جامے سے مجکو ذوق نہیں
چھوٹے چیرے کا دل کو شوق نہیں
پٹکا گاڑھے کا کب تلک باندھوں
موٹی شلوار تا کجا پہنوں
جوتی چمڑے کی مجھکو نہیں بھاتی
سوکھ کر پاؤں میں نہیں آتی

پھر لڑکا اپنے لباس، ہتھیار، گھوڑے وغیرہ کی فرمائش کرتا ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں عہدِ سودا کے نوجوان کے لباس اور زیب و آرائش کے تمام ساز و سامان کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب لڑکے نے بہت کڑوی کسیلی باتیں کہیں تو باپ نے جواب دیا۔

تب کہا باپ نے اے میری جان
حق نے قسمت کیا ہے سو ہے ندان
ہم غریبوں کی دال روٹی ہے
گاہ پتلی ہے گاہ موٹی ہے
گر مزے چاہتی ہے تیری زباں
حق نے دی ہے تجھے یہ زر کی کاں
اپنے اوپر کسی کو کر عاشق
یا ہو وہ پاکباز یا فاسق

نخرے سے اس کی گود میں جا لیٹ
کھول چھاتی کو اور دکھا کر پیٹ

غرض باپ بیٹے میں جھگڑا اتنا بڑھا کہ لڑکا گھر سے نکل آیا۔ اسی محلے میں ایک پہلوان رہتے تھے۔ جو اسی قسم کے لڑکوں کی تاک میں رہتے تھے۔ یہ لڑکا کشتی کے بہانے سے ان کے پاس گیا۔ پہلوان زور کرانے کے لیے اکھاڑے میں لے گئے۔ یہاں سودا نے پہلوانی کی بہت سی اصطلاحیں نظم کی ہیں جو زبان پر کام کرنے والوں کے لیے بہت اہم ہیں۔ کشتی کے بعد جب لڑکا اکھاڑے سے آیا تو اُس نے اپنی اس نئی روش سے توبہ کر لی اور بقول سودا ''شعر پڑھتا یہ اپنے گھر کو چلا''۔

سنو اے لڑکو ہو نہ راہ سے کم
اس نصیحت کو گوش جان سے تم
باپ کے گھر کی چاٹ کے چٹنی
کرو لذران یارو تم اپنی

اس مثنوی کا قصہ بہت کمزور اور غیر دلچسپ ہے۔ اندازِ بیان میں بھی کوئی خوبی نہیں۔ البتہ اس کی صرف یہ خوبی ہے کہ اس میں اُس دَور کے لباس وغیرہ اور پہلوانی کی اصطلاحات کا ذکر آیا ہے۔

دوسری مثنوی میں بھی ایک قصہ بیان کر کے اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ مگر پہلی مثنوی کی طرح اس کا قصہ بھی بہت کمزور ہے۔ البتہ یہاں سودا کا اپنا اندازِ بیان قائم ہے۔ مثنوی شروع اس طرح ہوتی ہے۔

ایک مشفق ہیں ہمارے مہرباں
خوب صورت خوب سیرت نوجواں

ناگہاں اک روز ہم سے مل گئے
دیکھتے ہی شکل جوں گُل کھِل گئے

سوداؔ نے غور سے دیکھا تو ان کی صحت بہت خراب تھی اور بقول سوداؔ:

دیکھتا کیا ہوں کہ عالم اور ہے
گرد رخساروں کے خط کا دور ہے

مزید سات شعروں میں سوداؔ نے ان کی خستہ حالی کا بیان کیا ہے۔ پھر سوداؔ اس کی بربادی اور تباہی کی وجہ دریافت کرتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے۔

کد خدائی کا ہے جب سے اتفاق
زندگانی ہوگئی ہے جی پہ شاق
ہو جیو مشاطہ کا خانہ خراب
ہاتھ سے جس کے ہے اپنا جی کباب
ایسا بدصورت ملایا آدمی
کہیے کیا اپنی ہے قسمت کی کمی
بیاہ کی رات اور مجھ پر یوں کٹھن
چاند کوں لگتا ہے جیسے کہ گہن
آرسی مصحف لگا تب دیکھنے
آسماں اوپر لگا جب دیکھنے
جو ہیں پڑتی ہے مری اوس پر نگاہ
ہے گویا اک پارۂ ابر سیاہ

کوئی اوس صورت کا دیکھانے سنا
دیکھتے ہی میں نے سر اپنا دھنا

سوداؔ نے اس لڑکی کی بدصورتی اور دوست کی تباہ حالی کا ذکر ستاون اشعار میں کیا ہے۔ جب وہ دوست اپنا پورا قصہ سنا چکا تو سوداؔ اُسے نصیحت کرتے ہیں۔

تب کہا میں عقل سے یہ دور ہے
کونسا اے یار یہ مذکور ہے
جب سے دنیا میں ہے انساں کی سرشت
کوئی روئے خوب ہے اور کوئی زشت
ماٹی کی مورت بناوے ہے کمہار
کوئی بدصورت کوئی ہے تاجدار
دیکھ بدصورت کو مت ہنس کھلکھلا
اس میں ہوجاتا ہے صانع کا گِلا
گنج کوئی مار سے خالی نہیں
دامنِ گل خار سے خالی نہیں
صورت اور سیرت کا باہم اتفاق
ایسا ہوتا ہے بہت کم اتفاق
کیجیے صورت کا بس کیا اعتبار
کوئی دن ہے یہ بھی جوں فصلِ بہار

اس کے بعد سوداؔ نے اپنے عہد کے کچھ حسینوں کا ذکر کیا ہے۔

خوب صورت یار بھی اپنے گئے
مونس و غم خوار بھی اپنے گئے
جیسے عبدالحی تاباںؔ ہوچکا
ساتھ اس کے اک سلیماںؔ ہوچکا
یوسفِ مصری سے مصری کم نہ تھا
تلخیِ دوراں سے جس کو غم نہ تھا
نام تھا اک خوب صورت کا عزیزؔ
جان سے زیادہ ہمیں وہ تھا عزیز
ہوچکا مالکؔ بھی ملک حسن کا
تھا وہ بخشی الممالک حسن کا
میر قطبیؔ قطب تارا ہوچکا
کیا کہوں میں زور پیارا ہوچکا
سانوروں میں اک گمانیؔ زور تھا
ہند میں جس کے نمک کا شور تھا

اس کے بعد سوداؔ بے ثباتی دنیا کا ذکر کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر چیز ناپائیدار ہے۔ کیسی کیسی صورتیں خاک میں مل گئیں۔ کیسے کیسے لوگ تہِ خاک چلے گئے۔ انسان کب تک اور کس کس کا ماتم کرے اور آخر میں نصیحت کرتے ہیں کہ ان تمام باتوں کا مدعا یہ ہے کہ دنیا سے دل مت لگا۔

آدمی کو چاہیے وارستگی
صورتِ فانی سے کیا دل بستگی
زندگانی کا نہ ہو جب اعتبار
شکل و صورت کا تو ہے کب اعتبار
پائداری ہے اوسی کی ذات کو
بس ہے سوداؔ، نفی کر اس بات کو

خطوط:-

مثنوی بطور خط

مثنوی بطور خط

ان دونوں مثنویوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ خط کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کے دوستوں نے انھیں جو خطوط لکھے، یہ مثنویات ان ہی کے جواب کے طور پر لکھی گئیں۔

تنقیدی:-

مثنوی در بیان معانی بیت مثنوی مولوی روم۔

سبیل ہدایت

مولوی روم کا ایک شعر ہے۔

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

بظاہر اس شعر کا مطلب یہی ہے کہ مولوی روم آواگون کے فلسفے کو تسلیم کرتے تھے جو اسلامی نقطۂ نظر سے کفر ہے۔ اس شعر پر کافی بحث و مباحثہ ہو چکا ہے اور ہر شخص نے اپنے اپنے انداز سے اس کی تشریح کی ہے۔ سودا نے بھی اس کی تشریح ان اشعار میں کی ہے:

مدعا اگنے سے ہے نشوونما
ہر جگہ کرنا خودی سے ہو فنا
ہے غرض قالب سے دل ہر ایک کا
خلقتِ خالق میں بد اور نیک کا
لے کے انسانات سے تا وحش وطیر
دیکھنی قالب سے مطلب اون کی سیر
یوں کلام مولوی دے ہے خبر
یعنی میں جس دل میں دیکھا بیٹھ کر
کچھ نظر آیا نہ غیر از اوس کی ذات
اس قدر پایا محیطِ کائنات
معنی ہم اس شعر کے سمجھے ہیں یوں
اور کی فہمید میں کچھ اور ہوں

ظاہر ہے کہ اس شرح میں سودا نے زبردستی کی ٹھونس ٹھانس کی ہے۔ ورنہ مطلب وہی ہے جس پر لوگوں کو اعتراض ہے۔ دوسری مثنوی پر ہجو گوئی کے تحت تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

منظر نگاری:

مثنوی موسم گرما

اس موضوع پر کلیاتِ سودا میں صرف ایک مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں وہی مبالغہ آرائی ہے

جو سودا کے قصیدوں اور ہجوؤں میں ملتی ہے۔ اسی لیے زبان و بیان کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے دور ہے۔ پھر بھی اس مثنوی کی یہ اہمیت ہے کہ موسمِ بہار کے علاوہ فطری منظر نگاری پر سودا کی پہلی کوشش ہے۔ غالباً اس مثنوی کو اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ کیوں کہ سودا کے شاگرد قائم نے اسی طرح موسمِ سرما پر ایک نظم کہی۔ بعد کے شاعروں نے مرثیوں میں فطرت نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ خاص طور پر موسم گرما کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں سودا موسمِ بہار کی کیفیت بیان کرتے ہوئے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس دفعہ تو بہار کا موسم بھی اتنا گرم ہے کہ :

یہ پٹاخا چٹکتی وقت گلاب
کفِ نرگس پہ چھٹتی ہے مہتاب
دستۂ گل کا کیا کہوں میں رنگ
اس میں ہت پھول کے سے ہینگے ڈھنگ
غنچے کھلتے ہیں یوں ہو آتشبار
گویا پھٹتا ہے داغنے میں انار
نہیں گیندوں کے یہ چمن میں درخت
دی ہے آتش ستاروں کو یک لخت

گرمی کی شدّت اس طرح بیان کی ہے۔

ہے حرارت گلوں کو اب یاں تک
نہیں شبنم یہ نکلی ہے چیچک

پانی کو بلبلیں پھریں بھٹکی
طفل غنچوں کو لگ گئی چٹکی
گیا تالاب میں ہر ایک کنول
کنول کاغذی کی طرح سے جل
بوند کو دل صدف کا ترسے ہے
ابر نیساں سے آگ برسے ہے
ہے پسینے سے میخوروں کا یہ حال
باد گویا ہے آب در غربال

اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات و استعارات ہیں۔ فطرت نگاری کے لحاظ سے یہ مثنوی اعلیٰ درجے کی نہ ہو۔ لیکن سودا کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت ضرور ہے۔

عشقیہ:۔

مثنوی قصہٗ در عشق پسر شیشہ گر بزرگر پسر بطور ساقی نامہ و دیگر حکایت شیخ و دعاء پادشاہ مثنویاتِ سودا میں یہ واحد مثنوی ہے جس میں عشقیہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ سودا کا یہ میدان نہیں ہے۔ مثنوی کی ابتدا حمدِ خدا سے ہوتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مرا دل نام پر اوس کے ہے شیدا
کیا ہے جن نے حسن و عشق پیدا
کہیں نورِ چراغِ خانہ ہے وہ
کہیں سوزِ دلِ پروانہ ہے وہ

کسو کے دل میں پاتا ہوں اسے درد
کسی سینے میں تاثیر دم سرد
کسی جاگہ میں عیسیٰ کا ہو وہ دم
کسی جا ہو سموم آکر پر از سَم

سوداؔ خدا سے دعا مانگتے ہیں۔

خدایا دے تو اپنے عشق کا درد
عنایت کر دل گرم و دم سرد
محبت کا دے اپنے داغ دل پر
بغیر از شمع ہے تاریک یہ گھر
خم دل میں شرابِ درد بھر دے
پیالی چشم کی لبریز کردے
تعشق میں کر اپنے اس قدر غرق
نہ مجھ سے کفر و دیں میں ہو سکے فرق

مناجات اور دعا کے بعد بیس شعروں میں نعت ہے جس کے چار شعر یہ ہیں۔

محمدؐ باعثِ ایجاد افلاک
محمدؐ علتِ غائی لولاک
محمدؐ ہے مشیرِ عالمِ غیب
محمدؐ ازدارِ حق ہے لاریب

محمدؐ عادل و کامل و عاقل
محمدؐ ہے جو کچھ تھا اوس کے قابل
اوسی کی ذات سے اثبات حق ہے
؛ کہ اوس کی ذات عینِ ذاتِ حق ہے

اس کے بعد منقبت میں حضرت علیؓ کی تعریف کی گئی ہے۔

علی برحق امام رہنما ہے
علی ہی جانشینِ مصطفا ہے
علی ہی شہسوارِ راہِ دیں ہے
علی مہرِ نبوت کا نگیں ہے
کروں کیا مرتبے کی اوس کے تقریر
کہ تابع جس کی مرضی کے ہے تقدیر

۷۷ اشعار میں ساقی سے خطاب اور موسم بہار کا بیان کر کے سوداؔ اصل قصے پر آتے ہیں۔

حکایت ہے کہ اک عابد بآفاق
عبادت کرنے میں تھے حق کے وہ طاق
خدا کی یاد میں رہتے تھے دن رات
نماز و روزہ میں گزرے تھے اوقات

ان بزرگ کے زہد، عبادت گزاری، نیکی اور شرافت کی بہت زیادہ تعریف وتوصیف کے بعد سوداؔ کہتے ہیں۔

ملے اک روز سودا سے وہ ناگاہ
کہا مجھکو ہے قصدِ کعبۃ اللہ
نجات اپنی اگر تجھکو نظر ہے
تو آمرزش کا موجب یہ سفر ہے
یہ بہتر ہے کہ چل ہمراہ میرے
جرائم عفو واں سب ہوں گے تیرے

سودا اُن کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ اُن بزرگ اور سودا نے سامانِ سفر تیار کیا۔ ساز و سامان اور گھوڑا لے کر یہ لوگ روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ اس بزرگ کے مرید بھی تھے۔ کوئی ان کا عصا لیے ہوئے تھا۔ کسی کے ہاتھ میں مورچھل تھا، کسی کے پاس حضرت کا رومال تھا، کوئی پیکدان لیے ساتھ چل رہا تھا، کسی نے سر پر مصلا رکھا ہوا تھا۔ غرض اس طرح قافلہ روانہ ہوا۔ ابھی دو چار منزلیں طے کی تھیں کہ شومیِ قسمت سے ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔ یہاں سودا نے طنز نگاری سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ان بزرگ کی پارسائی اور زہد کا مذاق اُڑایا ہے۔

پیادے کس طرح یہ کاٹتے راہ
عصا گر رہ گیا پاس ان کے سو آہ
نظر کر بعد غارت راہ کا رنج
لگے کرنے دل اپنے میں شش و پنج
نہ زادِ راہ پاس ان کے نہ مرکب
اب ان سے عزم کعبے کا بندھے کب
توکل پر چلیں کعبے یہ کیا ذکر
انھیں اسباب کی اپنی پڑی فکر

کبھو عمامے کے جانے کا مذکور
کبھو تھا فکرِ پیراہن سے دل چور
سلیمانی کی گہہ یاد آتی تسبیح
ہوئی جاتی تھی جس کے غم سے تشریح
کبھو کہتے کہ یارو کیا عصا تھا
بڑے حضرت کے میرے ہاتھ کا تھا
عقیق سرخ کا جو ناسداں تھا
اگر بکتا تو قیمت میں گراں تھا

اس بے سروسامانی کے عالم میں انھوں نے حج کا ارادہ ملتوی کردیا۔ جب انھوں نے سوداؔ کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو:

جواب ان کو دیا سوداؔ نے سنکر
جو فرماتے ہو تم ہووے گا بہتر
پر اب اس حال سے گھر کیونکہ جاؤں
بھلا واں جاکے منہ کس کو دکھاؤں
کہا حضرت نے سن کر تم ہو گمراہ
نہیں مسئلے مسائل سے کچھ آگاہ
حرم کا فرض ہے مقدور پر طوف
گیا یاں مال آگے جان کا خوف

مریدوں اور اُن بزرگ نے یہ ہی طے کیا کہ واپس چلنا چاہیے۔ واپسی پر ایک منزل

پر ٹھہرے۔ چوں کہ سامان وغیرہ کچھ تھا نہیں۔ اس لیے سونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اُن بزرگ نے سودا سے فرمائش کی کہ وہ کوئی قصہ سنائیں۔

سودا حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ حلب میں ایک شیشہ گر کا لڑکا تھا۔

حلب میں تھا پسر اک شیشہ گر کا[1]
نہایت لاڈلا مادر پدر کا
بنایا حق نے سب سے دور اوس کو
پری پہنچے نہ ہرگز حور اوس کو
پدر سے سیکھتا تھا شیشہ سازی
نہ تھا کچھ کام اوسے با عشق بازی
قضا کا کیا کہوں آگے میں نیرنگ
کہ مارا اوس پہ ناگہ عشق نے چنگ
ہوا مائل وہ اک زرگر پسر پر
دیا آئینۂ دل اک نظر پر
رہے وہ صبح سے تا شام بے خواب
کہ جیسے چودھویں شب کا ہو مہتاب
نہ فکرِ روزی اور نے خواہشِ قوت
ہوا زرگر پسر کو دیکھ مبہوت

---

1. سودا نے یہ قصہ تقریباً ۲۲۴ اشعار میں بیان کیا ہے۔ میں نے یہاں صرف وہ اشعار نقل کیے ہیں جن سے پورا قصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ (خ-۱)

کہ یک شب پھاڑکر اپنا گریباں
برنگ گل وہ گل روتا مداماں
چلا اس طرح گھر سے بے سروپا
کہ جاتا ہوں کدھر جاکر کروں کیا
کٹی جب اس طرح سے وہ شب تار
ہوئی عالم میں صبح اوس دم نمودار
پدر بالیں تلک اوس کے جو آیا
تو بستر خالی اوس کا اوس سے پایا
پھرا گھر گھر میں وہ حیران و خاموش
گرا بستر پہ اوس کے ہوکے بے ہوش
کٹے رمال کے یاں دن کو اوقات
منجم کے پڑے رہتے تھے گھر رات
انھوں‌کو ایک دن رحم ان پہ آیا
عمل اپنے سے ان کو یوں بتایا
نہ ہو تم زندگی سے اوس کی مایوس
طرف مشرق کے یاں سے ہے وہ سوکوس
پر ایسے اک بیاباں میں کہیں ہے
گذر انسان کا جس جا نہیں ہے

باپ اپنے کچھ دوستوں کو لے کر اس صحرا کی طرف چلا۔

غرض پہونچے یہ جوں توں بعد یک ماہ
نواحی بیچ اس صحرا کے ناگاہ
نظر آیا عجب صحرا لق و دق
کہ دیکھے سے جگر ہو شیر کا شق
بیاباں تھا وہ ایسا وحشت انگیز
کہ وحشت جس کی تھی عالم میں خوں ریز
کہ ناگہ اک نسیم آئی اودھر سے
جہاں بیٹھا تھا وہ آوارہ گھر سے
نظر آیا اسے یوں اس کا دلبند
کہ اوس میں وحشت اوس صحرا سے دو چند
لگا کہنے کہ سن لے اے مری جاں
میں تیرے روم روم اوپر سے قرباں
کہے گا تو جو کچھ وہ ہی کروں گا
رضا میں تیری جیوں، مروں گا
پر اب بہر خدا چل گھر کو یاں سے
مجھے بیزار مت کر میری جاں سے
یہ کہہ کر اوس کے قدموں پر گرا جب
ہوا راضی وہ گھر کے چلنے کو تب

لڑکا گھر تو واپس آ گیا۔ لیکن اس کی حالت وہی رہی۔ آخر

جب آیا تنگ وہ گھبرا کے اک روز
چلا پھر گھر سے بھرتا آہِ جاں سوز
چلے ساتھ اوس کے سب روتے ہوے زار
کہ جوں شبنم سے ٹپکیں گرد گل خار

اس وقت لڑکے کے ہمدرد، ہوا خواہ اور والدین سب اُس کے ساتھ تھے۔ شہر شہر گلی گلی یہ قافلہ اُس لڑکے کے پیچھے چلتا رہا۔ آخر تنگ آ کر:

تھکے جب سو طرح کی کر کے تدبیر
کیا ناچار اس وحشی کو زنجیر

لیکن اس کے جنون میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ایک دن وہ زنجیروں سمیت فرار ہو گیا اور حُسنِ اتفاق سے راستے میں اُس کا محبوب مل گیا۔

سنی زنجیر کی جب اون نے آواز
کھلا ہے دل پہ اوس کے پردۂ راز
ہوا سنتے ہی شوق اوس کو دوبالا
قدم پر اوس کے سر جاتے ہی ڈالا
لگا کہنے کہ میری جان عاشق
میں سرتاپا ترے قربان عاشق
اب اوٹھ کر یاں سے تو چل گھر کو میرے
کروں شانہ میں بالوں بیچ تیرے

اس کے بعد شاہ عالم اور نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کی مدح میں اشعار ہیں۔بحیثیت مجموعی یہ غیردلچسپ مثنوی ہے۔بعض مقامات پر سودا نے ناقابلِ یقین بلکہ مضحکہ خیز اشعار کہے ہیں۔

واسوخت

مختلف اصناف کی طرح واسوخت بھی اردو شاعری میں فارسی ہی سے آئی ہے۔وحشی یزدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فارسی میں پہلا واسوخت اُس نے کہا تھا مگر واسوخت کی اصطلاح اردو میں وضع ہوئی ہے۔ فارسی میں وحشی نے اس کا عنوان مسدس اور مثمن دیا تھا۔اردو میں واسوخت نگاری کی ابتدا پہلے ہوئی اور اس کا نام واسوخت بعد میں پڑا۔ شاہ مبارک آبرو کی واسوخت کا عنوان ''جوش وخروش'' ہے۔حاتم نے ''سوز وگداز'' کے عنوان سے ایک ترکیب بند کہا ہے جو دراصل واسوخت ہے۔غالباً میر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس صنف کو واسوخت کا نام دیا۔ [۱]

واسوخت کے اجزائے ترکیبی قصیدے اور مرثیے کی طرح مخصوص ہوتے ہیں جو اس طرح ہیں۔

۱-ابتدا میں عشق کی تعریف ہوتی ہے یہاں شاعر یہ بھی بتاتا ہے کہ پہلے وہ عشق ومحبت کی دنیا سے بہت دور تھا۔

۲-پھر اپنے آغازِ عشق کا قصہ بیان کرتا ہے

۳-اُن دنوں کا ذکر کرتا ہے جب اُسے وصلِ یار نصیب تھا۔

۴-محبوب کے حُسن کے ساتھ اس کی معصومیت،سادگی اور بھول پن کی تعریف کرتا ہے۔

۵-اس کے بعد اُس کی بے وفائی کا شکوہ اور اپنی خستہ حالی کا بیان کرتا ہے۔

---

[۱] میں نے اس باب کے لکھنے میں اپنے عزیز شاگرد انیس حسن لیکچرار دہلی کالج کے غیر مطبوعہ مقالہ ''اردو میں واسوخت نگاری'' سے استفادہ کیا ہے۔جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔اُن کا مقالہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔(خ-۱)

۶۔ آخر میں شاعر محبوب کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ بعض اوقات اس کی بدصورتی کا بیان کر کے ایک نئے محبوب کی تعریف کرتا ہے اور پھر اُس سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔

دکنی شاعری میں واسوخت کے اشعار ضرور مل جاتے ہیں لیکن مکمل واسوخت نہیں ملتا۔ غالباً بحیثیت صنفِ سخن واسوخت کی ابتدا شمالی ہندوستان ہی میں ہوئی۔ دورِ ایہام گویاں میں آبرو اور حاتم دونوں کے ہاں واسوخت ملتے ہیں۔ چوں کہ آبرو عمر میں بڑے تھے۔ اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ اردو کے پہلے واسوخت نگار تھے۔

سودا نے بھی ایک واسوخت کہا تھا لیکن اس کے اجزائے ترکیبی وہ نہیں ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔ نہ صرف سودا بلکہ اس عہد کے کسی بھی شاعر کے ہاں ایسا واسوخت نہیں ملتا جس میں یہ تمام اجزائے ترکیبی موجود ہوں۔ ان اجزا کا تعین غالباً بعد کے زمانے میں ہوا ہے۔

سودا نے واسوخت کے پہلے بند میں خدا سے دعا مانگی ہے کہ اُسے "زلفِ خوباں" کے جنجال سے نکال دے۔

یا الٰہی کہوں اب کس سے میں اپنا احوال
زلف خوباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جنجال
یا رب اس پیچ سے میرے دلِ شیدا کو نکال
کاش اب موت ہو یا دور ہو یہ سر سے دبال
تجھ سوا غیر سے میں کیونکہ کہوں دل کا حال
تیری ہی ذات سے میرا یہی ہر دم ہے سوال

ساز آباد خدایا دلِ ویرانے را
یا مدہ مہر بتاں پیچ مسلمانے را

اس کے بعد شاعر دل کو بُرا بھلا کہتا ہے جو لاکھ سمجھانے کے باوجود گرفتارِ محبت ہو کر رہا پھر

شاعر خود کو یہ کہہ کر سمجھاتا ہے۔

کیا کرے دل بھی بُرا ہے یہ محبت کا فسوں
کب تلک دل سے میں اس کاوشِ بیجا کو کروں
اس غم و درد و بلا بیچ کہاں تک میں مروں
آتشِ غم سے طرح شمع کے رو رو کے جلوں
اب نہیں تاب زباں کو جو میں خاموش رہوں
کیونکہ احوالِ دل اُس شوخ سے جاکر یہ کہوں

شرح ایں آتشِ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں راز نہفتن تا کے

شاعر اپنے محبوب سے پوچھتا ہے کہ وہ وعدے کیا ہوئے۔ یہ عہد شکنی کیوں؟ اور

سچ کہو کس سے تمھاری نئی لاگی ہے لگن
کیا ہوا کس کو ٹھگا کس کا لیا ہاتھ میں من

تم کو حسین اور خوب رو ہم ہی نے تو بنایا ہے ورنہ:

خوبرویوں میں تجھے کن نے بنایا سجدار
ورنہ خوباں میں نہ کرتا تھا کوئی تجکو شمار
بلکہ پھرتا تھا تو ہر ایک کے گھر سو سو بار
اپنی مجلس میں نہ دیتا تھا کوئی تجکو بار

ایں زماں جائے تو در دیدۂ مردم شدہ است
روے زیباے تو از دیدۂ من گم شدہ است

پھر سوداؔ اپنے محبوب کو بتاتے ہیں کہ حسینوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔

شیشۂ دل کو مرے سنگِ ستم سے پھوڑا
دل نے میرے بھی منہ اب تیری طرف سے موڑا
تم جو کچھ ساتھ کیا میرے نہیں وہ تھوڑا
مجکو بھاتا نہیں ہر دم کا ترا نکتوڑا
خوبرویوں کا جہاں بیچ نہیں کچھ توڑا
شعر وحشی کا دل اپنے پہ یہ میں لکھ چھوڑا
میدہم جائے دگردل بدل آرائے دگر
چشم خود فرش کنم زیرکف پائے دگر

پھر سوداؔ اُن غیروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں جن کی صحبت میں رہ کر ان کا محبوب بگڑا ہے اور آخر میں اُس سے التجا کرتے ہیں۔

اس قدر کس لیے بیزار ہے مجھ زار سے تو
مت چھپا منہ کو سجن اپنے خریدار سے تو
چشم پوشی تو نہ کر عاشقِ بیمار سے تو
مجکو محروم نہ رکھ لذّتِ دیدار سے تو
سُن لے یہ بات میاں اپنے گرفتار سے تو
دیکھ ایدھر بھی کبھی ایک نظر پیار سے تو
نگہے جانب سوداؔ گہہ وگاہے کافی است
بلکہ از لطف بادنیم نگاہے کافی است

یہ واسوخت اردو واسوخت نگاری کے ابتدائی نقوش میں سے ہے اور اسی بنا پر اہمیت رکھتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں اتنے اعلیٰ درجے کے واسوخت لکھے گئے ہیں کہ اُن کے مقابلے میں یہ بہت معمولی اور سطحی سی تصنیف ہے۔

رباعیات:۔

فارسی اور اردو شاعری میں رباعی ایک اہم صنف ہے لیکن اسے وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کو رہی ہے۔ حالاں کہ بیشتر بڑے شاعروں کے کلیات میں کچھ نہ کچھ رباعیاں مل جاتی ہیں۔ بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کا سرمایۂ شعری صرف رباعیات ہی ہو۔ فارسی میں ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام اور شاہ سرمد کی شہرت کی بنیاد رباعیوں پر ہے۔ فریدالدین عطار اور حافظ کے دیوان میں رباعیات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

دکنی اردو میں محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، شاہی، نصرتی، ولی اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ کے ہاں رباعیاں ملتی ہیں۔[۱] شمالی ہند میں اٹھارویں صدی کے بیشتر شعرا کے دواوین میں رباعیاں موجود ہیں۔

سودا نے بھی اس صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلیات مطبوعہ مطبع مصطفائی میں ۸۰ رباعیاں ہیں۔ اس میں غزل کے دو اشعار کو بھی رباعی کی طرح شامل کر دیا گیا ہے اور احسن اللہ خاں بیان کی بھی ایک رباعی آ گئی ہے۔ بعض مقامات پر رباعی کی مقررہ بحروں سے بھی انحراف نظر آتا ہے۔[۲]

رباعیوں میں سودا کا موضوعِ سخن وہی ہے جو عام طور پر ان کے پیش رووں کی رباعیوں کا ہے۔ یہاں الگ الگ عنوانات کے تحت ان رباعیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

---

۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، رباعیاتِ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

۲ تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو۔ "سودا کا الحاقی کلام"۔

عشقیہ:-

سوداؔ نے سب سے زیادہ عشقیہ رباعیاں کہی ہیں۔ان رباعیوں کے موضوعات وہی ہیں جو سوداؔ کی غزل کے ہیں یعنی یہاں بھی کوئی خاص بات نہیں کہی گئی۔ان رباعیوں کی خوبی صرف سودا کا اندازِ بیان ہے۔ایک تشبیہہ ملاحظہ ہو۔

ہے فوج سے غمزہ کے نہایت بیداد
نت اُٹھ ہے مرا خرمنِ طاقت برباد
یہ حال رہے ہے دل کا جیسے دہقاں
لٹتے ہوئے کھیت کی کرے ہے فریاد

اس رباعی میں تکرارِ الفاظ نے حُسن پیدا کردیا ہے۔

آیا ہوں بتنگ دُور رہتے رہتے
لوگوں سے تھکا پیام کہتے کہتے
روتا ہوں کہ سیلِ اشک جاری ہووے
پہونچوں میں گلی میں اس کی بہتے بہتے

متصوفانہ:-

متصوفانہ رباعیوں میں سوداؔ نے مذہبی رواداری، بے ثباتی دنیا، قناعت اور صبر و استقلال کے مضامین باندھے ہیں۔ سودا کا عقیدہ ہے کہ خدا دیر و حرم میں نہیں خود انسان میں ہے۔اسے خود سے باہر تلاش کرنا بے سود ہے۔

ایک رباعی ہے:

ہر سو تری تحقیق میں تھے ہم سرگرم
تھا گاہ یقین کعبے پہ کہ دیر پہ بھرم
پایا غرض آپ ہی میں تجھے پر اون کو
سجدہ جو کیجیے تو نہیں رہتی شرم

ایک رباعی میں سوداؔ شیخ کو طعنہ دیتے ہیں کہ تیرا حرم میں جا کر طواف کرنا جلاہے کے تانے بانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اے شیخ حرم تک تجھے جانا آنا
یہ طوف جلاہے کا ہے تانا بانا
پہچانے گا واں کیا اوسے حیراں ہوں میں
جس کو حرمِ دل میں نہ تیں پہچانا

ایک رباعی میں سوداؔ کہتے ہیں کہ وہ لوگ تو خدا کا شکر ادا کرتے ہی ہیں جنھیں اُس نے زر و مال اور دولت و اقبال دیا ہے لیکن شاکر تو وہی ہے جو ہر حال میں خدا کا شکر کرے۔

کتنوں کا جہاں میں زر و مال ہے شکر
کتنوں کا ہی با دولت و اقبال ہے شکر
یوں شکر تو سب کرتے ہیں لیکن سوداؔ
شاکر ہے وہی جس کو بہر حال ہے شکر

صوفی شاعروں کا یہ محبوب موضوع ہے کہ دنیا چند روز کی ہے۔ اس سے دل لگا کر کسی کو کچھ نہیں ملا۔ عقل مندی یہی ہے کہ اس فاحشہ سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔

دنیا ہمیں کہتی ہے کہ دل مجھ سے موڑ
مجھ فاحشہ پر تو نہ یہ جی جامہ توڑ
داڑھی کی سیاہی پہ سفیدی دوڑی
اب رات نہیں صبح ہوئی ہے بس چھوڑ

اس موضوع پر سوؔدا کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔

سوؔدا پئے دنیا تو بہرسو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ تا دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

اسی موضوع پر ایک مستزاد رباعی ہے۔

لولی سے میں دنیا کی کہایوں جاکر سن اے بے پرد
اب ایک کی ہو رہ نہ پھرا کر گھر گھر تیں صورت زرد
بولی کہ جو کوئی مرد ہے سو تو مجھکو رکھتا ہی نہیں
باندھی ہے جنھوں نے مرے رکھنے پہ کمر سو ہیں نامرد

مذہبی:

دو تین رباعیاں ایسی بھی ہیں جو مذہبی مسائل اور موضوعات پر کہی گئی ہیں۔ مثلاً

مجھکو ہرچند نہیں شیعہ و سنّی سے کام
پر یہ سمجھا ہوں کہ اس دور میں تھے بارہ امام

اُن سوا ہو جو کوئی ہے وہ امامِ تسبیح
اُس تلک جائے سے موقوف ہو اللہ کا نام

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو۔

جس ذات کو آفاق میں کہتے ہیں احد
وہ اور امام ایک ہیں نزدِ خرد
گر ہندسہ داں ہے تو سمجھ لے تعداد
کتنے ہیں احد کے بحسابِ ابجد

اخلاق:۔

اگر کوئی شخص کسی پر مہربانی کرے تو اسے مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ اُس کا فرض ہے کہ اگر کسی کو کچھ دے تو اس طرح کہ سیدھے ہاتھ کی اُلٹے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

افسوس کریموں میں نہیں یہ دستور
مفلس پہ کرم کرکے نہ ہوویں مغرور
جھکتا ہے اگر شاخِ ثمردار کا ہاتھ
پھل دے کے وہیں آپ کو کھینچے ہے دور

اسی طرح ایک رباعی میں سوداؔ نے یہ تعلیم دی ہے کہ تو اگر بلندی میں چاند سے بھی دس گنا زیادہ ہے تو اپنے سے پست لوگوں کو دیکھ کر خرسند نہ ہو۔

گر مہ سے بلندی میں ہوا تو دہ چند
پستوں کی طرف دیکھ کے مت ہو خرسند

جتنے کہ بلندوں کی ہیں نظروں میں پست
پستوں کی بھی نظروں میں ہیں او تنے ہی بلند

مدحیہ:-

چوں کہ سودؔا قصیدے کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کے قصیدوں کی طرح مدحیہ رباعیاں بھی کامیاب ہیں۔

ایوانِ عدالت میں تمھارے اے شاہ
کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا جو واں طاق سے رپٹے ہے پاؤں
پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اگر چہ رباعی میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ اس مبالغے پر حقیقت کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے۔۔ایسی ہی ایک رباعی اور ملاحظہ ہو۔

تجھ پاس گدا کب آکے ایسا بولا
جس کو نہ جواہر میں تو لے کر تولا
یاں تک تو ترے ہاتھ نے بخشے یاقوت
جب طشت نے وقت فصد دامن کھولا

ہجویہ:-

سودؔا نے ندرتؔ اور ساجدؔ کی ہجو میں رباعیاں بھی کہی ہیں جو ''ہجو گوئی'' کے تحت نقل کی گئی ہیں۔ تین ہجویہ رباعیاں فحش ہیں جو مطبع مصطفائی کے نسخے میں شامل ہیں۔آسؔی نے دو

رباعیاں تو بالکل ہی نقل نہیں کیں اور ایک رباعی لفظ کی ترمیم کے ساتھ نقل کی ہے۔

تعلّی:

تین رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں سوداؔ نے تعلّی سے کام لیا ہے۔ایک رباعی میں سوداؔ نے خود کو فنِ شاعری کا پیغمبر اور خدائے سخن بتایا ہے۔

سوداؔ شعرا میں ہے بڑائی تجھ کو
تشریفِ سخن عرش سے آئی تجھ کو
عالم تجھے اس فن میں پیمبر سمجھا
پوجا جہلا نے بہ خدائی تجھ کو

ایک اور رباعی میں سوداؔ خود کو ''خاقانی ثانی'' اور ''نطق کا خلاق معانی'' بتاتے ہیں۔

سوداؔ بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے
آفاق میں خاقانیِ ثانی تو ہے
گو نطق کا ہرچند نہیں تو خالق
پر نطق کا خلاقِ معانی تو ہے

سوداؔ کی رباعیاں دوسرے اور تیسرے درجے کی ہیں۔ان میں وہی باتیں کہی گئی ہیں جو سودا غزل میں کہتے ہیں۔

پہیلیاں

ہندوستانی ادب میں پہیلی کہنے کا رواج بہت قدیم ہے۔اس کی قدیم ترین مثالیں ویدوں

میں ملتی ہیں، جن میں بعض کہانیوں اور پہیلیوں کو برہمودے ब्रहमोदय کہا جاتا تھا۔[1] سنسکرت میں پہیلی کو پرَہیلیکا प्रहेलिका اور پہیلی کہنے کے فن کو پرَہیلی प्रहेलि کہا جاتا ہے۔اردو لفظ پہیلی اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ہندوستان کی بعض زبانوں میں اسے بوجھوّل بھی کہا جاتا ہے۔مگر اردو میں صرف پہیلی ہی رائج ہے۔

پہیلی میں

۱-ایسا ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے کئی معنی ہوں۔

۲-یا ایک ہی لفظ کو دو بار مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

عہدِ قدیم کے ایک نقاد دنڈی दण्डी نے اپنی کتاب काव्यदर्श میں پہیلی کی تیں قسمیں بتائی ہیں۔دنڈی سے پہلے صرف سولہ قسمیں مانی جاتی تھیں۔[2]

چھٹی صدی کے ایک نقاد بھاماہ भामह نے काव्यालकार میں لکھا ہے کہ رام شرما چیوت پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پہیلی کہی۔[3]

بظاہر پہیلی کا مقصد بچّوں کی تفریحِ طبع کے لیے کچھ سامان فراہم کرنا ہے۔انھیں جواب تلاش کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔[4]

پہیلی کی اہمیت یہ ہے کہ ایک مخصوص سماج کی تہذیب وتمدن، لباس، عام استعمال کی چیزیں، رہن سہن وغیرہ کے مطالعے کے لیے پہیلیوں سے بہت مدد ملتی ہے۔مثلاً سودا نے بورانی، مسّی، ارگجا، گلگیر، شمشیر، سپر، باز، انار آتشبازی، حمام، گھڑیاں، ستار وطنبور، پاپڑ، ہت پھول، بندوق، طبلہ مردنگ وغیرہ کی پہیلیاں کہی ہیں۔

1- Monier Williams, Sanskrit-English Dictionary, England, 1899. P. 741.

२. धीरेन्द्र वर्मा, हिन्दी साहित्य कोश, बनारस, १९५८, पृ० ४६२ -- ३ वही।

३. रामधन शर्मा कूटकाव्य, दिल्ली। १९६३ई० पृ०. १२--१३।

४. कृष्णलाल हंस, निमाड़ी और उसका साहित्य, इलाहबाद, १९६०। पृ० ३११--३१२।

کلیاتِ سودا مرتبہٗ آسی میں ایک سونو پہیلیاں ہیں، جن میں فارسی اور عربی کے ساتھ ٹھیٹھ ہندی الفاظ کا برجستہ استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سودا کو ہندی زبان پر اچھا خاصا عبور تھا۔ یہ پہیلیاں ایک شعر سے لے کر چھ اشعار تک کی ہیں۔ چند دل چسپ پہیلیاں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ گال پھولائے لینا تاکے
جب منہ کھولے سر کو کاٹے
(گلگیر)

۲۔ آدھا انار سارا ہاتھی
جن دیکھا اُن لایا چھاتی
(ارگجا)

۳۔ رات سمیں اک میوہ آیا
پھولوں پاتوں سب کو بھایا
آگ دے وہ ہووے روکھ
پانی دیے وہ جاوے سوکھ
(انارآتشبازی)

۴۔ ایک پرکھ میں ایسا دیکھا
سیس کم سے وا کا لیکھا
شاہ و گدا میں وا کا ناؤں
بوجھ پہیلی یا چھانڈو گاؤں
(تکیہ)

سودا تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں

سودا ان خوش نصیب فن کاروں میں ہیں جو اپنی زندگی ہی میں شہرت اور مقبولیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہندو پاک اور بعض غیر ملکی لائبریریوں میں کلامِ سودا کے لا تعداد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ اردو شاعروں میں جتنے قلمی دیوان و کلیات یقین اور سودا کے ملتے ہیں شاید کسی اور کے نہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان دونوں کو دوسرے شعرا کی نسبت زیادہ مقبولیت حاصل رہی۔ یقین کی شہرت ایک مخصوص زمانے تک رہی۔ لیکن سودا کا شمار آج بھی ایوانِ اردو کے اہم ستونوں میں ہوتا ہے۔

شاید "گلشنِ گفتار" جنوبی ہند کا پہلا تذکرہ ہے جس میں سودا کا ذکر آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جنوبی ہند میں سودا سے بہت کم لوگ واقف تھے اور کم از کم تذکرے کے مولف خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کو تو سودا کے حالات کا بہت کم علم تھا۔ انھوں نے لکھا ہے۔

> "......سودا...... منصب دار بودہ۔ متوطن شاہ جہاں آباد۔ مردِ سودا مزاج و کم سخن [1]"۔

گلشنِ گفتار کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ اسی سال میر کے نکات الشعرا کی اشاعت ہوئی۔ میر نے جن الفاظ میں سودا کی تعریف کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ حقِ دوستی بھی ادا کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "......غزل قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید

---

[1] گلشنِ گفتار، ص ۴۷

سر آمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گواست۔ بلا گردان ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ، درچمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرع برجستہ اش راسرو آزاد بندہ، پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ، شاعرِ ریختہ، چناں چہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید ۱؎"

سید فتح علی حسینی گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویان" میں لکھا ہے:

"نکتہ دانِ بے ہمتا میرزا محمد رفیع سوداؔ مردے است سپاہی پیشہ و درست اندیشہ، حقا کہ رتبہ شعرش عالی است وسخن دردمندانہ اش حالی، امروز درمیدانِ گفتگو گوے سبقت از اقران و امثال خودمی رباید وداد معنی یابی ورنگین خیالی می دہد ۲؎"۔

شیخ محمد قیام الدین قائمؔ کو سوداؔ سے تلمذ تھا۔ وہ سوداؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"عندلیب خوش نغمہ گلشن روز گار گل سرسبد محافلِ اشعار یگانہ کشور افضل نقادۂ دودمان کمال انتخاب نسخہ صاحب کمالے...... بالفعل بخطاب ملک الشعراے کہ مہین پایۂ سخنوران است اعزاز و امتیاز دارد ۳؎"۔

لگ بھگ اسی زمانے میں جنوبی ہند میں ایک اور تذکرہ "ریاض حسنیٰ" لکھا گیا اس کا مولف خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت بھی سودا کے حالات سے کچھ زیادہ واقف نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے لکھا ہے:

"معنی یاب بے ہمتا مرزا محمد رفیع سوداؔ، فخر سخن گویانِ جہاں آباد است بلبل طبعش از آئینہ نمائے محمد میر میر گویا بندہ، چناں چہ می سراید:

۱؎ نکات الشعرا، ص ۳۱
۲؎ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۶۷
۳؎ مخزن نکات، ص ص ۳۵-۳۶

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف [۱]"

اس شعر سے فتوت کو دھوکا ہوا۔ یہاں میرؔ سے مراد میر تقی میرؔ سے ہے جو سوداؔ کے استاد نہیں ہم عصر ہیں۔

لچھمی نرائن شفیقؔ نے اپنا تذکرہ ۱۱۷۵ھ میں تالیف کیا۔ اس وقت تک میرؔ اور گردیزی کے تذکرے جنوبی ہند میں پہنچ چکے تھے۔ انہی تذکروں سے شمالی ہند کے شعرا کو وہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔ شفیقؔ نے ان دونوں تذکروں سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ شمالی ہند کے شاعروں میں سب سے زیادہ مداح یقینؔ کے ہیں۔ یقینؔ کے بعد جن شاعروں کی عظمت کے وہ معترف ہیں۔ ان میں سودا بھی ہیں۔ سودا کے ترجمے میں انھوں نے لکھا ہے۔

"......صیاد غزالان سخن و سرآمد نکتہ سنجان این فن است۔ شاہین زبان ناقص بیان را کہ پارۂ کمے بیش نیست، چہ جرأت کہ بہ ہوائے توصیف آن ہمائے اوج نازک خیالے، چناں کہ باید، بال کشاید...... وطوطیان ہندوستان شکر بیانی ازان آئینہ دل آموختہ۔ گویا نزاکت مضامین دلچسپ چوں حسن بے یوسف بذاتش حسن اختتام پزیرفتہ...... اگر صریر کلکش را ہمدم اعجاز مسیحا انگارم بجا، کہ دل مردگاں را حلول جان تازہ ازاں متصور۔ واگر چشمۂ خضر در ظلمات الفاظ نوائیش پندارم روا......"۔ [۲]

میر حسنؔ کے والد میر ضاحکؔ سے سوداؔ کا زبردست معرکہ ہوا تھا۔ دونوں طرف سے خوب خوب ہجویں کہی گئی تھیں۔ بلکہ سوداؔ نے جو میر ضاحکؔ کی ہجویں کہی تھیں۔ ان میں بعض ہجویں تو انتہائی فحش ہیں۔ اس سب کے باوجود میر حسن پر اس معرکہ کا کوئی اثر نظر نہیں

۱۔ ریاض حسنی (قلمی) سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد۔ ص ص ۱۲۰-۱۲۱
۲۔ چمنستانِ شعرا، ص ص ۳۲۷، ۳۲۸

آتا۔ انھوں نے کھلے دل سے سوداؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''استادِ استادان کامل وقادر۔ سرآمد شعرائے زماں، درمیدانِ نزاکتِ بیان فکرش چوں مہر گرم تازست، و در عرصۂ لطافت و قدرت و متانتِ سخن بازوے فطرتِ اوچوں تیرراست انداز ست...... استادشعرائے عصر ومقتدائے بلغائے دہر، میدانِ بیان او وسیع وطرزِ معانی او بدیع...... درقصیدہ و ہجوید بیضادارد۔ قصائد عذب ودل آواز و بیان ہجو بلند۔ نظمش طرب انگیز است، مردے ست از مغتنماتِ روزگار، خوش خلق و نیک خود یار باش...... درعلم موسیقی نیز ماہرست وتصانیف بسیار درنفسیہ ہم دارد۔ تاحال مثال او درہندوستانِ جنت نشاں کے برنہ خاستہ [۱]''۔

اسدعلی خاں تمناؔ اورنگ آبادی نے ''گل عجائب'' میں سوداؔ کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر اس تعریف میں انشاپردازی کوزیادہ دخل ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''نکتہ سنج دانش دستگاہ، خوش ذہنِ والا جاہ، دانشورِ یکتا مرزا محمد رفیع سودا۔ درمعنی پروری ومضمون گستری ممتاز است وصافی ذہن وجودتِ طبعش بےانبار،...... [۲]''۔

شورشؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

''شعررا بخوبی تمام می گوید ومضامین تازہ والفاظ بہ فصاحت ورنگین ادامی نماید، غرض قصائد ومثنوی وغزلیات ومخمس ورباعی ہمہ خوب می گوید۔ اگر ملک الشعرائے ریختہ گویان خیال کنم رواست وگر

---

۱ تذکرہ شعرائے اردو، ص ص ۸۲-۸۳

۲ اسدعلی خاں تمناؔ اورنگ آبادی، گل عجائب، اورنگ آباد، ۱۹۳۶، ص ۵۷

پہلوان الشعرا گویم بجاست [۱]"۔

مولوی قدرت اللہ شوق رام پوری نے لکھا ہے۔

"از اکمل و اشہر شعراے ریختہ گوے ہندوستان ست در ریختہ گوئی عدیل و نظیر خود در خطۂ ہندوستان نداشت و دم استادی و ملک الشعرائی می زند۔ در غزل و مثنوی و رباعی یکتاے وقت خود بودہ، خصوصاً در قصیدہ گوئی بے مثال و بے عدیل بود [۲]"۔

حسین قلی خاں عاشقی نے لکھا ہے کہ تمام ریختہ گو انھیں امامِ فن اور پیغمبر سخن مانتے ہیں۔ قصایدِ سودا کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ عرفی کے قصیدوں سے پہلو مارتے ہیں۔ انھوں نے سودا کے ذکر میں لکھا ہے۔

"...... جمیع ریختہ گویانِ ہندوے را امام ایں فن و پیغمبر سخن می دانستند۔ اگر چہ جملہ طرز کلام را استادی بود حاوی الا در مدح و قدح کہ مراد از ہجو و قصیدہ باشد اعجاز بکار بردہ و قصائد ریختہ بر قصائد ملّا عرفی شیرازی پہلو بہ پہلو گفتہ...... مثل او کسے ریختہ گو را ایں مرتبہ دست ندادہ۔ و کسانیکہ دم ریختہ گوئی می زنند و زباں بایں دعوے می کشایند خوشہ چین و راہ نمودہ اویند کہ بر آں قدم می نہند [۳]"۔

شیخ محمد وجیہہ الدین عشقی نے اپنے تذکرے میں سودا کی مدح میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ اُن کا بیان ہے۔

"......مردے مغتنم الوجود، از یکہ تازان میدان سخنوری بود، تا حال در ہندوستان مینونشان چنیں شاعرے زبردست در فنِ ریختہ پیدا نگردیدہ و چنیں صاحب جوہرے از کتم عدم سر بہ عرصۂ شہود نکشیدہ طبع

---

۱ دو تذکرے (شورش) ص ۳۷۹
۲ تکملۃ الشعرا (قلمی) ص ۲۹۶
۳ نشتر عشق (قلمی) ص ۶۶۶

بلند آہنگش کمند فکر را بہ کنگرہ کیوان رسانیدہ وبنائے ریختہ را چوں دیوار ریختہ اوج استحکام بخشیدہ۔ بے شائبہ ریب اگر اوراسر آمد ایں فن خوانم رواست و اگر قصائد اوراہم پلہ قصیدہ مرصع کہکشاں دانم بجا۔ دیوانش مطبوع طبایع جمیع سخن سنجان رنگین کلام است وکلامش ورد زبانِ ہر خاص وعام ۱؎۔

شاہ حمزہ نے سودا کو دادِ سخن ان الفاظ میں دی ہے۔

''...... غزل ومثنوی وقطعہ ومخمس ورباعی ہمہ خوب می گوید۔ علی الخصوص در قصیدہ گوئی بازار سحر سامری می کشد وقصائدش باقصائد عرفی پہلوی زنند ۲؎''۔

گلشنِ سخن کے مولف مردان علی خاں مبتلا اُن کی مدح میں رقم طراز ہیں۔

''اعجوبۂ زماں وسرخیل ریختہ گویانِ ہندوستان بودہ، در جمیع فنونِ نظم، خاصہ در قصائد دقت بسیار بکار بردہ، برزبان نکتہ سنجان بہ مسلم الثبوتی مشہور...... الحق مرتبہ ریختہ گوئی بجائے رسانیدہ کہ شاہباز بلند پرواز فکرت بہ پیرامون اوجی تواند پرید...... ۳؎''۔

حکیم قدرت اللہ قاسم کو بھی سودا سے بہت عقیدت ہے۔ وہ ترجمۂ سودا میں لکھتے ہیں۔

''...... وے شاعرے بود فصاحت بیان شیریں مقال بلاغت نشاں، عدیم المثال معنی یاب فصاحت آئین نکتہ پیرا بلاغت آگیں فارس میدان سخنوری شہسوار مضمار ہنر گستری عندلیب خوش نوائے گلستانِ سخن طرازی، بلبلِ دبستان سرائے بوستان نکتہ پردازی قادر، ہر گونہ سخن ماہر بیشترے از اصول فن جم غفیرے از زبان دانان اہل

۱؎ دو تذکرے (عشقی)، ص ۳۸۰
۲؎ فص الکلمات (قلمی) ورق ۱۴۱ الف
۳؎ گلشن سخن (قلمی) ورق ۵۶ ب

سخن استفادہ ......نمودہ از گفتار شعر خوبی اشعارش کیفیتے دارد کہ
سامعہ نکتہ پرداز صاحب فراست داند طرز کلام صحت انتظامش
حلاوتے دارد کہ ذائقہ طبع سخن سنج صاحب گفتار شناسد...... [۱]"۔

مصحفی نے سودا کے ذکر میں اُن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف تو کیا ہے۔ لیکن کچھ ٹیڑھی ترچھی باتیں بھی کی ہیں۔ اسی وجہ سے مصحفی اور شاگردانِ سودا میں زبردست معرکہ ہوا تھا۔ جس کا تفصیلی ذکر "ہجو گوئی" کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ مصحفی نے جہاں سودا کو صائب وقت اور خاقانی لکھا ہے وہاں اُن پر جہل اور سرقہ کا بھی الزام لگایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شیر بیشۂ سخندانی مرد میدان پہلوانی...... در عصر خویش سر آمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ، بعضے اورا دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند، بعضے بہ سبب دریافتِ اغلاطِ صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند، غرض ہر چہ بود در روانی طبع نظیر خود نداشت۔ غزلہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و ہجوہا و مثنویہائے متعددہ وغیر ہم نگاشتہ۔ خامۂ خیالش بر صفحہ روز یادگار است۔ دیوانش بہ فرنگ و صفاہان رسیدہ، دیگرے ایں شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در مثال بندیٔ اشعار غزل صائب وقتش گویم بجا است و اگر در علو مراتب معانی ابیاتِ قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اوّل نظم قصیدہ در زبانِ ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید پیرو تتبعش خواہد بود...... و بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آنہا نیز قادر۔ غرض کہ شخص جامع الکمالات بود ہر جا کہ می رفت عزت و حرمتِ تمام می یافت [۲]"۔

شاید ہی کوئی تذکرہ نگار ایسا ہو جس نے سودا کی قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کی تعریف نہ کی ہو۔ بلکہ بعض مورخین نے بھی سودا کے اس فن کی تعریف کی ہے۔ سلطان علی حسینی صفوی نے

---

۱ مجموعہ نغز، ۱، ص ۳۰۴
۲ تذکرہ ہندی، ص ص ۱۲۵-۱۲۶

اپنی تاریخ ''معدن السعادت'' میں لکھا ہے۔

''.....شعر ہندی خوب می گفت، خصوصاً مدح و ذم کہ دراں باب یگانۂ روزگار گشتہ آخر رفتہ رفتہ بدرجہ ملک الشعرائی رسید [۱]''۔

سید احد علی خاں یکتا نے بھی سودا کی قصیدہ گوئی کے بارے میں وہی کچھ کہا ہے جو مصحفی نے لکھا تھا۔ ان کا بھی خیال ہے کہ اوستادانِ فارسی کے طرز پر اردو میں قصیدہ نگاری کی بنیاد سودا نے رکھی تھی۔ یکتا سودا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''......رفتہ رفتہ لطافت ایں صناعت بہ تحقیق و تدقیق افصح الفصحا و ابلغ البلغا، خاقانی عصر، فردوسی زماں، انوری دہر، عرفی دوراں، وحید زمانہ، محقق یگانہ، ملک الشعراے ہند، سلطان ہر ظریف و رند...... بہ مرتبۂ کمال رسید۔ تا آنکہ شانِ لطافت و صفاے آں بہ مذاق متاملان منصف برشوکت فارسی چربیدہ۔ چراکہ صورت قصائد را بہ طرز اوستادانِ فارسی اوّل کسے کہ بزبانِ ہندی بہ لوح ہستی حسن جلوۂ دادہ، ہمیں نقاش معانی بودہ است...... بالجملہ آنچہ از محققان بہ تحقیق پیوستہ اینست کہ ببصرئ جواہر کلمات و نقادئ نقود الفاظ، از مردود و مقبول و متین و سخیف و مروج و متروک، بہ قید کثرتِ محاورہ صحتِ لغت کہ برزبان شرفا و نجبا و اعزہ جاری باشد و تالیفِ شعر بہ متانت تمام بہ طور قصائد اساتذہ از فارسی گویان، تعلق بہ مرزا محمد رفیع دارد [۲]''۔

یکتا کو سودا سے بہت زیادہ عقیدت ہے۔ انھوں نے دیباچے میں بھی سودا کا ذکر کیا ہے۔ اوپر کا اقتباس دیباچۂ دستور الفصاحت ہی سے لیا گیا ہے۔ تذکرے کی ابتدا سودا کے ترجمے سے ہوتی ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ شاید سودا ہی کی تعریف کی ہے [۳]''۔

کچھ تذکرہ نگاروں نے غزلوں سے زیادہ سودا کے قصیدوں کی تعریف کی ہے۔ جس کا

---

[۱] سلطان علی حسینی صفوی، معدن السعادت (قلمی) کلکتہ، ۴، ورق ۳۴۶ ب

[۲] دستور الفصاحت، ص ص ۶-۷

[۳] ملاحظہ ہو۔ دستور الفصاحت، ص ص ۱۴-۱۸

مطلب ہے بعض ناقدین سوداؔ کے قصیدوں کو غزلوں سے بہتر سمجھتے تھے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کی رائے مختلف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''...... بافنونِ شاعری مناسبت تام دارد و براصناف سخن قدرت تمام وآنکہ بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرفیست مہمل بہ زعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است وقصیدہ اش بہ از غزل اگر گوئی کہ غزل از اشعار پُر کن مملو است وقصیدہ ازاں خالی زیادہ ازیں چہ تواں گفت کہ قباحت ایں تحقیق پیر نظارگیاں دیوانش خالی و دخلۃ السر آنست کہ قدما را مانند فصحاے متاخرین پیرامون خاطر و جاگزینِ دل نہ ایں بود کہ ہر شعر دلپذیر آید و ہر بیت خاطر نشیں لہٰذا در کلام ایناں رقص الجمل واقع شدہ، چہ در قصیدہ و چہ در و چہ غزل مع انہم اوّلون والموجدون والا خاطر بہ جمیع فنون ہا معتذر للمتقدمین وللہ در من قال العلم للمتاخرین پس بنا بریں مقدمات بریں بزرگان وار و گیر زنہار سزاوار نیست [۱]''۔

کچھ تذکرہ نگاروں نے سوداؔ کی زبان کی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً عبدالقادر چیف رام پوری نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔

''مرزا رفیع السوداؔ بہ قصیدہ گوئی ومضامین تازہ درمدح وقدح سرآمد روزگار خود بود، مگر پابندِ صحتِ الفاظ زبانِ دیگر نبود، ''افتادا'' بجاے آفتابہ و ''محل'' بہ سکون دوم بجاے متحرک و ''مبرہن'' بہ سکون باو فتح را، بجائے فتح باو سکون را آوردہ است [۲]''۔

کچھ اسی قسم کے اعتراضات انشاؔ نے بھی کیے ہیں۔ وہ دریائے لطافت میں لکھتے ہیں۔

''...... وملک الشعراے زبانِ اردو مرزا محمد رفیع متخلص بہ سوداؔ در

---

۱ گلشنِ بے خار، ص ص ۹۹-۱۰۰

۲ عبدالقادر چیف رام پوری، روزنامچہ عبدالقادر (قلمی) رام پور، ورق ۴۷ الف

قصیدہ لپک و چھپک لفظ کٹک را بہ معنی لشکر برائے ضرورت قافیہ ایراد نمودہ و کٹک ہرگز لفظِ اردو نیست ...... و لفظ تھوڑا کہ بہ معنی اندک آید بارائے ہندی صحت دارد و ہم چنیں تھوڑی کہ مونث آں باشد مرزا مذکور خلاف بازابستہ۔ یا گوری کہ بہ معنی چیز سفید روشن مونث باشد قافیہ کردہ شعر:

ساقِ سیمیں کو ترے دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

و باداو مجہول بغیر ہا گفتن ایں لفظ از قبیل تصرف ایں صاحبان است برائے قافیہ شعر خود، والا در اصل تھوڑا و تھوڑی باشد مثل ہاتھ بہ معنی دست کہ قافیہ ساتھ باشد، در اصل آں ہاء در تاء پنہاں است ایں صاحبان قافیہ بات وہیہات سازند و ہاء را خلاف تلفظ جمہور کنند[1]"۔

سعادت یار خاں رنگین نے بھی سودا کی زبان پر اعتراضات کیے ہیں۔ بلکہ انھوں نے بھی "گوری گوری" اور "تھوری تھوری" والے شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مجالس رنگین میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ رنگین بنارس میں نواب نصیر الدین خاں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس وقت کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ بقول رنگین:

"...... ہر یک در سخن گوئی دستگاہ خوب داشت، نواب موصوف ذکر شاعری مرزا رفیع بر آوردند و تعریف می کردند شخصے در آں میاں کہ از بندہ کدورتے داشت سخن تا بایں جا رسانید کہ مثل اوشاں ممکن نیست کہ پیدا شود گفتم کہ شاعرانِ سابق و حال در دِسر ناحق پیدا کردہ اندو گفت:

---

1. انشاء اللہ خاں انشا، دریائے لطافت، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۱۶ء، ص ص ۳۲-۳۳

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہا کردند درفتند

گفتم ایں راایں طور رشنیدہ ام۔

حریفاں باد ہا خوردند و ہستند
تہی خم خانہا کردند و مستند

گفت کجا اند چوں مکرر تکرار کرد ایں شعر سعدی خواندم

جہاں را ندارند بے کتخدا
یکے چوں رود دیگر آید بجا

گفت ایں درحق پادشاہاں ست گفتم ایں درحق شاعراں باشد۔

ہنوزاں ابر رحمت دُر فشاں ست
خم وخم خانہ بامہر و نشاں ست

گفت در کلام اوشاں غلطی محاورہ وخلل الفاظ اصلاحیست و لہجہ اردوے معلٰی را جلا و در اند و ملک الشعرا گذشتہ وحکم آیت وحدیث دارد دور اشعار ہائے دیگر شاعراں چند نقصان ست، گفتم مقدمۂ شاعری بسیار مشکل ورطب و یابس درکلام ہمہاست:

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضہ ہمہ انگشتہا یک دست نیست

گفت ایں سوائے مرزا رفیع درحق شاعراں دگرست۔ ازیں سخن تاب نیاوردم وگفتم کہ مطلع ومقطع غزل اوشاں یاددارم:

نگر آباد ہیں بسے ہیں گانو
تجھ بن اجڑے پڑے ہیں اپنے بھانو
قیس و فرہاد کا نہیں کچھ ذکر
اب تو سودا کا باجتا ہے نانو

قطع نظر از لفظ نگر و تجھ بن و بھانو قافیہ مقطع را باید دید کہ نام رانا نو گفتہ اند پس ایں کلام عربی وترکی نیست کہ در فہم نیاید زبان روزمرہ است گفت کہ اگر در دیوان در یک غزل از غلطی سہو شدہ، گفتم شعر دیگر یاد دارم:

ساقی سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری
شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

گفتم برقافیہ غور باید کرد گفت در زبان بھا کاڑے را رے می گویند و بدل می کنند گفتم دروغ گورا حافظہ نہ می باشد او شاں در زبان ریختہ غزل می گفتند یا در بھا کا مشق می کردند مطلع دیگر یاد دارم:

عاشق تو نامراد ہیں بس اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کرکے ہم

گفتم برقافیہ ایں غور باید کرد[1]"۔

یہاں تو رنگین نے اشعار سودا پر صرف اعتراضات کیے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو سودا سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ انھوں نے امتحان رنگین میں شاعروں کی چار قسمیں بتائی ہیں۔

1۔ مجالس رنگین، ص ص ۴۸-۵۰

۱- شاعر

۲- استاد

۳- ملک الشعرا

۴- علامہ

اردو میں شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ درد، میر، انشا، میر سوز، جرأت، مصحفی، میر حسن، نصیر اور ناسخ استاد ہیں۔ کیوں کہ یہ سب صاحب طرز ہیں۔ سودا ملک الشعرا ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک سے زیادہ طرز پر قادر ہیں اور علامہ صرف رنگین ہیں کیوں کہ (۱) انھوں نے تمام یعنی ستائیس اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ (۲) سترہ زبانوں میں شعر کہے ہیں (۳) اور گیارہ بحروں میں مثنویاں کہی ہیں [1]۔ تقریباً اسی قسم کے دعوے مصحفی نے کیے ہیں۔ انھوں نے تذکرہ ہندی میں سودا کو غزل میں صائب اور قصیدے میں خاقانی کہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے عقدِ ثریا میں انھیں "مردِ کم علم [2]" بتا چکے ہیں۔ نظم میں بھی کبھی انھوں نے سودا کی فوقیت کو تسلیم کیا ہے اور کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کا قصیدہ سودا سے نغز تر ہے۔ ایک قصیدہ میں کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سودا نہیں اس عہد میں ہے ہے
یہ حرف بھی کیا محض غلط رکھتا ہے تشہیر
سودا جو نہیں ہے تو نہ ہو میں تو ہوں بیٹھا
سودا کی طرح مسند معنی پہ بہ توقیر
پر دیدۂ انصاف زبس کور ہیں مجھ کو
دردی کش سودا بھی سمجھتے نہیں بے پیر

---

۱ امتحانِ رنگین بحوالہ سعادت یار خاں رنگین، ص ص ۳۳۵-۳۳۶
۲ عقدِ ثریا، ص ۳۲

سودا سے قصیدہ میں کہا نغز ہی نا
کچھ اس کے سوا اور تو میری نہیں تقصیر ۱؎"

ایک قصیدے میں یہ شعر بھی ہے۔

سودا تو یہاں کھیت رہا آدھی ہی رہ میں
طے ہو نہ سکا اس سے بھی صحرائے طبیعت

ایک اور قصیدہ میں خود کو میرؔ اور مرزا پر ترجیح دی ہے۔

تلتا میں اس کے پلے میں ہوتا گر انوری
مرزاؔ و میرؔ سے مجھے کیا ہے برابری

مصحفی نے تذکرہ ہندی میں جو سوداؔ کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے۔

"ایسے استاد مسلم الثبوت کو میاں مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ بہ سبب عدم دریافت اغلاطِ صریح دارد خیر ہر چہ بود در روانی طبع نظیر نداشت سعدی کیا خوب کہتا ہے:

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن
تابماند نام نیکت یاد گار

چند محاورے ٹھیٹھ ہندی کے جو اس کے کلام میں واقع ہیں سب ان کا اور اہلِ زبانِ اردو کے ہیں۔ اور کتنے روز مرے ایسے ہیں کہ ہنوز دلّی والے وہی بولتے ہیں چناں چہ لفظ شہران کی السنہ پر اب بھی مذکر ہے۔ اس صورت سے الزام انکا متقدمین پر عائد نہیں

۱؎ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ص ۱۶۱-۱۶۲

ہو سکتا[1]"۔

شاید آبِ حیات پہلا تذکرہ ہے جس میں کلام سودا پر اتنی تفصیل سے تنقید کی گئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے تحقیق میں ضرور بے شمار غلطیاں کی ہیں لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ وہ ایک باکمال سخن فہم تھے۔ آبِ حیات کے تمام صفحات ان کے فہم و ادراک اور تنقیدی شعور کا ثبوت ہیں۔ وہ سودا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "واسوخت، مخمس، ترجیع بند، مستزاد، قطعہ، رباعیاں، پہیلیاں وغیرہ اپنی اپنی طرز میں لاجواب ہیں۔ خصوصاً تاریخیں بے کم و کاست ایسی برمحل و برجستہ واقع ہوئی ہیں کہ ان کے عدم شہرت کا تعجب ہے۔ غرض جو کچھ کہا ہے اسے اعلیٰ درجۂ کمال پر پہنچایا ہے...... کُل اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی...... ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ، جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں جن سے ان کا کلام جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طمنچے کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ چناں چہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ شعر مزا ہی نہیں دیتا۔ خیالات نازک اور مضامین

---

[1] تذکرہ معرکہ خوش زیبا (قلمی) لکھنؤ۔

تازہ باندھتے ہیں۔ اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے ان کے ہاں ہیں مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ۔ رنگینی کے پردے میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے [1]"۔

مولانا حالی نے سودا کے ایک شعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"......نظیری کا شعر ہے:

بوے یار من ازیں ست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا کہتے ہیں:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس میں شک نہیں کہ سودا نے اپنے شعر کی بنیاد نظیری کے مضمون پر رکھی ہے۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اس کا ترجمہ کردیا ہے۔ لیکن بلاغت کے لحاظ سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی ممکن ہے کہ عاشق از خود رفتہ ہوجائے لیکن ساغر شراب کو دیکھ کر معشوق کی نشیلی آنکھ کے تصور سے بے خود ہوجانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس کے سوا "از کار شدم" میں وہ تعمیم نہیں ہے جو اس میں ہے کہ "چلا میں" نہیں معلوم کہ آپ سے چلا یا دین و دنیا سے چلا۔ یا جگہ سے چلا یا کہاں سے چلا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "چلا میں" ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مدہوش و بدحواس ہوکر گرنے کو ہوتا

---

[1] آب حیات، ص ص ۱۵۷-۱۵۸۔

ہے۔ اور ''از کار شدم'' میں یہ بات نہیں ہے۔ معطل ہونے۔ معزول ہونے، اپاہج اور نکمے ہونے کو بھی ''از کار شدم'' سے تعبیر کرتے ہیں[1]''۔

لالہ سری رام لکھتے ہیں:

''شکوہِ الفاظ، بلندیِ مضامین، رفعتِ خیال، نادر استعارات، بے بدل تشبیہات جس قدر سودا کے دفتر میں ہیں اُس رنگا رنگی سے میر کا کلام محروم ہے۔ مرزا زبردست الفاظ کے سرمایہ دار ہیں۔ جن کی مدد سے وہ مبتذل اور پیش پا مضامین کو بھی رنگینیِ الفاظ سے مرصع بنادیتے ہیں اور معمولی شعر میں بھی انتہا کا جوش پیدا کر دیتے ہیں...... اردو میں قصیدہ گوئی کا موجد اگر کسی کو کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف میرزا ہی کی ذات ہے۔ جن کے زورِ قلم نے عالمِ سخن میں دھاک بٹھا دی......[2]''۔

رام بابو سکسینہ نے ''تاریخ ادبِ اردو'' میں لکھا ہے:

''مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا۔ اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا.......... شاعری کی صناعیوں سے اس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ فارسی سے بہ کثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرزِ تخیل اور تلمیحات زبانِ اردو میں داخل کیے.......... اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کیے۔ جس میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آئندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا...... ان کے اردو قصائد بڑے بڑے فارسی

[1] خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، علی گڑھ، ص ص ۱۶۱-۱۶۲
[2] خم خانہ جاوید، ۴، ص ۲۶۴۔

استادوں کے قصائد کے ٹکّر کے ہیں اور بعض تو عرفیؔ و خاقانیؔ کے معرکتہ آلارا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکتِ خیال اور طرفگی مضامین میں وہ اکثر اہلِ عجم سے گوے سبقت لے گئے ہیں [۱]"۔

مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ نے قصایدِ سوداؔ کی تعریف کی ہے۔ لیکن ان پر کچھ اعتراضات بھی کیے ہیں۔ جن کی بنیاد مولانا حالی کے خیالات پر معلوم ہوتی ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے قصیدے میں مبالغہ کو ناپسند کیا ہے۔ تنہاؔ لکھتے ہیں۔

"......سوداؔ پہلا شخص ہے جس نے قصائد کو درجۂ تکمیل پر پہنچایا۔ اس سے پیشتر بھی دیگر شعرا نے قصائد لکھے لیکن سودا نے جس عمدگی اور خوبی کے ساتھ اپنا اظہارِ خیال کا ہے۔ اور دشوار قوافی اور مشکل ردیفوں میں جس آسانی کے ساتھ اپنے مطلب کو بیان کیا ہے اس کی نظیر متقدمین شعرایے اردو کے کلام میں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سودا کے قصائد میں جہاں خوبیاں ہیں، نقائص بھی ہیں اور مبالغہ جو بدقسمتی سے شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے وہ ان کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تاہم زبان پر قدرت اور ذہن رسا کی طباعی اور برّاقی ان سے ہویدا ہے...... نقائص سے قطع نظر آپ کے قصائد میں خوبیاں بھی بے حد ہیں۔ زورِ کلام، جوش اور روانی ایک دریاے زخار کی طرح آپ کے قصائد میں موجزن ہیں...... [۲]"۔

مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی نے لکھا ہے کہ سوداؔ ایسے مسلم الثبوت تھے کہ جن پر فنِ شاعری کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ ان کی ہمہ گیری نے کسی صنفِ سخن کو نہیں چھوڑا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مرزا جب قصیدہ پیش کرتے ہیں تو شکوہِ الفاظ کے ڈنکے بجا دیتے

۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء، ص ص ۱۱۲-۱۱۵

۲۔ محمد یحییٰ تنہا، مرآۃ شعرا، لاہور، ص ص ۱۶۹-۱۷۰

ہیں۔ غزل سناتے ہیں تو دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ مرثیہ پڑھتے ہیں تو سامعین کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ ہجو کرتے ہیں تو حریفوں پر ہستی تنگ کر دیتے ہیں۔ اردو شاعری اس جامعیت کا کوئی دوسرا شاعری پیش نہیں کرسکتی۔ بہر حال مرزا سودا اُن مسلم الثبوت اساتذہ میں ہیں جن پر فنِ شاعری کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

مرزا کی ہمہ گیری نے کسی صنفِ سخن کو نہیں چھوڑا۔ قصیدے، غزلیں مثنویاں، رباعیاں، قطعے، مستزاد، تاریخیں، پہیلیاں، ترجیع بند، مخمس، مرثیے، ہجویں سب کچھ کہیں اور خوب کہیں [1]''۔

رشید احمد صدیقی نے اردو میں طنز و مزاح کی تاریخ کی ابتدا سودا سے کی ہے۔ انھوں نے سودا کی ہجو گوئی کو ان کی باقی تمام شاعری پر ترجیح دی ہے۔ رشید صاحب لکھتے ہیں۔

''سودا کو اردو ہجو و ہجا میں نہ صرف فضل تقدم حاصل ہے بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے، لیکن جیسا کہیں عرض کیا گیا ہے بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔ تاہم اس خارستان میں بھی طنز و مضحکات کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا ہمیں پوری طرح معترف ہو جانا پڑتا ہے۔

سودا نے شعر و شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کو جو خصوصیت ایک ہجو گو ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے وہ سب پر فوق ہے اور یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے [2]''۔

---

[1] محمد مبین کیفی چریا کوٹی، جواہرِ سخن، الٰہ آباد، ۱۹۳۵ء، ۲، ص ص ۲۴۳

[2] طنزیات و مضحکات اردو، ص ۴۶

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

"......سودا میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک بلند پایہ ہجو گو کے لیے ضروری ہیں۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ بقول آزاد ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے۔ لیکن اس زندہ دلی کے باوجود جب وہ برہم ہوتے تو پھر ان کی برہمی کی انتہا نہ ہوتی۔ ان کی برہمی سے اُن کے معاصرین آشنا تھے۔ اور اس سے خائف رہتے تھے کیوں کہ ان کے ترکش میں طنز کے ہزاروں تیر تھے جن کی چوٹ بے پناہ تھی۔ لوگ اُن سے خائف رہتے تھے لیکن وہ کسی سے ہراساں نہ ہوتے۔ ان کا تخیل تیز رو اور بلند پرواز تھا وہ ایک لمحہ میں بوقلموں تصویریں مرتب کر سکتے تھے۔ ایک سے ایک رنگین و مضحکہ خیز............[1]"۔

شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ سودا کے ہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے ان کی ہجوؤں میں مضحکہ، پھکڑ پن، گالی گلوچ سب ہی کچھ ہے۔ انھوں نے ہجو کے ذریعے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ شوکت صاحب لکھتے ہیں۔

"سودا اردو کے پہلے طنز نگار شاعر ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے۔ سودا کی طنزیہ شاعری کا تمام تر سرمایہ ان کا ہجویہ کلام ہے۔ ویسے ہجو بھی طنز ہی ہے لیکن ہجو اور طنز میں ایک بنیادی فرق ہے۔ طنز صلاح و اصلاح ہے اور ہجو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا۔ سودا کے ہجویات اسی رنگ میں ہیں۔ ان میں استہزا، تمسخر مضحکہ، پھکڑ پن گالی گلوچ سبھی کچھ ہے۔ ان میں سودا نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ اُن کا مقصد اصلاح نہیں۔ اس لیے ان کو طنز نہیں کہا جا سکتا۔

---

1. نقوش، طنز و مزاح نمبر، ص ۵۳۔

اس میں کسی کو رسوا کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن سودا کی ہجویات دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی فرد واحد مثلاً فاخر مکین یا میر ضاحک کی خبر لی گئی ہے۔ یہ تمسخر کی حد میں آتی ہیں۔ چند ایسی بھی ہیں جن میں شکایتِ روزگار یا اہلِ روزگار ہے یا جن میں پورے معاشرے یا اس کے کسی طبقے کو ہدف مطاعن بنایا گیا ہے۔ ان میں طنز ہے اور بڑا گہرا اور شوخ قسم کا۔ اور شاید سودا کے اسی کلام کی وجہ سے اس کو اردو کے طنز نگاروں میں شمار کیا گیا ہے [۱]"۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر اور سودا کے شہر آشوبوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"......اس لحاظ سے میر اور سودا کے شہر آشوب اپنے زمانے کی سیاسی فضا کی کامیاب عکاسی کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جزئیات میں مبالغے کا رنگ ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ مگر واقعات اور حادثات کی عام تصویر اصل کے قریب قریب ہے۔ سودا کا شہر آشوب جوش کے اعتبار سے میر کے شہر آشوب سے افضل ہے۔ سودا کے شہر آشوبوں کا میدان وسیع تر ہے۔ اثر کو دیرپا اور گہرا کرنے کی خاطر سودا نے جزئیات میں رنگارنگی پیدا کی ہے اور اثر آفرینی کے ذریعے پڑھنے والے پر حالات کا وہی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے خود شاعر کا دل بھرپور ہے۔ میر کے ہاں سادگی اور خلوص ہے مگر میدان قدرے تنگ اور جزئیات کم ہیں تاہم میر بھی اپنے طور پر اس شہر آشوب میں کامیاب ہوئے ہیں۔

غالباً یہ خیال غلط نہ ہوگا کہ اردو میں شہر آشوب کی صنف کو زندگی اور بقا بخشنے والے میر اور سودا ہی تھے۔ ان سے پہلے اس صنف میں جو کچھ لکھا گیا اس میں قوت اور جان نہ تھی۔ ان

---

[۱] شوکت سبزواری، اردو شاعری میں طنز، علی گڑھ میگزین، طنز وظرافت نمبر، ۱۹۵۳ء ص ۳۵۔

کے بعد جو کچھ اس موضوع پر تصنیف ہوا وہ بیشتر نقالی تھی[1]"۔

سودا کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں جو مقبولیت اور شہرت اپنی زندگی میں حاصل ہوئی تھی۔ وہ آج تک باقی ہے۔ سودا نے بیشتر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے وہ امام اور خاتم ہیں۔ ممکن نہیں کہ ان اصناف سخن پر کتابیں لکھی جائیں اور ان میں سودا پر علاحدہ باب قائم نہ کیے جائیں۔ بلکہ شمالی ہند میں سب سے پہلے سودا ہی کا ذکر آتا ہے۔

---

[1] بحث ونظر، ص۵۹

سودا کی تصانیف

سودا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے
آفاق میں خاقانی ثانی تو ہے
گو نطق کا ہر چند نہیں تو خالق
پر نطق کا خلاقِ معانی تو ہے

نثر

ا- تذکرہ

قدرت اللہ قاسم واحد تذکرہ نگار ہیں۔ جن کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ سودا نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ قاسم نے مجموعہ نغز میں دو مقام پر اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو خانِ آرزو کے ترجمے میں ایک شعر کے بارے میں لکھا ہے۔

"مرزا محمد رفیع سودا ایں بیت را در تذکرہ خود بایں طور ثبت نمودہ [1]"۔

دوسرے سعدی کے ترجمے میں قاسم نے لکھا ہے۔

"......مظنہ بیشترے از سخن پیرا خصوص سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا رفیع سودا نظر بر اتحاد تخلص آنکہ ایں سعدی ہموں سعدی شیرازی است قدس سرہ کہ وارد دیار دکن شدہ و شعر ریختہ از طبع وقاد آں قدوہ متغزلان ریختہ چناں چہ در تذکرۂ خود اشعار ایں سعدی دکنی رائغی اللہ عنہ بہ شیخ شیراز علیہ الرحمۃ والغفران نسبت نمودہ [2]"۔

ان بیانات سے یہی پتا چلتا ہے کہ سودا نے تذکرہ لکھا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی

ا مجموعہ نغز، ا،ص ۲۹۸

۲ ایضاً

اور تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ جب کہ یہ ممکن نہیں تھا کہ سودا تذکرہ لکھتے۔ اور ہم عصر تذکرہ نگار اس کا حوالہ نہ دیتے۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں۔ ''میرا خیال ہے کہ سودا نے تذکرہ لکھا ہی نہیں۔ اس کے حق میں جو شہادت ہے وہ بالکل ناکافی ہے [۱]''۔ مجھے قاضی صاحب کے خیال سے بالکل اتفاق ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سودا نے کسی بیاض میں کچھ شاعروں کے اشعار نقل کیے ہوں۔ جو قاسم کے ہاتھ آ گئی۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ سودا جیسا مقبول و مشہور شاعر تذکرہ لکھے اور قاسم کے علاوہ کوئی اور اس کا ذکر تک نہ کرے۔ قاسم سے بعد کے کچھ تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ تو ان کا ماخذ مجموعہ نغز ہی ہے۔ کیوں کہ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے یہ تذکرہ خود دیکھا ہے۔

۲- شعلۂ عشق

تذکرہ کی طرح شعلۂ عشق کا وجود بھی مشکوک ہے۔ کیوں کہ غالباً مولانا محمد حسین آزاد واحد تذکرہ نگار ہیں۔ جو ہمیں بتاتے ہیں کہ سودا نے میر کی مثنوی شعلۂ عشق کو نثر میں لکھا تھا۔ سودا کی اردو نثر پر رائے دیتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں۔

> ''مرزا کی زبان کا حال نظم میں تو سب کو معلوم ہے کہ کبھی دودھ ہے کبھی شربت۔ مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثر اردو ابھی بچہ ہے۔ زبان نہیں کھلتی۔ چناں چہ شعلۂ عشق کی عبارت سے واضح ہے کہ اردو ہے مگر مرزا بیدلؔ کی نثر فارسی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مذکور اس وقت موجود نہیں۔ لیکن ایک دیباچہ میں انھوں نے تھوڑی سی نثر بھی لکھی۔ اس سے افسانہ مذکور کا انداز معلوم ہو سکتا ہے [۲]''۔

۱۔ قاضی عبدالودود، دلّی کا دبستانِ شاعری، ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۸

۲۔ آبِ حیات، ص ۱۵۷۔

ایک اور مقام پر آزاد نے اس مثنوی کا ذکر کیا ہے:

''میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے۔ افسوس کہ اس وقت موجود نہیں [1]''۔

میرا خیال ہے کہ آزاد دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے۔ بلکہ انھیں غلط فہمی ہوئی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ سودا کی اس نثر کا وجود مشکوک ہے۔ کیوں کہ وہ نثر کیسی بھی ہوتی۔ لیکن اہلِ اردو کے لیے بہت اہم تھی۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ ہم عصر تذکرہ نگار اسے نظر انداز کر دیتے۔

۳- دیباچہ سبیل ہدایت

مثنوی سبیل ہدایت پر سودا نے ایک مختصر سا اردو دیباچہ بھی لکھا تھا۔ جو مثنوی کے درمیان میں ہے۔ اس نثر کی اہمیت یہ ہے کہ اردو نثر کے بالکل ہی ابتدائی نمونوں میں ہے۔

تنقید

۱- عبرت الغافلین

اس رسالے پر تفصیلی بحث ہجو گوئی کے باب میں ''سودا اور مکین'' کے تحت کی گئی ہے۔

۲- سبیل ہدایت

اس مثنوی پر بھی ہجو گوئی کے باب میں ''سودا اور میر تقی'' کے تحت بحث کی گئی ہے۔

---

[1] آبِ حیات، ص ۲۳۔

کلیاتِ سودا

سودا کے کلیات میں غزلیں، قصیدے، ہجویں، شہر آشوب، مثنویاں مرثیے، رباعیاں، قطعے، پہیلیاں، ایک واسوخت اور فارسی کلام موجود ہے۔ کلیاتِ سودا کے قلمی نسخے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ لیکن بیشتر نسخوں میں الحاقی کلام شامل ہوگیا ہے۔ البتہ دو نسخے ایسے ہیں جن میں الحاقی کلام بالکل نہیں۔ ایک تو آزاد لائبریری علی گڑھ کے حبیب گنج سیکشن کا نسخہ (نسخۂ حبیب) اور دوسرا انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ جسے رچرڈ جونسن کو پیش کیا گیا تھا۔ (نسخۂ رچرڈ جونس)۔

نسخۂ حبیب

کلیاتِ سودا کے اب تک جتنے بھی قلمی نسخے ملتے ہیں۔ اُن میں سب سے قدیم نسخہ یہی ہے۔ اس میں کلام کی ترتیب اس طرح ہے۔

۱۔	قصیدے	۲۶
۲۔	غزلیں	۲۳۳
۳۔	مخمس	۱۲
۴۔	ہجویں	۷
۵۔	رباعیاں	۱۱
۶۔	مطلعات	۱۲

ترقیمے کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ صادق مرزا نے حافظ نظارت خاں کی فرمائش سے اس نسخے کی کتابت اُس وقت کی تھی جب دہلی میں شاہ دڑانی اور مرہٹوں کے حملے ہو رہے تھے۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۷۴ھ کو اس کی کتابت مکمل ہوئی۔

نسخۂ رچرڈ جونسن

یہ وہ نسخہ ہے جسے سوداؔ نے رچرڈ جونسن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ محترمی قاضی عبدالودود نے ماہنامہ "صبا" (جلد ۵، شمارہ ۱۱، ۱۲) میں لکھا ہے۔ "یہ وہ نسخہ ہے جو سودا نے رچرڈ جونسن، نائب ریذیڈنٹ اودھ کو اپنی موت کے دو چار سال قبل دیا تھا"۔ شاید قاضی صاحب قبلہ کی نظر سے وہ قطعہ تاریخ نہیں گزرا جو سوداؔ نے راجہ ٹکیت رائے کے باغ پر کہا تھا۔ اس شعر سے تاریخ نکلتی ہے:

سرعدوے بہارش بریدم و گفتم
بگلشن تو الٰہی گزند دے نرسد

۱۲۶۳-۷۰=۱۱۹۳ھ

یہ قطعہ نسخۂ جانسن میں موجود ہے۔ سوداؔ کا انتقال ۱۱۹۵ ہجری میں ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ کلیاتِ سودا ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مرتب ہوا۔

کلیات میں سب سے پہلے سوداؔ کی ایک قلمی تصویر ہے۔ جس میں سوداؔ کے ایک ہاتھ میں کاغذ ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے حقّہ پی رہے ہیں اور پیچھے ملازم کھڑا ہے۔ تصویر کے بعد دو صفحے خالی ہیں۔ پھر ایک صفحہ کے بالکل اوپر انگریزی میں یہ عبارت لکھی ہے کہ رچرڈ جونسن کو مصنف مرزا سودا کا تحفہ۔

اس کے بعد جانسن کی شان میں قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے تیس اشعار ہیں۔ قاضی عبدالودود نے یہ قصیدہ "صبا" جلد ۵، شمارہ ۱۱، ۱۲ میں، اور امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے اردو ادب کے کسی شمارے میں شائع کرا دیا ہے۔ اُس صفحے سے اگلے صفحے پر یہ عبارتیں ہیں۔

دیوانِ مرزا رفیع سودا گزرانیدہ میر حسین صاحب در بلدۂ لکھنؤ داخل کتب خانہ سرکار شد	دیوان سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچرڈ جانسن صاحب بہادر دام اقبالہ

پہلی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوداؔ نے خود نہیں بلکہ میر حسین نے پیش کیا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سودا نے براہِ راست نہیں بلکہ میر حسین کی معرفت گزرانا تھا۔ میرے اس خیال کا ثبوت جانسن کی شان میں قصیدہ اور انگریزی عبارت ہے۔

یہ کلیات سوداؔ کے معتبر ترین نسخوں میں ہے۔ اس میں وہ تمام الحاقی کلام نہیں ہے جو نسخۂ مصطفائی اور نسخۂ آسی میں ہے۔ لیکن سودا کے شاگرد فتح علی شیدا نے فدوی لاہوری کی ہجو کہی تھی جو اس میں شامل ہے۔ یہ ہجو مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ شعر اس طرح ملتا ہے:

سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں
شعر پہ میرے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں

نسخۂ جانسن میں اس کی بدلی ہوئی شکل ہے:

حضرت سوداؔ تلک جو میرے استاد ہیں
شعر پہ اون کے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں

اس طرح نسخۂ جانسن میں یہ مقطع بھی موجود ہے:

بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انھیں شیداؔ خاموش
کیجیے اس سے سخن ہووے جسے عقل و ہوش

کلیاتِ سوداؔ کے مطبوعہ نسخے

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں۔ ''گارساں دتاسی نے اپنی تاریخِ ادبیات (جلد۳، ص ۰۷)

میں Primitiae Orientalis جلد ۳ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں اعلان ہوا تھا کہ کلکتہ میں کلیاتِ سودا تین جلدوں میں زیرِ طبع تھا۔ میر کا کلیات، وفاتِ میر کے کچھ ہی بعد کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اہلِ کلکتہ کو اگر کلیاتِ سودا کی اشاعت کا خیال آیا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ میر شیر علی افسوس نے جو اُس زمانے میں کلکتہ میں تھے، لکھا ہے کہ میرا کچھ وقت کلیاتِ سودا کی تصحیح میں صرف ہوا۔ مگر یہ نہیں بتاتے کہ اس کی ضرورت کیا تھی۔ دتاسی کا بیان ہے کہ افسوس، جوان اور محمد اسلم کا تصحیح کیا ہوا انتخاب کلیاتِ سودا ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا امکان ہے کہ تصحیح کلیات سے اسی کی طرف اشارہ ہو۔ وہ کلیات جس کی طرف دتاسی نے اشارہ کیا ہے کہیں نہیں ملتا۔ یا تو ارادۂ، مطلقاً قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ یا بعض اجزا چھپے جو محفوظ نہ رہ سکے [۱]۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ کلیاتِ سودا فورٹ ولیم کالج سے تین جلدوں میں شائع ہو رہا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کونسل کی ایک رپورٹ مرتبہ ۴راپریل ۱۸۰۳ء کے مطابق جو پانچ کتابیں مطبع میں بھیجی جا چکی تھیں۔ ان میں کلیاتِ سودا بھی تھا۔ جو تین جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا [۲]۔ اگر یہ کلیات شائع ہو گیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ نہ رہتا۔ یا کم از کم کوئی شخص اس کا مدعی نہ ہوتا کہ اس نے مطبوعہ کلیات دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے پریس بھیجا ضرور گیا تھا۔ مگر چھپ نہیں سکا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کتابوں کی تیاری اور طباعت پر بہت زیادہ روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ اور اس خرچ کا ذمہ دار خود گلکرسٹ تھا جو پوری تن دہی سے اس کام میں مصروف تھا لیکن کالج کے ذمہ داران اتنا روپیہ خرچ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی پوری تفصیل محمد عتیق صدیقی نے "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں دی ہے۔ ۲۴رفروری ۱۸۰۴ء کو گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو گیا [۳]۔ اُس کے رخصت ہونے کے وقت تک کلیاتِ سودا کی طباعت کا کام شروع ہی نہیں ہوا تھا یا کچھ اجزا چھپے ہوں گے۔ بعد میں اس کے جانشینوں نے اس کام کو رکوا دیا۔ بالکل ایسا ہی قرآن شریف کے ترجمے کے ساتھ ہوا تھا۔ البتہ ۱۸۱۰ء میں کلیاتِ سودا کا ایک انتخاب شائع ہوا۔ جو میری نظر سے نہیں گزرا۔

۱۔ سویرا، ۲۹، ص ۴۸

۲۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۹۷

۳۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۸۶

نسخۂ مصطفائی

کلیاتِ سوؔدا کے اب تک جتنے مطبوعہ نسخے ملتے ہیں۔ ان میں قدیم ترین نسخہ یہی ہے۔ اس کلیات کی طباعت ۲۹ رربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو شروع ہوئی اور ۱۰ ارجمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ ۱۲×۷ ½ کے سائز پر ۴۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ قدیم انداز پر شائع ہوا تھا یعنی حاشیہ پر بھی اشعار دیے گئے تھے۔ پہلے صفحے پر مصحح کا نام میر عبدالرحمٰن متخلص بہ آہؔی شاگرد رشید مومن خاں مرحوم دیا گیا ہے۔ مطبع کے متعلق لکھا گیا ہے۔ ''در مطبع مصطفائی محمد حسین خاں طبع نمود''۔ صفحہ ۲ اور ۳ پر ظہور علی ظہوؔر کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ ہے۔ اسی دیباچے میں ایک قطعہ تاریخ بھی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ طباعت کا کام ۲۹ رربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو شروع ہوا تھا۔ صفحہ ۳ کی آخری سطروں سے سودا کے ایک شاگرد کا دیباچہ شروع ہوتا ہے جو عبرت الغافلین پر لکھا گیا ہے۔ یہ دیباچہ کلیاتِ سودا مرتبہ آسؔی میں بھی شامل ہے (ص ص ۳۳۶-۳۳۷)۔ ص ۴ سے شاگردِ سودا[1] کا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

کیا حضرتِ سوؔدا نے کی اے مصحّفی تقصیر
کرتا ہے جو ہجو اوس کی تو ہر صفحے میں تحریر

صفحہ ۱۸ سے رسالہ عبرت الغافلین شروع ہوتا ہے۔ صفحہ ۵۱ سے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۱۷ سے مثنویوں کا آغاز ہوتا ہے۔ فارسی دیوان کی ابتدا صفحہ ۱۷۵ سے ہوتی ہے۔ صفحہ ۱۸۸ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں۔ صفحہ ۳۰۶ سے قطعے شروع ہوتے ہیں۔ صفحہ ۳۱۶ سے پہیلیاں اور پھر مخمس دیے گئے ہیں۔ ۳۶۹ صفحے سے دیوان مرثیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اختتام پر خاتمہ الطبع کی عبارت ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۰ ارجمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو غلام احمد کے نسخے کے مطابق طبع ہوا۔ غلام احمد نے جو کلیات مرتب کیا تھا اُس کا دیباچہ حسبِ ذیل ہے۔

''بعد شکر ایزد واہب العطیات ونعت سید الموجودات بندہ غلام احمد

---

[1] ''ہجو گوئی'' کے باب میں اس شاگرد کے نام سے بحث کی جاچکی ہے۔

کہ مولف کلیات ہذا است مگوید کہ دیوانہاے افضل المتاخرین مرزا رفیع المتخلص بہ سودا بہ شوق تمام ذوق مالا کلام محنت و دماغ سوزی از چند جا بہم رسانیدہ بہ ترتیب دل پذیر مرتب ساختہ یادگار روزگار گذاشت، چون این کلیات جامع تر از دیگر دواوین مشہور است، اکثر عزیزاں و صاحبانِ شوق بہ قیمت صد روپیہ طالب نسخہ بودند، لیکن دوری آں قبول طبع خاکسار نیفتاد و خدا شاہد این مقالست"۔

نسخۂ مصطفائی اب بہت کم ملتا ہے۔ اس کا ایک نسخہ دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

نسخۂ نول کشوری

مجھے اس کا علم نہیں کہ مطبع نول کشور سے کلیاتِ سودا کا پہلا اڈیشن کب شائع ہوا تھا۔ میرے پیشِ نظر چوتھا ایڈیشن ہے جو مئی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیباچہ نگار کا نام نہیں پتا چلتا۔ دیباچے میں بتایا گیا ہے کہ یہ کلیات مطبع نول کشور کانپور میں چھپا ہے۔ اس کلیات کی ترتیب بالکل وہی ہے جو نسخۂ مصطفائی کی ہے۔ صرف سائز کا فرق ہے۔ یہ ۱۰ ½×۶ ½ سائز پر ہے اور ۶۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

نسخۂ آسی

یہ نسخہ عبدالباری آسی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ پہلے کلیاتِ سودا ایک جلد میں شائع ہوا تھا۔ آسی نے ترتیب بھی بدل دی اور دو جلدوں میں کر دیا۔ یہی وہ نسخہ ہے جو آج کل ہر لائبریری میں ملتا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے جو نسخۂ مصطفائی میں تو ہیں لیکن آسی میں نہیں۔ ان کے بارے میں آسی نے دیباچے میں لکھا ہے۔

"ان کا کلیات جہاں تک مجھے معلوم ہے پہلے مطبع مصطفائی میں طبع ہوا تھا۔ مگر وہ بہت زیادہ غلط ہے۔ پھر بھی رطب و یابس فحش اور غیر فحش کلام کا مجموعہ ہے۔ غالباً اوسی کو دیکھ پہلی مرتبہ مطبع ہذا میں بھی طبع ہوا۔ کیوں کہ پہلا چھپا ہوا دیوان نہ صرف حرف بہ حرف اُس سے ملتا

ہے بلکہ سائز کی حیثیت سے بھی اوس کے برابر ہے۔ البتہ بعد کی ضرورت کا اقتضا سمجھ کر کسی مصحح نے حکماً یا بلا حکم اس میں سے وہ شعر نکال دیے جو فحش اور قابلِ گرفت ہیں۔ جس دیوان کی تصحیح کا مجھے اتفاق ہوا وہ یہی نسخہ تھا۔ جس کو ان کانٹوں سے پاک کردیا گیا تھا"۔

آسی کا یہ بیان درست ہے کہ انھوں نے جس نسخے کی تصحیح کی ہے وہ کانٹوں سے پاک تھا۔ کیوں کہ جتنے اشعار نسخہ نول کشوری میں نہیں ہیں۔ وہ آسی کے ہاں بھی غیر حاضر ہیں۔ حسب ذیل قصیدہ، ہجویں، قطعے، رباعیاں، مثنویاں اور مخمس نسخۂ مصطفائی میں موجود ہیں۔ لیکن نسخۂ نول کشوری اور نسخۂ آسی میں نہیں۔

۱- قصیدہ در ہجو مولوی ساجد متوطن کٹھیر کہ سخت متعصب بود:

ساجدا کیوں نہ یہ پرواز کرے تا بہ فلک
پہنچی پشمین سے یوں نطفے کی حلت جس تک

۲- در ہجو طفل پتنگ باز:

ایک لونڈا پتنگ کا ہے کھلاڑ
دور میں اوس کے..... ہیں ہزار

۳- ہجو کوکی یعنی دختر دایہ:

واسطے طفل کے جو بہتر ہے
شیر اگر ہے تو شیر مادر ہے

رباعیاں

۴- لیتا ہے نفع جو دے دمڑی کا سوت (کذا)

۵- اے ساجدِ ملعون خدا سے ڈر تو

۶- بچا بلبل کا ہے یہ ساجدِ ملعون

قطعے

۷- کیا شیخ مخنث میں ہے عنوانِ دیانت

۸- شاعر ہوا ہے فدوی کیا شاعروں کا تلا
۹- پئی جو سودا دے کن یہ گل کہ فدوی جس کول جاوندا ہے

مثنوی

۱۰- مولوی جی سے جورو بھٹکی ہے

قطعہ

۱۱- ہرگز ڈرانہ مجھ سے تو اے بے شعور بھڑوے (کذا)

مخمس

۱۲- کہتا ہے یہ سودا کہ اے خلاقِ مقدر
۱۳- ندرت ہے ایک بھڑوا کا شو ہے ایک پدنا

مثنوی

۱۴- حکایت ڈومنی
ممکن ہے کچھ اور اشعار بھی غیر حاضر ہوں۔

ڈاکٹر محمد شمس صدیقی کا مرتبہ کلیاتِ سودا

مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے ڈاکٹر محمد شمس صدیقی کا مرتبہ تین جلدوں میں کلیاتِ سودا ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔

ہاجرہ ولی اللہ کا تحقیقی مقالہ

ہاجرہ ولی اللہ نے غزلیاتِ سودا کے عنوان سے سودا کی غزلیات مرتب کرکے تحقیقی مقالے کے طور پر لکھنؤ یونی ورسٹی میں پیش کیا جس پر انھیں یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

نسیم احمد کی مرتبہ غزلیاتِ سودا

بنارس یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے ڈاکٹر نسیم احمد نے سودا کی غزلیات مرتب کرکے شائع کی ہیں۔

دیکھا نہ جائی اس سی کسی کا رمان تک / غنچی کی بھی ہنسی سی ہی چشم زنانک

شیشہ نہ توڑی شہ کی اگر عیش کا / کاسہ یہ ہی گدا کی یہ دارد کری ہی سنگ

گر خاک سی اوٹھا کی یہ دیوی کسی کو اوج / سوبون کی جیسی جیونٹی کو پردی ہی کہہ دھنگ

اسکی حسد کی کمی کا اب کیا کرون بیان / پہنچی جو شہد لب تمین کو دی وہی سر رگ

مشت معن قطرہ کو گر آئی ہی ہہر / جو اوکو بھیجی اوسکی سوی کلہ تنگ

جو دولہ ہی اسکا سو دشمنی ہی اوسکی ساتھ / خالی نہین فساد سی اسکی ہی جو ترنگ

پہنچاتی ہی یہ کری نہ فلک گر کسکو دید / اور اسکو کچھہ نکلتی زمین پر نہین درنگ

ہی یہ زمانہ اور جو اہل زمانہ ہین / اونکا جہان مین چشم مروت کا ہی ہی رنگ

مفلس پدر ہوا اور پسر جسکا ہو غنی / بیٹی کو باپ کی ولدیت سی آئی ننگ

پس اب کوئی کسو سی رکھی کسطرح امید / بیٹی کا باپ کی ہو زبانی مین جب یہ رنگ

ہی اب گروہ ایک کہ جسکا یہ ہی خطاب / ممتاز دولہ فخر جہان و حسام جنگ

پایا ہی تو نسکو کچھہ اوسکی سر پہ حالا / سینی پہ آئینی کی اگر جھاڑا ہا سو زنگ

نسخۂ رچرڈ جونسن کے ....

جوہری کو یہ چاربی عنصری سب یہ خلق ‌ جلوے کو اوسکی دکھیے ہے جوہر شناس سنگ

دل میں مح عاشقانہ سی حاصل نہیں سرور ‌ مت کر حضور جا کی تمنا کری مین درنگ

تیری وہ ذات کہ تو نہیں ہی شئی فرنگ

عرسی مین تیری پایہ اورنگ کا ہی ذہنگ

باعث یہ تیری دست کرم کا ہی دہر مین ‌ خالی جو در سی لیکی چمن سی ہین تا کمنگ

خونمین عدو کی تیغ کی تیری شناوری ‌ ہی اسطرح کہ بحر مین تیری ہی جون نہنگ

سائی تلی سپر کی تیری جسکو ہو پناہ ‌ اودہر نہ رو کمان فلک کا کری خدنگ

سرعت یہ بادپا کی تیری جسکی سامنی ‌ موج ہوا ہی اب ہوا کی قدم مین لنگ

تو وہ حلیم لذت شہد آئی کام مین ‌ چکھنی یہان خلق مین تیری اگر ترنگ

شائق کی جائی بر مین مو چشم ہو اگر ‌ تب اوسکی دل سی نکلی تیری دید کی امنگ

دور از ادب ہی طول سخن اسکی اب عوض ‌ سودا نکال دل کی دعائیہ سی اومنگ

یارب تمام دوست ہین تجسی فیضیاب

جاری ہی جبتلک کہ جہان بیچ آب گنگ

نسخۂ رچرڈ جونسن اور نسخۂ حبیب کا اِشاریہ

چوں کہ نسخۂ رچرڈ جونسن ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مرتب ہوا تھا۔ اس لیے اس میں نسخۂ حبیب کے مقابلے میں زیادہ کلام ہے یہ دونوں کلیات سودا کے معتبر ترین نسخے ہیں۔ نسخۂ رچرڈ جونسن میں فتح علی شیدا کی کہی ہوئی ہجو فدوی شامل ہے لیکن ہجو میں شیدا ہی کا تخلص ہے۔ غزل کے تین اشعار اور ہیں جو ان دونوں نسخوں میں ملتے ہیں اور دیوان یقین میں بھی موجود ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث "الحاقی کلام" کے تحت کی گئی ہے۔ یہاں دونوں نسخوں کا اشاریہ دیا جاتا ہے۔ اختلاف نسخ کو عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نسخۂ رچرڈ جونسن بنیاد ہے۔ جس مصرع کے آگے "حبیب" لکھا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ غزل یا قصیدہ وغیرہ نسخۂ حبیب میں بھی موجود ہے۔ بعض وجوہ سے کلام کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ نسخۂ رچرڈ جونسن میں ترتیب اس طرح ہے۔ قصیدے، غزلیں، مخمس، رباعیاں، فردیات، غزلیات ناتمام، مثنویاں، قطعے، فارسی کلام۔

غزلیں

۱- مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا (حبیب)

۲- ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا (حبیب)

۳- دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا (حبیب)

یہ شعر دونوں نسخوں میں نہیں۔ لیکن آسی میں ہے۔

چشمِ کرم سے عاشقِ وحشی اسیر ہو
الفت ہے دام آہوے دل کے شکار کا

۴- ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا (حبیب)

۵- نجانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشے کا (حبیب)

۶- ہر موء پر ہے ترے لخت دل اس رنجور کا (حبیب)

۷- رطوبت داغ دل میری کی ہے گرداب آتش کا (حبیب)

رچرڈ جونسن اور آسی میں مقطع ہے

جلاتی ہے جگر بن یار اتنا مے خوری سوداؔ

پیے ہیں جام گویا بزم میں احباب آتش کا

حبیب میں اس مقطع کے بجائے دوسرا مقطع ہے۔

ہوائے رنگ پر میرے نہ چھوٹے کیوں کے اے سوداؔ

جلے ہے داغ دل ایسا کہ جوں مہتاب آتش کا

۸- تو ہی اے رات سن اب سوز تک اس چھاتی کا (حبیب)

۹- گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا (حبیب)

۱۰- کھینچانہ میں چمن میں آرام یک نفس کا (حبیب)

آسی اور رچرڈ جونسن میں جو مقطع ہے وہ حبیب میں نہیں۔اس کے بدلے یہ ہے۔

سوداؔ کے سوزِ دل کو بے سوزِ دل نہ سمجھے

پروانے کا سمجھنا کیا ہوش ہے مگس کا

۱۱- چمن ہے کس کی گرفتار زلف وکاکل کا

۱۲- ہو یہ دیوانہ مرید اس زلف چھٹ کس پیر کا (حبیب)

۱۳- جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا (حبیب)

۱۴- اے دیدہ، خانماں تو ہمارا ڈبو سکا (حبیب)

۱۵- تیرے کوچے سے جو میں آپ کو چلتا دیکھا

۱۶- نہ کھینچ اے شانہ ان زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا (حبیب)

۱۷- دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا (حبیب)

۱۸- کعبہ جاوے پوچھتا ہے کب چلن آگاہ کا

۱۹- سالہا ہم نے صنم نالۂ شب گیر کیا (حبیب)

۲۰- دل میں تیرے جو کوئی گھر کر گیا (حبیب)

۲۱- قاصد اشک آگے خبر کر گیا (حبیب)

۲۲- دل مرا پند کو نہ سمجھے گا

۲۳- بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا

۲۴- قابو میں ہوں میں تیرے گو اب جیا تو پھر کیا (حبیب)

۲۵- چمن میں صبح جب اس جنگجو کا نام لیا (حبیب)

۲۶- کہاں نطق فصیح از طبع ناہنجار ہو پیدا

۲۷- آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا (حبیب)

۲۸- ملک آئین جب سے تمیں لوٹا (حبیب)

۲۹- تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا (حبیب)

۳۰- بے وجہ نہیں ہے آئینہ ہر بار دیکھنا (حبیب)

۳۱- کب دل شکستگاں سے کر عرضِ حال آیا (حبیب)

۳۲- رنگ اڑتا ہے دیکھ اس کے تئیں لالہ رخاں کا

۳۳- سحر جو باغ میں دلدار ایک بار آیا

۳۴- اسیری کی جو لذت سے پڑا ڈھب آشنائی کا

۳۵- اجل نے عہد میں تیرے ہی تقدیر سے یہ پیغام کیا

۳۶- جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں، دیا انھیں کو وقار اپنا

۳۷- دل یار کی ہرگز نہ سرِ زلف سے چھوٹا

۳۸- سیہ کاری ہے مانند نگیں ہر چند کام اپنا (حبیب)

۳۹- زخم کا دل کے تر و تازہ ہے انگور سدا (حبیب)

۴۰- سودا غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا (حبیب)

۴۱- طبیعت سے فرومایہ کی شعر تر نہیں ہوتا

۴۲- نگاہِ مست نے ساقی کی عالم کو چھکا ڈالا

۴۳- پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا (حبیب)

۴۴- قاتل کا ہاتھ ہرگز ہتھیار تک نہ پہنچا

آسی میں یہ مطلع زائد ہے۔

افسوس کام غم کا اظہار تک نہ پہنچا
یہ لخت دل بھی چشم خوں بار تک نہ پہنچا

۴۵- ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا

۴۶- جو گذری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا (حبیب)

۴۷- اب تلک اشک کا طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا (حبیب)

۴۸- وہ ہم نہیں جو کریں سیر بوستاں تنہا (حبیب)

۴۹- اعمال سے میں اپنے بہت بے خبر چلا

۵۰- حالِ دل سے مرے جب تک وہ خبردار نہ تھا (حبیب)

۵۱- جب بزم میں بتاں کی وہ رشک مہ گیا تھا (حبیب)

۵۲- جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا

۵۳- میں دشمن جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا (حبیب)

۵۴- بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا (حبیب)

۵۵- والہ کو تری چشم کے آزار ہی رہا (حبیب)

۵۶- آنکھوں سے اشک جتنا آتا تھا شب نہ آیا

۵۷- جو چلن چلتے ہو تم کیا اس سے حاصل ہوئے گا

۵۸- چھٹنا ضرور مکھ پہ ہے زلفِ سیاہ کا

۵۹- پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا

۶۰- نو را غذ ہنر کرنے میں دل کا میں گنوایا

۶۱- باغ میں جس دم خرام اس سرو قامت نے کیا

۶۲- دل اپنا چاہتا ہے وہ جنوں از غیب ہو پیدا

۶۳- نہ شکوہ یار کا لب تک دلا بیرانہ سرلے جا

۶۴- باہر رکھوں نہ بزم سے اے رشکِ باغ پا

۶۵- ترکش اولینڈ سینہ عالم کا چھان مارا

۶۶- ڈروں ہوں بہہ نہ جاوے شہر، بندھا گرتا رونے کا

۶۷- شب کو جو چھپا مہ تو سحر کہنے یہ لاگا

۶۸- کیا جانیں کس کی خاک ہو رکھ ہوش نقشِ پا

۶۹- یاں پھر اس شرم سے عیسیٰ نے گذارا نہ کیا

۷۰- کرتا ہوں سیر جب سے باغ جہاں بنایا

۷۱- جامِ خالی سے جو ساقی نے مجھے ڈھکایا

۷۲- نالہ سینے سے کرے عزمِ سفر آخرِ شب

۷۳- ٹک جاگ لے تو چھوڑ کے غافل پلنگ و خواب (حبیب)

۷۴- مجھ اشک میں جوں ابر اثر ہوے گا یا رب (حبیب)

۷۵- بھنگ پی بھنگ خیال اس کا ہے افلاک پرست

۷۶- بزمِ غم خونِ جگر پہ مرے مہمان تھی رات

۷۷- ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست

۷۸- نظر آجائے ہے جیسی کہ ہندوستان میں صورت (حبیب)

۷۹- عشق اپنے کی فلک نے جہاں میں پوائی بات

۸۰- مانے ہے کسے واقفِ اسرارِ محبت

۸۱- لاگے ہے کس کے منہ پہ بایں زور پشت دست

۸۲- سودا گرفتہ دل کو نہ لاؤ سخن کے بیچ (حبیب)

۸۳- یاروں میں کیا عہد اسے مانیو تم بیچ

۸۴- شمع میں ہرچند ہے سر سے گزر جانے کی طرح (حبیب)

۸۵- آہ کس سرو میں قمری ہے قدِ یار کی طرح (حبیب)

۸۶- تجھ بن بہت ہی کٹتی ہے اوقات بے طرح

۸۷- لطفِ نشاطِ بادہ و حسنِ ظہورِ صبح

۸۸- لے آئے در پہ ترے جو ستم کشاں فریاد (حبیب)

۸۹- کھینچ کر پوست کرے گردشِ ایام سفید

۹۰- اشک کو کب ہے شناسائی گہر سے پیوند

۹۱- خرمی پھرتی ہے یوں دل پہ مرے غم سے دور (حبیب)

۹۲- بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور (حبیب)

۹۳- جوش سے میرے جنوں کے کیا خوش آتی ہے بہار (حبیب)

۹۴- دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر (حبیب)

۹۵- یہ نہ ہو مہر کہ تا شب رہے گھر سے باہر

۹۶- کام آیا نہ کچھ اپنا تنِ زار آخرِ کار

۹۷- باندھی جھنجھلا کے کمر شوخ نے کیں میرے پر

۹۸- بکھرائی ہے وہ زلفِ سیہ فام جہاں پر

۹۹- گردم سے جدا تن کو رکھا دیرِ ہوا پر

۱۰۰- پھینکے جو کماں دار مرا تیر ہوا پر

۱۰۱- دی پیچ دل کو سادہ لوح اس زلف نے پا کر

۱۰۲- تو جسے چاہے وہ یارب تجھ سے ہو بیباک تر

۱۰۳- دل نا آشنائے نالہ سے صد رہ جرس بہتر

۱۰۴- دل نہ کر منت زراہِ بے قراری بیشتر

۱۰۵- سمندر کر دیا نام اس کا ناحق سب نے کہہ کہہ کر

۱۰۶- منزل کے پہنچنے سے ورے قافلہ دے چھوڑ

۱۰۷- دیکھا میں نخل وادیٔ ایمن ہر ایک جھاڑ (حبیب)

۱۰۸- بے خبر دردِ محبت سے ہے وہ یار ہنوز

۱۰۹- انکار قتل سے تو کرے ہے تجن ہنوز (حبیب)

۱۱۰- شبنم کرے ہے دامن گل شست وشو ہنوز

۱۱۱- کس کے ہیں زیرِ زمیں دیدۂ نمناک ہنوز (حبیب)

۱۱۲- بے ہودہ اس قدر نہیں آتا ہے کام ناز

۱۱۳- ماہِ نو تجھ یادِ ابرو میں ہے سینے کا خراش

نرائن میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

رہتا ہے تیرے غم میں دل زار زار زار

نکلے ہے آہ آہ شرر بار بار بار

قاضی عبدالودود نے بھی اسے سوداؔ ہی کی تسلیم کی ہے۔ (سویرا، ۲۹ص ۶۲) لیکن یہ میر سوزؔ کی ہے اور اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

۱۱۴- دوری ہے تری اپنے دلِ زار کو آتش

۱۱۵- دیں شیخ و برہمن نے کیا یار فراموش

۱۱۶- سینے میں ہوا نالہ و پہلو میں دل آتش

۱۱۷- گو آپ نے نہ مجھ غریب کے بالیں تک آئی شمع (حبیب) (کذا)

۱۱۸- لطف اس چہرے کے آگے کوئی یاں رکھتی ہے شمع (حبیب)

۱۱۹- سرد مہری سے بتاں کی مٹ گیا ہے سوز داغ (حبیب)

۱۲۰- کس طرح دل میں چھپاؤں تجھ کو ہیں سینے میں داغ

۱۲۱- اے لالہ گو فلک نے دیے تجھ کو چار داغ (حبیب)

۱۲۲- دیکھوں ہوں یوں میں اس ستم ایجاد کی طرف

(رچرڈ جونسن میں دو اور آسی و حبیب میں سات شعر ہیں)

۱۲۳- بلبل نہ چمن ہے گلِ گلزار کا عاشق

۱۲۴- خط آچکا پہ مجھ سے وہی ڈھنگ اب تلک (حبیب)

۱۲۵- پھونک دی ہے عشق کی تپ نے ہمارے تن میں آگ (حبیب)

۱۲۶- کب لگ سکے ہے اوس سے کوئی رنگ اور نمک

۱۲۷- کرتی ہے میرے دل میں تری جلوہ گری رنگ (حبیب)

۱۲۸- رہے اس فصل ہم اے بلبل و گل ناتواں یاں تک

۱۲۹- شاعروں میں کب رکھے ہے شیر کی تقریر جنگ

۱۳۰- عدد ہے دوری سے ایک اور خمار ہے ایک

۱۳۱- سخنِ عشق نہ گوشِ دل بیتاب میں ڈال (حبیب)

۱۳۲- یکدست اگر زمانہ جہاں میں لٹائے گل (حبیب)

۱۳۳- کھینچ شمشیر چاؤ دل کے نکال (حبیب)

۱۳۴- اس چمن کی سیر میں آیار پیویں مل کے مُل

۱۳۵- قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام (حبیب)

۱۳۶- نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام (حبیب)

۱۳۷- مبدأ جو بلا کا ہے سو ہے وہ نظر چشم

۱۳۸- اب اس طرف تری دل گرمی شعلہ خو معلوم (حبیب)

۱۳۹- کیا مچائی ان نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم (حبیب)

۱۴۰- عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم (حبیب)

۱۴۱- ہیں صفائے بادہ ودرِ دِتہِ پیانہ ہم (حبیب)

۱۴۲- دھن کے سر بولا، گئے جب یار کے کاشانے ہم (حبیب)

۱۴۳- لے دیدۂ تر جدھر گئے ہم (حبیب)

۱۴۴- تو کیوں جیتی رہی بلبل چمن میں دیکھ کر شبنم (حبیب)

۱۴۵- ملائم ہوگئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں (حبیب)

۱۴۶- نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلیں کلیاں (حبیب)

۱۴۷- بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرابیاں (حبیب)

۱۴۸- باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھالیاں (حبیب)

۱۴۹- نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں نہ دل سے اٹھتی ہیں آہیں

۱۵۰- تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں (حبیب)

۱۵۱- نہ اپنا سوز ہم تجھ سے بیاں جوں شمع کرتے ہیں (حبیب)

۱۵۲- عاشق فنا میں اپنی بہبود جانتے ہیں

۱۵۳- سمجھ کے باندھا تھا آشیاں ہم رہے گا بآب و تاب گلشن

۱۵۴- یار آزردہ ہوا رات جو مے نوشی میں

۱۵۵- باتیں کتنی ہی نہیں منہ لگنے سے منظور ہمیں (حبیب)

۱۵۶- ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آ جاتا ہوں (حبیب)

۱۵۷- واشد ہو خرمی سے یہ کیا حساب تجھ بن

۱۵۸- نگر آباد ہے بسے ہیں گاؤں (حبیب)

۱۵۹- گلشن میں یار بن مجھے شرب مدام میں (حبیب)

۱۶۰- گر کیجیے انصاف تو کی زور وفا میں

۱۶۱- عقل اس ناداں میں کیا تیرا جو دیوانہ نہیں

۱۶۲- پچھی اُٹھ کر میں تجھے رات کروں یا نہ کروں

۱۶۳- پونچھ کر چشم کریں ہم جو فشارِ دامن

۱۶۴- غم کی مے ہم نے جو شب دل کی بھری شیشے میں (حبیب)

۱۶۵- ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں (حبیب)

۱۶۶- سجدہ کیا صنم کو میں دل کے کنشت میں (حبیب)

۱۶۷- مژہ اوس چشم کی کھٹکے ہے دلِ مفتوں میں (حبیب)

۱۶۸- عاشق کی کہے چشم روے بن تر ہوں میں

۱۶۹- چشمِ تر میرے سے کیا رکھتی ہے مطلب آستیں (حبیب)

۱۷۰- بلبلِ تصویر ہوں جوں نقشِ دیوارِ چمن (حبیب)

۱۷۱- غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں (حبیب)

۱۷۲- اسباب سے جہاں کے کچھ اب پاس گو نہیں (حبیب)

۱۷۳- کہے ہے توبہ پہ زاہد کہ تجکو دین تو نہیں (حبیب)

۱۷۴- پیارے تمھارا پیار کس انسان پر نہیں (حبیب)

۱۷۵- جو کچھ ہو سو ہو مجھے بھاگنا تیرے در سے کار نکو نہیں (حبیب)

۱۷۶- جی تک تو دے کے لوں کہ تو ہو کارگر کہیں (حبیب)

۱۷۷- نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں (حبیب)

۱۷۸- کیوں میں تسکینِ دل اے یار کروں یا نہ کروں

۱۷۹- اسی کو چھپا کہیے جو یہ قلقل ہے شیشے میں

۱۸۰- چمن کا لطفِ سیر اور رونقِ محفل ہے شیشے میں

۱۸۱- تجھ بن یہ چمن ہر خس و ہر خار پریشاں

۱۸۲- خانۂ دل کہ ہو خون ہونے کا آئیں جس میں

۱۸۳- گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۱۸۴- لختِ جگر آنکھوں سے ہر آن نکلتے ہیں

۱۸۵- خوبوں میں دل دہی کی روش کم بہت ہے یاں

۱۸۶- شکل گل میں نے تمام اپنا کیا تن دامن

۱۸۷- مست سحر و توبہ کن شام کا ہوں میں

۱۸۸- تیرے پہلو سے جو مجلس میں ہٹے جاتے ہیں

۱۸۹- زندگی مجبوب کیا کیا اس میں ہیں محبوبیاں

۱۹۰- کوسوں کا نہیں فرق وجود اور عدم میں

۱۹۱- لازم ہے بزم میں وہ سخن بر زباں زبوں

۱۹۲- چیز کیا ہوں جو کریں قتل وہ انکھیاں مجھ کو (حبیب)

۱۹۳- ظلم کے تیرے ہیں گواہ خانہ بہ خانہ کو بہ کو (حبیب)

۱۹۴- محتسب آیا بزم میں ساقی لے آ شراب کو

۱۹۵- کیجیے نہ اسیری میں اگر ضبط نفس کو (حبیب)

۱۹۶- خط اوس کے سادہ لوحوں کے پرستاروں سے مت پوچھو (حبیب)

۱۹۷- شیخ نے اوس بت کو جس کوچے میں دیکھا شام کو

۱۹۸- آلودہ ز قطرات عرق دیکھ جبیں کو

۱۹۹- بادشاہت دو جہاں کی بھی جو ہووے مجھ کو

۲۰۰- بس ہو تو رکھوں آنکھوں میں اوس آفت جاں کو

۲۰۱- مرے نامے کے خاطر مرغ جاں سے کون بہتر ہو (حبیب)

۲۰۲- خواہی رہ صد سالہ ہو تو خواہ یہیں ہو (حبیب)

۲۰۳- اس دل کو دے کے لوں دو جہاں یہ کبھو نہ ہو (حبیب)

۲۰۴- دلدار اوس کو خواہ دل آزار کچھ کہو (حبیب)

۲۰۵- غیر پہ نت ہے کرم ہم پہ ستم واہ واہ (حبیب)

۲۰۶- آ پہنچ ساقی کہ پھر ایام کب آتے ہیں یہ (حبیب)

۲۰۷- شیخ تو کعبے کو پہنچے ہے کرامات کی راہ

۲۰۸- یاں نہ ذرہ ہی چمکتا ہے فقط گرد کے ساتھ (حبیب)

۲۰۹- شیخی تھی جام کی سو گئی جانِ جم کے ساتھ (حبیب)

۲۱۰- مجھ سے پہ لیے پھرنا تلوار بہت تحفہ (حبیب)

۲۱۱- جب خوش ہو تو دے گالی اک بار سو یہ تحفہ (حبیب)

۲۱۲- تجھ حُسن کا یوں تجکو مری جان ہے شعلہ

۲۱۳- حسن سے اس کے اسے دے ہے خبر آئینہ (حبیب)

۲۱۴- میکدہ ہی میں نہ اے بادہ کشاں ہے شیشہ (حبیب)

۲۱۵- ہے زلف میں دل میرا مت کیجیو تو شانہ (حبیب)

۲۱۶- خلقت کے نہ خلق اپنا پایا میں پسندیدہ

۲۱۷- غم کا ہے پسر خواندہ اور درد کا پالیدہ

۲۱۸- ہوں سرمۂ کوری سے وہ چشم تر آلودہ (حبیب)

۲۱۹- کہاں وہ نور کا شمس و قمر میں ہے شعلہ

۲۲۰- نیم جاں ہیں یہ تری چشم کے بیمار کئی (حبیب)

۲۲۱- ہمارے کفر کے پہلو سے دین کی راہ یاد آوے

۲۲۲- غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے

۲۲۳- سودا کی مرے جس کو تدبیر نظر آئی

۲۲۴- جو طبیب اپنا تھا دل اوس کا کسی پر زار ہے

۲۲۵- جھڑ کی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی (حبیب)

۲۲۶- تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی (حبیب)

۲۲۷- اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے (حبیب)

۲۲۸- مارے کو تیری زلف کے لاکھوں جتن کیے (حبیب)

۲۲۹- دلا تو یار کو شمس و قمر لگا کہنے

۲۳۰- نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے

۲۳۱- آتش جو عشق کی ہے سو نور بصر میں ہے

۲۳۲- کچھ یہ بھی پیش وحشتِ کامل زمین ہے

۲۳۳- صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے

۲۳۴- جدی جدی یہ جہاں آن بان ہے سب کی

۲۳۵- فکر میں ہجر کی دل وصل کا دن کھوتا ہے

۲۳۶- ہم ہیں وارستہ محبت کی مددگاری سے

۲۳۷- جب اپنے بندِ قبا تم نے جان کھول دیے (حبیب)

۲۳۸- ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے (حبیب)

۲۳۹- وعدۂ لطف و کرم گر نہ وفا کیجیے (حبیب)

۲۴۰- ہر سحر قتل تری چشم کا اک مفتون ہے (حبیب)

۲۴۱- سرو گلشن ہے نہ کچھ مفتون ہے (حبیب)

۲۴۲- جب اون انکھیوں کا غمزہ بر سر بیداد آتا ہے

۲۴۳- گوہر کو جوہری اور صرّاف زر کو پرکھے

۲۴۴- تری انکھیوں نے نرگس سے چمن میں یار ایسی کی

۲۴۵- خورشید و مہ نے پیارے تجھ پر یہ بیتوائی

۲۴۶- گر تجھ میں ہے وفا تو جفا کار کون ہے (حبیب)

۲۴۷- دل لے کے ہمارا جو کوئی طالب جاں ہے (حبیب)

۲۴۸- میری آنکھوں میں تو بستا مجھے تو کیوں رلاتا ہے (حبیب)

۲۴۹- اس قدر سادہ و پرکار کہیں دیکھا ہے

۲۵۰- کیا جانیے کہ کس کے دل کا لہو پیا ہے (حبیب)

۲۵۱- ارض و سما شفق نے لہو میں بھر دیا ہے (حبیب)

۲۵۲- نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے (حبیب)

۲۵۳- سودا جو سنا ہے کسی کا نام یہی ہے (حبیب)

۲۵۴- جو گل ہے یاں سو اوس گل رخسار ساتھ ہے

۲۵۵- لینا جو شیشۂ دل منظور ہے تو یہ ہے

۲۵۶- چہرہ مریض لب کا ترے زرد ہے سو ہے (حبیب)

۲۵۷- درد میرے استخواں کا کیا ترے دم ساز ہے (حبیب)

۲۵۸- ہمیں کسی سے گر اظہار درد آتا ہے (حبیب)

۲۵۹- مجھے تجھ زلف کے سنبل سمجھنے میں تامل ہے

۲۶۰- اس چال کے نبھنے کا کچھ اسلوب نہیں ہے

۲۶۱- نہیں جوں گل طلب ابر سیاہ ہے گا ہے

۲۶۲- جس دن تری گلی کی طرف ٹک پون بہے (حبیب)

۲۶۳- کسی کا درد دل پیارے تمھارا ناز کیا سمجھے

۲۶۴- کہوں میں کس سے کہ مطلب مرا روا کیجیے (حبیب)

۲۶۵- مونہہ لگاوے کون تجکو گر نہ پوچھے تو مجھے (حبیب)

۲۶۶- سود جوں شمع نہیں گرمی بازار مجھے (حبیب)

۲۶۷- اس قدر اب کے ہوا مست ہے ویرانے کی (حبیب)

۲۶۸- نہ تاب لا سکے خورشید عشق کی تپ کی (حبیب)

۲۶۹- جو بادہ تو نہ پیے جام لالہ ہو نہ سکے (حبیب)

۲۷۰- ممکن ہے تیر خوردہ تڑپ کر سنبھل سکے (حبیب)

۲۷۱- ماریں گے ایک دو کو یا آپ مر رہیں گے (حبیب)

۲۷۲- نے ضرر کفر کو نے دین کا نقصاں مجھ سے (حبیب)

۲۷۳- تصور میں ترے کہیو صبا اوس لاابالی سے (حبیب)

۲۷۴- تخم گل امید چمن اس شورہ زار سے (حبیب)

۲۷۵- مرجاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے (حبیب)

۲۷۶- شکوہ ہے دور ظالم کرنا مروتوں سے (حبیب)

۲۷۷- گو دخترِ زر عشق میں یاروں کے پکی ہے (حبیب)

۲۷۸- کوئی کرتا رہے اوس سے جو یہ مذکور بہتر ہے (حبیب)

۲۷۹- بلبلِ نالاں و دردِ عشق کچھ معقول ہے

۲۸۰- خشک رہنے سے ہمارا دیدۂ تر پاک ہے (حبیب)

۲۸۱- عارضی سامان حرمت کب ہمیں درکار ہے

۲۸۲- قاتل سے کیوں جھگڑتے ہو کیا مجھ سے بیر ہے (حبیب)

۲۸۳- خاک پر بھی تیرے دیوانے کی یہ تدبیر ہے (حبیب)

۲۸۴- گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی (حبیب)

۲۸۵- نہ مجھ سے کہہ کہ چمن میں بہار آئی ہے (حبیب)

۲۸۶- بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے (حبیب)

۲۸۷- اس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آوے (حبیب)

۲۸۸- افعی کو یہ طاقت ہے کہ اوس سے بہ سر آوے (حبیب)

۲۸۹- نسیم گر قدم دوستی بجالا وے (حبیب)

۲۹۰- الٰہی بزم بتاں سے وہ شمع ٹل جاوے (حبیب)

۲۹۱- گو غنچہ ساں گرہ میں دنی جمع زر کرے (حبیب)

۲۹۲- بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے (حبیب)

۲۹۳- ساقیِ سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری (حبیب)

۲۹۴- کافر جو ہو مجھ سا او سے دل اپنے میں جاوے (حبیب)

۲۹۵- دل میں بسنے کی تری مجکو نپٹ ہے شادی (حبیب)

۲۹۶- تجھ تیغ تلے کہہ تو ستم سے کہ سر دھر دے (حبیب)

۲۹۷- خط نقص صفائی رخ دلدار نہ ہووے (حبیب)

۲۹۸- جس دم وہ صنم سوار ہووے (حبیب)

۲۹۹- بھر نظر تجکو نہ دیکھا کبھو ڈرتے ڈرتے (حبیب)

۳۰۰- اے آہ تری قدر اثر نے تو نہ جانی (حبیب)

۳۰۱- برہمن بتکدے کے شیخ بیت اللہ کے صدقے (حبیب)

۳۰۲- اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے (حبیب)

۳۰۳- جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے (حبیب)

۳۰۴- خاتم کے جوں نگیں ہمیں کس کام کے لیے

۳۰۵- نکل نہ چوکھٹ سے گھر کی پیارے جو پٹ کے اجھل ٹھٹک رہا ہے

۳۰۶- تیری واسوخت سے خالی میں نہ پایا کوئی

۳۰۷- ہم آج ایک صنم میں غرور دیکھا ہے

۳۰۸- وہی جہاں میں رموز قلندری جانے

۳۰۹- تجھ عشق سے سودا کا انکار نظر میں ہے

۳۱۰- کس سے جا اٹکا ہے دل میرا عجب دیوانہ ہے

۳۱۱- عارض پہ حسن خط سے دمک کیا ہے نور کی

۳۱۲- یاں صورت و سیرت سے بت کون سا خالی ہے

۳۱۳- بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے

۳۱۴- مگر وہ دید کو آیا تھا باغ میں گل کی

۳۱۵- میرے ملنے کی اوس کو تب ہوس ہووے اگر ہووے

۳۱۶- خوب واقف ہیں محبت کے وہ سر رشتے سے

۳۱۷- دل اس سینے میں ہے یا قطرۂ سیماب ہے

۳۱۸- نہیں وہ بولتے اون میں خبر جن کو ہے کچھ دہر کی

۳۱۹- چاہنا بزم تعیش کا ہوسنا کی ہے

۳۲۰- عاشق کو نہ کر پیار جی سے

۳۲۱- کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کو الم سے

۳۲۲- غفلت میں زندگی کو نہ کھو گر شعور ہے

۳۲۳- پنبہ کو دور کر مرے سینے کے داغ سے

۳۲۴- جب نظر اس کی آن پڑتی ہے

۳۲۵- زمانہ تجھ سے اگر ہو ناساز کر تو اس سے زمانہ سازی

۳۲۶- ہر لحظہ اب پہ نشو و نما خط یار ہے

۳۲۷- دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے

۳۲۸- درد دل کس کو کہوں میں وہ کہاں ہے تو ہے

۳۲۹- ہم سے لالچ پہ ارادہ کچھ اگر اس کا ہے

متفرقات غزلیات ناتمام

۳۳۰- مسیحا سن کے اٹھ جاوے جو کہیے کچھ دوا کیجیے

۳۳۱- تو تک جگر تو مرے مرغ نامہ بر کا دیکھ

۳۳۲- اگر دنیا میں اب یوں ہی سجن رسم وفا ہوگا

۳۳۳- ساقی ہماری توبہ تجھ پر ہے کیوں گوارا

۳۳۴- کیا تاب ہے جو موہنہ پہ ترے آوے آفتاب (حبیب)

۳۳۵- نہ جائے سر سے مرے تا ابد ہوائے شراب (حبیب)

۳۳۶- کیوں اسیری پہ مری صیاد کو تھا اضطراب (حبیب)

۳۳۷- کیا خوشی ہم کو کہ اپنی ہے یہ حیرانی کی طرح

۳۳۸- یہ زندگی مری وحشت کا ننگ ہے صیاد

۳۳۹- جام گل تیرے سے اب بلبل کو مستی ہے بہار ۲

۳۴۰- شیخ تک چشم عشق سے کر سیر ۲

۳۴۱- ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس

(رچرڈ جونسن اور آسی میں دو اور حبیب میں ایک شعر ہے)

۳۴۲- آشیاں کو مت اجڑوا کر کے فریاد و خروش

(حبیب اور رچرڈ جونسن میں دو اور آسی میں تین شعر ہیں)

۳۴۳- ابھرے ہے کیا حباب نمط اے حریر پوش ۲ (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۴۴- گو آپ نہ مجھ غریب کے بالیں تک آئی شمع ۴

۳۴۵- پروانہ رات شمع سے کہتا تھا رازِ عشق (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۴۶- رخ سے دیکھوں ہوں میں اوس زلف سیہ فام تلک ۳

۳۴۷- ہووے نہ ملک عشق سے کم رسم داغ دل (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۴۸- تیرے ہی دیکھنے کے نہ آوے جو کام چشم

(حبیب، رچرڈ جونسن میں دو شعر اور آسی میں پوری غزل ہے)

۳۴۹- کس کس طرح کی دیکھیں اس باغ کی فضائیں (رچرڈ جونسن، حبیب دو شعر)

۳۵۰- خلش کروں نہ کسی سے اگرچہ خار ہوں میں ۲

۳۵۱- عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں

(حبیب تین شعر، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۵۲- موسم گل ہے و لے کچھ یہ دل اب شاد نہیں (حبیب، رچرڈ جونسن دو شعر)

۳۵۳- ظاہر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں ۲

۳۵۴- مجکو نہیں ہے دل میں تری راہ کیا کروں ۲

۳۵۵- الٰہی ہے سکت نعم البدل کی تجکو دینے کی

مجھے اس کے عوض تو کچھ نہ دے پر پھیرے دل کو ۱

۳۵۶- اب دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۵۷- تجھ بن تو دو جہاں سے کچھ اپنے تئیں نہ ہو ۲

(حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۵۸- بوؤں میں تخم دل کو جہاں واں زقوم ہو (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۵۹- اے نالہ مت سبک ہو نکل کر جگر سے تو (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۶۰- لٹی ہے، اُٹھ گیا ساقی مرا بھی پر ہو پیانہ ۲

۳۶۱- تیری اون الفتوں کے زمانے کدھر گئے ۲ (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۶۲- جو ہے جلا جلوں کا ہے غم خوار وہ کوئی ۲

۳۶۳- ہمت کہاں کہ منت دوناں نہ لیجیے ۳ (حبیب، رچرڈ جونسن، تین شعر)

۳۶۴- اٹھایا کوہ رستم نے اگر تو سخت ناداں ہے (حبیب، رچرڈ جونسن، تین شعر)

۳۶۵- حیران ہوں شمع کس کے لیے سوز ناک ہے (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

۳۶۶- حیراں ہوں شمع کس کے لیے سوز ناک ہے (حبیب، رچرڈ جونسن، دو شعر)

حسب ذیل ناتمام غزلیں صرف حبیب میں ہیں

۳۶۷- قاصد کو اپنے ظالم جو کچھ میں دوں بجا ہے

۳۶۸- یاں چشم سرمہ سا کا مارا کوئی جیا ہے

۳۶۹- نہیں ممکن اسیروں کی کوئی فریاد کو پہنچے (تین شعر)

۳۷۰- مرے خونِ ناحق کی دے کر گواہی

(دو شعر، آسی میں یہ شعر رباعیات کے تحت دیے گئے ہیں)

۳۷۱- سودا یہ کرے گانت اس طرح کا رونا

۳۷۲- حق کی خلقت سے آگے ترا دیوانہ تھا

۳۷۳- بال و پر ہونے نہ پائے تھے نمودار ہنوز

۳۷۴- کیا کیجیے کہ ہم سے کچھ بات نہیں بن آتی (دوشعر)

۳۷۵- وہی ہیں دن وہی راتیں وہی فجر وہی شام

۳۷۶- خانہ پرورِ چمن ہیں آخر اے صیاد ہم

۳۷۷- کرے تک منفعل کوئی مرے بیدرد قاتل کو

۳۷۸- بہار باغ ہو مینا ہو جامِ صہبا ہو

۳۷۹- اب شہدِ زندگی کی نہیں ہے ہوس مجھے

۳۸۰- سینے کو دشمنوں کو نگہ تیری توڑ دے (دوشعر)

فردیات

۳۸۱- دیدۂ پُر آب سے تجھ بن ہمیں کیا کم ہے جام

۳۸۲- جب تک ہے جہاں میں گل وگلزار سلامت

۳۸۳- میکشاں روح ہماری بھی کبھی شاد کرو

۳۸۴- کون کہتا ہے نہ اوروں سے ملا کر مجھ سے مل

۳۸۵- اوس دل پہ تجھے رحم جفا کار نہیں ہے

۳۸۶- میں کہتا ہوں دل اپنے کو کہ ننگ و نام سے گزرے

۳۸۷- تبسم دیکھ تیرا کیوں نہ دل بیتاب ہو جاوے

۳۸۸- یار ہے بے قدر جب ہو آشنا دس بیس کا

۳۸۹- خط مرغ نامہ بر نے تجھے کون سا دیا

۳۹۰- فائدہ کیا خط تجھے لکھ لکھ اگر روتا ہوں میں

۳۹۱- سن کے یہ کہتا ہے میرے نالۂ جانکاہ کو

مخمس

۱-

۲- بہر جامی روم از خویش می جوشد تماشائے

۳- کہ در وموے نہ گنجید ز بسیاری دل

۴- کہ سر بکوہ و بیاباں تو دردۂ مارا

۵- سوزم گرت نہ بینم، میرم چو رُخ نمائی

۶- مخمس بر غزلِ میرؔ۔ تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ

۷- کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

۸- مخمس بر غزل تاباں۔ ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے

۹- مخمس بر مصرع خود۔ طاقت نہیں رہی ہے مجھے انتظار کی

۱۰- مخمس بر غزل خود۔ جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہوگئی

۱۱- گویا چمن میں جز دمِ عیسیٰ صبا نہیں

۱۲- مخمس بر غزلِ خود۔ ہونے سے دوستوں میں ہم پیار رہ گئے

۱۳- مخمس در ویرانی شاہ جہاں آباد۔ بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

۱۴- دیکھنے کے مجھے مانع ہیں طبیبان گل و صبح

۱۵- ہر کہ عیب دگراں پیشِ تو آورد و شمرد

۱۶- عینک بھی جوڑے ساتھ منگاتے ہیں شیخ جی

۱۷- کہتے ہیں حور و ملک شیخ جی تم زور بنے

۱۸- اک مسخرا یہ کہتا تھا کوا حلال ہے

۱۹- مخمس در ہجو ندرت۔ گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنک لگام دو

۲۰- مخمس در ہجو ندرت۔ آبروئے ریختہ از جوش سودا ریختہ

۲۱- مخمس در ہجو ندرت۔ لولو کرا نچھو چ لچ دے پارے پارے مدنا

۲۲- مخمس در تعریض بعض شعرا۔ موننہ پرورش شانہ میں تو ہو موسل

۲۳- مخمس در ہجو فدوی۔ کہ فدوی جگ میں کہاتا ہے الو بنئے کا

۲۴- مخمس در ہجو ضاحک۔ روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

۲۵- مخمس در ہجو ضاحک۔ بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

۲۶- مخمس در ہجو ضاحک۔ جا صبا زاہد سے کہہ بعد از سلام

مثنویاں

۱- میرا دل نام پر اُس کے ہے شیدا

۲- مثنوی در بیانِ شدت گرما (حبیب)

۳- مثنوی در ہجو فیل (حبیب)

۴- مثنوی در بے نسقیٔ شاہجہاں آباد (حبیب)

۵- مثنوی در ہجو بخیل

۶- مثنوی در ہجو بسیار خوار کہ عبارت از ضاحک باشد

۷- مثنوی در ہجو فوتی (حبیب)

۸- مثنوی در تعریف دیوان مہربان خاں

۹- مثنوی در ہجو فدوی (یہ شیدا کی تصنیف ہے)

۱۰- مثنوی در ہجو حکیم غوث (حبیب)

یہ مثنویاں رچرڈ جونسن میں نہیں ہیں حبیب میں ہیں

۱- ہے خدا کا یہ ایک شمہ نور

۲- ہجو کودک ابتر و ضائع روزگار

رباعیات

۱- خاوند وہ ایسا ہے کہ عالم کو دے

۲- ہر سو تیری تحقیق میں تھے ہم سرگرم

۳- ایوانِ عدالت میں تمھارے یا شاہ (حبیب)

۴- مومن نہیں زنار سے میرے آگاہ (حبیب)

۵- سودا جو کوئی ہے مئے وحدت سے مست

۶- سایا تیرا اے نخلِ امید کہہ و مہ

۷- نادیدنی از بسکہ ہے روئے عالم (حبیب)

۸- تجھ پاس گدا کب آکے ایسا بولا (حبیب)

۹- دکھ تفرقہ کا یاروں کے کچھ مت پوچھو

۱۰- آنکھوں سے پڑا اشک مرے ڈھلتا ہے (حبیب)

۱۱- کوتاہ نہ عمرِ مے پرستی کیجیے (حبیب)

۱۲- آنکھیں کہیں بھوؤں سے کہ حصہ کیجیے (حبیب)

۱۳- ہرنوں کو اے آخون شکاری میرے (حبیب)

۱۴- دلو کہے آخون بلاؤ مجھ کو (حبیب)

۱۵- گر ہجو پہ سودا کی او سے رغبت ہے (حبیب)

۱۶- سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک

۱۷- ہے فوج سے غمزے کی ہمیشہ بیداد

۱۸- مونہہ پھیرے ہے گو دیکھ کے ہم کو عالم

۱۹- ہے زیرِ فلک جتنے کہ یہ موجودات

۲۰- گر مہ سے بلندی میں ہوا تو وہ چند

۲۱- اے نفس دنی حرف تو میرا کر گوش

۲۲- دنیا ہمیں کہتی ہے کہ دل مجھ سے موڑ

۲۳- اے دوست تجھے دل میں تو پاتا ہوں سرور

۲۴- افسوس کریموں میں نہیں یہ دستور

۲۵- ہستی یہ تری وہم کا اک ریشہ ہے

۲۶- سودا شعرا میں ہے بڑائی تجکو

۲۷- سودا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے

۲۸- اس باغ پر از میوہ میں جو آیا ہے

۲۹- سودا دہنِ یار کے ہوتے رکھ ہوش

۳۰- باریک وطویل اتنا ہوا کس کے پوت

۳۱- سودا کی ہے یہ عرض یقین اس کو جان

۳۲- ناطق تو نہ تھا جب تو سنے تھا تب کچھ

۳۴- اے شیخ حرم تک تجھے آنا جانا

۳۵- ہے حرص و ہوا تن کے ترے ہر مو میں

۳۶- میں دیر و حرم ڈھونڈ کے یارو ہارا

۳۷- چاہی تھی بتوں کی آشنائی ہم نے

۳۸- کتنوں کا جہاں میں بہ زر و مال ہے شکر

۳۹- جب سے چمنِ حسن میں تو در آیا

۴۰- اوس چشم و مژہ سے دل دیا تھا اٹکا

۴۱- اوس آتشیں خو سے دل یہ کس کا اٹکا

۴۲- کیا جانے بسا ہے آج کس کے جا کر

۴۳- کل آگے جنھوں کے دکھ سے وقفا پایا

۴۴- تیشہ سے جو کوہکن نے سر کو پٹکا

۴۵- دکھ دل کا کوئی جو تجھ سے کہہ کہہ رووے

۴۶- ولی سے میں دنیا کی کہاں یوں جا کر

قطعات

۱- یوں سنا ہے کہ خسرو یک عصر (حبیب)

۲- در تہنیت عید۔ نوید زیر فلک یوں ہوئی ہے شہرۂ عام

۳- در تہنیت عید۔ علی الصباح جو نکلا میں بندہ خانے سے

۴- در تہنیت عید۔ فلک جناب دربارگاہ میں تیرے

۵- در تہنیت سالگرہ۔ بے شمار ترے عمر سال عالم کے

۶- در تہنیت۔ رہے فلک پہ درخشندگی میں تا میزاں

۷- در تہنیت سالگرہ۔ جو سال عمر ازل سے ترے مقرر ہیں

۸- در تہنیت و تاریخ عروسی مہرباں خاں۔ صبا اس دوست کو جا تہنیت دے

۹- در دعائیہ۔ جہاں میں آب و ہوا کی موافقت تجھ کو

۱۰- در موعظہ۔ سحر تصنیف سودؔا سے مغنی

۱۱- قطعہ آخری۔ عروس شیخ سے پوچھا یہ ایک زاہد نے

۱۲- قطعہ آخری در تعریض بعضے شعرا۔ میں ایک فارسی داں سے کہا کہ اب مجھ کو

۱۳- در تعریض میرؔ۔ ایک مشفق کے گھر گیا تھا میں

۱۴- در تہنیت فتح روہیلہ۔ الٰہی ذات سے تیری جہاں میں

۱۵- در مضحکہ مشتمل بر تاریخ۔ چشم و چراغ جن کے ملا کشمیر کے تھے۔

۱۶- کہا کلام یہ سودؔا سے ایک عاقل نے

۱۷- تہنیت عید۔ ہر ایک عید مہ و خور نے سیم و زر لیکر

۱۸- تاریخ عروسی۔ اہل تنجیم جہاں تک ہیں اب آفاق کے بیچ

۱۹- در تہنیت عید۔ صباحِ عید ہے دل میں خوشی سے مالا مال

۲۰- تہنیت عید۔ یہ روزِ عید ہے آفاق میں ہے رسم قدیم

۲۱- تاریخِ ولادت۔ صبح دم آج دل خلائق کا

۲۲- تہنیت عید الضحیٰ۔ جہاں میں شادی عید الضحیٰ ہے آج کے دن

۲۳- کھیت رہنے سے یارو حافظ کے

۲۴- چل قلم کہہ حسن رضا خاں سے

۲۵- تہنیت عید الضحیٰ۔ خوشی جہاں میں ہے عید الضحیٰ کی آج کے روز

۲۶- مجکو ہر چند نہیں شیعہ وسنّی سے کام

(حبیب میں یہ قطعہ رباعیات کے تحت دیا گیا ہے۔)

۲۷- درعذر دوست داشتنِ سگ۔ ایک عاقل نے یہ سودا سے کہا از سرِ پند

۲۸- قصیدہ و تاریخ بنائے مسجد۔ باعندلیب گلشنِ ایماں برابر است

۲۹- تاریخ تولد۔ مبارک باد ایں فرزند دلبند

۳۰- قطعہ تعریف چاہ۔ چشمہ از حکم آصف الدولہ

۳۱- قطعہ تعریف چاہ۔ شد بہ حکم آصف الدولہ بنا

۳۲- ٹکیٹ رائے مہاراجہ ساخت بستانے

قصیدے

۱- قصیدہ در مدح رچرڈ جونسن

دیکھا نہ جائے اس سے روئے گلرخاں پہ رنگ (یہ قصیدہ کسی مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں)

۲- قصیدہ در نعت حضرت رسالت علیہ السلام

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی (حبیب)

۳- قصیدہ در نعت و منقبت

چہرہ مہر وش ہے ایک سنبل مشکفام دو (حبیب)

۴- قصیدہ در منقبت امیر المومنین

بسانِ دانہ روئیدہ ایکبار گرہ (حبیب)

۵- قصیدہ در منقبت امیر المومنین

سنگ کو اتنے لیے کرتا ہے پانی آسماں (حبیب)

۶- قصیدہ در منقبت امیر المومنین

یار و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک

۷- قصیدہ در منقبت امیر المومنین

اوٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

۸- در منقبت سید الشہدا علیہ السلام

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منت دستار (حبیب)

۹- در منقبت کاظمین علیہ السلام

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک (حبیب)

۱۰- در منقبت امام رضا

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا

۱۱- درمنقبت امام عسکری

عیب پوشی ہو لباسِ چرک سے کیا ننگ ہے (حبیب)

۱۲- درمنقبت صاحب الزماں

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہر عرض حال (حبیب)

۱۳- قصیدہ درمدح عالم گیر ثانی

رکھے ہمیشہ تری تیغ کار کفر تباہ (حبیب)

۱۴- درمدح عالم گیر ثانی

ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب

۱۵- درمدح عالم گیر ثانی

کہے ہے کاتب دوراں سے منشی تقدیر (مصطفائی اور آسی میں یہ قصیدہ عماد الملک کی مدح میں ہے جو ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس قصیدے میں یہ شعر بھی ہے۔

سنا نہیں ہے کہ غازی دیں عماد الملک

جو میر بخشی تھا واں کا سواب ہوا ہے وزیر

۱۶- درمدح نواب عماد الملک

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک (حبیب)

۱۷- درمدح نواب شجاع الدولہ

خوں مرے دل میں نہیں تشنہ ہے گو تیرا ناز

۱۸- درصفت تیر اندازی

احکام پر تیرے نہ کرے کیوں کے کام تیر

۱۹- درمدح نواب شجاع الدولہ

آیا عمل میں تیغ سے تیرے وہ کارزار

۲۰- درمدح آصف الدولہ

تیرے سائے تلے ہے تو وہ نہفت

۲۱- درمدح آصف الدولہ

کیا تجکو بجی مسند دیوانِ وزارت

۲۲- درمدح نواب مرحوم

اشجار کا بستانِ جہاں کے ہے عجب ڈھنگ

۲۳- قصیدہ بہاریہ درمدح نواب سیف الدولہ

برجِ حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار (حبیب)

۲۴- درمدح نواب سیف الدولہ

ہمخوش کا ہو دل تو رہے دہر سے بتنگ (حبیب)

۲۵- درمدح نواب سیف الدولہ

ہے سخن سنج اک جوانِ متین (حبیب)

۲٦- درمدح نواب وزیر آصف الدولہ

کیا قلم کو رقم سے ہے منظور

۲۷- در مدح نسبت خاں

کل حرص نام شخصے سوداؔ پہ مہرباں ہو (حبیب)

۲۸- در مدح نسبت خاں

تاثیر گردش آج کواکب کے صبح کو (حبیب)

۲۹- در مدح آصف الدولہ

گر فلک اب یہ مہرباں ہووے

۳۰- در مدح نواب آصف الدولہ

سوداؔ پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام

۳۱- در نعت

زخمی میں ترا اور گلستاں ہے برابر

۳۲- در تعریف بہ یکے از معاصرین و مدح شاہ خراسان

مستغنی ذاتی نہ مہوس کے ہوں تسخیر

۳۳- در نعت

منکر خلا سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں

۳۴- شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے (حبیب)

۳۵- ہجو مولوی ساجد خارجی

سنا ہے میں یہ کسی نے بہ مدعائے فساد

۳۶- در ہجو اسپ

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پہ سوار (حبیب)

۳۷- ہجو مولوی ساجد خارجی

ساجدا کیوں نہ وہ پرواز کرے تا بہ فلک (مصطفائی میں یہ ہجو ہے لیکن آسی میں نہیں)

۳۸- در مدح طبیب

علم ظنّی ہے طبابت تو یہ سن رکھ ہمدم

غزلیات فارسی

۱- ز دشعلۂ بدل از نفسِ سرود ماغ ما

۲- چوں دل نتواند کہ کند ترکِ وفا را

۳- گر بہ لکنت وا کند یار آں دو لعلِ بستہ را

۴- اے کہ در چشم بہر صورت تو منظوری بیا

۵- من بساطِ عیش خود را بر نچینم تا کجا

۶- کس بروں زاں کوچہ نتواں کرد ایں دلدادہ را

۷- تنہا نہ موج خندہ زند بر بقائے ما

۸- آں شعلہ کہ در خرمنِ موسیٰ شرر اوست

۹- غم ز ایامِ جوانی یادگار ماندہ است

۱۰- سخن ز ما بہ جہاں وز دیگراں گہر ست

۱۱- سدِ رہش زمانہ چو جانہانمی گذاشت

۱۲- دانم کہ عشق ہم چو منے قابل تو نیست

۱۳- جوہرِ آئینہ از تابِ رخش سوختہ است

۱۴- ساختم از حالِ دل آگاہ و یار از دست رفت

۱۵- افسوس پائے عیشِ جہاں را قیام نیست

۱۶- بہ چہرہ راہ خط مشکبار نتواں بست

۱۷- عشق تو ز پروانہ ما تا نہ مگس سوخت

۱۸- در پردہ بہ ما ناز سزاوارِ تو باشد

۱۹- در کشوری کہ ناز و ادا می فروختند

۲۰- شادم اگر بہائے دلم یار بشکند

۲۱- مشہور دلم چو بہ ہمدم دو چار نالد و گرید

۲۲- ہر یکے خواہاں دل از جنس خوباں می شود

۲۳- گردنم را چو بآں تیغ سر و کار افتد

۲۴- دردم ز دوائے تو فزوں شد شدہ باشد

۲۵- تا کارِ من دل شدہ با سلسلہ افتاد

۲۶- آنانکہ بدست تو دلِ زار فروشند

۲۷- نے گلے در باغ رنگ و بوے او در خواب دید

۲۸- سودے ازیں جہانِ خرابی ندید کس

۲۹- زاں دید کہ بر د جلوۂ صیاد در قفس

۳۰- در میکدۂ ما چو رسیدی ز حرم باش

۳۱- جان ستم رسیدہ من داد خواہ دل

۳۲- گہہ کعبہ راز کوے تو بہتر نہ گفتہ ام

۳۳- بچشم مردماں از رہگذار سرمہ می آیم

۳۴- دل را کشید جاناں تا در بر تبسم

۳۵- در قتل گہم آئی و من روے تو بینم

۳۶- ہرگز بجہاں ما غم دستار نداریم

۳۷- از دلم چوں آہ آتشناک می آید بروں

۳۸- لالہ بے دود چراغست چہ می بینی تو

۳۹- دارم من آشنائی کز روز آشنائی

سوداؔ کا اِلحاقی کلام

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مطبوعہ کلیاتِ سوداؔ میں بہت سا کلام دوسرے شاعروں کا ہے۔ یہاں سودا کے تمام الحاقی کلام کی نشان دہی کی گئی ہے۔

مندرجۂ ذیل غزلیں میر سوزؔ کی ہیں: [۱]

۱- دلا دریاے رحمت قطرہ ہے آبِ محمد کا

۲- جب خیال آتا ہے اس دل میں ترے اطوار کا

۳- مل کے اُس بدخو سے اے دل جب تو رسوا ہوے گا

۴- قدرداں بن ہے بہت حال برا شیشے کا

۵- لگے ہے جام جو منہ دل ہے آبِ شیشے کا

۶- تہی لانا مجالس میں نہیں دستور شیشے کا

۷- کریں شمار ہم دل کے یار داغوں کا

---

[۱] انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں دیوانِ سوزؔ کے تین قلمی نسخے ہیں۔ جن کے نمبر حسب ذیل ہیں۔

۱۱۵۵ء ۸۹۱	۱۱۵۵ء ۸۹۱	۱۱۵۵ء ۸۹۱
س ۴۲ دس	س ۴۲ دس	س ۴۲ دس
ن ۱	ن ۲	ن ۳

ان تینوں نسخوں سے کلیاتِ سوداؔ مرتبۂ آسیؔ کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اردوے معلّی کے "میر سوز" نمبر اور قاضی عبدالودود کے ایک مقالے "کلیاتِ سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ" (سویرا، ۲۹) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۸- عشق تھا یا کیا تھا جس سے دل اٹکتا ہی رہا

۹- چہرے پہ نہ یہ نقاب دیکھا

۱۰- جب بادہ خونِ دل ہو تو سیرِ چمن کجا

۱۱- نہ دانہ ساتھ لے صیاد تین نے دام لیتا جا

۱۲- افسوس تم اوروں سے ملورات کو تنہا

۱۳- عشاق تیرے سب سے پر زار تھا سو میں تھا

۱۴- دیکھ کر جو مر گئے ہیں تیری پوروں پر حنا

۱۵- کہتی ہے میرے قتل کو یہ بے وفا حنا

۱۶- نے رستم اب جہاں میں نے سام رہ گیا

۱۷- نہیں پیکاں یہ جو ہر نامہ اُن نے تیر پر لکھا[1]

۱۸- موتی کو بھی ترا کرے احیا پیامِ لب

۱۹- کھولی گرہ جو غنچے کی تو نے تو کیا عجب

۲۰- کر حذر میرا نہیں ہے شیشہ خالی محتسب

۲۱- ہوئے ہیں غنچوں کے دل بے قرار تیرے ہات

۲۲- دین و کفر آنکھوں نے تیری کر دیا اے یار مست

۲۳- رہتے تھے ہم تو شاد نہایت عدم کے بیچ

---

[1] کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں یہ شعر بھی شامل ہے۔

اسی مضمون سے معلوم اس کی سرد مہری ہے
مرا نامہ جو اس نے کاغذِ کشمیر پر لکھا

لیکن یہ شعر دیوانِ سوز کے کسی نسخے میں نہیں ہے۔ مجموعہ نغز (جلد ۱، ص ۶۵) عمدۂ منتخبہ (ص ۱۰۶) اور سخن شعرا (ص ۳۷) میں اعظم خاں اعظم شاگرد محمد نصیر الدین نصیر سے منسوب ہے۔

۲۴- جان عشاق کی لے چھوڑے یہ کر پیار کے بیچ

۲۵- ہوا ہے داغ مرا دل انار کے مانند

۲۶- لذتِ بے رنج ملتی ہے زمانے سے بعید

۲۷- میں چاہتا نہیں دنیا میں عز و جاہ بلند

۲۸- مجھ ساتھ تری دوستی جب ہو گئی آخر

۲۹- صبا حریف لے آئی ہے تو مرے دل پر

۳۰- پیوں ہوں خونِ دل اتنا، تجھے گماں ساغر

۳۱- تپ جائے کیوں کہ عشق کی اے یار تجھ بغیر

۳۲- کاٹتے دل کو ہیں ابرو یار کے تلوار وار

۳۳- کرتا ہوں ترکِ عشق میں یوں پیش و پس ہنوز

۳۴- کب ہم کو ہے بہار میں گلزار کی ہوس

۳۵- بلبل کو ہے ترے سرِ دیوار کا ہلاس

۳۶- یوں دیکھ مرے دیدۂ پُر آب کی گردش

۳۷- رکھتے ہیں ترے زلف کے ہر تار کا خلش

۳۸- آرام پھر کہاں ہے جو ہو دل میں جائے حرص

۳۹- دیکھ لینا ہم کو تیرا یار ہے جب تب غرض

۴۰- سرسبز حسن رکھتی ہے تیرا بہارِ خط

۴۱- تیری آنکھوں کی طرح سے نہ رکھے جام نشاط

۴۲- سمجھے تھے ہم جو دوست تجھے اے میاں غلط

۴۳- اشک کے قطرے سے نیساں کا اثر رکھتی ہے شمع

۴۴- مژگاں کی گر خلش کا بدل ڈھنگ ہے وسیع

۴۵- آتش ہے مرا بوجھ، سمندر نہ ورے داغ

۴۶- نالے سے میں اپنے نہیں اے رشکِ پری داغ

۴۷- عشق کی ہووے تو ہو ہم کو اسیری کا دماغ

۴۸- اب ہو تو نہ ہرگز رہے کنعان میں یوسف

۴۹- میں بتاؤں تم کو یارو گر کرو تدبیر ایک

۵۰- سنبل و زلف سیہ کاکل و شب چاروں ایک

۵۱- رونے سے میرے تابہ کجا دل سے آئے اشک

۵۲- مرا لگتا نہیں اے باغباں تیرے چمن میں دل

۵۳- جب تو چمن سے گھر کو چلا کر کے دید گل

۵۴- جاتا ہے دل تو جائیو ہشیار آج کل

۵۵- سنا ہے اب تو خط آیا ہے، کس اسلوب دیکھیں ہم

۵۶- پیتا ہوں یادِ دوست میں ہر صبح و شام جام

۵۷- کرے ہے عشق کی گرمی سے دل آنند آتش میں

۵۸- لڑیں ہیں کیوں ترے مژگاں و ابروِ یار آپس میں

۵۹- قیس کی آوارگی ہے دل میں سمجھو تو کہوں

۶۰- عاشق ترے ہم نے کیے معلوم بہت ہیں

۶۱- کردے ہے مہر بدکیں افلاک ایک پل میں

۶۲- آپ کوتو گو سمجھتا ہے کہ وہ دانا نہیں

۶۳- اتنا ستم نہ کیجیے مری جان جان جان

۶۴- جاتا ہوں ترے در سے بس اے یار رہا میں

۶۵- بہار اس کی نہیں لگتی ہے اک پاسنگ آنکھوں میں

۶۶- امید ہوگئی کچھ گوشہ گیری دل میں

۶۷- دل کو یہ آرزو ہے صبا کوے یار میں

۶۸- بلبل کہیں، پتنگ کہیں اور ہم کہیں

۶۹- مت پھر تو ساتھ غیر کے، آمان، ہر کہیں

۷۰- یاد میاں اب دل میں تیری دے باتیں نہیں آتی ہیں

۷۱- آنکھوں کو تنک سنبھالو یہ مارتی ہیں راہیں

۷۲- چاہ کے غرق تجھے ہے یہ گماں ترتے ہیں

۷۳- اس سروقد کی دوستی میں کچھ ثمر نہیں

۷۴- امید وصل جز طمع خام کچھ نہیں

۷۵- مجھے معلوم یوں ہوتا ہے میری بھی پھنسی آنکھیں

۷۶- دماغ اصلاح دینے کا نہیں کہہ دو ہلالی کو

۷۷- چہ بے گنہ چہ گنہگار یہ نہ ہو وہ ہو

۷۸- یوں نہ چاہے گا دلِ آگاہ یہ، دوہ نہ ہو

۷۹- حالِ دل پوچھے ہے کیا مجھ سے مرا اے یار تو

۸۰- لہو اس چشم کا پوچھے سے ناصح بند کیوں کر ہو

۸۱- کرر کھا تیغِ نگہ نے دلِ فگار آئینے کو

۸۲- تمھارے فہم میں پیارے جو ہم ہیں غیر یوں سمجھو

۸۳- لینے لگا ہے اب تو مرا نام گاہ گاہ

۸۴- نہ دے عاشق نہ دے معشوق جن میں ہو نہ کچھ خامی

۸۵- بولا وہ جسے تیری تصویر نظر آئی

۸۶- یار کا جلوہ مرے کیا شہرۂ آفاق ہے

۸۷- سنگ پر چینی کو پٹکو گر صدا منظور ہے

۸۸- میں تجھ سے کہہ نہیں سکتا سخن اے یار نازک ہے

۸۹- کیا کہیے جو اس شوخ کی اوقات ہوئی ہے

۹۰- محیطِ دل ہوئی اے شوخ تیری چاہ پھرتی ہے

۹۱- جرم کے عفو کی تدبیر بہت اچھی ہے

۹۲- عاشق تھا کبھی تجھ پہ پھر دل تو وہی ہے

۹۳- کیا کہیے اپنا حال جو کچھ ہے سو ہے سو ہے

۹۴- گزشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے

۹۵- کیا کہیے وہ بت آہ کس آئین تمکیں ہے

۹۶- دل جنسِ فروشندۂ بازارِ ہنر ہے

۹۷- پھوٹے وہ آنکھ جس میں نہ ذرہ بھی نم رہے

۹۸- ناصح جفائے عشق اگر میں سہی سہی

۹۹- بیمار کی آج اپنے سرشام خبر لے

۱۰۰- اے تڑپ چین تو بسمل کو کہیں تل بھر دے

۱۰۱- دنیا تمام گردشِ افلاک سے بنی

۱۰۲- جب اس چمن سے چھوڑ کے ہم آشیاں چلے

۱۰۳- جاتے ہیں لوگ قافلے کے پیش وپس چلے

۱۰۴- یار جس سے خوش رہے مجکو وہ آئیں چاہیے

۱۰۵- یا تو جاتے رہے اے یار ہمیں دنیا سے

۱۰۶- نہ تیرے پاٹ دامن کا نہ اس کی آستیں ڈوبی

۱۰۷- بیوفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی

۱۰۸- معتقد ہرگز نہیں ہیں کفر اور اسلام کے

۱۰۹- کہوں کیا بات اس بے پیر دل کی

۱۱۰- صورت ہمیں اُس مہر کی پہچان اگر آوے

۱۱۱- لاکھ طوفاں بہ جہاں ہم کو فلک دکھلاوے

۱۱۲- وہ غل ہے جس کا موجب تو ہے ورنہ شور بہتیرے

۱۱۳- یارب کہیں سے گرمی بازار بھیج دے

۱۱۴- جب سے کہ چشم خلق صنم تجھ سے جا لگی

۱۱۵- مری آنکھوں میں یاروا شک ایسا موج مارے ہے

۱۱۶- ہم کو حنا جو قتل کرا اور آپ بچ رہی

۱۱۷- ''مطلعات'' کے تحت کلیات سودا مرتبہ آسی میں یہ مطلع بھی ہے۔

کسو نے روم لی قسمت میں کوئی شام لے آیا

ہمیں لے کچھ نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا

قائم کا شعر:

نسخۂ آسی میں یہ شعر بھی شامل ہے:

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ

کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

یہ شعر نسخۂ رچرڈ جونسن میں نہیں۔ جب کہ پوری غزل موجود ہے۔ یہ شعر دراصل محمد قیام الدین قائم کا ہے۔ انھوں نے مخزنِ نکات میں اپنے ترجمے میں یہ شعر نقل کیا ہے [۱]

اور ان کے دیوان میں بھی یہ شعر موجود ہے۔ [۲] مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ نسخۂ حبیب میں بالکل اسی مفہوم کا یہ شعر ہے۔

کعبہ ڈھا تو غم نہ کر اے شیخ بت شکن

دل برہمن کا ہے کہ بنایا نہ جائے گا

یہ شعر کسی اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ میرا خیال ہے کہ قائم کے شعر کی مقبولیت دیکھ کر سودا نے اپنا یہ شعر قلم زد کر دیا ہوگا۔

---

۱ مخزنِ نکات، ص ۷۹

۲ دیوانِ قائم، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، دہلی، ۱۹۶۳، ص ۷

مجذوبؔ کا کلام:

کچھ اشعار ایسے ہیں جو مطبوعہ کلیات سودا میں بھی ملتے ہیں اور بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں میرزا غلام حیدر مجذوب سے منسوب کیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ سودا میں یہ غزل ہے۔

ہم نے بھی دیر و کعبہ سے دن چار کی ہوس

یہ غزل سوداؔ کے کسی معتبر دیوان میں نہیں ہے۔ میر حسن نے اس غزل کا ایک شعر:

گھر امن کا اسی کو ملا آسماں تلے
جس نے جہاں میں آن کے مسمار کی ہوس

مجذوبؔ کے نام سے درج کیا ہے۔[1] جس کا مطلب ہے کہ یہ غزل مجذوبؔ کی ہے۔ مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ مجذوبؔ کا دیوان کہیں نہیں ملتا۔

وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

میر حسن[2]، قاسمؔ[3] اور سرورؔ[4] نے یہ غزل مجذوبؔ سے منسوب کی ہے۔

مطبوعہ کلیات سوداؔ میں یہ دو شعر ہیں۔

چاہو مدد جو غیر سے اغیار کے لیے
تو میں بھی یار کم نہیں دو چار کے لیے

۱؎ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۱
۲؎ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۱
۳؎ مجموعہ نغز، ۲، ص ۱۵۵
۴؎ عمدۂ منتخبہ، ص ۶۶۴

طوبیٰ تلے میں بیٹھ کے رووٴں گا زار زار

جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لیے

میر حسن[1]، قاسم[2]، سرور[3] اور قدرت اللہ شوق[4] نے یہ دونوں اشعار مجذوبؔ کے نام سے درج کیے ہیں۔

کب کسی دل سوختہ سے ساز کرتی ہے حنا

ان دنوں ہاتھوں پہ تیرے ناز کرتی ہے حنا

یہ غزل نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن دونوں میں نہیں ہے۔ قدرت اللہ شوق نے اس غزل کے دو اشعار مجذوبؔ کے ترجمے میں نقل کیے ہیں۔[5] جس کا مطلب ہے یہ غزل مجذوبؔ کی ہے۔

فتح علی شیداؔ

مطبوعہ کلیات میں غزل جس کا مطلع ہے۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

سوداؔ کے ایک شاگرد فتح علی شیداؔ کی ہے۔ میر حسن نے شیدا کے نمونۂ کلام میں اس غزل کا مطلع اور ایک شعر نقل کیا ہے۔[6] عشقیؔ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ میر حسن یہ غزل شیداؔ کی بتاتے ہیں۔ لیکن بعض اہل سخن ذوقیؔ سے منسوب کرتے ہیں۔[7] ان دونوں میں

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۰
[2] مجموعۂ نغز، ۲، ص ۱۵۵
[3] عمدۂ منتخبہ، ص ص ۶۶۴-۶۶۵
[4] طبقات الشعرا (قلمی) ورق ۱۶۸ ب
[5] طبقات الشعرا (قلمی) ورق ۱۶۸ ب
[6] تذکرہ شعرائے اردو، ص ۹۷
[7] دو تذکرے (عشقی)، ۲، ص ۲۸

سے یہ کس کی غزل ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ سوؔدا کی نہیں ہے۔ کلیاتِ سوؔدا میں ایک اور غزل ہے۔

میں تو ملوں گا ناصح باتیں یہ تینوں جان کے

گو کہ عدو ہیں خوبرو دل کے جگر کے جان کے

قاسمؔ نے یہ غزل مجذوبؔ سے منسوب کی ہے اور لکھا ہے کہ میں نے یہ غزل کلیاتِ سوؔدا میں بھی دیکھی ہے۔ اغلب ہے کہ غلطی سے اس میں شامل ہوگئی ہو یا ممکن ہے کہ واقعی سودا کی ہو۔[1]

انعام اللہ خاں یقیںؔ

مطبوعہ کلیاتِ سوؔدا میں ایک غزل ہے۔ جس میں یہ تین شعر بھی شامل ہیں۔

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے

اپنا ہی تو فریفتہ ہووے، خدا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور

آیندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

خلوت ہو اور شراب ہو، معشوق سامنے

زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ان تینوں شعروں کے ساتھ بہت دل چسپ معاملہ ہے۔ کلیاتِ سوؔدا میں نو شعروں کی غزل ہے۔ جس میں یہ اشعار ہیں۔ دیوان یقین میں پانچ شعروں کی غزل میں یہ اشعار ہیں۔ دونوں کے پہلے دو شعر بالکل اسی طرح ہیں البتہ تیسرے شعر کا پہلا مصرع سودا کے ہاں اس طرح ہے۔

---

[1] مجموعۂ نغز، ۱، ص۳۵۶

گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو

میرؔ نے نکات الشعرا میں یہ شعر ''بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے'' سوداؔ کے ذکر میں نقل کیا ہے۔ [۱] فتح علی حسینی گردیزی نے سودا کے ترجمے میں اس غزل کے چار شعر دیے ہیں جن میں دو شعر یہ بھی ہیں۔ ''قاتل ہماری نعش کی تشہیر ہے ضرور'' اور ''گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو''۔ [۲] نسخۂ حبیب میں یہ پوری غزل موجود ہے۔ مگر نسخۂ رچرڈ جونسن میں نہیں۔ سودا نے ایک مخمس میں اس غزل کو تضمین کیا تھا جس میں یہ تینوں شعر بھی موجود ہیں۔ اور یہ مخمس کلیاتِ سوداؔ میں شامل ہے۔ یہ تمام شہادتیں اس حق میں ہیں کہ یہ تینوں اشعار سوداؔ کے ہیں۔ اس کے برعکس یہ تینوں اشعار یقین کی ایک غزل میں بھی موجود ہیں۔ [۳] یقین پانچ اشعار کی غزل کہتے تھے۔ یہ غزل بھی پانچ اشعار کی ہے۔ مطبوعہ دیوان کے علاوہ میں نے دیوانِ یقین کے جتنے بھی قلمی نسخے دیکھے ہیں ان میں یہ اشعار موجود ہیں۔ مزید برآں یہ کہ لچھمی نرائن شفیق نے تینوں شعر یقین کے نام سے درج کیے ہیں۔ [۴] اور لکھا ہے کہ فتح علی خان نے یہ دو شعر اور میر نے مطلع سودا کے ترجمے میں لکھا ہے مگر میں نے یقین کے اکثر دیوانوں میں یہ اشعار دیکھے ہیں۔ واللہ اعلم۔ لیکن ''نہج بستگی'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار یقیناً یقین کے ہیں۔ جو کوئی ان دونوں صاحبان کی طرزِ سخن گوئی سے واقف ہے وہ دونوں کی زبان پہچانتا ہے۔ (فارسی سے ترجمہ) [۵]

میر تقی میرؔ

مطبوعہ کلیاتِ سوداؔ میں مطلعات کے تحت یہ مطلع بھی دیا گیا ہے۔

اعجاز منہ تکے ہے ترے لب کے کام کا
کیا ذکر ہے مسیح علیہ السلام کا

۱۔ نکات الشعرا، ص ۳۹
۲۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۷۹
۳۔ دیوانِ یقین، مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء، ص ۴۹
۴۔ چمنستانِ شعرا، ص ۱۹۵
۵۔ ایضاً

یہ مطلع میر تقی میر کا ہے اور ان کے دیوانِ سوم میں موجود ہے۔[۱]

شیخ قلندر بخش جرأت

کلیاتِ سودا میں "افراد" کے تحت جو اشعار دیے گئے ہیں۔ اُن میں مطلع جرأت کا ہے۔

کل جو بیٹھا پاس میں اک جا ترے ہم نام کے
رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے[۲]

قصائد

۱- نسخۂ آسی میں ایک قصیدہ "مثنوی در تعریف چاہ مومن خاں" بھی شامل ہے۔ یہ قصیدہ احسن اللہ خاں بیان شاگرد مرزا مظہر جان جاناں کا ہے۔ میری نظر سے دیوانِ بیان کے دو قلمی نسخے گزرے ہیں۔ یہ قصیدہ دونوں میں موجود ہے۔[۳]

ہجویات

۲- "مثنوی در ہجو فدوی متوطن پنجاب کہ دراصل بقال بچہ بود"۔ کلیاتِ آسی میں شامل ہے۔ میر حسن[۴] علی لطف[۵] نے اس کا مصنف میر فتح علی شیدا کو بتایا ہے۔ ابوالحسن امیر الدین نے شیدا کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انھوں نے سودا کے حریف فدوی لاہوری کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ جو فدوی کے ترجمے میں نقل کی جائے گی۔[۶] لیکن فدوی کے ترجمے میں یہ ہجو نہیں دی گئی۔ بظاہر ابوالحسن کا اشارہ اسی ہجو کی طرف ہے۔ شیخ چاند نے بہت تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی فتح علی شیدا کی

---

۱ کلیاتِ میر مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۴۸ء، ص ۳۷۴
۲ کلیاتِ شیخ قلندر بخش جرأت، لکھنؤ، ۱۸۸۳ء، ص ۱۵۲
۳ دیوانِ بیان (قلمی) آصفیہ اور دیوانِ بیان (قلمی) سالار جنگ
۴ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۲۰
۵ تذکرہ گلزارِ ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند، ص ۱۹۰
۶ تذکرہ مسرت افزا بحوالہ معاصر، حصہ ۷، ص ۱۱۵

ہے۔[۱] لیکن مصحفی اسے سودا ہی کی تصنیف بتاتے ہیں۔ [۲] قاضی عبدالودود کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ سودا کی تصنیف ہے۔[۳] یہ مثنوی رچرڈ جونسن میں بھی شامل ہے اور اس میں یہ دو شعر اس طرح ہیں۔

حضرت سودا تلک جو مرے استاد ہیں
شعر پہ ان کے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں

———

بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انھیں شیدا خاموش
کیجیے اس سے سخن ہووے جسے عقل و ہوش

یہ دونوں شعر اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ یہ مثنوی فتح علی شیدا ہی کی ہے۔

۳۔ مثنوی در ہجو میر زا فیضو"۔

جس کا پہلا شعر ہے۔

آہ واویلا ز دستِ روز گار
توش خانوں میں یہ غم ہے روبکار

یہ ہجو سودا کے کسی معتبر کلیات میں نہیں۔ لیکن کریم الدین نے سودا کے ترجمے میں نقل کی ہے۔[۴] جو غلط ہے۔ دراصل اس کے مصنف احسن اللہ خاں بیان ہیں۔ یہ ہجو اُن کے قلمی دیوان میں موجود ہے۔[۵]

---

۱ سودا، ص ص ۱۱۱-۱۱۲
۲ تذکرہ ہندی، ص ۱۶۶
۳ سویرا، ۲۹، ص ۵۱
۴ طبقات الشعرا، کریم الدین، ص ۱۰۳
۵ دیوان بیان (قلمی) سالار جنگ

بعض تذکرہ نگاروں نے احسن اللہ خاں بیاؔن کے ترجمے میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ [1]

۴- ''مسدس در ہجو مرزا علی''۔ اس کا پہلا بند ہے۔

اک قصہ میں سنا تھا مردم سے یہ قضا را
بیت الخلا گیا تھا مرزا علی بچارا
ناگاہ کھڈی اوپر گیڈر نے جا پچھاڑا
تب رو کے اُس جگہ پر لونڈی کے تئیں پکارا
دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

کلیاتِ سوؔدا کے مطبوعہ نسخے میں اس مخمس کے تین بند موجود ہیں۔ لیکن یہ میر حسن کا مخمس ہے اور ان کے قلمی دیوان میں پورا نقل ہوا ہے۔ [2]

۵- مخمس جس کا پہلا مصرع ہے۔

نشو و نمائے باغ جہاں سے رمیدہ ہوں

سوؔدا کا نہیں۔ اگر چہ مطبوعہ کلیات میں شامل ہے۔ نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن میں بھی یہ مخمس نہیں ہے۔ قیام الدین قائمؔ نے سودا کے شاگرد بندرابن راقمؔ کے ترجمے میں اس مخمس کے سات بند نقل کیے ہیں۔ [3] غالباً غلط فہمی کی وجہ سے۔ سودا کی غزل ہے جسے راقمؔ نے اس مخمس میں تضمین کیا ہے۔

۶- مخمس جس کا پہلا مصرع ہے:

ے کشو بخشو ہو کیوں مجھ دل افگار کے ساتھ

---

[1] مثلاً تذکرہ شعرائے اردو، ص ۲۷ -- مجموعۂ نغز، ۱، ص ۱۲۴ وغیرہ۔
[2] دیوانِ میر حسن (قلمی) رام پور
[3] مخزن نکات، ص ص ۵۷-۵۸

اس میں قائم کی غزل تضمین کی گئی ہے۔ لیکن مقطع میں سودا کا نام ہے۔ اس مخمس کا مصنف کون ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن دونوں میں یہ مخمس نہیں ہے۔ جب تک کسی معتبر ذرائع سے تصدیق نہیں ہو جاتی۔ اسے سودا کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔

رباعیات

۷۔ یہ رباعی احسن اللہ خاں بیان کی ہے۔

کیا زلف میں اس شوخ کے تھی دبکی صبح
جوں شام سے ہوتی ہے کسی شب کی صبح
جب زلف کو میں ہاتھ لگایا اودھر
ہمسایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح

یہ رباعی نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن میں نہیں۔ جب کہ دیوانِ بیان میں موجود ہے۔ [1]

۸۔ افسوس کہوں میں کس سے اپنے گھٹ کی
قالب سے پھرے ہے روح بھٹکی بھٹکی
اس آنکھ نے چین جی سے کھویا سودا
یہ خانہ خراب جس سے اٹکی اٹکی

یہ رباعی بھی دونوں قلمی نسخوں میں نہیں ملتی جب کہ مطبوعہ نسخے میں شامل ہے۔ قدرت اللہ شوق نے اسے غلام حیدر مجذوب کے ترجمے میں نقل کیا ہے۔ [2]

---

[1] دیوانِ بیان (قلمی) سالار جنگ
[2] طبقات الشعراء، ورق ۱۶۷ الف

مثنویاں

۹- مثنوی تعریف چھڑی۔ جس کا پہلا شعر ہے۔

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز

میر حسن اسے فضل علی ممتاز شاگرد سودا کی تصنیف بتاتے ہیں۔ انھوں نے ممتاز کے ترجمے میں لکھا ہے۔ ''یک مثنوی، مسمّٰی بہ لاٹھی نامہ خوب گفتہ کہ سلسلۂ اورا تا بہ عصائے کلیم رسانیدہ''۔ اور اس مثنوی کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ پہلا اس طرح ہے:

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز[۱]

علی ابراہیم ممتاز کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''مثنوی در تعریف لاٹھی بہ بحر مخزن اسرار گفتہ، فکرش استوار ست''۔ ابراہیم نے بھی مثنوی کے اشعار نقل کیے ہیں۔[۲]

قیام الدین قائم کی سات مثنویاں کلیاتِ سودا میں شامل ہوگئی ہیں۔ دیوان قائم [۳] کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور اور ایک انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ میں نے صرف رام پور کا نسخہ دیکھا ہے۔ جس میں یہ تمام مثنویاں موجود ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری کے نسخے کے لیے نثار احمد فاروقی کے ایک مقالے سے استفادہ کیا گیا ہے۔[۴] یہ تمام مثنویاں قائم کی ہیں۔

۱۰- مثنوی در ہجو موسم سرما

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

۱؎ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۶۰
۲؎ گلزار ابراہیم مع گلشنِ ہند، ص ۲۳۶
۳؎ دیوانِ قائم (قلمی) رام پور
۴؎ مثنویاتِ قائم چاند پوری، نقوش، لاہور، دسمبر ۱۹۶۱، ص ص ۲۵۳-۲۶۱

۱۱- حکایت

سلف کے زمانے کا تاریخ داں
یہ لکھتا ہے احوالِ وارفتگاں

۱۲- حکایت

سنا ہے کہ اک مرد آزادہ طور
جز اپنے نہ رکھتا تھا اسباب اور

۱۳- حکایت

سنا جائے ہے ایک مہوس کا حال
کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

۱۴- حکایت

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل
تپ دل دے بقدر خواہشِ دل

۱۵- درہجو طفل پتنگ باز

ایک لونڈا پتنگ کا ہے کھلاڑ
دور میں اوس کے ...... ہیں ہزار

یہ مثنوی نسخۂ مصطفائی (ص ص ۱۴۷-۱۴۸) میں شامل ہے۔ لیکن آسی میں نہیں۔

۱۶- حکایت

سنا ہے کہ ایک مردِ اہلِ طریق
نہایت ہی واقع ہوا تھا خلیق

یہ مثنوی بھی نسخۂ مصطفائی (ص ص ۱۶۰-۱۶۱) میں شامل ہے۔ لیکن آسی میں نہیں۔

آسی میں اٹھارہ مرثیے ایسے ہیں جس میں مہرباں خاں نام بطور مصنف آیا ہے۔ بظاہر یہ مہرباں خاں رند ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ میر سوز ان کو اشعار کہہ کر دیا کرتے تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں دیوانِ رند کا ایک نسخہ ہے۔ جس میں وہ تمام اشعار ہیں جو دیوان میر سوز میں موجود ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ سودا نے مہربان خاں کے نام سے مرثیے کہے ہوں اور بعد میں اپنے دیوان میں شامل کر لیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور نے کہے ہوں اور غلطی سے کلیاتِ سودا میں شامل ہو گئے۔ بہر حال مزید تحقیق کے بغیر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ مرثیے کس کے زائیدۂ فکر ہیں۔ زیرِ بحث مرثیے یہ ہیں۔

۱- کہتا ہے غم ہمیں نہ کسی دم سے پوچھیے
۲- نکلا وطن سے جو ہونے رواں حسین غریب
۳- کرتی ہیں بانو یہ زاری یا رسول
۴- غم ہے مجنوں حسین و دل عالم وادی
۵- گیا گودی میں جب مرجھائے اصغر
۶- مقبول حق ہے جس کو کچھ غم حسین کا ہے
۷- ہائے دے حیدر کے پیارے کیا ہوئے
۸- سن اے گردوں اگر تو دوں نہ ہوتا
۹- ہے ایک روایت ز روایات پُر از غم
۱۰- کافراں آلِ محمد پہ ستم کیا کیتا
۱۱- اے قوم ٹک سنو تو بھلا ہائے ہائے ہائے
۱۲- بانو یوں کہتی ہیں سرور کیا ہوا

۱۳- ماں اصغر کی کہتی ہے رو رو بچے کے سوجانے کو

۱۴- کیوں مضطرب الحال نسیم سحری ہے

۱۵- بنتِ نبی فاطمہ کہتی ہیں اے ذوالجلال

۱۶- رو وے وہ آل نبی سے جسے محبت ہے

۱۷- دل خیر النسا جس دم کراہا

۱۸- دل جو پوچھا میں اپنے کیوں نہیں ہے تجکو چین

سودا کا غیر مطبوعہ کلام

اس عنوان کے تحت سودا کا ایسا کلام یکجا کیا گیا ہے جو نسخۂ حبیب اور نسخۂ رچرڈ جونسن میں موجود ہے لیکن کسی مطبوعہ کلیات میں نہیں ملتا۔ اس میں مزید دو قلمی نسخوں کے زائد اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان دونوں نسخوں کا تعارف قاضی عبدالودود نے کرایا ہے۔ پہلا نسخہ ۱۲۱۲ فصلی میں کتابت ہوا تھا۔ اس پر قاضی صاحب کا مضمون (سویرا، ۲۹) میں شائع ہوا تھا۔ اس نسخے کا حوالہ "نراین" کے نام سے دیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کا ہے۔ (خدا بخش) اس پر قاضی صاحب کا مضمون (نوائے ادب، جولائی ۱۹۶۱ء) شائع ہوا تھا۔ میں نے اصل نسخے نہیں دیکھے بلکہ انہی مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

اشعارِ غزلیات

۱۔ سونپا ہے کیا جنوں نے گریباں کو مرے
لیتا ہے اب حساب جو یہ تار تار کا (حبیب، رچرڈ جونسن، خدا بخش)

۲۔ جو کہ ظالم ہو وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں
سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو شمشیر کا (حبیب، رچرڈ جونسن، خدا بخش)

۳۔ آتی ہے تجھ گلی سے پریشاں صدائے آہ
شاید کسی کا شیشۂ دل چور ہو گیا (رچرڈ جونسن، حبیب میں یہ غزل نہیں)

مصطفائی اور آسی میں اسی قافیے کا دوسرا شعر ہے جو رچرڈ جونسن میں نہیں۔ شعر یہ ہے۔

جا ہی بھرا تھا اس صفِ مژگاں سے دل مرا

پر زخم یہ اٹھائے کہ بس چور ہوگیا

۴۔ کن نے دیکھا نہ تجھے یوں کہ گلی میں تیری

ہاتھ اپنے وہ سرو سینہ پہ مارا نہ کیا (رچرڈ جونسن، حبیب میں یہ غزل نہیں)

مصطفائی اور آسی میں ایک غزل کا مقطع ہے

جلاتی ہے جگر بن یار اتنا بے خوری سوداؔ

پیے ہیں جام گویا بزم میں احباب آتش کا

حبیب میں یہ مقطع دوسرا ہے۔

۵۔ ہوائے رنگ پر میرے نہ چھوٹے کیوں کے اے سوداؔ

جلے ہے داغ دل ایسا کہ جوں مہتاب آتش کا (حبیب)

مصطفائی اور آسی میں ایک مقطع ہے۔

پروانہ شمع رو پر کیوں کر نہ ہووے سوداؔ

شعلے کے گرد پھرنا کب کام ہے مگس کا

حبیب میں اسی قافیے کا دوسرا مقطع ہے

۶۔ سوداؔ کے سوزِ دل کو بے سوزِ دل نہ سمجھے

پروانے کا سمجھنا کیا ہوش ہے مگس کا (حبیب)

۷۔ اگر دنیا میں اب یونہیں بجن رسمِ وفا ہوگا

تو کس امید پر کوئی کسی سے آشنا ہوگا (رچرڈ جونسن، حبیب)

جو یہ منظور ہے تم کو مرا دل لے کے جی لینا

گیا اک مجھ سا دنیا سے ترے صدقے گیا ہوگا (رچرڈ جونسن، حبیب) (کذا)

۸۔ یاں تک میرے مشہد سے ہے تشنہ لبی پیدا
اوس سمت جو ہو گذرا جلاد بہت رویا (حبیب)

۹۔ نخلِ حیات اپنا گلشن میں باغباں نے
بویا تو تھا ہوس کر، لیکن نہ پال آیا (حبیب)

۱۰۔ کعبہ ڈھا تو غم نہ کر اے شیخ بت شکن
دل برہمن کا ہے کہ بنایا نہ جائے گا (حبیب)

۱۱۔ سودا سے یہ کہا میں "دل اس طرح سے کھونا؟"
کہنے لگا کہ "ناداں، کیا پوچھتا ہے ہونا؟" (نراین)

۱۲۔ گر سلطنت سلیماں ہے گی محیطِ عالم
ہم نے بھی اپنے دل کا گھیرا ہے ایک کونا (نراین)

حسب ذیل غزلیں صرف نرائن میں ہیں۔

۱۳۔ لہو ہے جوش میں، خونخوار سے یہی کہنا
اجل تو یار کی تلوار سے یہی کہنا

۱۴۔ عیب ڈرے ہے، بہر وجہ روبہ صحت ہے
طبیبِ عشق کے بیمار سے یہی کہنا

۱۵۔ صبا میں کیا کروں؟ نہیں چھوڑتا مجھے صیاد
قفس میں بند ہوں، گلزار سے یہی کہنا

۱۶۔ نہ جی کو امن، نہ دل کو ہے چین اے قاصد
پیام جا کے مرے یار سے یہی کہنا

۱۷۔ غرورِ حسن سے گر اپنے وہ سنے نہ یہ بات

تو اس کے تو در و دیوار سے یہی کہنا

۱۸۔ بہار جاتی ہے ساقی پہنچ تو سے لے کر
زبانی سودا کے خمار سے یہی کہنا

۱۹۔ پہلو سے میرے صبح دلدار اٹھ گیا
روزِ وصال کر کے شب تار اٹھ گیا

۲۰۔ آہ و فغاں کی آج جو آتی نہیں صدا
شاید ترا جہاں سے یہ بیمار اُٹھ گیا

۲۱۔ لائق نہ تھا یہ سینہ ترے زخمِ تیغ کا
پر اس طرف بھی ہاتھ ترا یار اُٹھ گیا

۲۲۔ بدنام تو عبث مجھے کرتا ہے ناصحا
مدّت ہوئی بتوں سے سروکار اُٹھ گیا

۲۳۔ تو رہ جہاں میں اے گلِ گلزار کیا ہے غم
مجھ سا جو تیرے کوچے سے اک خار اُٹھ گیا

۲۴۔ غیروں کو دیکھ بیٹھے ہوئے بزم میں تری
جب کچھ نہ بس چلا تو میں ناچار اُٹھ گیا

۲۵۔ وعدے سے پھیر دینے کو دل لے گیا تھا شوخ
سودا نے جب کہ مانگا کر انکار اُٹھ گیا

۲۶۔ تمنا کی انکھیاں نے سجن ہمنا کا دل جھٹ پٹ لیا
کیونکر ملے ہمنا کو وہ اب ظالماں نے بٹ لیا

۲۷۔ دستا نہیں کوئی اور سو ہمنا کو ست کاں جائیں ہم؟
سب جگ کے اب خوباں منیں ہمنا تمن کو چھٹ لیا

۲۸۔ ہمنا کو ناصح مت ڈرا جیو جان کے جانے سیتی
جب اس گلی میں پگ رکھا پہلے ہمن سر کٹ لیا
۲۹۔ وہ دل کہ قیمت جس کی میں ملتا تھا ہمنا کو دو جگ
افسوس ظالم نے نپٹ مولاں میں ہم سے گھٹ لیا
۳۰۔ مستی ہمن کو اس سبب زیادہ رقیباں سے ہوئی
جب لے چکا پیالہ سجن اس کا ہمن تلچھٹ لیا
۳۱۔ مجلس میں عشاق کی اس شوخ نے مدھ کی جگہ (کذا)
دل کے رکت کا گھونٹ پر گھونٹ آن کر غٹ لیا (کذا)
۳۲۔ زلفاں کو ساجن کی ہمن سودا یہ دل دیتے بنی
وہ بانکاں کیا قہر ہیں آخر اسے کر لٹ لیا
۳۳۔ آنکھوں سے جب کہ آنسو گلرنگ ہو کے نکلا
سینے سے میرے نالہ دل تنگ ہو کے نکلا
۳۴۔ کیا دل پر اپنے سختی ایّام کی کہوں میں
سمجھا تھا جس کو شیشہ وہ سنگ ہو کے نکلا
۳۵۔ یاں تک خیال دل میں اس زلف کا گھٹا ہے
آنسو تلک زمیں سے شبرنگ ہو کے نکلا
۳۶۔ دشمن حواس کا ہے، اس دلربا کا کوچہ
آیا جو اس گلی میں چت بھنگ ہو کے نکلا
۳۷۔ راہِ طلب میں ماندا چل دو قدم ہوا یہ
گویا کہ میں ہزاروں فرسنگ ہو کے نکلا
۳۸۔ زاہد بہت ہی نازاں تھا صومعے پر اپنے

میخانہ دیکھ میرا وہ دنگ ہو کے نکلا

۳۹۔ کہتے تھے ہم تو، سودا کر پاس آبرو کا
آخر تو اس کے گھر سے بے ننگ ہو کے نکلا

۴۰۔ سانجھ کو آئے تھے گلشن میں، سویرا نہ لیا
باغباں باغ میں ہم تیرے بسیرا نہ لیا

۴۱۔ عشق لایا تھا دل و دین تلک اس کی نذر
جی سوا حسن نے کچھ یار کے میرا نہ لیا

۴۲۔ پہنچ کر منزلِ مقصود کو تو نے افسوس
آسرا دیکھ کے دیوار کا ڈیرا نہ لیا

۴۳۔ غیرتِ عشق میں دل دے کے کوئی لیتا ہے؟
ہم سے گو یار نے سو بار اسے پھیرا، نہ لیا

۴۴۔ آج کس منہ (سے) تو کرتا ہے بڑائی سودا
ان نے اب تک تو کبھی نام بھی تیرا نہ لیا

۴۵۔ اوس مکھڑے کے حضور کسے بھاوے آفتاب
یہ دل لگو نہیں، گرمی کہاں پاوے آفتاب (حبیب، رچرڈ جانسن، خدا بخش، نراین)

یہ غزل صرف نراین میں ہے اور کسی نسخے میں نہیں۔

۴۶۔ آہِ سوزاں نے کیا داغ جگر آخرِ شب
شمع کا تابہ قدم پہنچے ہے سر آخرِ شب

۴۷۔ پوچھتے کیا ہو مرے دیدۂ تر کا احوال
شام کو اشک ہے تو خونِ جگر آخرِ شب

۴۸۔ خون ہوں رشک سے ظالم کہ ترے کو میں نسیم

کرے ہے بھر کے دمِ سرد گزر آخرِ شب

۴۹۔ ساقیا جام کو دے غسل کہ ہے صبح کو عید
پہنچی اس ماہ کی آ مجھ کو خبر آخرِ شب

۵۰۔ یار سودا سے کہے ہے تیں ہوں کس طرح، کہ وہ (کذا)
گھورے ہے مجھ کو باندازِ دگر آخر شب[1]

۵۱۔ بہادر پائے خوں مجھ چشم سے یاں تک کہ مژگاں کی
لگی ہے ملنے یارو پنجہ مرجان میں صورت (حبیب، نراین)

۵۲۔ جب تک ہے جہاں میں گل وگلزار سلامت
یارب وہ رہے گوشۂ دستار سلامت (حبیب، خدابخش)

یہ تین شعر صرف نراین میں ہیں۔

۵۳۔ ہاتھ سے جس کے گریباں ہے مرا چاک پرست
آستیں اس کی نہیں دیدۂ نمناک پرست

۵۴۔ اس قدر داد طلب کس کی ہے خود سے ظالم
کہ گریبان ہے شعلے کا سدا چاک پرست

۵۵۔ ناتوانی کا ہماری ہو نہ جہاں شرح و بیاں
برق واں آن کے ہووے خس وخاشاک پرست

یہ غزل صرف خدابخش میں ہے۔

---

[1] اس زمین میں میر سوز کی بھی غزل ہے۔ مقطع کا دوسرا مصرع سوز اور سودا دونوں کے ہاں موجود ہے۔ میر سوز کا مقطع ہے۔

سنیو کہتا ہے رہوں سوز کے گھر کیونکر واہ
گھورے ہے مجھ کو بہ انداز دگر آخرِ شب

۵۶۔ کرتا ہوں تیرے ظلم سے ہر بار الغیاث
یکبار تیرے دل میں نہیں کارالغیاث

۵۷۔ تیری نگہ کو دیکھ کے گردش میں آسماں
کرتا پھرے ہے شعبدہ دور الغیاث (کذا)

۵۸۔ مغرور حسن کا ہے تجھے یہ کہاں خبر
یعنی کہ کون ہے پسِ دیوار الغیاث

۵۹۔ سودا میں کہتا ہوں کہ یہ پرہیز عشق سے
رسوا ہے کیوں تو کوچہ و بازار الغیاث

۶۰۔ ترکِ خوباں کیوں کہ ہو مجھ سے کہ ان کا ناصحا
رشتۂ الفت جگر میں ہے سلیمانی کی طرح (رچرڈ جونسن)

۶۱۔ پاؤں پڑنے میں ہے کیا لطف کسی کے خوں خوار (کذا)
سر پہ رہ خلق کے ہو کر گل و گلزار کی طرح (حبیب)

۶۲۔ شور رہتا ہے مرا کوچے میں تیرے چار فصل
یہ جنوں کب ہے بہاری اور دیوانے کی طرح (حبیب)

۶۳۔ نو خطاں کی ہے سدا حق میں ہماری یہ دعا
کہ جیو یارب تو اس آغاز کا انجام سفید (رچرڈ جونسن، نراین)

۶۴۔ چاندنی دیکھے جو وہ کرکے در و بام سفید
ماہ بھی بزم میں اس کی ہو پھر اک جام سفید (نراین)

۶۵۔ یہ زندگی مری وحشت کا ننگ ہے صیاد
قفس مجھے ترے چنگل سے تنگ ہے صیاد (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین[1])

۶۶۔ تک اس برس تو کر آزاد، پھر سمجھ لینا
چمن میں اب کے عجب آب و رنگ ہے صیاد (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین)

۶۷۔ شیخ تک چشم عشق سے کر سیر
کعبہ سے کم نہیں ہمارا دیر (حبیب، رچرڈ جونسن)

۶۸۔ دیوے تھا غیر کو زکوٰۃ حسن
میں کہا کیا ہے کہنے لاگا خیر (حبیب، رچرڈ جونسن)

یہ تین شعر صرف نراین میں ہیں۔

۶۹۔ کی تھی تجھ پاس نہ آنے کی تو تدبیر بزور
پر لے آئی مجھے آخر کو یہ تقدیر بزور

۷۰۔ یہ خدا ساز ترا صفحۂ رو ہے، ورنہ
کب مصوّر سے کھنچے ناز کی تصویر بزور

۷۱۔ سخت بیدل ہوں کہ جکڑی ہے تری الفت کی
عشق ظالم نے مرے پاؤں میں زنجیر بزور

یہ اشعار صرف نراین میں ہیں۔

۷۲۔ دھوم سے سنتے ہیں اب کے سال آتی ہے بہار
دیکھئے کیا کچھ ہمارے سر پہ لاتی ہے بہار

---

[1] قاضی عبدالودود نے نسخۂ نراین سے تین شعر نقل کیے ہیں۔ اس میں یہ مطلع بھی ہے۔
اشکِ گلگلوں کو نہیں لعل گہر سے پیوند وہ رکھے سنگ سے نسبت یہ گہر سے پیوند
یہ غزل سودا کی نہیں بلکہ مرزا احسن علی احسن کی ہے۔ کیونکہ یہ مطلع گلشن بے خار (ص ۲۱) عمدۂ منتخبہ (ص ۵۷)

۷۳۔ شاید عزمِ یار کی گلشن میں پہنچی ہے خبر
گل کے پیراہن میں پھولی نہیں ساتی ہے بہار

۷۴۔ دیکھنے دے باغباں اب گلستاں اپنا مجھے
خانۂ زنجیر میں مہماں بلاتی ہے بہار

۷۵۔ شور یہ غنچوں کی واشد کا نہیں اے عندلیب
اب چمن میں طمطراق اپنا دکھاتی ہے بہار

۷۶۔ کیوں پھنسا گلشن میں یوں جا کر عبث اے عندلیب
میں نہ کہتا تھا کہ اے وہ دیکھ آتی ہے بہار

۷۷۔ جھومتی گلشن میں اب کے سال آتی ہے بہار
سبزی خط سے تری شاید کہ ماتی ہے بہار

۷۸۔ آج آتی ہے صبا سیتی مجھے بوئے گلاب
کیا کسی بلبل کا دل شاید جلاتی ہے بہار

۷۹۔ ہر گھڑی ٹپکے ہے شبنم برگ برگ گل سیتی (کذا)
کر دو انا ہم کو اب ٹسوے بہاتی ہے بہار

۸۰۔ ہر پرِ بلبل پہ جلوہ ہے پرِ طاؤس کا
اب کے کیا نیرنگ گلشن میں دکھاتی ہے بہار

۸۱۔ کس کی آنکھوں کے نشے سے آج ماتی ہے بہار
اس برس نرگس پہ کیا دھومیں مچاتی ہے بہار

۸۲۔ سیج پر پھولوں کی ظالم مجھ کو ہو ہے بے کلی
گل نہیں، تجھ بن انگاروں پہ لٹاتی ہے بہار

---

۱ سخن شعرا (ص۔۱۳) میں احسن کے ترجمے میں نقل ہوا ہے۔ کلیاتِ سودا کے کسی معتبر نسخے میں۔ یہ غزل نہیں ملتی۔

۸۳۔ دل پرویا تو ہے تجھ زلف میں ہم نے لیکن
تاب گوہر کی نہ لاوے گا یہ تار آخر کار (رچرڈ جونسن)

آسی میں ایک غزل کا مقطع ہے۔

نسیم اس باغ میں سودا نہیں پاتی گذر اب تو
رکھے ہے رخت گل کو غنچہ بنچے بیچ تہ تہ کر

لیکن رچرڈ جونسن میں یہ مقطع اس طرح ہے۔

۸۴۔ بہار اس باغ سے رکھتی ہے کیا عزم سفر سودا
جو رخت اپنا چمن میں غنچہ نے رکھا ہے تہ تہ کر

۸۵۔ آہ کیوں کرتے ہو اس کے تئیں ناحق تہ تیغ
آخر اے سنگدلاں سمجھو تو جاں رکھتی ہے شمع

یہ غزل رچرڈ جونسن اور خدا بخش دونوں میں ہے۔

۸۶۔ خط کے آنے پر بھی وہ ملتا نہیں ہو سینہ صاف
گرد سے ہوتا تو ہے یارب ہر اک آئینہ صاف

۸۷۔ خوش کوئی ناداں ہوا، دوراں سے تو کیا گو کہ ہو
غم سے دل طفلِ دبستاں کا شب آدینہ صاف

۸۸۔ چشم کم سے تیرہ بختوں کی نہ دیکھ افتادگی
سایہ چڑھ جاتا ہے تا بام فلک بے زینہ صاف

۸۹۔ جمع زر کرنے سے اپنی سربلندی تو نہ چاہ
لے گیا قارون کو تا تحت الثریٰ گنجینہ صاف

۹۰۔ عکس خوب وزشت جوں یکساں ہے آئینہ کے بیچ

دوست ودشمن سے ہے یوں اپنا دل بے کینہ صاف

۹۱۔ گو کیا ہم آپ کو دنیا کے انجھیڑے سے پاک
گلچھڑی جو یار کی دل میں ہے وہ تو کی نہ صاف

۹۲۔ شیخ کی داڑھی کو سودا رند تو کہتے ہیں پشم
مجھ کو اون کے منہ پر آتا ہے نظر پشمینہ صاف

۹۳۔ اس کارواں کا بار ہے گویا کہ دردِ دل
آواز ہر جرس کی ہے جوں آہِ سردِ دل (حبیب، خدا بخش)

۹۴۔ کرتی ہے قطع مزرعہ امید تیغ یاس
اے تف کہ اسے فلک تجھے کچھ بھی ہے درد دل (حبیب، خدا بخش)

۹۵۔ چشمِ خورشید کو غرفے سے تیرے دن سروکار
رات ہے دیدۂ شبنم کو لبِ بام سے کام (حبیب)

۹۶۔ تیرے آگے اوسے خورشید کا مونھ خوش نہیں آتا
چمن سے ورنہ کیوں جاتی رہی وقتِ سحر شبنم (حبیب)

۹۷۔ ظاہر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں
آوے مگر وہ خواب میں سو خواب ہی نہیں (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین، خدا بخش)

۹۸۔ سجدہ کروں نہ کیوں کے تری تیغ کے تلے
ایسی نمازِ عشق کو محراب ہی نہیں (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین، خدا بخش)

۹۹۔ مجھ کو نہیں ہے دل میں ترے راہ کیا کروں
پر بے اثر ہے عشق مرا آہ کیا کروں (رچرڈ جونسن، نراین، خدا بخش)

۱۰۰۔ سن کر ہزار شکل مرا حال یوں کہا
تُو تو کسی طرح نہیں دل خواہ کیا کروں (رچرڈ جونسن، نراین، خدا بخش)

۱۰۱۔ لہو کا ترے ہے یہ تشنۂ لب کہ ہوے ہے آبِ رواں کو تب
کوئی بلبلا نہ میں دیکھا اب کہ وہ جوششِ لبِ جو نہیں (حبیب)

یہ غزل صرف خدا بخش میں ہے۔

۱۰۲۔ ہوئیں ہیں پشتِ لب پہ جب سے سوار مونچھیں
کلے سے نیز بازی کرتی ہیں یار مونچھیں

۱۰۳۔ جوں کرک سبزہ واری کی ناک بیچ پر ہو
عفت پہ کر رہی ہیں ایسی بہار مونچھیں (کذا)

۱۰۴۔ زیادہ اسے بڑھا کر اب قہر کیا کروگے
جھینگر کی شکل ہیں تو کاندھوں کی بار مونچھیں

۱۰۵۔ جتنا کوئی اکھاڑے اکھڑے نہ پشم ان کی
حق نے تمھیں دیے ہیں کیا استوار مونچھیں (کذا)

۱۰۶۔ کلا تھا تو بنا قد ہے تمام ڈنڈی (کذا)
کھوڑچ ہے ناک منہ پر اور ہنگی تار مونچھیں

۱۰۷۔ بائیں سپید رکھو اور داہنے سیہ تم
ہنگی عجب طرح کی لیل و نہار مونچھیں

۱۰۸۔ نظر آتی ہیں بن ساقی چمن میں تاک کی چھاہیں
روئیں آبِ باغباں باہم گلے میں ڈال کے باہیں (حبیب، نراین)

۱۰۹۔ کشمیر سی جاگہہ میں ناشکر نہ رہ زاہد
جنت میں تو اے گیدی مارے ہے کیوں لاتیں (حبیب)

۱۱۰۔ تارِ نگاہ و سوزنِ مژگانِ یار بن

اپنا جو دل پھٹے تو کسی سے رفو نہ ہو (رچرڈ جونسن)

۱۱۱۔ فرصت کہاں کہ ربط کریں گل سے اے نسیم
ہیں اس چمن میں آشنا اک تیرے دم کے ساتھ (حبیب)

۱۱۲۔ جو ہے جلا جلوں کا ہے غم خوار وہ کوئی
بالیں پہ شمع رات کو میرے بہت روئی (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین)

۱۱۳۔ تیری صفائے رنگ کو پہنچا نہ ایک برگ
شبنم نے گرد عارض گل سے بہت دھوئی (حبیب، رچرڈ جونسن، نرائن)

۱۱۴۔ مری آنکھوں میں تو بستا مجھے تو کیوں رلاتا ہے
سمجھ کر دیکھ تو اپنا کوئی بھی گھر جلاتا ہے (حبیب)

۱۱۵۔ ہم بھی کبھی دکھاویں گے ندیوں کو اپنی موج
جو کچھ بھری ہے دل میں گر آنکھوں کی رہ بہی (حبیب، نراین)

۱۱۶۔ خالی خمیں کر اُٹھ گئے اس بزم سے حریف
بیٹھے ہیں ایک شیشۂ دل ہم بھرے ہوئے (حبیب)

۱۱۷۔ افسردگی ہماری مت دیکھ چشمِ کم سے
شمشیر کی طرح سے یہ دل بجھا ہوا ہے (حبیب)

یہ دو غزلیں صرف نراین میں ملتی ہیں۔

۱۱۸۔ ہمیں کسی سے کر اظہار درد دانائی
کہی نفس ہے بہ تقریب سرد دانائی

۱۱۹۔ کسی کی ہے مہِ نو داد خواہ ابرو پر
کہ شہر شہر ملے منہ کو گرد دانائی

۱۲۰۔ جلوں ہوں رشک سے میں شعلہ ساں گلی میں تری
جو رنگ کاہ نظر مجھ کو گرد دانائی ؟

۱۲۱۔ نہ پوچھ حال ہمارا کہ ایسی باتوں کی
کوئی سنے سے ترے دل کو درد دانائی ؟

۱۲۲۔ خبر دل اپنے کی پوچھے ہے اس سے جا سودا
تری گلی سے جو یہ رہ نورد دانائی

۱۲۳۔ کشور میں حسن کے ہیں احکامِ شاہ اُلٹے
کرتے ہیں بے گنہ یار عذر گناہ اُلٹے ؟

۱۲۴۔ اثباتِ خوں پہ میرے، دیتے جو تھے گواہی
منہ دیکھتے ہی اس کا بولا گواہ اُلٹے

۱۲۵۔ کب بیٹھنے وہ دے ہے مجلس میں اپنی ہم کو
گھر سے گئے جو سیدھے، کر یک نگاہ اُلٹے

۱۲۶۔ رنداں یہ کر رہے تھے افسوس کیا کہے مرد
گھر کو پھر آئے جس دم ہو کر تباہ اُلٹے

۱۲۷۔ سودا تو اس کی خوبی مت کہہ کسو کے آگے
اپنے لیے بیاد اب تو مت بساہ اُلٹے

اشعارِ ذیل فردیات کے تحت نراین میں دیے گئے ہیں۔ بقول قاضی عبدالودود صاحب ان میں دوسرے شعرا کے بھی اشعار ہیں۔

۱۲۸۔ کفن میرے پہ یارو یہ لکھانا
کسو سے دل کو کوئی مت لگانا

۱۲۹۔ دل کو سمجھاؤں تاں، ستانا ہے

اس کو کچھ مت کہو دوانا ہے

۱۳۰۔ دل ہوا شوخ سے جایار خدا خیر کرے
بے طرح کا ہے ستم گار خدا خیر کرے

۱۳۱۔ سرمہ دے کر نہیں رجھاتے ہو
کیا سجن توتیا لگاتے ہو

۱۳۲۔ پیالہ برہ کا جب سے پیا ہم کو پی گیا
اس کے نشے کی بات کہوں کیا کہ جی گیا

۱۳۳۔ دل کو تو ہر طرح سے دلاسا دیا کروں
آنکھیں تو مانتی نہیں ہیں اس کو کیا کروں

۱۳۴۔ ہر ایک کی پاؤں کی آواز سے جیتے ہیں
اس وعدے کی شب ہم کس انداز سے جیتے ہیں

۱۳۵۔ لگ چلنے کو تو آتے ہیں مجھ کو ہنر کئی
پر نازِ خو سے یار کی ہیں دل میں ڈر کئی

۱۳۶۔ چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
حیف ہے یہ زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں

۱۳۷۔ دن تو تیرے ہی تصور میں گزر جاتا ہے
رات کو خواب میں بھی تو ہی نظر آتا ہے

۱۳۸۔ ہم تمہارے ہجر میں ، تم غیر پاس
ہم کہاں اور تم کہاں، کیا قہر ہے

مثنوی در قصہ عشق پسر شیشہ گر بزرگر بطور ساقی نامہ

اسی کا جلوہ حسن زلف مہ رد

اسی کی نافۂ آہو میں ہے بو

اس شعر کے بعد رچرڈ جونسن اور خدا بخش میں یہ شعر زائد ہے۔

۱۳۹۔ کسی جا خلوت مریم کی ہو شمع
کسی جا بر سر تہمت وہ ہو جمع

مثنوی کا ایک شعر ہے۔

وہ بارہ ہیں ستونِ عرشِ اعظم
رہا ہے سب کچھ ان کی ذات سے قائم

اس شعر کے بعد رچرڈ جونسن اور خدا بخش میں یہ شعر زاید ہے۔

۱۴۰۔ کروں ایسے ہوں جب حامی محشر
بیاد ساقی و ساغر سخن سر

مثنوی میں یہ شعر ہے۔

تجھے بھی ہو کہیں الفت تو آ دیکھ
یہ تخمِ عشق کی نشو و نما دیکھ

اس شعر کے بعد خدا بخش میں ۱۷ اشعار اور ہیں جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔

۱۴۱۔ محبت کا کھلا ہے آخرش باغ
ہوا گل سے جگر لالے کا یوں داغ

۱۴۲۔ کہ جیسے آگ لگ کر اک شرر سے
جلے ہے دوسرا گھر ایک گھر سے

۱۴۳۔ نہ حاصل عشق کی دولت ہو بے رنج
کہ ہے مارِ سیہ کے سامنے گنج

۱۴۴۔ جب اس نے یہ بلا سر اپنے پر لی
دل زر گر پسر میں تب جگہ کی
۱۴۵۔ کرشمہ تھا یہ الفت کے اثر کا
کہ دل پگھلا دیا زرگر پسر کا
۱۴۶۔ گداز ایسا ہوا دل کا تب و تاب
کھٹالی میں طلا جیسے کہ ہو آب
۱۴۷۔ نہ دن کو چین اسے نے شب کو آرام
نہ تھا جز نالہ و فریاد کچھ کام
۱۴۸۔ اسی حالت میں اک دن یہ گیا سو
یہ خواب آیا نظر وہ آئینہ رو
۱۴۹۔ کہ یوں کہتا ہے وہ اس سے بصد درد
دلِ گرم اپنے سے بھر کر دمِ سرد
۱۵۰۔ محبت کا مری تجھ میں اثر ہے
تجھے کچھ حال سے میرے خبر ہے
۱۵۱۔ سخن میرا (یہ) شکوے سے نہیں ہے
کہ دور اس امر سے شکوہ کہیں ہے
۱۵۲۔ کرے گو شمع داغ اس کا سراپا
پتنگے کو شکایت سے نہیں جا
۱۵۳۔ جو مہ سے ہے جگر ٹکڑے کتاں کا
اسے شکوہ نہیں اپنے زیاں کا
۱۵۴۔ ہوا ہے یہ گلستاں جب سے ایجاد

ترانہ گل کو ہے بلبل کی فریاد

۱۵۵۔ وہی اے دوست میرا مدعا ہو
مرے حق میں جو کچھ تیری رضا ہو

۱۵۶۔ مری زنجیرِ پا میں جو کڑی ہے
محبت تیری ہی میں یہ گھڑی ہے

۱۵۷۔ مجھے خاک آپ کو بادِ سحر جان
جدھر تو چاہے مجھ کو پیشتر جان

قطعات

درمضحکہ مشتمل برتاریخ
(رچرڈ جونسن)

۱۵۸۔ چشم و چراغ جن کے ملا کٹھیر کے تھے
نابود کی خدا نے جس دن وہ قوم ساری

۱۵۹۔ ملا نے وہ جو دشمن تھے آل سے نبی کے
لایا تعصب اون کا سران کے پہ یہ خواری

۱۶۰۔ یوں مومنوں کے دل میں حق کی طرف سے گزرا
مغزان کا جوتیوں سے جھاڑو کہ ہیں یہ ناری

۱۶۱۔ تب سات سات جوتی ہر ایک کے لگائی
اور مولوی عمر کو دو اگلی سب سے ماری

۱۶۲۔ ہاتف نے بہر تاریخ اوس دم پڑھا یہ مصرع
کیا مولوی عمر کو ہوئی ہے کفش کاری

۱۶۳۔ حسن تو پس پردہ نہانست و نہاں نیست

چوں شعلۂ فانوس عیانست دعیاں نیست

۱۶۴۔ باسفیہاں چنیں روکش نسازم نالہ را
ورنہ ایں از عہدہ افلاک می آید بروں

۱۶۵۔ ہم نشیں حال دلم از گریۂ من ظاہر است
آستیں تامی تکانم خاک می آید بروں

قصیدے

درمنقبت امیر المومنین (رچرڈ جونسن)

۱۶۶۔ جوہری ہوئے جو بازارِ سخن کا سو کہے
قدر و قیمت میں ہیں باہم یہ رقم چاروں ایک

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۶۷۔ شیشے موتی سے نہیں کام کسو کے ان کو
ہو کے اس بات پہ کھاتے ہیں قسم چاروں ایک

قصیدہ در مدح حضرت امام ضامن

کہاں سے پردۂ ظلمات بیچ جا کر خضر
شراب عمر ابد سے یہ زندگی پاتا

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۶۸۔ شرار آب میں رہتے ہیں گوہر آتش میں
زبسکہ امن ترے عدل نے جہاں میں کیا

قصیدہ در مدح شجاع الدولہ

حافظ یہ چاہے عہدے سے اس کے بر آؤں میں

پیادے کو دے کے تین روپے نو روپے سوار

اس کے بعد یہ شعر ہے

۱۶۹۔ کہتے تھے اوس کو حافظِ زر دوست خلق میں
رکھتا تھا ناد ہندی میں ایسا وہ اشتہار

در مدح نواب آصف الدولہ (رچرڈ جونسن)

وہ جو تیرے کمان کی ہے سپر
کس کو اس کو اٹھانے کا مقدور

اس کے بعد یہ شعر ہے

۱۷۰۔ یاد میں جس کی تیرگی آوے
کوہ نظروں میں خانۂ زنبور

قصیدہ در مدح نواب آصف الدولہ (رچرڈ جونسن)

اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۷۱۔ مت رکھ روا یہ مجھ پہ کہ عمال کے تئیں
تیری سلامتی میں کروں مجرہ و سلام

ہجوِ ساجد (رچرڈ جونسن)

عدو میرا جو ہوا دشمن خدا ہے وہ
خدا کی دشمنی کرنا تو عین ہے الحاد

اس شعر کے بعد جونسن میں سات شعر ہیں۔

۱۷۲۔ مگر یہ کہتے ہیں اکثر تمہارے یاں کذّاب
ہوئی ہے اس لیے حضرت سے یہ حدیث ارشاد

۱۷۳۔ نکاحِ تازہ کی دل میں علی کی خواہش تھی
نبی نے بیٹی کی رنجش کی دیکھ یہ بنیاد

۱۷۴۔ حدیث یہ کہی تا سُن کے اس کو باز رہے
علی اس امر سے اور فاطمہ کا دل ہو شاد

۱۷۵۔ سو یہ لکھا نہیں اوس جا لکھے جہاں یہ حدیث
پیمبر اپنے یہ بہتاں میں سمجھے ہوں گے خوار

۱۷۶۔ کیا میں فرض جو یوں بھی بقول ان کے ہو
نبی کے حق میں جو کہتے ہیں یہ بغیر اسناد

۱۷۷۔ خدا شعور دے تو وہ اسی کو غور کریں
کہ جب علی کے سنانے کو ہووے یوں ارشاد

۱۷۸۔ تو وائے ان پہ جن اشخاص سے سوائے علی
گئیں ہوں فاطمہ دنیا سے لے کر دل میں عناد

قصیدہ در مدح رچرڈ جونسن

۱۷۹۔ دیکھا نہ جائے اس سے روئے نگر خاں پہ رنگ
غنچے کے بھی دہن سے ہے چشمِ زمانہ تنگ

۱۸۰۔ شیشہ نہ توڑے شہ کی مئے عیش کا فقط
کاسہ پہ بھی گدا کے یہ وارد کرے ہے سنگ

۱۸۱۔ گرخاک سے اوٹھا کے یہ دیوے کسی کو اوج
سویوں کہ جیسے چیونٹی کر پردے ہے یہ کوڈھنگ
۱۸۲۔ اس کے حسد کی تلخی کا اب کیا کروں بیاں
پہنچے جو شہد لب تئیں کردے اسے شرنگ
۱۸۳۔ مشتِ صدف میں قطرہ کو کرتا ہے یہ گہر
جو یا کو بھیجے اس کے سوئے کلّہ نہنگ
۱۸۴۔ جو ولولہ ہے اس کا سو فتنہ ہے اس کے ساتھ
خالی نہیں فساد سے اس کی ہے جو ترنگ
۱۸۵۔ پہنچاتے یہ کرے نہ فلک تک کسی کو دیر
اور اس کو کچھ ٹپکتے زمیں پر نہیں درنگ
۱۸۶۔ ہے یہ زمانہ اور جو اہلِ زمانہ ہیں
ان کا جہاں میں چشمِ مروت کا ہے یہ رنگ
۱۸۷۔ مفلس پدر ہو اور پسر جس کا ہو غنی
بیٹے کو باپ کی ولدیت سے آئے ننگ
۱۸۸۔ پس اب کوئی کسو سے رکھے کس طرح امید
بیٹے کا باپ سے ہو زمانے میں جب یہ ڈھنگ
۱۸۹۔ ہے اب گروہ ایک کہ جس کا یہ ہے خطاب
ممتاز دولہ فخرِ جہاں و حسام جنگ
۱۹۰۔ پا جائے شکل مہر نگہ اس کی سی جلا
سینے پہ آئینے کے اگر چھا رہا ہو زنگ
۱۹۱۔ جوہر سے گو کہ چار ہی عنصر کے سب ہیں خلق

جلوے کو اوس کے دیکھ ہیں جوہر شناس دنگ

۱۹۲۔ دل مدح غائبانہ سے حاصل نہیں سرور
مت کر حضور جا کے ثنا کرنے میں درنگ

۱۹۳۔ تیری وہ ذات، گو تو نہیں ہے شہِ فرنگ
کرسی میں تیری پایۂ اورنگ کا ہے ڈھنگ

۱۹۴۔ باعث یہ تیرے دست کرم کا ہے دہر میں
خالی جو ڈر سے لے کے چمن سے ہیں تا بہ کنگ

۱۹۵۔ خوں میں عدو کی تیغ کی تیری شناوری
ہے اس طرح کہ بحر میں پیرے ہے جوں نہنگ

۱۹۶۔ سائے تلے سپر کی ترے جس کو ہو پناہ
اودھر نہ رو کمانِ فلک کا کرے خدنگ

۱۹۷۔ سرعت یہ بادِ پا کی تری جس کے سامنے
موجِ ہوا ہے اسپ ہوا کے قدم میں لنگ

۱۹۸۔ تو وہ خلیق لذّتِ شہد آئے کام میں
چکھئے بیان خلق میں تیری اگر شرنگ

۱۹۹۔ شائق کی جائے ہر بنِ موچشم ہو اگر
تب اس کے دل سے نکلے تیرے دید کی امنگ

۲۰۰۔ دور از ادب ہے طولِ سخن اس کے اب عوض
سوداؔ نکال دل کی دعائیہ سے امنگ

۲۰۱۔ یارب تمام دوست رہیں تجھ سے فیضیاب
جاری ہے جب تلک کہ جہاں بیچ آبِ گنگ

تہنیت عید (رچرڈ جونسن)

۲۰۲۔ صباح عید ہے دل ہیں خوشی سے مالا مال
مے طرب سے ہیں سب مست اپنے اپنے حال
۲۰۳۔ جو کوئی خلقت انساں سے ہے بزیر فلک
مصمم آج کے دن دل میں اس کے ہے یہ خیال
۲۰۴۔ کہ پہنچے اس در دولت سراپہ لے کے نذر
جو تجھ جناب میں مقبول ہو خوشا احوال
۲۰۵۔ کوئی تو سیم، کوئی زر، کوئی گہر، کوئی لعل
ہر ایک ہے شرف اندوز یاں بایں منوال
۲۰۶۔ ہوا ہے بندہ بھی حاضر در سخن لے کر
پے حصول سعادت بدر گہہ اقبال
۲۰۷۔ اگرچہ تو ہے مسمّیٰ بآصف الدولہ
ترا فزود سلیماں سے بھی ہے جاہ و جلال
۲۰۸۔ تری تجلّیِ طالع ہے وہ کہ چرخ اوپر
غلام داغی ہے اختر کا تیرے بدر کمال
۲۰۹۔ علوئے جاہ کے آگے ترے نہیں کچھ قدر
کسو طرح کا کوئی نذر یاں کرے زر و مال
۲۱۰۔ مگر یہ نذر ہے شایاں اس آستاں کے ہی
نشاط عید جو لایا ہے غرّۂ شوال
۲۱۱۔ یہی جناب میں حق کی دعا ہے سوداؔ کی

جہاں ہو جب تئیں اے میرے قبلہ آمال

۲۱۲۔ رہے مجنوں پہ سایا ترا سپر کی طرح
سدا بخونِ وعدہ تیغ جوں شفق میں ہلال

قصیدہ تاریخ بنائے مسجد در فارسی (رچرڈ جونسن)

۲۱۳۔ باعندلیب گلشنِ ایماں برابر است
گلبانگ مرغ خامہ ام اللہ و اکبر است

۲۱۴۔ دارم من از لباس حرم صوف در مداد
ہرسو کہ او رواں شود اسلام رہبر است

۲۱۵۔ برصفحہ پائے خامۂ من کج نمی فتد
کز رشتۂ محبتِ حق تار مسطر است

۲۱۶۔ بین السطور اوکہ بہر صفحہ نقش زد
از چاک جیبِ صبح سعادت منور است

۲۱۷۔ حرفِ زبانِ کلکِ من از کثرتِ جلا
نحویست بر ورق چو در آئینہ جوہر است (؟)

۲۱۸۔ در خاطرم چو جلوہ، دہد شاہدِ خیال
می بینمش کہ جامۂ احرام در براست

۲۱۹۔ چشم اگر بہ سبزہ خطِ بتاں فتد
بے آہوے حرم بہ نظر نوک نشتر است

۲۲۰۔ بازوے شاہباز خیالم کہ در ہواست
برمرغ روبہ قبلہ نشیں سایہ گستر است

۲۲۱۔ از استماعِ نظم کلام دریں مقام

ہر رند جبہ در برو عمامہ برسر است

۲۲۳۔ ریشش زحدِ شرع بروں آنقدر کہ شیخ
او را بدست گیرد و گوید دُمِ خراست

۲۲۴۔ چوں محتسب سوار شود در رکاب او
سنگے برائے شیشہ بہ دستِ قلندر است

۲۲۵۔ شادیٔ غرّۂ رمضاں زیرِ آسماں
نزدِ مغاں زغرّۂ شوال خوشتر است

۲۲۶۔ بینی بہ زیرِ ابروے پیوستۂ بتاں
در چشم خلق جلوۂ محراب و منبر است

۲۲۷۔ تابشنود بہ مدرسہ بانگ و صلوٰۃ را
شد در پے معالجہ گر برہمن گر است (؟)

۲۲۸۔ خواہان سبحۂ بسکہ بود خلق دانہ اش
ازدرِّ شاہوار بہ قیمت گراں تر است

۲۲۹۔ درفکر بوریاست گدا از پے نماز
مصروف بر عمارتِ مسجد تونگر است

۲۳۰۔ دیدیم تازہ مسجد نورانی کرد (کذا)
در اقتباس نورمہ و مہرو اختر است

۲۳۱۔ آبے کہ ریختند بہ تعمیر آں مکاں
پیداست از صفاش کہ او آب گوہر است

۲۳۲۔ ہر سنگ اور عکس کواکب بہ وقتِ شب
در چشم روز گار زترصیع بہتر است

۲۲۳۔ یارب چہ مسجد است کہ گردِ حریم او
ارواح اولیائے مکمل کتوبر است
۲۲۴۔ فرماں روا مسیح بہ معمار آں بناست
دل را فزاے اوکہ چنیں روح پرور است؟
۲۲۵۔ آید صدا ز گنبدش از جنبشِ نسیم
بنگر کہ شان رفعتم از عرش برتر است
۲۲۶۔ دل را تعجب است کہ گلدستہ ہاے او
ہم در بہار و ہم بہ خزاں تازہ و تر است
۲۲۷۔ وصفِ کتابہ اش چہ نویسم کہ در نظر
چوں سر نوشت صاحبِ ایماں منور است
۲۲۸۔ حاجت وراں حرم بہ فروغ چراغ نیست
شب تا سحر تجلی حق شمع منبر است
۲۲۹۔ فی الفور می رسد بدرِ خانۂ قبول
آں جا براے مرغ دعا فیض شہپر است
۲۴۰۔ برسطح او مقابل محراب حوض نیست
چشمِ پر آب جانبِ ابروے دلبر است
۲۴۱۔ دیدم چو عکس قبۂ زرّینِ او در آب
پنداشتم کہ مہر بہ کوثر شناور است
۲۴۲۔ کرسی اور زمرتبۂ انبیا بلند
صحنش بہ وسعتِ کرمِ حق برابر است
۲۴۳۔ جاروب صحنِ شکل خطوطِ شعاعیست (؟)

جاروب کش بہ صورتِ سلطانِ خاور است

۲۴۴۔ ہر چند جاے رفتہ بسے دیدہ ام ولے
دل را ازاں صفا کہ برودید باور است

۲۴۵۔ آیند در شمار نگہہ (کذا) ذرّہ ہائے خاک
عکسے اگر دراں زہو اے مکدّر است

۲۴۶۔ چاہے بایں لطافت و خوبی بہ کنج اوست
آبش چناں قریب کہ بالب برابر است

۲۴۷۔ مردم بہ گرد اوہمہ وقت از پے وضو
چوں صورت صف مژدہ دیدۂ تر است

۲۴۸۔ نقاشی عمارتِ آں سجدہ گاہِ خلق
در تازگی نہ باغِ جناں ہم فزوں تر است

۲۴۹۔ نقاشِ اوکہ رنگ طراز است چوں بہار
کلکش بہر گلے کہ ز دیوار تا در است

۲۵۰۔ نوعے کشیدہ کردۂ موجِ نسیم صبح
برعارضِ نگار چو زلفِ معنبر است

۲۵۱۔ بیروں زحدِّ وصف بود دستکاریش
ہردم بہ کلک صنعتِ او صنع دیگر است

۲۵۲۔ از بس دراں احاطہ صفا را بکار برد
مطلع بہ وصف او ز گہر ہم فزوں تر است

۲۵۳۔ یک سمت نقش لالہ و یک سو صنوبر است
از عکسِ یک دگر بہ قراین برابر است

۲۵۴۔ آنجا کسے کہ پیش نماز است وصف او
در گوش ہوش از ہمہ اوصاف برتر است
۲۵۵۔ در فرض صبح و شام ز ہر سورہ خواندیش
نحوے بہ دل صدائے قرأت موثر است
۲۵۶۔ ہر کس کہ بود منکرِ قرآں شنید و گفت
لاشک کلامِ حق بہ زبانِ پیمبر است
۲۵۷۔ گویند عرشیاں کہ صدا ے موذنش
در گوشِ ماز نغمۂ داؤد خوشتر است
۲۵۸۔ خوش بلبلیست او کہ سحر گہہ ترانہ اش
در باغ دیں بہ مدح خدا و پیمبر است
۲۵۹۔ خوش لہجہ طوطیست خطبش کہ نطق او
بہرِ ضیافتِ صلحا شہد و شکر است
۲۶۰۔ لاریب ہم چو خانہ بود خانۂ خدا
کانجا گدا و شاہ بہ یک سجدہ ہمسر است
۲۶۲۔ ہر کس دراں مقام دو رکعت نماز خواند
فردا بہ -بادصواب دو صدحج اکبر است
۲۶۳۔ ہر گہہ دو کعبہ گشت کندرو کدام سو
زیں وجہ مرغ قبلہ نما سخت مضطر است
۲۶۴۔ سودا اگر کسے بہ قسم گوید این سخن
در رتبہ آں مکاں زحرم پایہ کمتر است

۲۶۵۔ شخصے کہ واقفست زشان بزرگیش
اورا کے از زبان کس ایں حرف باور است
۲۶۶۔ بودم دریں خیال در آنجا کہ ظاہرا
باکعبہ ایں رواق مقدس برابر است
۲۶۷۔ تاکہ بہ سجدہ از پے تاریخ خاجیے (؟)
سر رانہاد و گفت کہ از کعبہ بہتر است

یہ رباعی صرف خدابخش میں ہے۔

۲۶۸۔ اے دوست پے دفع عدو میجوشی
و ز غصہ شب و روز تو خوں مینوشی
۲۶۹۔ تاکشتن نفس خویش ممکن باشد
حیف است کہ برکشتن دشمن کوشی
یہ پہیلی صرف خدابخش میں ہے۔

۲۷۰۔ ایک پرکھ کے انچھر تین
تین میں چار اوکن پر بین
۲۷۱۔ اوہ اچھربن من موہ ڈالے
مدھ اچھر بن بن جی کو پالے
۲۷۲۔ انت اچھربن دیوے دکھ
سب اچھر سدوں کو سکھ

خدابخش لائبریری میں کلیات سوؔدا کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس میں فاخرمکیں کی ہجو میں سوؔدا کی ایک مثنوی ہے۔ جو کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتی۔ مثنوی اُردو میں ہے لیکن تمہید کے طور پر جو نثر ہے وہ فارسی میں ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کے ساتھ جو تمہید نثر ہے وہ بھی ظاہراً سودا کی لکھی ہوئی ہے''[1]

براے تنبیہ مرزا فاخر صاحب: مردم می گویند شخصے نقل می کرد کہ مرزا فاخر صاحب خود را برابر شیخ علی حزیں می شمارند، و تمام وضع نشست و برخاست او را پیش گرفتہ اند، بلکہ خود را در فضل و کمال از و بہتر می دانند و اکثر اشعار فارسی او را اصلاح می دہند، چناں چہ ایں بیت مثنوی حسب حال ایشانست، مثنوی در ہجو مرزا فاخر مکیں۔

۲۷۳۔ ایک نقل اس پہ مجھ کو آئی یاد
سچ ہو وہ یا کسی کا ہو ایجاد

۲۷۴۔ ایک ملا بہ عہد شاہ جہاں
نہ تو عالم ہی وہ نہ ہیچ مداں

۲۷۵۔ بین بین اس کو کچھ کچھ آتا تھا
لڑکے مکتب میں وہ پڑھاتا تھا

۲۷۶۔ بس کہ تھا وہ شعور سے معذور
لڑکے تھے اس سے خرم و مسرور

۲۷۷۔ اس سے دہشت کو تھی نہ دل میں راہ
صحن مکتب تھا ان کی بازی گاہ

۲۷۸۔ ایک جو اُن میں تھا فہیم و ذکی
مصلحت اُن نے لڑکوں سے یوں کی

۲۷۹۔ یارو ہم کھیلے سو طرح کا کھیل
دیکھے ہم نے سبھی وہ بیجا کھیل

---

[1] معاصر، حصہ۔۱، ص۔۳۔۷، اس مثنوی کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں۔ ''ایک مثنوی ایسی تھی جو کلیات مطبوعہ میں شامل نہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے کہیں اور بھی نہیں چھپی۔ دتاسی نے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ البتہ کیا ہے۔ جو اس کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی جلد۔۱ (ترجمہ بقا) میں موجود ہے۔'' قاضی صاحب کا خیال درست نہیں۔ مثنوی جان شیکسپیر منتخبات ہندی، لندن، ۱۸۲۵ء، ۲، میں شامل ہے۔

۲۸۰۔ کھیل اب میں نیا نکالا ہے
سارے کھیلوں سے وہ نرالا ہے
۲۸۱۔ لڑکے بولے بھائی جی فرماؤ
کیا ہے وہ کھیل تم ہمیں بھی بتاؤ
۲۸۲۔ کہا اس نے کہ بادشاہ و وزیر
لڑکے جو بنتے ہیں صغیر و کبیر
۲۸۳۔ اس میں چنداں تو یارو لطف نہیں
کھیل اس سے یہ خوب تر ہے کہیں
۲۸۴۔ میاں جی کو کسی طرح پھسلاؤ
مل کے شاہِ جہاں سب ان کو بناؤ
۲۸۵۔ ہنس کے وہ بولے ہوے یہ کس طرح
کہا اس نے کہ تم سنو اس طرح
۲۸۶۔ صبح مکتب میں پڑھنے جو آئے
منہ میاں جی کا تک کے رہ جائے
۲۸۷۔ پوچھیں جو کیا ہے دیکھنے کا سبب
کہے قدرت خدا کی دیکھوں ہوں اب
۲۸۸۔ ہوگئی شب میں آپ کی صورت
کچھ سے کچھ حق کی ہے یہ کیا قدرت
۲۸۹۔ کیا کہوں میں کہ آج کیسی ہے
شکل شاہِ جہاں کی جیسی ہے
۲۹۰۔ بحرِ حیرت میں ہوں یہ دیکھ کے غرق

سرِ مو کچھ رہا نہ باہم فرق

۲۹۱۔ پر یہ ہے شرط جائے جو اُن کے پاس
کہے کھا کھا قسم بلا وسواس

۲۹۲۔ تم تو سمجھو ہو ان کا عقل و شعور
بنیں گے جو بناؤگے بہ سرور

۲۹۳۔ مطلب ان نے جو کچھ کہ ٹھہرائے (کذا)
لڑکوں سے بات سب وہ بن آئے

۲۹۴۔ نہ رہا اس کو یہ بنا یاں تک
شکل شاہِ جہاں کی ہونے میں شک

۲۹۵۔ نہ کہ ٹھہرا ہے اس کے دل میں خیال (کذا)
ہوگا شاہِ جہاں کا جب کہ وصال

۲۹۶۔ اس کے ارکاں نہ لاکے تابِ فراق
میرے دیدار کو ہو سب مشتاق

۲۹۷۔ آئیں گے دیکھنے کو میرے گھر
بس مرے واسطے ہے یہ بہتر

۲۹۸۔ کہ میں پیدا کروں وہ خصلت و خو
خلق شاہِ جہاں سمجھ مجھ کو

۲۹۹۔ کریں مجرا، سلام اور تسلیم
نہ کروں میں فرشتے کی تعظیم

۳۰۰۔ غرض آفاق میں جسے ہو عقل
سمجھے ان کے مطابق اب یہ نقل

۲۸۰۔ کھیل اب میں نیا نکالا ہے
سارے کھیلوں سے وہ نرالا ہے
۲۸۱۔ لڑکے بولے بھائی جی فرماؤ
کیا ہے وہ کھیل تم ہمیں بھی بتاؤ
۲۸۲۔ کہا اس نے کہ بادشاہ و وزیر
لڑکے جو بنتے ہیں صغیر و کبیر
۲۸۳۔ اس میں چنداں تو یارو لطف نہیں
کھیل اس سے یہ خوب تر ہے کہیں
۲۸۴۔ میاں جی کو کسی طرح پھسلاؤ
مل کے شاہِ جہاں سب ان کو بناؤ
۲۸۵۔ ہنس کے وہ بولے ہوے یہ کس طرح
کہا اس نے کہ تم سنو اس طرح
۲۸۶۔ صبح مکتب میں پڑھنے جو آئے
منہ میاں جی کا تک کے رہ جائے
۲۸۷۔ پوچھیں جو کیا ہے دیکھنے کا سبب
کہے قدرت خدا کی دیکھوں ہوں اب
۲۸۸۔ ہوگئی شب میں آپ کی صورت
کچھ سے کچھ حق کی ہے یہ کیا قدرت
۲۸۹۔ کیا کہوں میں کہ آج کیسی ہے
شکل شاہِ جہاں کی جیسی ہے
۲۹۰۔ بحرِ حیرت میں ہوں یہ دیکھ کے غرق

سر مو کچھ رہا نہ باہم فرق
۲۹۱۔ پر یہ ہے شرط جائے جو اُن کے پاس
کہے کھا کھا قسم بلا وسواس
۲۹۲۔ تم تو سمجھو ہو ان کا عقل و شعور
بنیں گے جو بناؤگے بہ سرور
۲۹۳۔ مطلب ان نے جو کچھ کہ ٹھہراے (کذا)
لڑکوں سے بات سب وہ بن آئے
۲۹۴۔ نہ رہا اس کو یہ بنا یاں تک
شکل شاہِ جہاں کی ہونے میں شک
۲۹۵۔ نہ کہ ٹھہرا ہے اس کے دل میں خیال (کذا)
ہوگا شاہِ جہاں کا جب کہ وصال
۲۹۶۔ اس کے ارکاں نہ لاکے تابِ فراق
میرے دیدار کو ہو سب مشتاق
۲۹۷۔ آئیں گے دیکھنے کو میرے گھر
بس مرے واسطے ہے یہ بہتر
۲۹۸۔ کہ میں پیدا کروں وہ خصلت و خو
خلق شاہِ جہاں سمجھ مجھ کو
۲۹۹۔ کریں مجرا، سلام اور تسلیم
نہ کروں میں فرشتے کی تعظیم
۳۰۰۔ غرض آفاق میں جسے ہو عقل
سمجھے ان کے مطابق اب یہ نقل

۳۰۱۔ بنے یہ شیخ اپنے یوں بہ گماں
جیسے ملا بنا تھا شاہ جہاں
۳۰۲۔ شیخ کے سے نہ بخت ہیں نہ کمال
شیخ ہونا انھیں ہے امر محال[1]

---

1. اس مثنوی کے ساتھ جو تمہیدی نثر فارسی میں ہے۔ جان شیکسپیر نے اس کا اردو ترجمہ دیا ہے۔ "لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص نقل کرتا تھا کہ مرزا فاخر مکیں صاحب اپنے تئیں شیخ علی حزیں کے برابر جانتے ہیں اور سب وضع ان کی نشست و برخاست کی اختیار کی ہے بلکہ اپنے تئیں فضل و کمال میں ان سے بہتر جانتے ہیں اور اُن کے اکثر اشعار پر اصلاح کی ہے۔ چناں چہ یہ مثنوی حسب حال مرزا صاحب کے ہے۔"
(منتخبات ہندی، ۲، ص ص ۱۹۱۔۱۹۲)

سودا کے شاگرد

ہو کے استاد دبستانِ سخن میں سودا
شعر کے قاعدہ دانانِ جہاں پر آیا

شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا ہی سے استاد کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ ہر شاعر کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے عہد کے کسی استادِ فن کے سامنے زانوے ادب تہ کرے۔ استاد عروض و قوافی کے فن پر اچھا خاصا عبور رکھتا تھا۔ وہ فن شعر گوئی کے اصولوں سے شاگردوں کو واقف کرتا۔ استاد کی یہ اہمیت بیسویں صدی کے آغاز تک رہی اور اس آخری عہد کے اہم ترین استادوں میں داغ، امیر مینائی اور سیماب اکبرآبادی ہیں۔ اٹھارویں صدی اور نصف انیسویں صدی میں تو متمول لوگ گھروں پر بچوں کی تعلیم کے لیے جو اتالیق مقرر کرتے اس کے فرائض میں فن شعر گوئی کی تعلیم بھی شامل تھی۔ کیوں کہ اس دور کی تہذیب میں سخن گو ورنہ کم از کم سخن فہم ہونا ضروری تھا۔

اگر کوئی شاعر کسی استاد کا تلمذ اختیار نہ کرتا تو اس کی ادبی زندگی کے آغاز میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے اشعار کم رتبہ اور پایۂ اعتبار سے ساقط سمجھے جاتے۔ ادبی معرکوں میں اسے ''بے استادہ'' ہونے کا طعنہ دیا جاتا۔ میر نے ذکرِ میر میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے کسی استادِ فن سے کسبِ کمال کیا تھا۔ البتہ سعادت علی نامی ایک معمولی سے شاعر کا ذکر کیا ہے جس نے انھیں ریختہ گوئی کی ترغیب دی تھی۔ مگر میر یہ بات اس وقت کہہ سکے تھے جب اُن کی استادی مسلم ہو چکی تھی۔ اور ان کا شمار صفِ اوّل کے ریختہ گو شعرا میں ہونے لگا تھا۔ ورنہ جب تک لوگوں کے دلوں پر اُن کی شاعری کا سکہ نہیں بیٹھا تھا۔ اُنھیں جبراً و قہراً خانِ آرزو کو اپنا استاد کہنا پڑا تھا۔ تاکہ خانِ آرزو کے رعب سے مخالفین کے منہ بند رہیں۔[۱]

ایسا ہی حادثہ غالب کے ساتھ گزرا تھا۔ ادبی معرکہ میں انھوں نے عبدالصمد نامی ایک ایرانی نژاد شخص کو اپنا استاد بنایا ہے۔ لیکن اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عبدالصمد کا کوئی

---

۱ میر نے نکات الشعرا میں خانِ آرزو کو اپنا ''استاد و پیر و مرشد'' لکھا ہے۔ نکات الشعرا، ص۔۴، لیکن ذکرِ میر میں خانِ آرزو کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''خالوے من بادیہ پیماے طمع شد یعنی در لشکر شجاع الدولہ بہ ایں توقع رفت کہ برادرانِ اسحاق خاں شہید آں جا ہستند، نظر بر حقوق سابق رعایتے خواہند کرد۔ جز باد بدستش نیامد۔ للکدِ زمانہ خورد و ہم آں جا مُرد۔'' (ذکرِ میر، ص۷۵)

خارجی وجود نہیں تھا۔ اس کی اختراع محض مخالفوں کو خاموش کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

اٹھارویں صدی میں خان آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں دو اہم فارسی شاعر ہیں۔ ان دونوں کی تربیت نے بڑے بڑے اردو استاد پیدا کیے۔ خانِ آرزو کے شاگردوں میں شرف الدین مضمون، شاہ مبارک آبرو، غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ ایسے شاعر ہیں جن کا شمار ''دورۂ ایہام گویان'' کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح مرزا مظہر کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین، احسن اللہ خاں بیان، میر باقر حزیں اپنے عہد میں بہت مشہور و مقبول رہے۔ یہ لوگ ایہام گوئی کے خلاف تحریک کے علم بردار مانے جاتے ہیں۔ بڑے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے تلامذہ کی فہرست اچھی خاصی طویل نہ ہو۔

اگر ایک شاعر کے لیے یہ بات قابلِ فخر تھی کہ وہ کسی بڑے استاد کا شاگرد ہے تو استاد کے لیے بھی یہ بات باعثِ افتخار تھی کہ اس کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ حاتم نے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں اپنے ۴۵ شاگردوں کے نام درج کیے تھے[1] تلامذہ غالب میں مالک رام صاحب نے ۱۴۶ شاگردوں کا ذکر کیا ہے اور وہ الگ ہیں جن کے نام کتاب شائع ہونے کے بعد تحقیق ہوئے۔

شاہ کمال نے جرأت کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ہفتہ میں دو روز یعنی چہار شنبہ اور یک شنبہ اصلاح کے لیے مقرر تھے۔ تمام شاگرد جمع ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ ہر ایک کی اصلاح ہوتی۔ ایسی صحبت اور جلسہ شہر میں کہیں نہیں ہوتا تھا۔''
>
> (فارسی سے ترجمہ)[2]

مولانا محمد حسین آزاد نے ناسخ کے بارے میں لکھا ہے:

> ''آپ تکیہ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ شاگرد (جن میں اکثر امیر زادے شرفا ہوتے تھے) باادب بچھونے کے حاشیہ پر بیٹھتے جاتے۔

---

[1] مجموعہ نغز، ا، ص۔ ۱۵۵

[2] مجمع الانتخاب، ص۔ ۳

> دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے کچھ لکھتے۔ جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے ہوں! ایک شخص غزل سنانی شروع کرتا۔ کسی شعر میں کوئی قابلِ تبدیل ہوتا یا پس و پیش کے تغیر سے کام نکلتا تو اصلاح فرماتے۔ نہیں تو کہہ دیتے یہ کچھ نہیں نکال ڈالو یا اس کا پہلا یا دوسرا مصرع اچھا نہیں۔ اسے بدلو۔ یہ قافیہ خوب ہے۔ مگر اچھے پہلو سے نہیں بندھا۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ جب وہ شخص پڑھ چکتا تو دوسرا پڑھتا۔ اور کوئی بول نہ سکتا تھا۔"[1]

استاد اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی تربیت میں پوری کوشش کرتا۔ شاگرد بھی سعادت مندی سے پیش آتے۔ یہ استاد کی محبت کا نتیجہ تھا کہ بعض شاعروں کا تخلص استاد کے تخلص کے ہم وزن یا اُس جیسا ہوتا تھا۔ اس کی مثالیں شاگردانِ جرأت میں بہت ملتی ہیں۔ ان کے بعض شاگردوں کے تخلص تھے۔ اُلفت، غیرت، رخصت، حقیقت، محنت، محبت، مروت، قوت اور شوکت وغیرہ۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شاعر کسی استاد کا شاگرد ہے۔ استاد سے کسی بات پر اَن بَن ہوئی اور اس نے کسی اور کا تلمذ اختیار کرلیا۔ ایسے جھگڑوں میں کبھی کبھی شاگرد اپنے پہلے استاد کی ہجو بھی کہنے سے باز نہ رہتا۔ قائم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سودا کا تلمذ ترک کر کے ان کی ہجو کہی تھی۔ جس کا جواب سودا نے بھی ایک ہجو سے دیا تھا۔

ادبی معرکوں میں یہ شاگرد بہت کام آتے تھے۔ انشاء کے شاگردوں ہی نے مصحفی کے خلاف لکھنؤ کی سڑکوں پر جلوس نکالا تھا۔ مصحفی نے سودا کی وفات کے بعد ان پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ جن کا جواب شاگردانِ سودا نے دیا۔ کافی دن تک مصحفی اور شاگردانِ سودا میں معرکہ رہا۔ ایسے معرکوں میں اگر شاگرد میں صلاحیت ہوتی تو وہ خود استاد کے حریف کا مقابلہ کرتا۔ ورنہ استاد اس کے نام سے کہہ کر دیتا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ حریف کو نیچا دکھانے کے لیے استاد اپنے شاگردوں کو اعلیٰ درجے کی غزلیں کہہ کر دیتا۔ جو مشاعرے میں پڑھی جاتیں اور ان شاگردوں کی کامیابی کو حریف استاد کی ناکامی سمجھا جاتا۔ کبھی کبھی استاد اپنے کسی عزیز

---

[1] آبِ حیات، ص ص۔ ۳۵۰۔۳۵۱

نمونۂ کلام:

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

....

کل طلب میں مے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکاں ہو کے جوں سوفار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جامِ مے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسن کا نہ چاٹے جب تلک کب ہو نیام
اژدہے کی طرح وہ تلوار منہ کھولے رہے

....

دھمکایئے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سو گھونٹ اترتے ہیں
ہو دست پہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا
سو ناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدۂ غم دل سے
تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسنؔ
مغ پاس گرو ہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

....

کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قمر نہ لگا
بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان اک رمق باقی
لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسنؔ
گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

....

ہوس لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

....

ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

شاگرد کو باقاعدہ غزلیں کہہ کر دیا کرتا۔ یوں بھی ہوتا کہ اگر کسی نوجوان نے کوئی اچھی غزل پڑھی تو اسے استاد کا کلام تصور کیا جاتا۔ خواہ وہ اس نوجوان کا خونِ جگر ہی کیوں نہ ہو۔ انعام اللہ خاں یقینؔ اور دیا شنکر نسیمؔ پر یہی الزامات ہیں کہ یقین کا دیوان مرزا مظہر کا کیا ہوا ہے اور نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم آتش کی تصنیف ہے۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ صفِ اوّل کے بیشتر شاعروں کے نام سے ان کے اساتذہ کے نام زندہ ہیں ان شاعروں نے اساتذہ سے تربیت حاصل کی۔ لیکن بہت جلد اُن سے بہت آگے نکل آئے۔ اس کے برعکس یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ جن شاعروں پر اُردو ادب کو ناز ہے ان کے شاگردوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوا ہے جو استاد سے آگے بڑھنا تو کیا استاد کا ہم پلہ ہو۔

سوداؔ کے شاگردوں میں صاحب اقتدار بھی تھے اور غریب لوگ بھی۔ ایسے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جو صاحب دیوان تھے لیکن قائمؔ کے علاوہ ایک بھی ایسا شاعر نہیں جس نے حیاتِ جاوید پائی ہو۔

احسنؔ، مرزا احسن علی

سید علی حسن خاں[1] اور ضیغم[2] نے انھیں دہلوی لکھا ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ احسن پہلے خواجہ محمد یونس خاں سے متوسل تھے۔ پھر نواب وزیر مرحوم (نواب شجاع الدولہ) کے دربار میں ملازم ہوگئے۔ آج نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں بہادر کی سرکار میں ممتاز ہیں۔[3] میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ آج نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم ہیں۔[4] مصحفی نے نواب آصف الدولہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جب کہ شیفتہ لکھتے ہیں کہ وہ نواب آصف الدولہ کے دربار میں پیشۂ شاعری پر ملازم تھے۔[5] نساخ نے بھی یہی لکھا ہے۔ ممکن

---

1. بزمِ سخن، ص۔ ۱۰۱
2. تذکرۂ ضیغم، ص۔ ۱۲
3. تذکرہ ہندی، ص۔ ۱۷
4. تذکرہ شعرائے اُردو، ص
5. گلشنِ بے خار، ص۔ ۲۱

ہے احسن بہت کم عرصے کے لیے نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان دونوں تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ کچھ تذکرہ نگار اُن کی خوش نویسی کی تعریف کرتے ہیں۔[۱] معاصر تذکرہ نگار اُن کے بہت مداح ہیں۔ کمال لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مرزا احسن رضا خاں صاحب کے سرکار میں اُن سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ ''جوانِ جوش فکر و خوش خلق و خوش مزاج'' ہیں۔[۲] میر حسن انھیں ''خوش خلق اور نیک خو'' بتاتے ہیں۔[۳]

مصحفی ان کی شعر گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قوتِ شاعری چنانکہ شاعر را باید در قصیدہ وغیرہ پیدا کرد۔ چوں فی الجملہ طالب علمی ہم دارد شعر را بہ متانت وزانت تمام می گوید و احتیاطِ محاورہ وصحتِ زبان بسیاری می کند۔''[۴] میر حسن لکھتے ہیں۔ ''قصیدہ و غزل خوب می گوید''[۵] مصحفی نے ایک قصیدے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

مرے شفیق ہیں اول جو میرزا احسن
کمال ساتھ متانت کے ہے انھوں کا کلام

کلیاتِ سودا کے مصطفائی نسخے میں ایک قصیدہ ہے جس کے مصنف کے بارے میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سودا کا ایک شاگرد ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے۔

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر
کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ اس قصیدے کے مصنف احسن ہی ہیں۔[۶] ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔[۷]

---

۱ مصحفی انھیں ''خوش تحریر'' لکھتے ہیں (تذکرہ ہندی، ص۔۱۷)۔ شیفتہ لکھتے ہیں۔ ''بہ حسنِ خط و نکوے بیان مشہور است۔'' (گلشنِ بے خار، ص۔۲۱) مزید ملاحظہ ہو۔ عمدۂ منتخبہ، ص۔۵۶، تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۱۶

۲ مجموعۃ الانتخاب، ورق ۲۶ ب

۳ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔۱۶

۴ تذکرۂ ہندی، ص۔۱۷

۵ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔۱۶

۶ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء ص۔۱۷۹ ۷ ایضاً

نمونۂ کلام:

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

....

کل طلب میں مے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکاں ہو کے جوں سوفار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جامِ مے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسنؔ کا نہ چاٹے جب تلک کب ہو نیام
اژدہے کی طرح وہ تلوار منہ کھولے رہے

....

دھمکایئے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سو گھونٹ اترتے ہیں
ہو دست پہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا
سو ناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسن
مغ پاس گرو ہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

....

کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قمر نہ لگا
بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان اک رمق باقی
لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن
گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

....

ہوس لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

....

ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

نمونۂ کلام:

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

....

کل طلب میں مے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکاں ہو کے جوں سوفار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جامِ مے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسنؔ کا نہ چاٹے جب تلک کب ہو نیام
اژدہے کی طرح وہ تلوار منہ کھولے رہے

....

دھمکائیے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سو گھونٹ اترتے ہیں
ہو دست پہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا
سو ناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسن
مغ پاس گرو ہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

....

کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قمر نہ لگا
بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان اک رمق باقی
لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن
گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

....

ہوس لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

....

ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

نمونۂ کلام:

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

....

کل طلب میں مے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکاں ہو کے جوں سوفار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جام مے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسنؔ کا نہ چاٹے جب تلک کب ہو نیام
اژدہے کی طرح وہ تلوار منہ کھولے رہے

....

دھمکایئے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سو گھونٹ اترتے ہیں
ہو دست پہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا
سو ناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسنؔ
مغ پاس گرو ہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

....

کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قمر نہ لگا
بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان اک رمق باقی
لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسنؔ
گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

....

ہوس لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

....

ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر
کیوں تفکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے
یاد رہتی ہے اس میں پیارے تمہاری بیشتر
پیشتر تھی ہم کو اس سے دوستی اک طرح کی
اب تو بتلادے ہے تلوار و کٹاری پیشتر
بن کے خاک اب اُس کے کوچے سے بھلا کیوں کر اٹھے
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری پیشتر

....

کل بوسے کے سوال پر کیا کیا نہ کہہ گیا
میں اُس کے آگے اپنا سا منہ لے کے رہ گیا

....

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہِ حزیں ہے
کوئی دم ہے یاں، سو دمِ واپسیں ہے
گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا
ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے
گیا دل جو کہ کوچہ میں چیں جبیں کے
نہ پھر واں سے نکلا، عجب سرزمیں ہے
قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
کہا مان میرا ، یہ گھر دل نشیں ہے
نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

....

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا
رام اُس کا خدا ہے تو میں رام خدا کا

....

دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو
چشم میں روشنیِ طور سے بھی نور نہیں
بزم میں اس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی
دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو[1]

....

اسدؔ، میر امانی

میر حسن[2] اور عشقی[3] نے ایک شاعر میر اسد علی اسدؔ شاگردِ سودا کا ذکر کیا ہے۔ غالباً میر امانی اور میر اسد علی دونوں ایک ہی شاعر ہیں۔ کیوں کہ میر حسن اور عشقی دونوں نے اسدؔ کی ایک ہجو ''ہجو گنجفہ'' کا ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے میر امانی کے ترجمے میں اس ہجو کی تعریف کی ہے۔ اکثر تذکرہ نگاران کا نام میر امانی ہی بتاتے ہیں[4]۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ ''اکثر شاہجہاں آباد میں فقیر (مصحفی) کے مشاعرے میں آتے تھے۔ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ بعض لوگ انہیں اکبر آباد کا بتاتے ہیں۔ ان کے ایک ہمسائے میر ذوالفقار علی سے معلوم ہوا کہ وہ عازم لکھنؤ ہوئے تھے کہ خود کو پورب پہنچادیں۔ چونکہ ان کی موت نے امان نہ دی، راستے میں سرائے بانگر مئو میں رات کے وقت چوروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کی عمر پچاس سال

---

1. یہ اشعار تذکرۂ شعرائے اردو، تذکرۂ ہندی، عیار الشعراء (قلمی) مجموعۃ الانتخاب (قلمی)، گلشن بے خار اور گلشن ہند (علی لطف) سے لئے گئے۔
2. تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۱۳
3. تذکرۂ عشقی (دو تذکرے)، ص ۵۶
4. مثلاً مجموعہ نغز (ص ۱، ص ۵۹)، تذکرۂ ضیغم (ص ۴۵) طبقات الشعرائے ہند (ص ۶۴)، عیار الشعراء (ص ۱۵)، تذکرۂ آزردہ (ص ۴) بزم سخن (ص ۱۲، ۱۳) وغیرہ۔

کے قریب ہوگی۔" (فارسی سے ترجمہ[۱]) ذکا لکھتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں رہزنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ لیکن ضیغم لکھتے ہیں "اسد تخلص میر امانی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ مرزا رفیع سودا کے فن شعر میں شاگرد ہوئے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد پہنچے۔ وہیں انتقال کیا۔ مگر راقم تذکرۂ ہٰذا کو ایک ناتمام بوسیدہ تذکرہ مولف سراپا سخن کے والد کا لکھا ہوا مل گیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ آپ ۱۲۰۸ھ سے قبل لکھنؤ کی راہ میں کسی مقام پر رہزنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔"[۲]

میر حسن نے لکھا ہے کہ "حالات کی خرابی کی وجہ سے مرشد آباد چلے گئے۔"[۳] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسد لکھنؤ پہنچنے سے پہلے مرشد آباد گئے۔ وہاں سے لکھنؤ آتے ہوئے مارے گئے۔ مرشد آباد سے دہلی آئے اور پھر دہلی سے لکھنؤ کے راستے میں قتل ہوئے۔

اسد کچھ عرصے نواب افضل خاں کے ملازم رہے تھے۔ یہی وہ اسد ہیں جن کا شعر ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی[۴]

اور جس سے جل کر غالب نے اپنا تخلص اسد سے غالب کیا تھا۔ مصحفی ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "جوانے بود ظریف مزاج و خندہ روے دیوانے ضخیم ترتیب دادہ، در قصائد و غزل و مثنوی ماہر خصوصا مثنوی گنجفہ را بسیار بہ تلاش گفتہ[۵]۔" قاسم لکھتے ہیں۔ "وے جوانے بود خوش طبع شیریں زباں بذلہ سنج طیب بیاں خلیق و یار باش، خوش فکر پاکیزہ تلاش۔"[۶]

---

۱ تذکرۂ ہندی، ص۱۶

۲ تذکرۂ ضیغم، ص۴۵

۳ تذکرہ شعرائے اردو، ص۱۳

۴ تذکرۂ ہندی، ص۱۶

۵ تذکرہ ہندی، ص۔۱۶

۶ مجموعہ نغز، جلد۔۱، ص۔۵۹

کلام:

پی کر شراب دردِ تہِ جام دے گیا
وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا
آیا جو میکشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا
کل لڑ گیا کہ اور پہ عاشق ہے تو اسدؔ
آیا ہے جب وہ یاں تو اک الزام دے گیا

....

تھا بے خبر تو ہم سے ملے تھا وہ شوخ چشم
آئینہ دیکھتے ہی کچھ آنکھیں بدل گیا
جوں توں اسدؔ کو لائے تھے اس کی گلی سے ہم
خانہ خراب راہ میں آکر مچل گیا

....

مانے ہے کوئی وہ بتِ گمراہ کسی کو کی
گو آکے سفارش کرے اللہ کسی کو
پروانے پڑے جلتے ہیں روتی ہیں کھڑی شمع
یارب نہ شبِ وصل ہو کوتاہ کسی کی
پھنس قید میں، گر چاہ میں ہو گرگ کا طعمہ
جو چاہے اسدؔ کر، پہ نہ کر چاہ کسی کی

....

آدم تو کیا کہ جن و ملک ہیں ترے اسیر
مارا ہے دامِ زلف نے تیری جہان پر
اس مہروش کے چہرے پہ چیچک کے داغ سے
دن کو ستارے رہنے لگے آسمان پر
مت دیجو اپنے مصحفِ رخسار کی قسم
رکھ جاوے گا ابھی کوئی ہاتھ اس قرآن پر

....

رقیب مونہہ لگے اور میں نہ کرسکوں پا بوس
یہ کیا غضب ہے بس ایسا ہوں میں گیا گزرا
یہ دَوں لگی کہ نیستاں جلے ہے سر تا سر
مگر اسدؔ کوئی صحرا میں دل جلا گزرا

....

ہوں میں قربان ہر بہانے کے
خوب ڈھب یاد ہیں نہ آنے کے
کیا ہی رہتا ہے زلف سے برسر
ہاتھ اب چوم لیجے شانے کو کے
بر نہ آوے ترے سکوں سے اسدؔ
اتفاقات ہیں زمانے کے[1]

....

[1] یہ اشعار مجموعہ نغز، تذکرہ ہندی اور تذکرہ شعرائے اُردو سے لیے گئے۔

بسملؔ، مرزا بچھو بیگ

بہت غیر معروف شخصیت ہیں۔ دہلی کے رہنے والے اور سپاہی پیشہ تھے۔ اشپرنگر نے ذکاؔ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مغل نسل کے تھے اور ایک دیوان اُن سے یادگار ہے[۱]۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''......سپاہی پیشہ بہ اندیشہ نیک ذات حمیدہ صفات سخنش مطبوع و دلچسپ و کلامش مرغوب و الفت انگیز است[۲]'' کریم الدین نے تقریباً قاسم ہی کے الفاظ دہرا دیے ہیں[۳]۔

کلام:

نہ ہوتا گر کسو سے آشنا دل
تو کیا آرام سے رہتا مرا دل
اسے ہر وقت خوباں کیوں نہ چاہیں
رکھے ہے آرسی کی سی صفا دل
خدا جانے ہوا کیا اس کو بسملؔ
ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل[۴]

....

طرزِ سخن کو میرے کہتا ہے سن وفا سے
آتی ہے بوئے الفت بسملؔ ترے سخن سے[۵]

۱۔ یادگار شعرا، ص ۳۷
۲۔ مجموعۂ نغز، ۱، ص ۱۰۶
۳۔ طبقات شعرائے ہند، ص ص ۱۵۶،۱۵۵
۴۔ قاسم نے لکھا ہے بعض لوگ یہ غزل تاباںؔ سے منسوب کرتے ہیں۔ (مجموعۂ نغز، ۱۔ ص۔ ۱۰۶)
۵۔ یہ اشعار عمدۂ منتخبہ اور مجموعۂ نغز سے لیے گئے۔

جرأت، مرزا مغل

سرور نے ان کا تخلص جمیل لکھا ہے[1] جو بظاہر کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔ یہ حمید الدین خاں نیچہ کے صاحبزادے عبدالباقی خاں کے لڑکے تھے[2]۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''مردے بود بسیار قابل و نیک کردار نہایت خوشدل و شیریں گفتار[3]''۔ بریلی میں انتقال ہوا[4]۔

کلام

بھلا تو مجھ سے تو کہہ کیا ہوا تجھے اے دل
جو اس طرح سے تو رہتا ہے میرے لال پڑا
نپٹ ہی آج پریشاں ہے حال سنبل کا
چمن پہ آہ یہ کس زلف کا وبال پڑا

....

کیوں نہ ہوویں جان ودل سے ہم نثارِ آئینہ
عکس ہے مکھڑے کا تیرے ہم کنارِ آئینہ
روبرو ہوتے ہی مفتوں کرلیا اس شوخ کو
دیکھیو ٹک غور سے جرأت تو کارِ آئینہ

....

جوں برگِ گل جھڑے ہیں گلشن میں زیرِ گلبن

---

[1] عمدۂ منتخبہ، ص۔۲۰۹
[2] طبقات شعرائے ہند، ص۔۱۸۶
[3] مجموعۂ نغز، ۱، ص۔۱۶۶
[4] ایضاً اور سخن شعرا، ص۔۱۰۱

لختِ جگر پڑے ہیں یوں آس پاس میرے
غیروں کا گر میں شکوہ یارو کروں عبث ہے
سو دشمنوں کا دشمن دل ہے یہ پاس میرے[1]

....

جیناؔ، جینا بیگم

بہت کم تذکروں میں اِن کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مرزا بابر کی صاحبزادی اور جہاندار شاہ کی محلِ خاص تھیں[2]۔ ذکاؔ اور قاسمؔ نے اُن کے تلمذ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ابوالفضل محمد عباس رفعتؔ نے انہیں شاگردِ سودا لکھا ہے[3]۔

کلام:

یہ کس کی آتشِ غم نے جگر جلایا ہے
کہ تا فلک مرے شعلے نے سر اٹھایا ہے

....

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

....

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر
کیا جانیے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی

....

---

[1] یہ اشعار مجموعۂ نغز سے لیے گئے ہیں۔
[2] مجموعۂ نغز، ا، ص۔ ۱۷۸
[3] تذکرہ ماہِ درخشاں، ص۔ ۱۳

نہ دل کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمہارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

....

یاالٰہی یہ کس سے کام پڑا
دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

....

روٹھنے کا عبث بہانہ تھا
مدّعا تم کو یاں نہ آنا تھا[1]

....

حجّام، عنایت اللہ

ان کا عرف کلو تھا[2]۔ قاسم غالبًا واحد تذکرہ نگار ہیں، جنہوں نے لکھا ہے کہ ''در مقطع ہر غزل پرورش تخلص می کند[3]۔'' حالانکہ خود قاسم نے تقریبًا گیارہ مقطع نقل کیے ہیں جن میں حجام تخلص ہے اور کوئی مقطع ایسا نہیں ہے جس میں پرورش باندھا گیا ہو۔ غالبًا انہیں غلط فہمی ہوئی۔ حجام سہارنپور کے رہنے والے تھے[4]۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ ''متصل مدرسۂ غازی الدین خاں دکانِ سخن را گرم داشتہ[5]۔'' غالبًا میر حسن کا مطلب ہے کہ مدرسۂ غازی الدین کے قریب رہتے تھے۔ یہ حجام پیشہ تھے۔ لیکن بقول مصحفی دوسرے موتراشوں کی طرح یہ کبھی بازار میں گھومتے تھے اور نہ دکان پر بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ خانہ نشین رہتے[6]۔

---

[1] یہ اشعار مجموعۂ نغز اور تذکرہ ماہ درخشاں سے لیے گئے۔
[2] عمدۂ منتخبہ، ص۔ ۲۲۹۔ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص۔ ۲۱۷، عیار الشعرا (مائیکروفلم)، ص۔ ۲۱۶
[3] مجموعۂ نغز، ۱، ص۔ ۱۹۸
[4] تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۲۵۳، ب۔ گلشن بے خار، ص۔ ۵۶
[5] تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔ ۵۰
[6] تذکرہ ہندی، ص۔ ۷۷

اکثر تذکرہ نگاروں نے انہیں شاگردِ سودا لکھا ہے۔ شاہ کمال نے سودا سے ان کے تلمذ کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ لکھا ہے کہ میاں محمد قائم اور دوسرے شعرا کی صحبت میں تربیت پائی۔[1]

ہم عصر تذکرہ نگار اُن کے مداح ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ "چوں طبعش از ابتدا موزوں افتادہ بود باوجود کم علمی شعر ہندی را بخوبی سرانجام می دہد و معنی ہائے نازک تر از موے می یابد، چنانکہ در اکثر مشاعرہ ہا مورد تحسین و آفریں یاراں بودہ...... وضیع و شریف شاہجہاں آباد او را بسیار دوست می دارند"۔[2] قاسم لکھتے ہیں "...... اما درویش نہاد صاحب شعور، بیشتر اوقات مشغول بہ حق می ماندہ و مثنوی مولوی معنوی علیہ الرحمۃ می خواند و مولہ سماع بود و وجدی فرمود"۔[3]

حجّام مولانا محمد فخر الدین کے مرید تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ حجّام چھٹیوں کے دن یعنی سہ شنبہ اور جمعہ کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان کے خط کی اصلاح اور خضاب لگاتے۔ مولانا کی صحبت کا اثر ہے کہ حجّام مشائخانہ لباس پہنتے ہیں۔ اسی لیے اہل محلہ انہیں شاہ جی کہتے ہیں۔[4]

قدرت اللہ شوقؔ نے لکھا ہے کہ "حجّام مدت سے فرخ آباد میں مقیم ہیں۔" میری نظر سے کوئی اور تذکرہ نہیں گزرا جس میں ان کے قیام فرخ آباد کا ذکر ہو۔ اس کے برعکس مصحفی جوان سے آشنائی کے مدعی ہیں، لکھتے ہیں۔ "ان کی عمر پینتیس سال سے اوپر ہوگی۔ چھ سال ہوئے شاہجہاں آباد میں وفات ہوئی"۔[5]

میں نے ایسا کوئی تذکرہ نہیں دیکھا۔ جس میں ان کے صاحبِ دیوان ہونے کا ذکر ہو۔ لیکن قاسم نے جس انداز سے شعر پیش کیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان سے انتخاب کیے گئے ہیں۔

---

۱ تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۲۵۳
۲ تذکرۂ ہندی، ص۔۷۷
۳ مجموعہ نغز، ۱، ص۔۱۹۷
۴ تذکرۂ ہندی، ص۔۷۸
۵ ایضاً

کلام:

روز رخسار کے لیتا ہے مزے خوباں کے
بہتر اس سے کوئی حجام ہنر کیا ہوگا

....

ہردم نظر آتے ہیں نئے یار تمہارے
ہم جی چکے گر ہیں یہی اطوار تمہارے
ہے جی میں تمنا کہ اون آنکھوں سے یہ پوچھوں
بچتے نہیں کس واسطے بیمار تمہارے
اک روز نصیبوں سے کہیں واں تئیں پہنچوں
پھر سر ہے مرا اور در و دیوار تمہارے
اوّں کاوشِ مژگاں کا گلہ ہم سے عبث ہے
اے آنکھو! یہ بوے ہوئے ہیں خار تمہارے
اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک دن کہیں ہتھیار تمہارے

....

حجّام پڑا سخت حیا ناک سے پالا
کچھ اور تو کیا بات جو وہ منہ سے نکالے
لگ چلیے جو اُس شوخ سے رستے میں تو اے
جھنجھلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رزالے

....

کن سلوکوں سے ہم ان کے پاس اے ہمدم گئے

وہ گئے ہم سے اور ان کے دل سے بس اب ہم گئے
ہے یہ زخم عشق اے حجامؔ کب اچھا ہوا
واسطے ان کے عبث تم ڈھونڈنے مرہم گئے

....

فلک کے جور کے مارے ہوؤں سے یہ کوئی پوچھے
کہ ہو زیر زمیں بھی دکھ میں یا آرام کرتے ہو
رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی
بُلا حجامؔ کو جس روز تم حمام کرتے ہو

....

بھول اس کی گلی میں جارہا تھا
کل مرنے میں مرے کیا رہا تھا[1]

....

حسنؔ، میر محمد حسن دہلوی

میر نے ان کا نام میر حسن لکھا ہے۔ انہیں نوکر پیشہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اکثر میرے گھر پر مشاعرے میں تشریف لاتے ہیں[2]۔ گردیزی نے ان کا پورا نام میر محمد حسن دہلوی لکھا ہے اور وہی دو مطلعے نقل کیے ہیں جو میر نے نکات الشعرا میں دیے ہیں[3]۔ عشقی اور نساخ نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بہت غیر معروف شخصیت ہیں۔ مجھے ان دو شعروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔

لگتا ہے آج مجکو یہ سارا جہاں خراب

---

۱ یہ اشعار مجموعہ نغز، تذکرہ ہندی اور عمدہ منتخبہ سے لیے گئے ہیں۔
۲ نکات الشعرا، ص۔ ۱۳۵
۳ تذکرہ ریختہ گویان، ص۔ ۱۳۵

شاید کہ مر گیا ہے کوئی خانماں خراب
قاتل اگر کہے کہ سسکتا ہی چھوڑیو
خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑیو[1]

....

راقم، بندرابن

اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا وطن دہلی بتایا ہے۔ لیکن شیفتہ لکھتے ہیں بعضے انہیں متھرا کا باشندہ لکھتے ہیں اور بعضے دہلی کا بتاتے ہیں۔ لیکن ان کا نام دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ متھرا کے ہوں گے کیوں کہ وہاں نام اسی طرح رکھے جاتے ہیں۔[2]

شیفتہ نے تلمذ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ کسی نے انہیں مرزا مظہر کا شاگرد بتایا ہے اور کوئی شاگرد سودا لکھتا ہے۔[3] عبدالغفور نساخ نے انہیں دونوں (یعنی مظہر و سودا) کا بتایا ہے۔[4] لیکن کچھ تذکرہ نگار انہیں تلمیذ سودا بتاتے ہیں۔[5] اس سلسلہ میں میر کی روایت ہے کہ مشق شعر مرزا رفیع سے کرتے ہیں۔ اس سے قبل فقیر (میر) سے بھی مشورہ کرتے تھے۔[6] بقول قائم محرر پیشہ تھے۔ اسی رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص راقم رکھا تھا۔[7] میر حسن انہیں ذات کا کھتری بتاتے ہیں۔[8] عشقی نے لکھا ہے کہ وہ بہت کوتاہ قد تھے۔[9] میر حسن نے بھی یہی

---

۱ نکات الشعرا، ص۔ ۱۳۵

۲ گلشنِ بے خار، ص۔ ۸۴، قائم نے اُن کا وطن متھرا لکھا ہے۔ مخزن نکات، ص۔ ۵۵

۳ گلشنِ بے خار، ص۔ ۸۴

۴ سخن شعرا، ص۔ ۱۷۹

۵ مثلاً چمنستانِ شعرا، ص۔ ۵۱۲۔ تذکرہ گلزار ابراہیم مع تذکرہ گلشنِ ہند، ص۔ ۱۳۷، عمدۂ منتخبہ، ص۔ ۲۹۹ مجموعۂ نغز، ۱، ص۔ ۲۶۴۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔ ۷۳ وغیرہ۔

۶ نکات الشعرا، ص۔ ۱۴۳

۷ مخزن نکات، ص۔ ۵۵

۸ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔ ۷۳

۹ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص۔ ۳۲۶

لکھا ہے کہ بسیار پست قد و بلند فکر است"۔[۱] اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کی تعریف کی ہے۔ قائم لکھتے ہیں "قوت حافظہ کمال کی ہے۔ سو شعروں کا قصیدہ ایک بار سن کر یاد کر لیتے ہیں اور اسے دہرانے میں تامل نہیں کرتے"[۲] شورش لکھتے ہیں۔ بسیار خوش فکر و خوش گو است، مضمون را بآئین شائستہ می بندد"۔ کلامش فصیح و بلیغ است"[۳] مخمس کہنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ قائم، میر حسن اور عشقی نے ان کی مخمس گوئی کی تعریف کی ہے[۴] صاحب دیوان تھے[۵]

کلام:

دل کنجِ قفس میں کر فریاد بہت رویا
ہنسنے کے تئیں گل کے کر یاد بہت رویا

....

ابرِ تر سے چشم گریاں کم نہیں
موج دریا ہے شکنج آستیں

....

قطعہ

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب دل کی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

....

---

۱ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔۷۳
۲ مخزن نکات، ص ص۔۵۵۔۵۶
۳ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص۔۳۲۵
۴ مخزنِ نکات، ص۔۵۶، تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔۷۳، تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص۔۳۲۶
۵ عیار الشعرا (مائیکرو فلم) ص۔۱۷۰، اور سخن شعرا، ص۔۱۷۹

قطعہ

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
مجکو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

....

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب
یارب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

....

دیکھا نہ ہو جسے میں کوئی سرزمیں نہیں
پر تخمِ دل ہو سبز جہاں سو کہیں نہیں
سنتے تھے ہم جہان میں اہلِ کرم کا ہاتھ
آیا جو دید میں تو کم از آستیں نہیں

....

مری بد شرابیوں سے کریں توبہ میکساراں
رہے وہ عمل کہ ہووے سبب نجات یاراں
سنا کن نے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رویا
رکھے ہے مگر یہ قصہ اثرِ دعائے باراں

....

بیچوں ہوں میں اس پاس یہ دل نیم نگہ کو
اس پر بھی ستم ہے جو خریدار نہ ہووے

....

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں[1]
کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں
کہتا تھا کون یہ کہ خوشی ہے جہاں کے بیچ
اس بات کا تو یاں کہیں مذکور ہی نہیں

....

سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہے جگ میں دوام صبح
ہوگی کبھی اے چرخ ہماری بھی شام صبح

....

معصیت میری بہت ہے کہ تری بخشش بیش
اپنی رحمت پہ نظر کر میرے عصیاں کو نہ دیکھ

....

صیاد کب تو چھوڑے گا مجھ کو قفس سے آہ
کھٹکے ہے میرے دل میں بہت خار خار باغ

....

رونے میں اس قدر تو جگر اے جگر نہ کر
دیکھا نہ تو نے کچھ کہ دل و دیدہ کیا ہوے

....

---

[1] اس مصرع پر میر حسن نے اعتراض کیا ہے کہ عین کے گرنے سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے۔ اگر یہ مصرع اس طرح ہو تو اچھا ہے۔ "میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں۔" تذکرہ شعراے اُردو، ص۔ ۳۷

نامے کا مرے اس سے لے کر جواب پھرنا
پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا
اک دے بھی دن تھے یارب جو تھا ہمیں میسّر
گلشن میں ساتھ اس کے پیتے شراب پھرنا

....

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اس کی بات ہنس کر
جو چاہے گوہرِمقصود اے دل
صدف کی طرح تو پاسِ نفس کر

....

یاں تک قبول خاطر کیجیے تری جفا کو
تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

....

دیکھا میں رات جاکر احوال چشم راقم
برسات کی اندھیری پتلی کی تھی سیاہی

....

جوکہ مائل ہے تیغ ابرو کا
تشنہ لب ہے وہ اپنے لہو کا
تیرے اعضا میں تجھ کمر سے میاں
فرق ہر گز نہیں سرِ مو کا

راقم ہوتا نہیں وہ ہم آغوش
کیوں کے ہو دور درد پہلو کا

....

ہے زلف میں تیری جاے عاشق
زنجیر ہے اور پاے عاشق[1]

....

رضاؔ، مرزا احسن رضا[2]

ان کا عرف میرزا جیون[3] تھا۔ والد کا نام مرزا جان تھا۔ بزرگ خوارزم سے ہندوستان آئے تھے[4]۔ شاہ کمال ان سے ذاتی تعلقات کے مدعی تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔ رضا شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ صاحب دیوان تھے اور بہت خوش فکر، انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنا دیوان مجھے دیا تھا۔ جو موجود ہے۔ مشقِ سخن مرزا سودا سے کرتے تھے۔ مجھ سے بہت اتحاد و ربط تھا۔ بچپن سے سالہا سال اس زمانے تک لکھنؤ میں ملاقات رہتی تھی۔ ہم ایک ساتھ رہتے تھے۔ میں انہیں لکھنؤ چھوڑ کر آیا ہوں۔ خدا انہیں سلامت رکھے[5]۔ بعض تذکرہ نگار انہیں میر نظام الدین ممنون کا شاگرد بتاتے ہیں[6]۔ سرور لکھتے ہیں کہ وہ پہلے میاں نصیر (غالباً شاہ نصیر) سے اصلاح لیتے

---

[1] یہ اشعار نکات الشعرا، مخزنِ نکات، مجموعۂ نغز اور تذکرہ شعراے اُردو سے لیے گئے۔

[2] قاسم (مجموعۂ نغز، ۱، ۲۷۰) کریم الدین (طبقات شعراے اُردو، ص۔ ۲۲۶) نے اُن کا نام مرزا محمد رضا لکھا ہے جو ٹھیک نہیں۔

[3] ناسخ نے ان کا نام مرزا جیون لکھا ہے۔ سخن شعرا، ص۔ ۱۸۵

[4] عمدۂ منتخبہ (ص۔ ۲۹۴) میں ان کے والد کا نام مرزا خان دیا گیا ہے۔ جو غالباً سہوِ کاتب ہے۔ کیوں کہ سخن شعرا (ص۔ ۱۸۵) اور گلشنِ بے خار (ص۔ ۸۶) میں مرزا جان دیا گیا ہے۔

[5] تذکرہ کمال (قلمی) ورق۔ ۳۲۶

[6] گلشنِ بے خار، ص ۸۶، سخن شعرا، ص۔ ۱۸۵

تھے۔ بعد میں ممنون کا تلمذ اختیار کر لیا[1]

کلام:

یہ یقیں ہے کہ اس کی موت آئی
جس کو ملتا ہے یار ہر جائی
ہجر کی رات کیوں کے گزرے گی
یہ تو ساتھ اپنے آفتیں لائی

....

جو اب یاں سے تشریف لے جایئے گا
ہمیں بھی کبھی یاد فرمایئے گا
یہ دل بل رہا ہے ترے ساتھ پیارے
بھلا کس طرح اس کو بہلایئے گا
چلا جب کہا میں نے کیا حال میرا
لگا کہنے تجھ کو بھی بلوایئے گا
وہ ہرچند روٹھا ہے پر اس کو پیارے
یہاں تک کسی طرح سے لایئے گا
رضا یہ زمیں ہے نہایت شگفتہ
غزل در غزل اس کو کہلایئے گا
ترے در سے پیارے اگر جایئے گا
بہت دل کے ہاتھوں سے دکھ پایئے گا

---

[1] عمدہ منتخبہ، ص۔۲۹۴

نہ کہیے کہ عاشق نہیں جان دیتے
تماشا تمہیں یہ بھی دکھلایئے گا
ستانا کسی کا نہیں خوب ہرگز
عزیزو یہ بات اس کو سمجھایئے گا
سمجھتے ہو تم خوب غیروں سے ملنا
کیے کو بہت اپنے پچھتایئے گا
کبھی اے عزیزو قدم رنجہ کر کر
اگر اس کے کوچے تلک جایئے گا
رضاؔ مرچلا ہے جدائی میں تیری
مرا یہ پیام اس کو پہنچایئے گا

....

ہر ایک دوست ہے تیرے لیے عدو میرا
خدا کی یہ بھی ہے قدرت ہوا نہ تو میرا
کیا تھا گریہ کہ تاکم ہو اس کی آتشِ قہر
بھڑکنے اور لگا مجھ پہ شعلہ خو میرا
ہو نفع مجھے اس میں کہ یا ہو وے خسارا
اب ملک محبت کالیا میں نے اجارا
چمکے ہے دُرِ گوش تہِ زلف ترا یوں
جس طرح جھلک جائے کہیں ابر میں تارا
صورت ترے بیمار کی اب ایسی ہوئی ہے
کہتے ہیں اطبا نہیں تقدیر سے چارا

کس کام میں ہو آہ کہ ناکام ہیں مرتے
پھر آئے ہو کیا جب کہ ہوا کام ہمارا
اس مرگ کے صدقے کہ دم نزع وہ بولے
لو کام کیا میرے یہ خنجر نے تمہارا
منہ پر ترے قطرہ نہ عرق کا ہے چمکتا
حیرت ہے کہ خورشید میں نکلا ہے ستارا

....

کیا کیا نہ برق چمکے ہے ہر ہر شرار سے
نکلے ہیں شعلے ایسے دلِ داغ دار سے
مانگے ہے تیری چشم مرا دل، کروں ہوں نذر
دھمکائے کیوں ہے غمزۂ خنجر گزار سے
دستِ جنوں قصور نہ کر یہ بھی ہیں گراں
لٹکے رہ گئے ہیں میرے گریباں کے تار سے

....

دل میں حسرت رہ نہ جائے منہ دکھایا چاہیے
ہے وداع جان اپنی اب تو آیا چاہیے
بے طرح دل کو قلق ہے کوئی دم میں ہم چلے
دوستو بیٹھے ہو کیا ان کو لایا چاہیے

....

ضعف سے ہم نہیں سنبھلتے ہیں
لب ہلانے میں دم نکلتے ہیں

غیر سے گرم اختلاط ہیں وہ
ہم یہ سنتے ہیں اور جلتے ہیں
خانۂ دل رہے نہ کیوں روشن
داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
درد سے دل کے آہیں بھرتے ہیں
نہ تو جیتے ہیں ہم نہ مرتے ہیں
داغ دیں تازہ کیوں نہ لالہ رخاں
نت نیا غیر گل کترتے ہیں[1]

....

شرفؔ، شیخ شرف الدین حسین

سرورؔ نے انہیں لکھنؤ کا باشندہ لکھا ہے[2] لیکن شیفتہ[3] اور نساخ[4] انہیں دہلوی بتاتے ہیں۔ شیفتہؔ لکھتے ہیں قدم شریف کے راستے پر ان کا گھر تھا اور دارو غگی کروڑہ ان سے متعلق تھی[5] لیکن شاہ کمال لکھتے ہیں کہ غلام حسین خاں کروڑہ کے رشتہ داروں میں تھے۔ لکھنؤ میں فقیر سے بہت ملاقات ہوتی تھی[6] ممکن ہے یہ دہلی کے رہنے والے ہوں اور بعد میں لکھنؤ چلے گئے ہوں۔ قاسمؔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جوانے است خلیق وخوش گو، محبت منش، نیک خو، گونہ از علم بہرہ دُرو قدرے از چاشنی سخن باخبر اگر سلام و مرثیہ گوید، گاہے بہ تکلیف احبا رخشِ ہمت درمیدان غزل گفتن پویَد"[7] کمالؔ اور نساخؔ نے انہیں شاگردِ سوداؔ لکھا ہے۔

---

[1] یہ اشعار تذکرہ ہندی اور عمدہ منتخبہ سے لیے گئے۔

[2] عمدۂ منتخبہ، ص۔۳۷۴

[3] گلشنِ بے خار، ص۔۱۰۸

[4] سخن شعرا، ص۔۲۴۵

[5] گلشنِ بے خار، ص۔۱۰۸

[6] تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۵۲۶ ب

[7] مجموعۂ نغز، ۱، ص۔۳۴۱

کلام:

اب دن پھرے ہمارے یہ ہم پر عیاں ہوا
وہ مہ جبیں جو رات کو پھر مہرباں ہوا

....

ہمیں اس خاکساری پر بھی تو ناشاد مت کیجو
ہوائے ہجر سے ہم کو کبھی برباد مت کیجو

....

لوٹے چمن میں گل کے خزاں یوں بہار حیف
اور عندلیب جیتی رہے تو ہزار حیف

....

مانند مرغ قبلہ نما گرچہ مضطرب
پھرتا ہوں اپنے گھر میں پہ عزلت گزیدہ ہوں[1]

....

شید[1]، میر فتح علی

یہ سید زادے تھے[2]۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے انہیں شمس آباد مئو کا بتایا ہے۔[3] میر سوز نے انہیں متبنیٰ کر لیا تھا۔[4] آصف الدولہ کے ہاں خاص سپاہیوں اور مصاحبوں میں شامل تھے۔ پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔[5] میر حسن ان کے مداح ہیں لکھتے ہیں۔ ''جوانے بہ کمالِ اخلاق

---

[1] یہ اشعار عمدۂ منتخبہ، گلشنِ بے خار، مجموعۂ نغز اور سخن شعرا سے لیے گئے۔

[2] مجموعۂ نغز، ۱، ص۔ ۳۵۶

[3] گلزار ابراہیم، ص۔ ۱۶۵، سخن شعرا، ص۔ ۲۶۴، عمدۂ منتخبہ، ص۔ ۳۷۲ وغیرہ

[4] حیدر بخش حیدری، گلشن ہند (فوٹوسٹیٹ مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو) ص۔ ۴۸

[5] مجموعۂ نغز ص۔ ۳۵۶، نیز ملاحظہ ہو عیار الشعرا (قلمی) ۱۲۶۔ ب

متواضع، مؤدب''[1] تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ عشقی لکھتے ہیں۔ '' کلامش از حالتِ یاس وسوزِ درونی خالی نیست''[2] ابوالحسن امیر الدین لکھتے ہیں۔ ''طبع موزوں و دردمند دارد از کلامش بوے دل سوزی وشیدائی می آید''[3] قاسم لکھتے ہیں۔ ''شعرش بہ غایت پختہ و باکیفیت است ۔ دیوانش تا الیوم سہ ہزار بیت تخمیناً بر صفحہ روزگار ثبت افتادہ''[4] فدوی سے ادبی معرکہ ان ہی کا ہوا تھا۔ جس کی تفصیل ہجوگوئی کے تحت بیان کر دی گئی ہے۔

کلام:

کیا دل پر اپنے سختی ایام کی کہوں میں
سمجھا تھا جس کو شیشہ وہ سنگ ہو کے نکلا
راہِ طلب میں ماندا چل دو قدم ہوا یہ
گویا کہ میں ہزاروں فرسنگ ہو کے نکلا

....

رکھ دل کو مرے اے مرے صیاد قفس میں
ٹھہرے ہے کوئی مرغ ہو اگیر سرِ دست

....

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

....

---

۱ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔ ۹۲
۲ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)ص۔ ۴۸
۳ تذکرہ مسرت افزا، بحوالہ معاصر، حصہ۔ ۷، ص۔ ۱۱۵
۴ مجموعۂ نغز، ۱، ص۔ ۳۵۶

میں تو ملوں گا ناصحا باتیں یہ تینوں جان کے
گو کہ عدو ہیں خوبرو دل کے جگر کے جان کے[1]

....

عظیم، مرزا عظیم بیگ

میر حسن[2]، عشقی[3] اور علی ابراہیم خاں خلیل[4] نے جس محمد عظیم عظیم کا ذکر کیا ہے۔ وہ غالباً یہی ہیں۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کابلی الاصل تھے اور دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ بہت صاحب غیرت و عزت تھے۔ دوست نواز، دشمن گداز، مروت نہاد، فتوت بنیاد، محبت پرور، مودة گستر اور ظریف مزاج تھے[5] مصحفی نے انہیں دہلی میں دیکھا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں "چند روز فرخ آباد میں فقیری اختیار کر لی تھی[6] اب پھر دنیا دار ہو گئے ہیں۔ فقیر نے انہیں شاہجہاں آباد میں دیکھا تھا۔ چیچک رو تھے۔ اکثر مشاعروں میں آتے اور صدر مجلس پر بیٹھتے......سپاہی پیشہ تھے[7] قاسم نے لکھا ہے کہ عظیم ابتدا میں حاتم سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے خواجہ میر درد کے شاگرد رہے۔ آخر میں سودا کا تلمذ اختیار کیا[8] کچھ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ بہت برخود غلط آدمی تھے[9] لیکن اکثر تذکرہ نگاروں نے عظیم کے فن شاعری کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ سرور لکھتے ہیں۔ "الحق کہ معانی باریک

---

۱ یہ اشعار مجموعۂ نغز اور تذکرہ شعرائے اُردو سے لیے گئے۔ آخری دو مطلعے جن غزلوں کے ہیں وہ غلطی سے کلیاتِ سودا میں شامل ہو گئی ہیں۔ اُن کے اصل مصنف شیدا ہی ہیں۔

۲ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔۱۰۹

۳ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص۔۱۹

۴ گلزارِ ابراہیم، ص۔۱۸۰

۵ مجموعۂ نغز،۲، ص۔۱

۶ میر حسن نے محمد عظیم کے ترجمے میں لکھا ہے۔ "مدتے در فرخ آباد بہ لباسِ درویشی بہ سر بردہ۔" اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ دونوں عظیم ایک ہی ہیں اور ان کا اصل نام مرزا عظیم بیگ ہے۔

۷ تذکرہ ہندی، ص۔۱۴۹

۸ مجموعۂ نغز،۲، ص۔۲

۹ مثلاً تذکرہ ہندی، ص ص۔۱۵۰۔۱۵۱، گلشنِ بے خار، ص۔۱۳۶، عمدۂ منتخبہ، ص۔۳۱۶ وغیرہ۔

ومضامین نازک دراشعار مندرج می کرد......استاد زبان آور وخوش فکر زمان خود بود، قصائد کہ درحمد ونعت ومنقبت از طبع رسائے اور موزوں شدہ، پہلو بہ قصائد میرزا رفیع السودا می زند''[1]
قاسم ان کے بہت مداح ہیں۔ لکھتے ہیں۔''شعرش پختگی تمام دارد در خیال بندی ونازک خیالی خیلے ہنر پردازی ہا بر روے کار آرد۔ دریں کار استوار ید طولیٰ داشت وبیشتر بہ معانی بندی ہمت می گماشت اکثر غزل درغزل بہ تلاش لفظ ومعنی تا سہ چار غزل می گفت وصنائع بدائع بسیار بکار می بردزور طبعش از قصائد ریختۂ طبع وقادش روشن می شود قصیدہ وے بے اغراق بہ قصیدہ سرآمد شعراے فصاحت آیا مرزا محمد رفیع سودا می ماند مختصر کلام دیوانے مختصر در نہایت جودۃ وپختگی بر صفحہ روزگار از و یادگار است''[2]

یہی وہ عظیم بیگ ہیں جن کا انشاء اللہ خاں انشا سے ادبی معرکہ ہوا تھا۔ جس کی تفصیل قاسم نے بیان کی ہے۔ مختصر روداد یہ ہے کہ ایک دفعہ مرزا عظیم بیگ (جو بہت برخود غلط تھے) نے ایک غزل کہی۔ اتفاق سے بحر رجز سے بحر رمل میں جا پڑے۔ عظیم اپنے دوست اور مخلص میر ماشاء اللہ (والد انشاء اللہ خاں) کے ہاں یہ غزل سنا رہے تھے۔ اتفاق سے انشاء اللہ خاں بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے خوب تعریف وتحسین کی۔ دوبارہ پڑھوایا اور غزل یاد کر لی۔ جب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا میڈو کے مشاعرے میں عظیم غزل پڑھ رہے تھے تو ان سے تقطیع کرنے کو کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ بحر بدل گئی تھی۔ انشاء کا داؤ چل گیا تھا۔ اب جواباً انہوں نے ایک مخمس پڑھی جو عظیم کی ہجو میں تھی۔ پہلا بند یہ تھا ؎

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل پڑھے چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

---

[1] عمدۂ منتخبہ، ص۔۴۲۶ وغیرہ
[2] مجموعۂ نغز، ا ص ص۔۱۔۲

اس کے جواب میں عظیم نے بھی ایک مخمس کہی، جو قاسم نے پوری نقل کی ہے۔ جس کا ایک بند یہ ہے۔

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق
تبدیل بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق
شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

عظیم کی حمایت میں قاسم نے بھی انشاء کی ہجو کہی لیکن بقول قاسم یہ تو وہ مکا تھا جو لڑائی کے بعد یاد آتا ہے۔ نساخ لکھتے ہیں کہ بارہ سو اکیس ہجری میں ان کا انتقال ہوا[1]

کلام:

کل چشم خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ یک تختۂ چمن تھا
کچھ عظیم کو بھی یارب غریقِ رحمت
آوارۂ جنوں سا اک صاحب سخن تھا
اور معنی بند ایسا ہندی زباں کا صائب
ہندوستاں سے لے کر مشہور تا دکن تھا
اک دن جو گھر سے نکلا خط شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پر ہر تارِ پیرہن تھا
دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

....

[1] سخن شعرا، ص۔۳۳۳

چوں شمع کب چھپے ہے مرے سوزِ جاں کی بات
سر کاٹو تو گلے سے ہو روشن زباں کی بات
بھر عمر تم نے سیدھی نہ اے مہرباں کی بات
جب کی نہ کی تو کی ہے سدا ہم سے یاں کی بات
ہر بات میں نرالی ہے کچھ تیرے ہاں کی بات
نکلی سوا نہیں نہ کبھی تجھ سے ہاں کی بات
جوں تار ساز کب میں کہوں داستاں کی بات
نکلے ہے اوس کے ہاتھوں یہ میری زباں کی بات
پیدا کرے جو نام کوئی تو مٹے ہے کھوج
عنقا کے جی سے پوچھیے نام و نشاں کی بات
ہوں سینہ چاک و چشم تر از بسکہ جوں قلم
آتا ہے گریہ غیر کے سن کر بیاں کی بات
بیٹھا ہوں سر لیے تری تقریر پر عظیم
جوں شمع سر کے ہاتھ ہے میری زباں کی بات
پلٹنِ چشم فرنگی زادہ دل پر باندھ کوٹ
نت صفِ مژگاں کے سنگینیں چلا کرتی ہے چوٹ
سر چڑھا جو رونے تیرے شانہ کو ہت چھوٹ کیا
ہے بجا جو شیخ لے ہے یہ تری داڑھی کھسوٹ
رس بھری آنکھیں تو سے نوشوں کی ہوتی ہیں عظیم
چشمِ عاشق کا جو رس دیکھو تو ہے پانی کی پوٹ
جوہر کے ہوتے دیکھ تہی دست ہے چنار

یعنی ہے یاں کمال پہ رکھنی نظر عبث
کب سوزِ دل بجھے ہے نہ یہ چشم تر عبث
چوں شمع پا بہ گل مجھے رو رو نہ کر عبث
حیرت نے دی نہ فرصتِ نظارہ ایک پل
جوں آئینہ میں چشم سراپا ہوں پر عبث
جوں برق آکے پاؤں نہ رکھا کہ پھر گیا
مجھ گرم رو کے مت ہو مقابل شرر عبث

....

جوں صبح چاک جیب سے ذرہ پھرے نہ آنکھ
یاں ہے بہ شکل مہر نظر تار تار پر
ابھرے ہے مثلِ شیشۂ ساعت عبث فلک
اتنا غرور کیجیے نہ مشت غبار پر
فوارہ ساں بلند ہے جن کا کہ حوصلہ
دریادلوں کو تنکے میں ماریں ہیں دھار پر
پاسِ سخن یہی ہے یہاں اس کی شان پر
مانند خامہ دے جو سر اپنا زبان پر
باقی رہے گا ایک نہ قصہ جہان پر
آگئے جو ہم بھی اپنی کبھو داستان پر
غم میں ترے جو یوں ہیں اڑاتے پھریں گے خاک
پہنچے گی کوئی دن میں زمیں آسمان پر
چھاتی تو پُر تھی اشک سے مانندِ آئینہ

افشا کیا نہ چشم نے راز نہاں پر
لاکھوں ہی مردے یار نے یاں تو دیئے جلا
عیسیٰ بھی واں دھرے ہی رہے آسمان پر
پابوس کو بھی یوں کوئی بیٹھے ہے منہ پسار
رکھیو سمجھ کے شمع قدم شمع دان پر
تاثیرِ آہ کو غمِ پیری نہ ہو جو شرط
ہو منحصر نہ تیر کا لگنا کمان پر
گھر میں بھی اپنے آئینہ ساں منتظر ترا
حیراں کھڑا رہوں ہوں سدا آستان پر
نام آوری جہان میں ہے باعثِ کلنک
نازاں نہ جوں نگیں ہو تو نام و نشان پر
جوں شانہ سینہ چاک ہوں لیکن سوائے شکر
گزرا کبھی نہ شکوہ سرِ مو زبان پر
تقریرِ سرگزشت نہ پوچھو کہ خامہ دار
آتا ہے گریہ ہر سرِ حرفِ بیان پر

....

نگاہِ یار سے ہو مست یوں ہشیار بیٹھے ہیں
کہ جوں خورشید ننگے سر سرِ بازار بیٹھے ہیں
دکھاوے مے کے گوسو رنگ جوں قارورہ کیا حاصل
ہم اس مینائے گردوں پر تو مارے دھار بیٹھے ہیں
طلب پر بوسے کے زلفیں لگیں بل کھا کے یوں کہنے

ہم اکثر ایسی باتیں سن کے مونہہ پر مار بیٹھے ہیں
دماغ اب تو فلک پر ہے بتوں کا جو خدائی پر
بہ شکلِ ماہِ نو کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں
جگہ کرتی ہے خاکِ رہ میان شیشہ ٔساعت
دلوں میں گھر بنانے کو سر بازار بیٹھے ہیں
فلک عزّے سے ہے سرکش تو اپنا سر فرو کب ہے
اس اوندھی کھوپری پر مارے ہم بیزار بیٹھے ہیں[1]

....

فداؔ، پچھی رام پنڈت

قاسمؔ[2] نے ان کا نام پچھرام پنڈت اور شیفتہؔ[3] نے پچھی رام اور ذکاؔ[4]، سرور[5] اور نساخؔ[6] نے پچھی رام لکھا ہے۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ طویل عرصے تک دہلی میں مقیم رہے۔ کچھ دن ہوئے لکھنؤ چلے گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن خاں قندھاری جو نواب آصف الدولہ کے ملازم ہیں۔ ان کے ہاں وکالت کے عہدے پر فائز ہیں اور بانس بریلی میں متعین ہیں۔ عمدگی سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں[7] ذکا ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''مرد قابل و زیرک است''[8]

---

1. یہ شعر مجموعۂ نغز سے لیے گئے۔
2. مجموعۂ نغز، ۲، ص۔ ۲۷
3. گلشنِ بے خار، ص۔ ۱۴۶
4. عیار الشعرا (مائیکروفلم) ص۔ ۵۷۸
5. عمدۂ منتخبہ، ص۔ ۲۸۸
6. سخن شعرا، ص۔ ۳۵۸
7. مجموعۂ نغز، ۲۰، ص۔ ۱۴۶
8. عیار الشعرا (مائیکروفلم) ص۔ ۵۷۸

گزشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے
نہ ہو فریفتہ کیوں کر کہ آن باقی ہے
ہوا ہے قصۂ مجنوں اگرچہ شہر آشوب
ہمارے عشق کی بھی داستان باقی ہے
بہار حسن کی جاتی رہی اگر پیارے
تری بلا سے کہ یہ عزّ و شان باقی ہے
کہا جو ان سے کہ میں دل تو کر چکا ہوں فدا
یہ بولے ہنس کے ابھی تجھ میں جان باقی ہے

....

یک قطعۂ بہشت ہے روے زمین پر
کشمیر جس کی سیر کے قابل زمین ہے

....

قائم، قیام الدین

قائم اردو کے اہم ترین شاعروں میں ہیں۔ان کے متعلق اردو کے صاحب نظر اور دیدہ ور نقاد مولانا محمد حسین آزاد نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ''ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے۔مگر کیا کیجیے کہ قبول عام کچھ اور شئے ہے۔شہرت نہ پائی''۔[1]

قائم پر ہندوستان اور پاکستان میں دو اسکالروں نے کام کیا ہے جو زیر طبع ہے۔ان کا دیوان ڈاکٹر خورشید الاسلام نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ چونکہ قائم شاگردانِ سودا میں ہیں۔ اس لئے خانہ پُری کے لئے مختصر حالات لکھ رہا ہوں۔

---

[1] آب حیات، ص۔۱۵۶

قائم نے مخزنِ نکات میں اپنا نام قیام الدین لکھا ہے[1] جبکہ اچھے خاصے تذکرہ نگار اُن کا نام محمد قائم بتاتے ہیں[2] احد علی خاں یکتا لکھتے ہیں کہ ان کا اصل نام قیام الدین علی اور محمد قائم عرف تھا[3] لیکن امتیاز علی خاں عرشی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قائم کے والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا محمد اکرم تھا۔ اس لئے قائم کا نام محمد قائم ہوگا اور قیام الدین ان کا لقب ہے۔ جس کسی نے انہیں قیام الدین علی لکھا ہے وہ ان کے خاندان کے ناموں کی وضع سے واقف نہیں ہے[4]۔

قائم چاند پور نگینہ کے رہنے والے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی دہلی آ گئے[5] اور طویل عرصے تک یہیں رہے۔

قائم نے لکھا ہے آخر میں امروہہ کے قاضی مقرر ہو گئے تھے۔ تذکرہ شعرائے اردو کی تالیف کے وقت قائم سنبھل مراد آباد میں تھے۔ جیسا کہ میر حسن نے لکھا ہے۔ احد یار خاں یکتا لکھتے ہیں کہ قائم نے نواب محمد یار خاں اور پھر ان کے لڑکے احمد یار خاں کی رفاقت میں کافی زمانہ گزارا۔ مصحفی کی قائم سے ملاقات نواب محمد یار خاں کے دربار میں ہوئی تھی۔ قائم ہی کے توسط سے مصحفی کی نواب تک رسائی ہوئی تھی اور انہیں کی وجہ سے مصحفی نے قصیدہ پڑھا تھا اور نواب کی ملازمت حاصل کی تھی۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ عرصۂ قلیل میں ہم دونوں میں بہت ربط واتحاد ہو گیا۔ قائم کے پاس نواب کی غزلوں کے مسودے آتے تھے وہ قائم مصحفی کو اصلاح کے لئے دے دیا کرتے تھے۔ کٹھیر کی آبادی برہم ہو گئی۔ وہ نواب رہے نہ دربار۔ قائم نواب احمد یار خاں کے ملازم ہو کر رام پور آ گئے۔

۱ مخزنِ نکات، ص۔۷۷، اصل نام پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہوں: قائم چاند پوری، سعیدی، نگار (اگست ۱۹۲۸ء) حضرت قائم چاند پوری، راز چاند پوری، زمانہ (جولائی ۱۹۲۹ء) اور قائم چاند پوری، پنڈت پدم سنگھ شرما، مترجمہ مسعودہ حیات، نقوش (مئی ۱۹۶۱ء)

۲ تذکرہ مسرت افزا بحوالہ معاصر، ۷، ص۔۱۷۱، نکات الشعرا، ص۔۱۲۲، تذکرہ ریختہ گویان، ص۔۱۲۳، چمنستانِ شعرا، ص۔۵۰۱، تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص۔۱۴۴، بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ محمد قائم لکھا ہے۔ مثلاً تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص۔۱۴۵، گلزار ابراہیم، ص۔۱۹۱ وغیرہ

۳ دستور الفصاحت، ص۔۴۳، قاسم (مجموعہ نغز، ۲، ص۔۸۲)، سرور (عمدۂ منتخبہ، ص۔۴۹۷) نے قیام الدین علی لکھا ہے۔

۴ دستور الفصاحت، ص۔۴۴

۵ مخزنِ نکات، ص۔۷۷

قاسم نے لکھا ہے کہ وہ پہلے ہدایت اللہ ہدایتؔ کے شاگرد تھے۔ کسی بات پر بگڑی۔ ان سے تعلق ختم کر لیا اور ان کی شان میں ایک ہجویہ قطعہ کہا۔

شاعری کا اسے آیا ہے بہت سا غزا
جو یہ کہتا ہے وہ استادِ زماں سنتے ہو
امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یوں کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کہیں کج طینت
تیر ہوتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو

کچھ دن قائم خواجہ میر دردؔ کے شاگرد رہے اور آخر میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کا تلمذ اختیار کر لیا۔[۱]

میرزا علی لطف[۲]، شیفتہ[۳]، امیر مینائی[۴] اور حافظ احمد علی خاں شوقؔ[۵] نے ان کا سالِ وفات ۱۲۱۰ھ لکھا ہے۔ لیکن جرأت نے ان کی جو تاریخ وفات کہی تھی، اس سے ۱۲۰۸ھ نکلتا ہے۔

جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات، یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی، کیا کہیے اب آہ[٦]

....

قربانؔ، میر جیون

غیر معروف شاعر تھے۔ بہت کم تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ

---

۱ مجموعۂ نغز، ۲، ص ص ۸۲-۸۳
۲ گلشنِ ہند، ص ۱۳۴
۳ گلشنِ بے خار، ص ۱۵۳
۴ امیر مینائی، انتخاب یادگار، ص ۳۰۱
۵ حافظ احمد علی خاں شوقؔ، تذکرہ کاملانِ رامپور، دہلی، ۱۹۲۹ء، ص ۳۲٦
٦ مخزن نکات، ص ۴

معلوم ہوتی ہے کہ بیس سال کی عمر میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ غالباً میر حسن واحد تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے ان کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں۔ ''بیس سالہ نوجوان تھے۔ سپاہی پیشہ تھے۔ اس عمر میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ ایک روز فیض آباد میں فرنگیوں کی فوج صف کشیدہ جارہی تھی۔ یہ قسمت کا مارا اپنے ایک دوست کے ساتھ درمیان میں آ گیا۔ ان کتوں نے اپنی عادت کے مطابق شور و غل کیا اور برا بھلا کہا۔ ہر چند بلائے ناگہانی میں گرفتار ان لوگوں (قربان اور ان کے دوست) نے عجز و انکسار کیا معافی مانگی اور کہا کہ ہم نادانستہ اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ راستہ دے دو لیکن ان مغروروں نے قطعی پر دانہ کی۔ اور گالیاں دیں۔ بہت رد و بدل کے بعد شرم و غیرت کی وجہ سے خود کو قسمت کے حوالے کر کے تلوار سنبھال لی۔ آخر ایک زخمی ہوا اور یہ نوجوان ان کافرانِ سنگ دل کے ہاتھوں شہید ہوا۔ آفریں ہے اس کی ہمت مردانہ پر کہ عزّت و آبرو پر اپنی جان قربان کر دی۔ خدا اس کو بخشے''[1]

کریم الدین نے لکھا ہے کہ ''یہ شاعر اس لڑائی میں جو انگریزوں سے فیض آباد میں ہوئی تھی دادِ شجاعت دے کر فوت ہوا''[2] لیکن میر حسن کا بیان زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

کلام:

یوں بندِ قبا کھل گئے جو آن میں گل کے
کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے
کیا کچھ دلِ بلبل پہ کرے دیکھئے یہ عشق
سو چاک دیئے جس نے گریبان میں گل کے[3]

....

[1] تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔ ۱۳۵
[2] طبقات شعرائے ہند، ص۔ ۱۶۰
[3] میر حسن (ص۔ ۱۳۶) اور عشقی (دو تذکرے، ص۔ ۱۵۷) نے یہی دو شعر دیے ہیں۔

لطفؔ، مرزا علی

یہ اردو شاعروں کے تذکرے گلشنِ ہند کے مولف ہیں۔ تذکرے میں اپنے حالات بہت مختصر بیان کیے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے۔ متوطن اسطرآباد (ایران) شجاعت بنیاد کے ہیں۔ ۱۱۵۴ھ گیارہ سو چون ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی، مصدر عنایات بادشاہی ہوئے...... فارسی غزل کے کہنے میں حضرت کو یدِ طولیٰ تھا اور ہجری تخلص آپ کا تھا'' [۱]

سرورؔ نے لکھا ہے کہ لطف دہلی میں پیدا ہوئے تھے [۲] شیفتہ بتاتے ہیں کہ ان کی نشو و نما دہلی میں ہوئی تھی [۳]

بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں ساکن لکھنؤ لکھا ہے [۴] پتا نہیں وہ کب لکھنؤ پہنچے۔ عشقی کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ یہ لکھنؤ سے مرشد آباد گئے۔ وہاں کچھ دن رہ کر کلکتے گئے اور پھر لکھنؤ واپس آ گئے [۵] لیکن شیفتہ لکھتے ہیں کہ عظیم آباد کے نواح سے حیدر آباد گئے [۶]

لطف نے گلشنِ ہند میں اپنے تلمذ کے بارے میں لکھا ہے۔ ''اصلاح فارسی کی اس ہیچمدان کو آپ (کاظم بیگ خاں والدِ لطف) ہی کی جناب سے ہے اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے'' [۷] لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیوں کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھیں مرزا رفیع سودا سے تلمذ تھا [۸]

---

۱ گلشنِ ہند، ص ص۔ ۱۴٦۔ ۱۴۷

۲ مجموعۂ منتخبہ، ص۔ ۵۵۰

۳ گلشنِ بے خار، ص۔ ١٦٧

۴ مجموعۂ نغز، ۲، ص۔ ۱۴۸، تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص۔ ۱۷۷، عیار الشعرا (مائیکرو فلم)، ص ٦۴۷

۵ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص۔ ۱۷۷

٦ گلشنِ بے خار، ص۔ ١٦٧

۷ گلشنِ ہند، ص۔ ۱۴۷

۸ مجموعۂ نغز، ۲، ص۔ ۱۴۸، سخن شعرا، ص۔ ۴۰۵، تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص۔ ۱۷۷، عیار الشعرا (مائیکرو فلم) ص۔ ٦۴۷، طبقاتِ سخن (بحوالہ یادگار شعرا، ص۔ ۱۷۱) انتخاب یادگار، ص۔ ۲۲۸ وغیرہ

مصحفی انھیں شاگردِ سودا نہیں مانتے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ ''مثنویِ آبدار بہ سلکِ نظم کشیدۂ او بجّت برقول مولف است واز یں جہت خود بہ شاگردیٔ مرزا متہم می کند'' [۱] شیفتہ نے انھیں شاگردِ میر تقی میر لکھا ہے [۲] جو ٹھیک نہیں ہے۔ مولوی عبدالغفور نسّاخ نے شیفتہ کے اس بیان کی تردید کی ہے [۳]

امکان یہ ہے کہ مرزا علی لطف کو سودا سے تلمذ تھا۔ لیکن بعد میں اُن کی شاگردی سے وہ منکر ہو گئے۔

کلام:

پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شب ہجراں زباں پر لائیں کیا
بلبل و گل میں جوشش سرو قمری میں یہ ربط
گلستانِ دہر میں وہ پھر دل کے تئیں الجھائیں کیا
غیر لبریزِ شکایت ہے مری جانب سے آج
سُن کے میرے قدرداں اب دیکھیے فرمائیں کیا
سنتے تھے طوفانِ نوح آنکھوں سے دیکھا وہ تو لطف
دیکھیے یہ چشمِ گریاں اور اب دکھلائیں کیا

....

چمن کو کل جو تری مے کشی کا دھیان رہا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا
رہا جو زندہ شب تیرۂ فراق میں قیس

---

[۱] تذکرہ ہندی، ص۔ ۲۰۱
[۲] گلشنِ بے خار، ص۔ ۱۶۷
[۳] سخن شعرا، ص۔ ۴۰۵

سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اس کو دھیان رہا
جو عمر خضر ہو شاید تو وصل ہوئے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا
نہ آنکھ بھر کے کبھو ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

....

نہ کر اے بلبلِ دل سوختہ صیاد کا شکوا
کہ جاں بازوں کے دیں میں کفر ہے جلاد کا شکوا
نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوا
میں اپنے سرو قامت سے ہی کیا شاکی تھا گلشن میں
تسلّی ہو گئی قمری سے سن شمشاد کا شکوا
نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہے اک جہاں اُس خانماں آباد کا شکوا
ترے کانوں تلک بھی لطف کچھ آواز آتا ہے
ہے اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوا

....

ایک دن حالِ دلِ زار نہ دیکھا نہ سنا
سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سنا
دیکھ کل نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب
کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا، نہ سنا

وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خوں بار نہ دیکھا نہ سنا
لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفِ مژگاں پہ نمود
اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سنا
چشم اور گوش زمانہ ہیں مقر اس کے لطف
ثانئ حیدرِ کرار نہ دیکھا نہ سنا

....

ہے اس شدت سے رنگینیٔ کوئے یار کا چرچا
کہ بھولا عندلیبوں کو گل و گلزار کا چرچا
ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبت تو غنیمت ہے
ہوا ہے اب حکیموں میں مرے آزار کا چرچا
بہ رنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا ساکت
ہے اس پر اس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا
ہمیں ہے یار کے چرچے سے یہ فرصت کہاں ہمدم
کہ اب دن رات بیٹھے کیجیے اغیار کا چرچا
بیان دردِ دل کس لطف سے کرتے ہزار افسوس
جو ہوتا بزم میں اس کی کبھی اشعار کا چرچا

....

زہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھے تھے
کھلی چشمِ حقیقت بیں تو کامِ اژدہا نکلا
نہ کر اے لطیف ناحق رہروانِ دہر سے حجت

یہی رشتہ تو کھا کر پھیر ہے ، کعبہ کو جانکلا

....

یاروں نے یہ تو کہیے کیا کیا سجھائیاں ہیں
بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں
میں کیا ہوں باختہ رنگ اُس شعلہ رو کے آگے
مہتاب کے بھی منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں
اک جوئے شیر بدلے اے آفریں ہے فرہاد
کیا بے ستوں میں خون کی نہریں بہائیاں ہیں
کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے
گو سینکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں
طاقت حباب ساں اک نظارہ کی ملی ہے
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں
کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بتکدے سے آگاہ
یاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں
اس قد کا سرو سے ذکر چھوٹا منہ اور بڑی بات
غنچے کے دل میں بے ڈھب باتیں سمائیاں ہیں
اے لطفؔ اس غزل پر کہنا بقولِ سوداؔ
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

....

تم ہو بزمِ عیش ہے واں اور صحبت داریاں
ہم ہیں کنجِ غم میں یاں اور جان سے بیزاریاں

تم کو سیرِ باغ و گلگشتِ چمن کا واں ہے شوق
یاں بدن پر ہیں ہجومِ داغ سے گل کاریاں
دھیان ہے آرائشِ زلفِ پریشاں کا تمھیں
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
تم صفائے ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر زاریاں
تم نے دکھلائی وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھبن
یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے نے لہریں ماریاں
نیک و بد دونوں سے یاں ہم نے تو آنکھیں موند لیں
تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادو کاریاں
یاں برنگِ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں
قہقہے تم مارتے ہو واں بآواز بلند
دشمنوں سے یاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں
ہر مریضِ غم کی جاں بخشی کا ہے تم کو دھیاں
کھنچ گئیں یاں طولِ شدت سے مری بیماریاں
اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یاں رازِ عشق
سوجھتی ہیں واں تمھیں ہر بات میں تہ داریاں
کس سے کس سے بات کچھ بھولتے اک دم نہیں
ان بھلاووں سے وہ باتوں میں تری عیاریاں

....

کیوں دل پہ مرے جادو ان آنکھوں کا نہ ٹھن جائے
جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے

پلکیں وہ نکیلیں کہ نظر جب پڑے ان پر
سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے
بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

....

سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے
اب کی فصلِ گل میں،ہم بے طرح دیوانے ہوئے
شہر میں پایا نہ تیرے جور نے ٹھہرا کہ اب
گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے
بزم میں آیا جو شب وہ گل رخِ خوں شمع سے
بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے
سنتے ہیں، کی محتسب نے بیعتِ دستِ سبو
مژدہ ہے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے
تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم
آشنا ہو تجھ سے اک عالم سے بیگانے ہوئے

....

ماہرِ و فخر، میر فخر الدین

سرور[1] اور نساخ[2] نے لکھا ہے کہ یہ اشرف علی خاں فغاں کے صاحبزادے تھے۔ ان دونوں

---

[1] عمدۂ منتخبہ، ص۔۷۱۰

[2] سخن شعرا، ص۔۴۰۷، ذکا نے بھی اُن کے والد کا نام اشرف علی خاں فغاں لکھا ہے۔ عیار الشعرا (مائکرو فلم)، ص۔۶۵۱

کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ اشرف علی خاں وہ بزرگ ہیں جن کے تذکرے پر سودا اور فاخر مکیں کا ادبی معرکہ ہوا تھا۔ ماہر کا فغاں سے کوئی تعلق نہیں۔ قاسم لکھتے ہیں کہ ابتدا میں یہ فخر تخلص کرتے تھے[1] مصحفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مدتوں ماہر نے مرزا رفیع سودا کے دیوان کی کتابت کی ہے۔ چونکہ بزرگوں کی صحبت کا فیض ضائع نہیں ہوتا۔ خود بھی کچھ اشعار کہہ کر مرزا کی نظر سے گزارے ہیں۔ اسی لئے اکثر اوقات خود کو مصاحبان و مشیران مرزا سودا میں شمار کرتے ہیں اور فخر یہ کہتے ہیں کہ میں ہر وقت سودا کے ساتھ رہتا تھا[2] مصحفی ماہر سے خوش نہیں ہیں۔ انہوں نے تذکرے میں ان کے کلام کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔ ''طرفہ تر ایں کہ باوصف آگاہی فن اگر کلامش نگاہ کنی خالی از سخافت نیست، دریں جا ایں مثل بسیار بہ موقع بہ یاد آمدہ کہ دوران باخبر در حضور و نزدیکان بے بصر دور''[3] ماہر نے سودا کی وفات پر قطعۂ تاریخ لکھا تھا جو ان کے لوح قبر پر کندہ تھا۔ مصحفی نے اس تاریخ کی بھی مذمت کی ہے[4] قاسم لکھتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا نے سفارش کر کے انہیں نواب شجاع الدولہ کے ہاں ساٹھ روپے ماہوار پر ملازم رکھوا دیا تھا۔ آج کل بھی لکھنؤ میں سکونت پذیر ہیں[5] ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس ہے اور بقول قاضی عبدالودود ''اس پر دیوان ہوس لکھا ہے اور مقطعوں میں بھی یہی تخلص ہے۔ ہوس اور ماہر ہم وزن نہیں اس لئے مقطعوں میں تبدیل تخلص کے لیے خاص محنت کرنا پڑی ہوگی۔ قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کام کسی اور شخص نے کیا ہے۔ یہ پتا نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے''[6]

کلام:

جو اس کے در پہ بیٹھے ہیں سمجھتے ہیں وہ در کس کا

---

[1] مجموعہ نغز، ۲، ص۔ ۱۵۳

[2] تذکرہ ہندی، ص۔ ۲۲۶

[3] ایضاً، ص۔ ۲۲۶-۲۲۷

[4] ایضاً، ص۔ ۱۲۶

[5] مجموعہ نغز، ۲، ص۔ ۱۵۳

[6] اُردو ادب (اکتوبر ۱۹۵۰ء) ص۔ ۱۷۸

ہوے جو اس کے آوارے وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا
ملی اتنی نہ فرصت بھی کہ اٹھ کر مانگتے پانی
ہوا تیر نگہ یوں آہ دل میں کارگر کس کا

....

ہواؤ پڑ سکے جانے کا اس کے گھر کس کا
فرشتہ پر نہ جہاں مارے واں گزر کس کا

....

جلا ہے سینے میں دل شمع وار ساری رات
رہا ہے آنکھوں سے اشکوں کا تار ساری رات
ہمارے سائے سے چونکے ہے وہ بت وحشی
رہے ہے غیر سے جا ہم کنار ساری رات

....

ہمیں خیر خواہ اپنا جانو نہ جانو
کہیں گے بھلائی کی مانو نہ مانو
ہوا کام ماہر کا تیر نگہ سے
کماں ابرو کو اپنی تانو نہ تانو

....

موہنہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے
لیجیے سنگِ جفا اور شیشۂ دل پھوڑیے

....

ہوا اس زلف کا کیوں مبتلا دل
بلا سے گر بلا میں پڑ گیا دل[1]

....

---

[1] یہ اشعار مجموعہ نغز تذکرہ ہندی اور سخن شعرا سے لیے گئے۔

مجذوبؔ، غلام حیدر

ان کے حالات سوداؔ کے سوانح کے تحت بیان کر دیئے گئے۔ یہاں صرف اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

کلام:

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لیے
میں بھی تو یار کم نہیں دو چار کے لیے
ہے دردِ سر ہی بلبلِ آزاد کی صفیر
موزوں ہے نالہ مرغِ گرفتار کے لیے
طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے روؤں گا زار زار
جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لیے
مجذوبؔ بہر سبحہ ہے منت بھی شیخ سے
پھر برہمن سے عجز ہے زنار کے لیے

....

رکھیے لگائے اس کو گر بس چلے ہمیشہ
دینے پہ دل کے کیجیے آرے بلے ہمیشہ
آتے ملے دلے ہو گھر سے کسی کے اس دم
پھیرا کیے چھری ہو میرے گلے ہمیشہ
مجذوبؔ ان دنوں میں پھر روگ کچھ بسایا
رہتے تھے پیشتر تو اچھے بھلے ہمیشہ

....

چشم دوری میں تری یار یہ گریاں تھی رات

تھی شبِ ہجر مرے سر پہ کہ طوفاں تھی رات
ناز اختر کو مرے تھا فلکِ ہفتم پر
زلفِ سرکش جو تری تابع فرماں تھی رات
کسی دشمن پہ خدا دن وہ نہ ڈالے جوں کل
سر پہ مجذوب کے اے گبر و مسلماں تھی رات

....

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں
بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
تمہارا ہم سے جو عہدِ وفا ہے اس کو تم جانو
مرے پیماں میں کچھ نوعِ دگر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

....

قاصد جو بتاتا ہے تو محبوب کی باتیں
باور نہیں آتی ہیں اس اسلوب کی باتیں
تجھ عشق میں رسوا میں ہوا یار جہاں میں
کیا کیا نہ سنی ہم نے بد و خوب کی باتیں

....

چمن میں حسن سے جب وہ گلِ اندام لے آیا
اُدھر غنچہ صراحی اور ادھر گل جام لے آیا
طپش سے مہر کی جب جل گئی اک خلق کوچہ میں

مہ نو وقتِ شام اس کو بہ پشتِ بام لے آیا
عجب قیمت ہے اپنے دل کی بازار محبت میں
جو کوئی صبح اس کو لے گیا تو شام لے آیا
گئے تھے ہم ترے کو سے ارادہ کر نہ آنے کا
گریباں کھینچ کر لیکن وفا کا نام لے آیا
میں کافر ہوں گا مجذوبؔ اب کے شیخ کی ضد سے
بتوں کے پاس سے قاصد اگر پیغام لے آیا

....

بد کہنے کو کسی کے معیوب جانتے ہیں
اپنے تئیں کو یارو ہم خوب جانتے ہیں
قاصد ہزار ڈھب سے باتیں بناوے یارو
ہم تو زباں کی اس کی اسلوب جانتے ہیں
خاطر میں کون لاوے میرا سخن کہ مجھکو
سوداؔ کا سن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

....

بتاں قربانیٔ عشاق کی تمہید کرتے ہیں
لگا مہندی کو ہاتھوں میں یہ ظالم عید کرتے ہیں
طبیعت اس قدر بادی انھوں کی ہے کہ جب دیکھو
وضو کی شیخ جیو بیٹھے ہوئے تجدید کرتے ہیں

....

جور و جفا پہ یار کی دل مت نگاہ کر

اپنی طرف سے ہووے جہاں تک نباہ کر
نام و نشاں رہا نہ جہاں میں تو کیا ہوا
مثلِ نگیں تو منہ کو نہ اپنے سیاہ کر

....

آوے بھی مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
مجذوب ترے عجز و تکبر سے ہوں نالاں
بندہ ہو کبھی بیٹھے ہے تو گاہ خدا ہو

....

اے میرؔ سمجھیو مت مجذوبؔ کو اوروں سا
ہے وہ خلفِ سوداؔ اور اہلِ ہنر بھی ہے[1]

....

محبؔ، شیخ ولی اللہ

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ دہلی کے رہنے والے تھے [2] مگر خود محبؔ کا ایک شعر ہے ۔

محبؔ ہندوستاں زادوں کی گویائی کو کیا پہنچے
سخن کہنے میں ہو جس کا وطن سرہند انبالہ[3]

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبؔ انبالہ کے رہنے والے تھے اور غالبًا بچپن میں دہلی آ گئے۔

---

[1] اشعار طبقات الشعرا (قلمی) مجموعہ نغز اور تذکرہ ہندی سے لیے گئے۔
[2] تذکرہ ہندی، ص۔ ۲۲۱۔ عمدہ منتخبہ، ص۔ ۶۷۳، سخن شعرا، ص۔ ۶۱۵ وغیرہ
[3] محبؔ، حکیم سید احمد اللہ قادری، زمانہ (جولائی ۱۹۲۹ء)، ص۔ ۳۰

خوب چند ذکاؔ لکھتے ہیں کہ شاہ افضل خدانما معروف ومشہور بزرگ تھے۔ محبؔ ان کی اولاد میں ہیں [1] یہ دہلی سے نکل کر فرخ آباد پہنچے۔ وہاں کچھ عرصے نواب مہرباں خاں رند کے ساتھ رہے [2] اور پھر لکھنؤ آگئے۔ جہاں مرزا احمد سلیمان شکوہ کے دربار سے متوسل ہو گئے [3] بقول مصحفی یہیں "مرضِ مزمن ناسور پا" میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ مصحفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو دو سال ہوئے۔ تذکرۂ ہندی ۱۲۰۹ھ کو پایۂ اختتام کو پہنچا۔ جس کا مطلب ہے کہ لگ بھگ ۱۲۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ کریم الدین نے بھی ان کا سنہ وفات ۱۲۰۷ھ ہی لکھا ہے [4] پیر جلیل میں مدفون ہوئے [5]

کلام:

شایدکہ لکھا یوں تھا تقدیر الٰہی میں
عاشق کی رہے کشتی امواجِ تباہی میں

یوں دل کے سویدا میں روشن ہے تری صورت
جوں چشمۂ حیواں کا ہے نور سیاہی میں

ہے مشربِ رنداں میں بالفعل تو مے رائج
اس امر کو زاہد نے سمجھا ہے مناہی میں

معراج گدائی کا ہوتا نہیں کم ہرگز
پستی و بلندی ہے یاں افسرِ شاہی میں

دریا میں حباب آسا کیا مظہرِ وحدت ہے
جو غرق سراپا ہے اسرارِ الٰہی میں

---

1. عیار الشعرا (مائیکروفلم)، ص۔ ۶۶۷ اور مجموعہ نغز ۲، ص۔ ۱۶۴
2. تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۲۳۵ اور تذکرہ شعرائے اردو، ص۔ ۱۵۱
3. تذکرۂ ہندی، ص۔ ۲۲۱
4. طبقات شعرائے ہند، ص۔ ۳۶۱
5. تذکرۂ ہندی، ص۔ ۲۲۱

ہر برگ و گلِ لالہ اک مظہرِ خونی ہے
سینہ کے محبؔ تیرے داغوں کی گواہی میں

....

مے جو گلگونوں کے شیشہ میں بھری رہتی ہے
چشمِ مستوں میں عجب جلوہ گری رہتی ہے
نالہ بلبل ہے چمن زار ہے دل داغوں سے
آہ تا صبح نسیمِ سحری رہتی ہے
لب و چشم اپنے ،ہیں اک عالمِ خشکی و تری
عشق کی سلطنتِ بحر وبری رہتی ہے
اشک باری سے غم و درد کی کھیتی باڑی
لہلہے سی نظر آتی ہے ہری رہتی ہے
بے نشاں زخم سے اس تیرِ نگہ کے دل سے
درد رہتا ہے نہ پیکاں نہ سری رہتی ہے
دل کو لے ڈوبتی کیونکر نہ نظر آئے محبؔ
کشتیِ چشم تو پانی سے بھری رہتی ہے

....

ہزار صاحبِ تدبیر ہو تو کیا حاصل
موافق اس سے نہ تقدیر ہو تو کیا حاصل
ملے سے عاشق و معشوق کی بڑی ہے قدر
جدا کمان سے گر تیر ہو تو کیا حاصل
نہ حرف ہو نہ حکایت خموش مجلس عیش
بہ شکل صفحۂ تصویر ہو تو کیا حاصل
جہاں کو پائے قناعت سے اے محبؔ کر سیر
جو دستِ حرص گلو گیر ہو تو کیا حاصل

....

ریختہ کے ملک کا سوداؔ کو بخشا تو نے راج
اس نگر میں کون ایسا ناظم و ناثر ہوا

....

جس طرف تشنۂ دیوار ترے جا نکلے
ادھر آنکھوں سے بہاتے ہوئے دریا نکلے
یار آیا نہ کہا ضعف سے میں اتنا بھی
خیریت صاحبِ من آج کدھر آ نکلے
قافلہ پہلی ہی منزل سے دیا ہم نے چھوڑ
سفرِ ملکِ عدم کو تنِ تنہا نکلے
جی جو بے چین ہے کوچہ ہی ترا دیکھ آئے
کیا کریں ایک گھڑی دل وہیں بہلا نکلے
ہم چمن میں گئے تھے سیر کو گل دیکھتے ہی
یاد آیا جو وہ گل باغ سے گل کھا نکلے

....

اُس بت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی
شیشہ میں عجب آن سے جھمکی تھی خدائی
عالم میں نشہ کے شبِ مہتاب میں تیرے
خورشید سے مکھڑے نے طلسمات دکھائی
مارا ہے اسے چھوڑ ترے تیرِ نگہ نے
جس ساتھ میاں تو نے ذرا آنکھ لڑائی
گو غیر کے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے
چھپتی نہیں وہ بات جو ہو دل سے بنائی
واللہ ہمیں عشق کی بھولی ہوئی سب چال
کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی
ہردم تو بھرا شیشہ جھکاتا ہے نشہ میں

ڈرتا ہوں کہ تیری نہ موڑک جائے کلائی
آئینہ نمدپوش ہوا عشق میں تیرے
چار ابروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی
ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا
ہے روزِ قیامت تری اک شب کی خدائی
عاشق کو محبؔ سلطنتِ ہر دوجہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی

....

چشمِ پُر آب میں ہے جلوہ قدِ دل جو کا
دیدکرتا ہوں عجب سروِ کنار جو کا
شب فرقت میں جو اُٹھتی ہیں جگر سے آہیں
اک جہاں مجکو نظر آئے ہے عالم ہوکا
ہاتھ تب عشق کے میں سنگِ گراں کے ڈالا
زور فرہاد کے جب تول لیا بازو کا
باندھنوں پر یہ نیا باندھنوں باندھا ہے محبؔ
شوخ نے چیرہ جو سر پر ہے سجا سالو کا

....

عظیم اور انؔشا کے ادبی معرکے میں محبؔ نے عظیم کا ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے ایک غزل کہی جس میں اس ادبی معرکے کا ذکر ہے۔ ہوا یوں کہ انؔشا نے بادشاہ کو اس پورے گروہ کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکا دیا کہ مشاعرے میں فلاں فلاں آپ کی غزل پر قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے اور غالباً انؔشا نے بادشاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ اس ادبی معرکے میں انؔشا کا ساتھ دیں[1] اب وہ غزل ملاحظہ ہو۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مجموعہ نغز، ا، ص ص۔ ۸۲-۸۶

سرسبز خط فرماں رہے تحریر کے آگے
ہو لال زباں داں مری تقریر کے آگے
دل ہے سو نگہ تیرے کے ہے تیر کے آگے
سر ہے جو خمیدہ دمِ شمشیر کے آگے
تدبیر پڑی ٹھوکریں کھاتی رہی پیچھے
یاں حضرتِ انساں تری تقدیر کے آگے
ہوتا ہے ہمیں محوِ خدائی کا بھی آداب
جا نکلے ہیں جب اس بتِ بے پیر کے آگے
شیطاں جسے کہتے وہ اے شیخ مزوّر
پیچھے ہی رہے ہے تیری تزویر کے آگے
کیا معنی ہے آئینہ نہ پانی ہو بہ صد رنگ
اس بو قلموں شوخ کی تصویر کے آگے
کس طرح نہ ہو سلسلہ زنجیر کا بر پا
دیوانوں سے اس زلفِ گرہ گیر کے آگے
مبحث میں چکھے چاہیے قضیہ شعرا کا
اس فن کے کسی صاحبِ توقیر کے آگے
ہے نقص جو شاعر ہوئے فریادی و دادی
اکبر کے حضور اور جہانگیر کے آگے
نیزے پہ ہدف کر کے رکھیں ہم سر حاسد
اور تیر قلم اپنے کے سر تیر کے آگے
ہو رستمِ میداں سخن کے بھی ہمارا

یک مصرع -و مصرع شمشیر کے آگے
جوعرضِ مطالب کرے مقصد ہی کو پہنچے
باصدقِ محبّ حضرت شبیر کے آگے[1]

....

معیّن، شیخ محمد معین الدین

سروؔر نے باشندۂ الہ آباد لکھا ہے[2] جو درست نہیں۔ یہ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ البتہ الہ آباد میں کافی دن رہے تھے[3] شورؔش نے لکھا ہے کہ الہ آباد میں جو بادشاہ کے لیے باغ تیار ہوا تھا اور ''رونق افزا'' جس کا نام رکھا گیا تھا معین نے اس باغ کی مدح کی تھی۔ اسی مدح کے وسیلے سے انہیں سرکار عالی میں ملازمت مل گئی۔ اس قصیدے کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

اے فلک تیرے ستاروں میں کہاں ایسی بہار
باغ حضرت میں جو کچھ جلوۂ داؤدی ہے[4] -(کذا)

الہ آباد سے یہ لکھنؤ آ گئے تھے[5] قاسم نے لکھا ہے کہ مدت سے عظیم آباد میں ہیں[6] میری نظر سے کوئی اور تذکرہ نہیں گزرا جس میں ان کے قیامِ عظیم آباد کا ذکر ہو۔ البتہ میر حسن نے لکھا ہے کہ آج کل خیر آباد میں ہیں[7]

میر حسن ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''اکثر اپنے معاصر شاعروں سے جھگڑتے تھے۔

---

[1] یہ اشعار زمانہ جولائی ۱۹۲۹ء، مجموعہ نغز اور تذکرہ ہندی سے لیے گئے۔
[2] عمدۂ منتخبہ ص۔ ۸۶۰
[3] تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص۔ ۲۳۱، گلزار ابراہیم، ص۔ ۲۳۵ اور گلشنِ سخن (قلمی) ورق ۹۲ ب
[4] تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص۔ ۲۳۰
[5] خلیل نے لکھا ہے اس وقت کہ ۱۱۹۶ھ ہے معیّن لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ گلزار ابراہیم، ص۔ ۲۳۵
[6] مجموعہ نغز، ۲، ص۔ ۲۰۱
[7] تذکرے شعرائے اُردو، ص۔ ۱۶۵

چنانچہ ایک دفعہ مجھ فقیر کے شعر پر بے جا اعتراض کیا۔ ہر چند سمجھایا نہ سمجھے۔ مرزا رفیع کی سند دی۔ نہیں مانے۔ کہنے لگے میرے پاس مرزا کے دیوان کا صحیح نسخہ ہے۔ اس میں تو اس طرح نہیں ہے۔ غرض جس جگہ ایسا لفظ پاتے ہیں۔ استاد کے دیوان کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر لیتے ہیں"۔[۱] اس سب کے باوجود میر حسن نے ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ "لیکن اس تمام خود آرائی اور خود پسندی کے باوجود ان جیسا صاحب طبع کوئی نہیں ہے۔ مثنوی، قصیدہ اور ہجو خوب کہتے ہیں"۔[۲] سرور انہیں "بسیار شیریں کلام" لکھتے ہیں۔[۳]

کلام:

اے بادِ صبا باغ میں مت جائیو تڑکے
سوتا ہے وہ گل پات مبادا کہیں کھڑکے

جوں یشم کی تختی اگر اس راحت جاں کو
چھاتی سے لگا رکھیے تو دل کاہے کو دھڑکے

آتے ہی نہیں گر کے سوئے چشم پھر آنسو
اس گھر سے مگر روٹھ کے نکلے ہیں یہ لڑکے

قمری ہے فدا باغ میں شمشاد کی دھج پر
ہم صدقے ہیں اے سرو رواں تیری اکڑ کے

قصہ ہی کرو مختصر اب جانے دو یارو
کیا لینا ہے تم کو مرے قاتل سے جھگڑ کے

سر رشتہ رہِ عشق کا ہرگز نہ کروں گم

۱۔ تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔ ۱۶۵

۲۔ ایضاً

۳۔ عمدۂ منتخبہ، ص۔ ۶۸

سو ٹکڑے اگر سبحہ نمط ہوں مرے دھڑ کے
اے ابر بہاری شبِ ہجراں میں خبردار
دامن ترا اس آہ کے شعلے سے نہ بھڑکے
ہوں میں وہ دوانا کہ بہار آنے سے پہلے
زنجیر میں رکھتا ہے معیںؔ مجھکو جکڑ کے

....

دیں جگہ تیری جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا تجھ بت بے باک میں ہم
نقش پا کی نمط اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم
لختِ دل نہیں ہے جو لے نکلے ہے نت قاصد اشک
پرزے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈاک میں ہم
خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں بہ رنگ بوے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم
پھرے نالوں سے نہ راتوں کو معیںؔ دن اپنے
آہ کب تک رہیں گے گردشِ افلاک میں ہم

....

غیر تجھ دستِ ستم سے گو پھریں بھاگے ہوئے
ہم تو ہیں جیوں سایہ قدموں سے ترے لاگے ہوئے
پھر رہی ہے نیند آنکھوں میں چھپاتے ہو عبث
ٹک ادھر تو دیکھنا دو رات کے جاگے ہوئے

....

رباعی

جب سے تجھ ساتھ دل لگایا ہم نے
کیا کیا اندوہ و غم اٹھایا ہم نے
تقصیر نہیں ہے اس میں تیری باللہ
جیسا کہ کیا تھا ویسا ہی پایا ہم نے

....

دیگر

دل کے ہاتھوں ہمارا جینا معلوم
خوں پیتے ہیں اب تو مے کا پینا معلوم
گر جیب پھٹا ہو تو رفو ہو ناصح
یہ چاک جگر ہے اس کا سینا معلوم[1]

....

ممتازؔ، حافظ فضل علی

دہلی کے شیخ زادوں میں سے تھے[2] بقول میر حسن حافظِ قرآن تھے[3] قدرت اللہ شوقؔ کے آنولے میں اُن سے ذاتی تعلقات رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دکن جاتے ہوئے رہزنوں کے ہاتھوں شہادت پائی[4] میر حسن ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''شاعرِ دردمند و گداز...... سر رشتۂ طرز کلامش استوار و گل فکرِ بیانش رشکِ لالہ زار، تخنش شاعرانہ وطرزش

---

[1] یہ اشعار تذکرہ شعرائے اُردو، مجموعۂ نغز، تذکرہ ہندی اور تذکرہ شورش سے لیے گئے۔
[2] تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص۔ ۱۸۹
[3] تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔ ۱۶۰
[4] طبقات الشعرا (قلمی)، ورق۔ ۱۰۵ ب

استادانہ[1] شوق لکھتے ہیں۔ ''طبع سلیم و جولاں داشت، رسائی فکرش از مذاق سخنش پیدا و استعداد قابلیتش از صفائے گفتگویش ظاہر و ہویدا''[2]

ممتاز کا قلمی دیوان سالار جنگ لائبریری حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ یہاں اس سے انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

یاد نہیں عمر تھی یا خواب تھا بے ہوشی کا
تا کجا شکر بجا لاؤں فراموشی کا
لختِ دل مونہہ سے نکلتے تھے ابھی بات کے سات
پوچھ مت راز صبا غنچہ کی خاموشی کا
کان میں گل کے صبا کہتی رہی راز اور ہم
آہ پائے نہ مزہ عمر میں سرگوشی کا

....

ڈھونڈے ہے قدر مرتبہ جس کے کمال کا
پہونچے کب اس کو حوصلہ میرے خیال کا
جب سے نظر پڑا ہے ترا حسن با نمک
کچھ پوچھ مت بیاں دلِ شوریدہ حال کا
دنیا کے بیچ وہ بھی کوئی آدمی ہے یار
اندیشہ ہوے جس کو نہ اپنے ہی مال کا
نیکی بھی وہ زیادہ نہ چاہے بدی تو کیا
جس شخص کو ملا ہو مزا اعتدال کا

....

---

[1] تذکرہ شعرائے اُردو، ص۔۱۶۰

[2] طبقات الشعرا (قلمی) ورق ۱۰۵ ب

روؤں میں کس لیے رنجش سے پیار میں کیا تھا
میں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا
جفائے یار نے کس طرح کردیا مایوس
اور اپنے خاطرِ اُمیدوار میں کیا تھا
ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگر نہ ہستی ناپائیدار میں کیا تھا

....

دشمن نہ ہو دیدہ تو ہمارا
پامال نہ کر لہو ہمارا
رسوا ہوئے ہم اتنے ہم کہ صد شکر
مذکور ہے کو بہ کو ہمارا
اے نالہ نہ ہو بلند خاموش
بھڑ کے نہ وہ شعلہ خو ہمارا

....

پوچھے اگر ترے سے کوئی کیوں کر اٹھے گا حشر
اپنی جگہ سے اٹھ کے تو اس کو بتا کہ اس طرح

....

ہے یار کے لئے ہمیں اغیار سے غرض
ہوتی ہے جیسے گل کے سبب خار سے غرض
کیا جانیے کدھر ہے ترا بدگماں خیال
مجھ کو تو ہے فقط ترے دیدار سے غرض
ممتاز سب کو اپنے ہی مطلب سے یاں ہے کام
مقصد نہ دشمنی سے ہے نہ پیار سے غرض

....

عشق میں تیرے سجن اپنے ہمیں کام سے کام
نہ ہمیں کفر سے مطلب ہے نہ اسلام سے کام

....

فرصت کا جو وقت پائیں گے
احوال تیرا سنائیں گے
اے ساقی برنگ جام و شیشہ
رو رو کے تجھے ہنسائیں گے
لادیں گے اور لاکھ مضموں
پھر ایسی غزل بنائیں گے
قائم رکھنا وفا کا ممتاز
جیتے جی تو کر دکھائیں گے

....

تیری نگہ سے زلفِ سیہ کے نقاب میں
بجلی چمک کے رہ گئی پیارے سحاب میں

....

اٹھایا جب سجن مکھ سے نقاب آہستہ آہستہ
لگا بادل میں چھپنے آفتاب آہستہ آہستہ
تو شاید سیر کر آیا کہ مونہہ پر اہلِ گلشن کے
چھڑکتی ہی رہی شبنم گلاب آہستہ آہستہ
مری کم اضطراری پر خفا مت ہوجیو پیارے
نیا ہوں سیکھتا ہوں اضطراب آہستہ آہستہ

....

برسات میں جب تو ہو آرام کی بارش ہے
گر تو نہ نظر آوے کیا کام کی بارش ہے
دلدار سے اب اپنے اوقات کیے ہے یوں
یک بوسہ اگر چاہیں دشنام کی بارش ہے

....

ہمارے جی میں جو کچھ ہے سو یار کیا جانے
وہ حالتِ دلِ بے اختیار کیا جانے
نہ پوچھیو دلِ عاشق سیتی رموزِ نشاط
یہ بلبلِ قفسی ہے بہار کیا جانے

....

ابھی تلک مری آنکھوں سے اشک جاری ہے
تمہارے خنجرِ مژگاں کی آبداری ہے
بہ شکل آئینہ ہے آنکھ اوس کی چشم براہ
کسو کی نرگسِ شہلا کو انتظاری ہے
اکیلے جینا بھی اے خضر کچھ رکھے ہے مزا
یہ زندگی ہے تری یا نفس شماری ہے

....

موسمِ عیش ہے جوانی ہے
یہی کچھ لطفِ زندگانی ہے
مجھ کو پوچھو تو دوست کا ملنا
یہی شادی ہے شادمانی ہے

مجھ سے تو پوچھتا ہے ہنس ہنس کر
کیوں ترا رنگ زعفرانی ہے
حالِ دل تیرے روبرو کہنا
جانِ من یہ بھی اک کہانی ہے

....

شمیمِ گل جو قفس تک نسیم لائی ہے
کوئی خبر دے مجھے کیا بہار آئی ہے
تجھے نگاہِ مروت اگر نہیں تو نہ ہو
ہمیں تو مدِ نظر پاسِ آشنائی ہے
ہم آگے ہاتھ پساریں ترے معاذاللہ
ہمارے پاس دعا مانگنا گدائی ہے
پہونچ سکے نہ کسو دل تلک تو کیا ممتاز
اگرچہ تا بہ فلک آہ کی رسائی ہے

....

کیا مرا عشق ہے بہانہ ہے
ناصحو یہ عجب زمانہ ہے
اپنے عاشق سے تو برا مت مان
اس کی کیا بات وہ دیوانہ ہے
غم کو فرہاد و عیش کو پرویز
یہ خدائی کا کارخانہ ہے

....

اے بت تجھے ہم اپنا کریں رام تو سہی

تجھ سے نکالیں دل کا اگر کام تو سہی
دکھلادیں جو رقیبوں کو غربت وطن کے بیچ
ہم دشمنوں کی صبح کریں شام تو سہی
شاہی سے لے کے تا بخدائی کائنات
جو دل کہے سو کردیں سر انجام تو سہی

....

نالاں، میر احمد علی

دہلی کے رہنے والے تھے۔ عظیم آباد چلے گئے[1] صاحب دیوان شاعر تھے[2] لیکن خلیل لکھتے ہیں کہ نالاں خود کو شاگردانِ سودا میں شمار کرتے ہیں۔ میں نے مرشد آباد میں انہیں دیکھا۔ بالکل استعداد نہیں رکھتے تھے[3]

کلام:

غیر سے کیا امید کیا شکوا
اپنا اپنا ہی دل اگر نہ ہوا

....

یہ میری آستیں جل جاے ہے پونچھوں ہوں جب آنسو
اثر رکھتا ہے میرے اشک کا یہ آب آتش کا

....

اگرچہ حسن لاثانی سجن مہتاب رکھتا ہے
ولے ہو روبرو تیرے کہاں یہ تاب رکھتا ہے

....

---

۱ تذکرۂ شورش (دو تذکرے) ص۔۲۷۶
۲ تذکرۂ عشقی (دو تذکرے) ص۔۲۷۷
۳ گلزار ابراہیم، ص۔۲۴۴

حسرت دل کے سوا یاں سے نہ لے جاویں گے
ایک دن دست تہی ہم بھی چلے جاویں گے
شب کو مے نوش مرا کیفی ہو بولا نالاں
گو نشے میں ہیں پر اب گھر کو چلے جاویں گے

....

میں کہا ہنس کے کہ کیا سچ ہی سدھارو گے اب
مسکرا کر وہ لگا کہنے بلے جاویں گے

....

دلِ سوزاں کو یارو یوں نہاں رکھتا ہوں پہلو میں
کہ اخگر جیسے خاکستر میں کوئی ڈھانپ رکھتا ہے[1]

....

نثار، منشی سدا سکھ

بشاش نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ ''خلف سیتل پرشاد، باشندہ دہلی، قوم کائستھ، مقیم الہ آباد، شاگردِ سودا صاحب دو دیوان اردو و فارسی و بھاکا و مثنوی گزرے ایک واسوخت بھی کہا ہے''[2] بہت غیر معروف شاعر ہیں۔ اکثر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

کلام:

کیا سنگار رجھانے کو کس کے تم نے چشم
کہ بال بال دُرِ اشک جو پروئیں ہیں

....

---

1. یہ اشعار تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی سے لیے گئے۔
2. دیبی پرشاد بشاش، آثار شعرائے ہنود، دہلی، ۱۸۸۵ء، ص۔۱۳۱

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے
تو شکوہ ہمیں کچھ تمہارا نہیں ہے[۱]

....

نظیر

ان کے نام کا پتا نہیں چل سکا۔ بہت غیر معروف شاعر تھے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ محمد آباد بنارس کے رہنے والے تھے۔[۲] شیفتہ لکھتے ہیں۔ نظیر ایک شخص کا تخلص ہے جو خود کو شاگرد سودا بتاتا ہے۔[۳]

کلام:

جب ترے کوچے سے ہم اُٹھ کے چلے جاتے ہیں
شعلۂ آہ کی گرمی سے جلے جاتے ہیں

....

تاریک نظر دیکھے تجھے اے مہِ تاباں
رہتا ہے سدا مہر درخشاں ہمہ تن چشم

....

وحشت، میر ابوالحسن

اشپرنگر نے قائم اور علی ابراہیم کے حوالے سے لکھا ہے۔''......ساکن میتو متصل دہلی، تیر انداز خاں کے پوتے اور سودا کے شاگرد تھے۔ ۱۱۶۸ھ سے پیشتر یہ انتقال کر چکے تھے''۔[۴] قائم

---

۱ یہ اشعار سخن شعرا اور تذکرہ عشقی سے لیے گئے۔
۲ مجموعہ نغز، ۲، ص۔ ۳۰۸
۳ گلشن بے خار، ص۔ ۲۳۲
۴ یادگار شعرا، ص۔ ۲۱۴

نے لکھا ہے کہ کچھ عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو چکا[1] علی ابراہیم نے انھیں تیر انداز خاں کا پوتا اور شاگردِ سودا بتایا ہے۔[2]

مطبوعہ نسخوں میں ان کے وطن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ پتا نہیں اشپرنگر کو کہاں سے ملی۔ ممکن ہے اس کے پیشِ نظر ان تذکروں کے ایسے قلمی نسخے رہے ہوں جن میں وحشت کے وطن کا ذکر کیا گیا ہو۔ عشقی لکھتے ہیں۔ ''جوانے اہلبیت شعار، سپاہی پیشہ''[3] عشقی نے لکھا ہے کہ میر غلام حسن کے تذکرے اور گلزار ابراہیم سے یہ معلوم ہوا کہ محمد حسن حسن اور ابوالحسن وحشت ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ میر تقی میر نے ان کا ذکر میر حسن حسن کے نام سے کیا ہے۔ ممکن ہے ابوالحسن کا لقب محمد حسن بھی ہو اور وحشت و حسن دونوں تخلص کرتے ہوں[4]

کلام:

میں تو شروع نزع سے کی تھی تجھے خبر
پہنچا تو پہنچ، گھڑی کہ مرا کام ہو چکا

....

گہ گریۂ شب ، گاہ میں آہِ سحری ہوں
جو کچھ ہے سو ہوں پر گردِ بے اثری ہوں
جس پاس میں جاتا ہوں سو منہ پھیرے ہے مجھ سے
گویا کہ میں گردِ قدمِ رہ گذری ہوں

....

---

1. مخزن نکات، ص۔۶۱
2. گلزار ابراہیم، ص۔۲۵۲
3. تذکرۂ عشقی (دو تذکرے)، ص۳۰۹
4. ایضاً، ص۔۳۰۹

قاتل اگر کہے کہ سکتا ہی چھوڑیو
خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑیو
شیشہ نہیں جو مول لیا دیں گے پھر اُسے
پیارے یہ دل ہے اس کو سمجھ کر کے توڑیو

....

کروں گا اس دوانے دل کی میں تدبیر آنکھوں سے
لگی ہے بہنے موجِ اشک کی زنجیر آنکھوں سے
مثالِ عکسِ آئینہ نکل جاتا ہے جی میرا
جب ہی (کذا) ٹک دور ہوتے ہی تری تصویر آنکھوں سے

....

کہیں یہ جھوٹ دیکھا ہے تجھے جب میں بلاتا ہوں
صریحاً تو چلا جائے مجھے کہتا ہے آتا ہوں

....

نسترن ہے گل ہے سوسن ہے گل اور رنگ ہے
اے بہارِ باغ بے رنگی یہ کیا کیا رنگ ہے

....

بید مجنوں کی طرح جتنی بڑھی گھٹتی ہے
شجرِ عمر کی بالیدگی معکوس ہے[1]

....

---

[1] یہ اشعار مخزن نکات سے لیے گئے۔

ہاشمی، میر ہاشم علی

مصحفی نے ان کا نام میر ہاشمی لکھا ہے جو غالباً سہو کاتب ہے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ ان کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوگی [۱]

کلام:

مرا سو بار اُس تک نامۂ پُر آرزو پہنچا
اُدھر سے پر جواب صاف پہنچا جب کبھو پہنچا

کیا افشا تمھیں نے رازِ عشق اے دیدۂ گریاں
بگوشِ خلق ورنہ کس طرح بے گفتگو پہنچا

دماغ آشفتہ ہوتا ہے صبا نکہت سے سنبل کی
مشامِ آرزو میں تو کسی کاکل کی بو پہنچا

ابھی چھوٹا ہے موجِ رشک کی زنجیر سے قمری
نہ پھر گوشِ دلِ دیوانہ تک آوازِ ہو پہنچا

یہ دعوے سب کے باطل محکمہ میں ہاشمی ہوں گے
اگر حاکم تلک وہ شوخ باردے نکو پہنچا

....

آہ و نالہ کے دو مصرع جو کہے میں موزوں
صاحبِ درد اُسے شعرِ فغانی سمجھا

وہ برہمن بچہ افسوس کہ اے ہم نفساں
قصۂ درد مرا رام کہانی سمجھا

....

---

۱ تذکرہ ہندی، ص۔ ۲۷۰

کچھ کفر و دیں میں شاید رشتہ ہوا برہمن
تسبیح شیخ کی، جو زنار درمیاں ہے
غیرت یہ چاہتی ہے ہم آئینہ کو توڑیں
پر کیا کریں کہ روے دلدار درمیاں ہے[1]

....

کچھ تذکرہ نگاروں نے میر حسن، صغیر علی مروّت اور گنا بیگم منتظر کو بھی شاگردانِ سودا میں شمار کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو سودا سے تلمذ نہیں تھا۔ یہ محض بعض تذکرہ نگاروں کی غلط فہمی ہے۔

---

[1] یہ اشعار مجموعۂ نغز، سخن شعرا اور تذکرۂ ہندی سے لیے گئے۔

عاصلِ سخن

مرزا محمد رفیع سودا نے جب ہوش سنبھالا تو مغل حکومت کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ مرہٹے، جاٹ، سکھ، روہیلے اور انگریز اس عظیم الشان عمارت کی بنیادیں ہلا رہے تھے۔ ان میں سے ابتدائی تین طاقتیں خود مغلوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ مغل حکومت کے جاہ و حشم کا دار و مدار اُس کثیر دولت پر تھا جو لگان کی صورت میں حاصل ہوتی تھی۔ جاگیردار زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرنے کے لیے کاشتکاروں پر ظلم کرتے تھے۔ ظلم و تشدد سے تنگ آ کر یہ کاشتکار بغاوت کرتے۔ خود اکبر کے عہد سے بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ عہدِ اورنگ زیب میں بغاوتیں کثرت سے ہونے لگیں اور اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ منظم تھیں۔ مرہٹے، جاٹ اور سکھ ایسے زمیندار اور کاشتکار ہیں جنھوں نے مغل حکومت کے خلاف منظم بغاوتیں کیں۔ روہیلوں اور انگریزوں نے صرف مغلوں کے سیاسی انتشار اور فوجی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔

دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ قلعے کے خزانے خالی ہو گئے۔ امرا اور وسا بھوکے مرنے لگے اس بے بسی اور لاچاری نے لوگوں کو فرار پر مجبور کر دیا۔ کچھ لوگ عیش و عشرت میں ڈوب گئے اور کچھ نے خانقاہوں میں پناہ لی۔ سودا ایک ذہین اور حساس شاعر تھے۔ خود ان کے سر سے بارہا موجِ خوں گزری تھی۔ انھوں نے خود قتل و غارت گری کے بھیانک مناظر دیکھے تھے۔ انھیں حکمراں طبقے کی بے زری کا پورا پورا احساس تھا۔ اُن کے شہر آشوب اُس عہد کے سیاسی و سماجی انتشار کی سچی تصویریں ہیں۔ اٹھارویں صدی پر کام کرنے والے مورخین کے لیے ان شہر آشوبوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کے آباو اجداد کابل سے ہندوستان آئے تھے مگر یہ درست نہیں۔ ان کا وطنِ اصلی بخارا تھا جیسا کہ باغِ معانی میں نقش علی نے لکھا ہے۔ مرزا کے خاندانی حالات کا زیادہ پتا نہیں چل سکا۔ قیام الدین قائم نے مخزنِ نکات میں ان کے چچا کا ذکر کیا ہے لیکن نام نہیں بتایا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سودا کو "پسرِ دخترِ نعمت خانِ علی" لکھا ہے۔ شاہ کمال نے لکھا ہے کہ سودا کی والدہ عالی کی بہن تھیں۔ یہ بیانات درست نہیں۔ امکان صرف یہ ہے کہ سودا کی والدہ خاندانِ عالی سے ہوں۔ یعنی سودا کا عالی سے دُور کا رشتہ ہو۔ عنایت خاں راسخ نے "ذکر مغنیانِ ہندوستانِ بہشت فشان" میں مرشد قلی خاں کو سودا کا نانا بتایا ہے۔ ممکن ہے راسخ کا بیان درست ہو۔ سودا کے والد مرزا شفیع کے بارے میں قیاس ہے کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ قائم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ پیشۂ تجارت میں مشہور تھے۔

محمد حسین آزاد نے سودا کا سنِ ولادت ۱۱۲۵ھ لکھا ہے اور غالبًا بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان ہی کی تقلید میں ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے جس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ سودا کم عمر تھے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اور بقولِ قائم سودا کو جو کچھ ترکہ ملا تھا انھوں نے بہت جلد دستوں میں اُڑا دیا۔

سودا کی اولاد میں غلام حیدر مجذوب کا نام ملتا ہے۔ جنھیں بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا حقیقی بیٹا اور بعض نے متبنٰی لکھا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ وہ حقیقی بیٹے تھے۔ خوب چند ذکا نے سلیمان نامی ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سودا کے متبنٰی تھے۔ محمد حسین آزاد مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں ان کی ملاقات سودا کے نواسے سے ہوئی تھی۔

سودا نے ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۰ھ کے درمیان ریختہ گوئی کا آغاز کیا اور ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ شعر گوئی کی ابتدا انہوں نے فارسی سے کی تھی مگر بہت جلد ریختہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

تذکرہ نگاروں نے سودا کے چار استادوں کا ذکر کیا ہے۔ سلیمان قلی خاں وداد، نظام الدین احمد صانع، شاہ حاتم اور خان آرزو۔ ہمارا خیال ہے کہ سودا کو خان آرزو سے باقاعدہ تلمذ

نہیں تھا۔ البتہ ان کی صحبت سے ضرور فیض اٹھایا تھا۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کو ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ کچھ لکھتے ہیں کہ شاہ عالم نے دیا تھا۔ کچھ کا خیال ہے کہ نواب آصف الدولہ سے ملا تھا۔ اور کچھ کا بیان ہے کہ شیخ علی حزیں کی عنایت تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سودا کو کسی نے یہ خطاب نہیں دیا تھا۔ میر نے سب سے پہلی بار نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ ''سودا ملک الشعرا کے لائق ہیں۔'' بعد کے تذکرہ نگاروں نے انہیں ملک الشعرا ہی بنا دیا۔

سودا بہت مہذب، بااخلاق، شگفتہ مزاج، زندہ دل اور یار باش تھے۔ اس سلسلہ میں بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ تذکروں میں کچھ لطیفے بھی ان سے منسوب کیے گئے ہیں۔

سودا علم موسیقی میں بھی ماہر تھے۔ عشقی لکھتے ہیں۔ ''سودا...... در علم موسیقی دستار نوازی دستگاہ ہے معقولے داشت۔'' مصحفی کا بیان ہے کہ ''بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ وسلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آں نیز قادر۔'' انھیں کتے پالنے کا بھی شوق تھا۔ میر نے اسی سلسلے میں ان کی ہجو کہی تھی۔ جس کا جواب کلیاتِ سودا میں موجود ہے۔

دہلی کی تباہی و بربادی سے اہلِ ہنر ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ اکثر اہلِ فن دکن، فرخ آباد، اودھ اور دوسرے مقامات پر چلے گئے جہاں متاعِ فن کی قدر ہو سکتی تھی۔ خانِ آرزو، عارف علی خاں عاجز، قیام الدین قائم، احسن اللہ خاں بیان، محمد فقیہہ صاحب دردمند، ہدایت اللہ ہدایت، قلندر بخش جرات، مصحفی، میر، منت، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ وہ شاعر ہیں جنھیں حالات سے مجبور ہو کر دہلی چھوڑنی پڑی۔

سودا لگ بھگ ۱۱۷۴ھ میں دہلی سے نکل کر عماد الملک کے پاس متھرا پہنچ گئے۔ ۱۱۷۴ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیانی زمانے میں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد آ گئے جہاں نواب مہرباں خاں رند کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے مہرباں خاں رند کے حالات خراب ہو گئے اور سودا کو مجبوراً فیض آباد آنا پڑا۔ یہاں نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں معقول تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ نواب

شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ مسند نشین ہوئے اور سودا آصف الدولہ کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ جب آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔ مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے سودا کے لیے چھ ہزار سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی تھی۔ یہ درست نہیں۔ نواب شجاع الدولہ نے ان کے دو سو روپے ماہوار مقرر کیے تھے۔ آصف الدولہ نے بھی یہی تنخواہ برقرار رکھی۔ بعض قصیدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کو تنخواہ وقت پر نہیں ملتی تھی اور انھیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ایک دن سودا نے آم زیادہ کھا لیے تھے۔ جس سے ان کی وفات ہو گئی۔ شاہ محمد حمزہ نے تاریخ وفات ماہ جمادی الثانی ۱۱۹۵ھ لکھی ہے۔

سودا ایک عظیم شاعر تھے۔ لیکن عظیم غزل گو نہیں۔ اگر ان کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو اُن کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا۔ ان کی شہرت و مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب نمونے موجود ہیں۔

صفِ اول کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے اور غزل میں خارجیت، زورِ بیان اور نشاط آمیز لب و لہجہ انھیں کی دین ہے۔ سودا کا مزاج اور ذہن اُس غزل کو راس نہیں آ سکتا تھا جس کی بنیاد داخلیت پر ہوتی تھی۔ ان کی شوخی چنچل اور طرارے بھرتی ہوئی یہ رنگ طبیعت اس دردمندی، سوز و گداز اور برشتگی و خستگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ اُن کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجے میں نرمی و گھلاوٹ اور اندازِ بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ اُردو قصیدہ نگاری کے سودا امام ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کے قصائد عرفیؔ، خاقانیؔ اور انوری کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ سودا اکثر میدانوں میں فارسی قصیدہ گو شعرا سے آگے نکل گئے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ قصائد سودا اُردو نظم کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ سودا الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے اور وہ ہر لفظ کے مزاج اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ طرح طرح کی تشبیہات اور استعارات کے سہارے ایک

ہی بات کو سو انداز سے کہہ سکتے ہیں۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا ان کا ہی کام ہے۔ بعد کے قصیدہ نگار سودا سے متاثر ہیں اور اکثر شعرا نے ان کی زمینوں میں قصیدے کہے ہیں۔

قصیدے کی طرح فن ہجو گوئی میں بھی سوداؔ کی حیثیت امام اور خاتم کی ہے۔ وہ اس فن کو جس بلندی پر پہنچا گئے تھے۔ اس سے آگے اور کوئی نہ جا سکا۔ سودا کی ہجوؤں میں نہ صرف اس عہد کی معاشرت، تہذیب، سیاسی اور سماجی حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ ایسا بھی کافی مواد حاصل ہوتا ہے جس سے سودا کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان ہجوؤں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سودا کن اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتے تھے۔ سودا کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جب کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں ان کا ذہن منظر کی معمولی سے معمولی تفصیل کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی لیے جب وہ اس منظر کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو کوئی گوشہ تشنہ رہنے نہیں پاتا۔ اصل منظر میں جو کمی رہ جاتی ہے، سودا اُسے اپنے زورِ تخیل سے پورا کر دیتے ہیں جو مصوّری اور شاعری کا حسین ترین امتزاج ہے۔

سوداؔ نے ایک واسوخت، مرثیے، مثنویاں اور شہر آشوب بھی کہے ہیں۔ جن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

اشعارِ سوداؔ کا انگریزی ترجمہ

جان گلکرسٹ کو سوداؔ سے بہت عقیدت تھی۔ اُس نے لکھا ہے کہ میں نے اُردو کلیات سوداؔ سے سیکھی ہے۔ گلکرسٹ نے اپنی کتاب ہندوستانی زبان کی گرائمر، مطبوعہ کرونیکل پریس، کلکتہ، ۱۷۹۶ء (انگریزی) کے سرِ ورق پر سوداؔ کے یہ اشعار دیے ہیں۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعوے نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سوداؔ کو سُنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ کہ کیا نظم و بیاں ہے

اسی کتاب میں اُردو شاعروں کے بہت سے اشعار مثال کے طور پر دیے گئے ہیں پہلے یہ اشعار رومن رسم خط میں لکھے گئے ہیں۔ اور پھر ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اشعار سودا کے ہیں۔ میں نے یہاں پہلے اُردو اشعار اور پھر اُن کا ترجمہ ترتیب دیا ہے۔ اُردو شعر یا بند کا جو نمبر ہے وہی اس کے ترجمے کا ہے۔

GRAMMAR,

OF THE

HINDOOSTANEE LANGUAGE,

OR PART THIRD

OF

VOLUME FIRST,

OF A SYSTEM OF

HINDOOSTANEE PHILOLOGY.

By JOHN GILCHRIST.

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے	[illegible]
دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زبان ہے	[illegible]
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو	[illegible]
اللہ ہی اللہ کیا نظم و بیان ہے	[illegible]

[illegible]
[illegible]

"Where ... Love, ... Comedies,
"And ... running ..." DR. DALHOUSIE'S MERCHANT.

CALCUTTA.
PRINTED AT THE CHRONICLE PRESS.
MDCCXCVI.

گلکرسٹ کی ایک کتاب کا سرورق

ہجو حکیم غوث

۱۔ ہو کے کسلمند جو وہ بے حیا اپنے تئیں آپ کرے ہے دوا
مردہ شو و مولوی تابوت گر گھیرتے ہیں آن کے سب اس کا گھر
دیں ہیں دہائی وہ بصد قیل و قال ان میں سے ہر ایک کرے ہے سوال
اپنی دوا آپ تو ظالم نہ کر ہم بے کسوں کی بھی طرف نظر کر
خوب جو کرتا ہے تو اپنی دوا اور کوئی آپ سا مجھ کو بتا
روزی سے خاطر ہو مری تا کہ جمع بھیجوں تری گور پہ گل اور شمع

....

۲۔ اُن نے کہا تو نے اے زشت رو دیکھا صدیدی کو نہ قانون کو
ساتھ حکیموں کے تو اے بے تمیز بخشتی ہے ڈیڑھ روپے کی کنیز
اِس میں کہا ایک نے شوخی کی راہ سنتے ہی مانا نہیں ان کا کہا
بی بی تیری پردے میں اور یہ ادھر لقوہ و فالج سے ہو کیونکر خبر
سمجھیو تک لوٹنے کی ہے یہ جا کہتا ہے پھر آپ بھی ہاں اور کیا
سنتے ہی اس حرف کے کھا پیچ و تاب تھوک کے ڈاڑھی پہ کیا یہ خضاب
لاتو صدیدی کو تو، اے میرے پوت کھول تو قانون کو اے بھڑوے اوت
بات کا اپنی تو، مجھے دے نشاں میں بھی تو دیکھوں ہے یہ اُس میں کہاں

لقوہ و فالج ہو جسے یا صَرع　　دیجیے اُس کے تئیں ماء القرع
پھر تو یہ جس وقت بڑھی آگے بات　　اُن نے جڑی دھول اُسے اُن نے لات
اُن نے قلمدان سے کی اُس پہ چوٹ　　اُن نے لیا ڈاڑھی کو اُس کے کھسوٹ
چوٹی غرض اس کی ہوئی اس کے ہاتھ　　تُھیپے پکڑ لوٹ گئی وہ بھی ساتھ
زور جب آپس میں دھما دھم ہوئے　　مار کٹائی سیتی بے دم ہوئے
دوڑ کر لوگوں نے چھڑایا انھیں　　منت و زاری سے اُٹھایا انہیں
کرنے لگے وے جو تھے معقول ہیں　　اُس کے تئیں لعن اُسے آفریں
تھا غرض اس نقل سے یہ مدعا　　تا کہ تو اب اس کی نہ کھاوے دوا
اپنے لیے گور نہ تو آپ کھود　　سُن تو لیا ایسا ہے یہ بیٹی چود

....

۳۔ سوداؔ سے کہا میں کہ ترے شہرے کو سن کر
دیکھا جو تجھے آکے تو اے بے سروپا ہیچ
بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرعۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

....

۴۔ مصرع کو یقیںؔ تیرے سوداؔ نے سُنا تھا کل　　روتا ہے وہ تب سے ہی برسے ہے گویا بادل
ہے رعد نمن نالاں بجلی کی طرح بے کل　　پھر پھر کے وہ پڑھتا ہے ہاتھوں کے تئیں مل مل
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

....

۵۔ اس جینے سے بہتر ہے اب موت پہ دل دھریے جل بجھیے کہیں جا کر یا ڈوب کہیں مریے
کس طور کے تئیں راتیں کس طرح سے دن بھریے کچھ بن نہیں آتی ہے حیران ہوں کیا کریے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

۶۔ کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں اس سے مشہور تر ہے اس کا خیال

۷۔ موٹے جاے کا مجھ کو ذوق نہیں چھوٹے چیرے کا دل میں شوق نہیں

۸۔ ظالم نہ میں کہا تھا کہ اس خوں سے درگزر سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

۹۔ سنو اے لڑکو ہو نہ راہ سے گم اس نصیحت کو گوش و جاں سے تم

۱۰۔ باپ کے گھر کی چاٹ کر چٹنی کرو گذران یارو تم اپنی

۱۱۔ کس کس طرح سے دیکھیں اس باغ کی فضائیں کیدھر گئے وہ ساقی، وے ابر وے ہوائیں

۱۲۔ لب و لہجہ ترا سا کس کو ہے خوبانِ عالم میں یہ غلط العام ہے جگ میں کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

۱۳۔ تبسم یوں نمایاں ہے مسّی آلودہ ہونٹوں سے نہ ہو ابر سیہ میں اس طرح بجلی کی لہچلیاں

۱۴۔ قاضیوں کی بزم میں ہوتے ہو جا کے شعر خواں شاعروں پاس آپ کو کہتے ہو نہ ہو دصرف داں

۱۵۔ سالہا ہم نے صنم نالۂ شبگیر کیا آہ اک روز تیرے دل میں نہ تاثیر کیا

۱۶۔ نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام مدعا ساقی سے اپنے ہمیں اور جام سے کام

۱۷۔ ذکر میرا جا کے تو کرتا ہے غیروں کے حضور اب تلک یہ لب نہیں شکوے سے تیرے آشنا

۱۸۔ لازم نہیں ہے پیارے اتنا غرور کرنا مجھ ناتواں کی حالت سن کر سرور کرنا

۱۹۔ احوال سے تمہارے واقف میں ہو رہا ہوں کیا فائدہ ہے شیخی میرے حضور کرنا

۲۰۔ مذکور جانے بھی دو ہم دل طپیدگاں کا احوال کچھ نہ پوچھو آفت رسیدگاں کا

۲۱۔ کیا کروں گالے کے واعظ ہاتھ سے حوروں کے جام میں ہوں ساغر کش کسی کی نرگس مخمور کا

۲۲۔ گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

۲۳۔ ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

۲۴۔ ساقِ سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

۲۵۔ سرِ سلطنت سے آستانہ یار بہتر تھا ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

۲۶۔ موجِ نسیم آج ہے آلودہ گرد سے دل خاک ہوگیا ہے کسی بے قرار کا

۲۷۔ سودا شرابِ عشق نہ کہتے تھے ہم نہ پی کھینچا نہ تو نے دردِ سر اس کے خمار کا

۲۸۔ سودا چمن دہر سے یہ چشم نہ رکھیو وہ گل نظر آوے کہ جسے خار نہ ہووے

۲۹۔ اب خدا حافظ ہے سودا کا مجھے آتا ہے رحم ایک تو تھا ہی دیوانہ تس پہ آتی ہے بہار

۳۰۔ میں نے کہا کہ شیخ جی تم بیاہ مت رچاؤ
نوے برس کی عمر تمھاری ہے باز آؤ
کہنے کو دوستوں کے بھی خاطر میں اپنے لاؤ
ایسے لگوگے جورو کے تم وقت داؤ چاؤ
گویا کہ اپنی پوتی کھلاتے ہیں شیخ جی
گاتی تھیں بیٹی ڈومنیاں گرد یہ سہاگ
دولھا نمک بھرا ہے کہ جوں لوہیے کا ساگ
دولھن شتاب آکے پہنچ گھر سے اپنے بھاگ
نوشہ سگھڑ ہے لگے سسرے کے گھر کو آگ؟
سر کو تو تال و سر سے ہلاتے ہیں شیخ جی

اے اچپلی دلھن تری شوخی ہے یہ زبوں
تو نے ہمارے شیخ کو کیا کیا کیا فسوں
یاں تک ہے تیری شرم سے چوکی پہ سرنگوں
مالن کہے ہے بار خدایا میں کیا کروں
تختوں سے سرکا سہرا بندھاتے ہیں شیخ جی

....

۳۱۔ معاش اہلِ چمن جائے رشک ہے سوداؔ   کہ زندگی کا انھوں نے مزا تمام لیا
کسی کا ان میں نہ محسود ہے نہ والی روم   حسد کسی کو نہ اس پر کہ جس نے شام لیا
کہیں نہ واسطے منصب کے ہیں یہ مجرائی   سلام کر کے کسی سے نہ لاکھ دام لیا
کبھوں نہ اُن کو میں دیکھا تلاش خدمت میں   کبھی نہ فکر تردد سے کوئی کام لیا
ادھر شروع کیا صبح نغمہ بلبل نے   ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

....

۳۲۔ بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرابیاں   ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں
تجھ مکھ پہ تا نثار کرے، مہر و ماہ کی   لبریز سیم و زر سے ہیں دونوں رکابیاں
صیاد کہہ تو کن نے کبوتر کو دام میں   سکھلائیاں ہیں دل کی مرے اضطرابیاں
فرہاد و قیس ووں گئے سوداؔ کا ہے یہ حال   کیا کیا کیا میں عشق میں خانہ خرابیاں

....

۳۴۔ ساون کے بادلوں کی طرح جل بھرے ہوئے
یہ وے نین ہیں جن سیتی جنگل ہرے ہوئے

اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے

پلکیں تری کہاں نہ صف آرا ہوئیں کہ واں
افواج قاہرہ کے نہ نیزے کھڑے ہوئے

آنکھیں کو تیری کیوں کہ میں باندھوں کہ یہ غزال
جاتے ہیں میرے دل کی زراعت چرے ہوئے

بوندوں کی جمدھروں سے یہ لڑتے ہیں اک دگر
لڑکے مجھ آنسوؤں کے نپٹ منگرے ہوئے

خالی خُمیں کر اُٹھ گئے اس بزم سے حریف
بیٹھے ہیں ایک شیشۂ دل ہم بھرے ہوئے

نزدیک اپنے رہنے سے مت کر ہمیں تو منع
ہیں لاکھ کوس جب ترے دل سے پرے ہوئے

انصاف اپنا سوچیے کس کو بجز خدا
منصف جو بولتے ہیں تو تجھ سے ڈرے ہوئے

مجلس میں چھوکروں کی جو حجرے سے شیخ جی
آویں تو پھر خدا نے کہا مسخرے ہوئے

سوؔدا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے

لڑکے کھڑے ہیں پتھروں سے جھولی بھرے ہوئے

....

۳۴۔ ساقی ہماری توبہ تجھ پر ہے کیوں گوارا

منت نہیں تو ظالم ترغیب یا اشارا

اک بار ہی جھکادے ساقی کہ فصلِ گل کو

عرصہ کہاں کہ دے تو ساغر ہمیں دوبارا

....

۳۵۔ غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں

جلوہ گر یار مرا، ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

۳۶۔ مہر ہر ذرّہ میں مجھ کو تو نظر آتا ہے

تم بھی ٹک دیکھو کہ صاحب نظراں ہے کہ نہیں

۳۷۔ دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں

کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

۳۸۔ پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل

ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں

۳۹۔ آگے شمشیر تمہاری کے بھلا یہ گردن

مُو سے باریک تر اے خوش کمراں ہے کہ نہیں

۴۰۔ جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

۴۱۔ پوچھا سوداؔ سے میں اک روز کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معیّن بھی مکاں ہے کہ نہیں

۴۲۔ یک بہ یک ہو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں

۴۳۔ دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

....

۴۴۔ کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا
مند جائے چشمِ عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

۴۵۔ جیوں غنچہ تو چمن میں بند قبا جو کھولے
پھر گل سے اے پیارے بلبل کبھو نہ بولے

۴۶۔ آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
شبنم سے کہہ دے بلبل پیالے گلوں کے دھولے

۴۷۔ باغ جہاں میں آ کر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سینکڑوں ملولے

۴۸۔ اتنا جو جاؤں کرتے ہوئے تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہوگی سو آج ہی وہ ہولے

۵۰۔ چشمِ پُر آب ہوں میں جیوں آئینہ حبابی
رک رک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

۵۱۔ کون ایسا اب کہے یہ سوداؔ گلی میں اوسکی
آ تجھ کو لے چلیں ہم دل کھول کر تو رو لے

....

۵۲۔ باتیں کدھر گئیں وہ تیری بھولی بھالیاں
دل لے کے بولتا ہے جو تو اب یہ بولیاں

۵۳۔ ہر بات ہے لطیفہ و ہر یک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

۵۴۔ حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دی پھر کبھو
انکھیاں جس آرسی نے ترے مونہہ پہ کھولیاں

۵۵۔ اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک
جیوں خوش چھبوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں

۵۶۔ کن نے کیا خرام چمن میں کہ اب صبا
لاتی ہے بوئے ناز سے بھر بھر کے جھولیاں

۵۷۔ ساقی پہنچ شتاب کہ تجھ بن اس ابر سے
پڑنے نہیں تگرگ برستی ہیں گولیاں

۵۸۔ کیا چاہیے تجھے سرانگشت پر حنا
جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں

۵۹۔ جیوں برف ہو گئے ہیں خنک اب بتانِ ہند
نسبت انھوں کے گرم ہیں کابل کی لولیاں

۶۰۔ سوداؔ کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلفِ یار
شانے نے پیچ پڑ کے گرہیں اس کی کھولیاں

....

۶۱۔ لے دیدۂ تر جدھر گئے ہم ڈبرے جو تھے خشک بھر گئے ہم
۶۲۔ میں اور عندلیب ازل سے ہیں بے نصیب مجھ پر ترا ستم ہے نت اوپر جفائے گل
۶۳۔ چین دینے کا نہیں زیرزمیں بھی نالا سوتوں کی نیند میں کرنے کو خلل جاؤں گا
۶۴۔ تقدیر کے لکھے کو امکان نہیں دھونا تقصیر نہیں دل کی میں فرض کیا ہونا
۶۵۔ قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا
۶۶۔ عشق کے بیمار کی تشخیص میں ہو لا علاج بھول سب قانونِ حکمت بوعلی بھی رو گیا
۶۷۔ دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
۶۸۔ سوداؔ کبھی بہار میں وضع زمانہ دیکھ اے وائے وائے بلبل او ہائے ہائے گل
۶۹۔ کیا کروں گا میں تو سلامت رہ تیرے دروازے کا ہوں خاک نشیں

۷۰۔ سودا یہ کرے گا نت اس قدر کا رونا عالم کو اے دیوانے مت ساتھ لے ڈبونا

۷۱۔ لٹی سے اٹھ گیا ساقی میرا نہیں پر یو پیانہ الٰہی کس طرح دیکھوں میں ان انکھیوں سے میخانہ؟

۷۲۔ بنا ہی اُٹھ گئی یارو غزل کے خوب کہنے کی گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو دیوانہ

۷۳۔ اے باد صبا تو دم صبح کے تڑکے سوتا ہو وہ گل رو تو کہیں پات نہ کھڑکے

۷۴۔ نہ بچے طائر مضمون نظر انداز میرا فکر عالی کی ہے شاہیں میری راہ نوال

۷۵۔ کشش خلق اس کا غرض کام ہے مرگ و قضا مفت میں بدنام ہے

TRANSLATION OF

SOUDA'S VERSES

☆

By

J.B. GILCHRIST

☆

Jamal Printing Press, Jama Masjid, Delhi-6

SOUDA'S SATIRE ON DOCTOR GHOUS

1. When the blockhead gets sick, he administers; medicines to his self, and then all the undertakers, pall-bearers and mourners, surround his house, where they lament with many exclamations, and every one among them supplicates thus: "Take not thy self, O barbarian, thy own physick, but have some mercy on us, poor wretches' however if thou still persist in swallowing your own drugs, first recommend me says. each, to any other person, like your worship, that my mind may be easy about my daily bread, and I shall then furnish thy grave with tapers and flowers."

2. He (the doctor) replied, thou has neither, O hag, seen the Sudeedee, nor the Qanoon, and canst thou impudent worthess slave argue with physicians; on which, one who listening, did not regard the doctors speech, and wittily observed: Tey mistress concealed within, and he without, how can he know anything of having a palsy or convulsions, consider a little, is not this a good joke, on which his worship (Ghous) also said, yes it is to be sure. The woman hearing this remark, and being enraged, spit on his beard and thus addressed him- well bring thou the Sudeedee now my Cock, come open the Qanoon Cuckoldy wight, and give me a proof of your own doctrine, as I wish to see where this is written in it, that you must prescribe pompion juice for the palsy, convulsions, or epilepsy; after this when the altercation encreased, he gave her a slap, and she kicked him, he hit her a blow with the standish, and she toused his beard, in short her tail got twisted in his fist, and she seizing his cods, tumbled also on the ground, where they had a rare scrabmle among themselves, and being breathless with beating each other, the bystanders running up, separated and lifted them with much entreaty. Those who judged rightly, cursed him, and praised her. In fact the intention of this story is, that thou mayest not take his medicines, nor thou thyself dig thy own grave, now you have learned what a caitiff he is."

3. I thus addressed Souda : having heard of thy renown I came, O wight, but saw nothing. On which he said, Dost thou recollect that verse of Bedil, "The universe is full of my fame though I be nobody."

4. Souda heard the verse repeated yesterday, Yaqeen, and weeps ever since as a surcharged cloud that dissolves in streams: He at one time is murmuring like the distant thunder, and at another more restless than its volatile messenger, wringing his hands, he again an agian repeat " what made you cherish this passion, O my soul! but, alss! how can (or shall) I (or one) reason with a distracted mind."

5. It will be better for me resolutely to embrace death, than to lead such a life, let me depart and perish in the flames, or drown myself somewhere; for how shall I pass the cheerless night, or where can I spend my lonely days; Alas! What must I distracted do, when there is no end of my woes Oh my soul, what hast thou done? but why do I reason with a frantic mind?

6. Is Neamut Khan inferior to Nasir ulee ? the fancy ? of the former is more famous than the latter's.

7. I have no desire for a coarse robe, nor feel any inclination to a small turband.

8. Did I not bid thee refrain, O! tyrand, from this murder, it is the assassination of Souda, and never can be concealed.

9/10. Hear me, O! children, depart not from virtue, but listen to this cousel with an attentive ear, and always be contented, O ! my friends, with whatever the board your father affords.

11. Ah ! how shall we enjoy the flower beds of this garden, where are now the cup bearers, the vernal clounds, and the zephyrs of spring.

12/13. Who among the beauties of the univers, have mouth and words like thine ? It must be an errour of the vulgar that in

this world any others can be sweet as chrystals of sugar. A smile has more lustre on thy lips, obscured with missee than the flashes of lightning have in a sable cloud.

14. When you go into an assembly of qazees you pretend to be judge or poetry, and in a circle of poets you call you self a grammarian.

15. For years, O my beloved ! have I wasted the nights with my plaints; but alas! without ever once exciting thy compassion.

16. We esteem not Paganism, nor do we venerate the Faith; but we adore our beloved, while a flowing bowl is the alter for us, (and our libations).

17. Thou Talkest of me when in the presence of strangers, though this lip knows not how to complain of thee.

18/19. It is not becoming, O my beloved, to affect such pride; or when you hear the distress of wretched me, to rejoice. I am perfectly accequainted with your condition; for what purpose then assume air in my presence (or before me).

20. Forbear even the mention of us lovers, and ask not an account of the forlon.

21. What shall I do, O preacher, with a bowl from the damsels of Paradise, who am here intosicated with the wanton eye of any one.

22. You throw flowers and fruits even to others; do plunderer of the garden, then fling a few also this way.

23. There are but a few moments between existecne and annihilation; where then is there so expeditious a journey as our pasaage from this world ?

24. When the candle beholds thy fair polished limbs, it gradually burns with shame away.

25. My lover's threshold was better to me than an imperial throne

and his humble roof more desireable than the shade of the royal eagle.

26. Since you do thus this repeat, I am going, I shall go, pray depart, and let that betide me today which must happen to-morrow.

27. O Souda ! did we not say, do not drink the wine of desire; and hast thou not at last experience the anguish after such intoxication.

28. Cherish not the hope, O ! Souda, in this terrestrial abode, that a rose will ever blossom here without producing a thorn.

29. May God preseve Souda, I really pity him; He was distracted enough before, and now season of love is again approaching.

SOUDA'S SATIRE ON SHEKH JEE

30. I said, Reverend sage meddle not with marriage, but refrain now that you are ninety years of age, and mind the counsel of freinds' lest when dallying with a wife, you seem to be dandling your own grand daughter. The female musicians sat in a circle singing this nuptial song. " The Bridegroom is leep, but sedative as the leaves of purslane, come with speen, O bride, and leave thy former home, a busband is the proper man, and you may now make a bonfire of his father-in-law's house; see the old gentleman himself even nods approbation to the chorus." Ah! wanton bride, thy pranks art baneful indeen, for thou hast enchanted, and abashed our master to stoop on the bench so much, that gardener's wife exclaims, Good Lord! what can I do, when his worship inclines to make the boardsagah ifdrsloranhead.

PART OF A HINDOOTSANEE ODE FROM SOUDA

31. Souda, observe the garden's" state!
What gifts the flowry people bless!
Each earthly sweet, allowed by fate,
In full perfection they possess.
To them, ambition, is unknown:
No heart corroding envy bears;
The King of Room or Syrias throne,
In them excites no jealous cares.
Never did guileful flattery's bate
For these, disgraceful honor's gain:
Ne'er did the homage of the great
For these, unearth wealth obtain
Ne'er did they creep from man to man,
And beg for slaver's galling yoke;
Ne'er did the deep-concerted Plan
In them the pangs of doubt provoke.
But, hark! the birds their wild notes sing,
To greet at morn this happy tribe
While they with goblets, hail the spring,
And freely, purest juice unlike.

(Translated by H.H)

32. O ! Philomel whose drunken frolicks have polluted the garden, and left the capsules of the rose buds thus deflowered and torn-that the sun and moon may devote their offering to thy charms; lo ! they both revolve as untensils resplendent with silver and gold-Say ! O ! flower, who hath taught the captive dove the emotions of my bosom ? Furhad and Qys perished so, and such is Souda's condition now-Alas, what devastation hath not love produced!

33. These eyes of mine ae surcharged with streams, like the clouds of the rains, with which the wilds are cloathed in their deepest green. O ! my soul, what contest in this to which an ocean of

bring tears stained. with salughtered hearts seems advancing apace ?

They eye brows, my beloved, never were marshalled for a battle, without displaying the parts of conquering armies. Why not arrest the rays of those destructive orbs, that like wanton fawns crop the tender buds of my dearest hopes? These pearly drops are contending with each other to issue forth to the fight but, alas ! the damsels are not at all dismayed at the sight of my feeble tears. Though my rivals have drained the goblets, and are with-drawn from the banquet still I with a tender and over-flowing heart remain; do not therefore forbid my enjoying thy company, since being estranged by their affection, I am virtually a myraid of miles away. From whom except God can I expect justice, when the judges who decide are themselves smitten by thee ? Should a hermit from his cell intrude on the assemly of the fair, he would surely become a laughing stock there: leave not thy house O ! lunatic, for at present the youth of the village are waiting with their pockets full of stones in expectations of thee.

34. How O ! cup bearer my wows of sobreity be agreeable to thee ? Though much solicitation was not expected on thy part, still, why not wheedle me back, ah! heedless youth to the banquet ! come drain the generous bowl, my boy, at once, for alas ! the vernal season lasts not long enough to keep me to the cup a second time.

FREELY TRANSLATED

35. I often wonder, whether the radiant object of my adoration smiles upon others or not, yet where is the spot that God is not there ?

36. You glorious orb to me appears in every beem : do you also, O ye enlightened ! pray behold if this be really so or not.

37. I am wandering about with the fragments of a broken heart in

my hand ; say o doctors, if there be any balm for the cementing them or not ?

38. Songstress of the night, I also the mild influence of divine love, were it other wise, what degree noisy praise is there that may voice could not reach.

39. Before thy falchi, this neck of mine indeed is more slender than the finest hair : is so or not O ye daughters of geniune devotion!

40. Is the jusitice of Providence to blame of is it the fault of my way-ward fate ? do let some people say here, if a tongue be in their head or not.

41. I one day asked of Souda, O wanderer ! hast thou any fixed residence on earth ?

42. All at once becoming enraged, he began to say silly body, is there one atom of sense in thy possession or not ?

43. I have long since with my mind's eye espied a weary wight at the palace gate even of the mighty Fureedon who knocking, rears out" is threre any one here or not".

CLOSELY TRANSLATED

35. In may foolish imagination; conceived another possessed not the radiant object of my love-else where is he not ?

36. The sun of the universe in every atom shines to my perception ; look ye enlightened, for a moment and see if he be there or not.

37. A broken heart, I wandering carry within my bosom'! have you a cure for this, ye skilful in art ? or have you not ?

38. O nightinagale ! I feel the reverence the due to love, else what is thy cause of lamentation that I have not ?

39. Before the sword divine, this little neck is smaller than a hair-say, angel, is it not ?

40. Say is my love to blame ? or my hard fate ? tell me who can, is there a tongue to speak or not ?

41. I one day enquired of Souda the pilgrim "hast thou a fixed dwelling place or not ?""

42. Empassioned at the question, abruptly answered "hast thou one particle of reason, friend, or not ?""

43. "Behold ! at the palace gate of the (late) monarch Fureedon, a man calls aloud-is any one here or not?"

PARAPHRASE

35. What else, I oftimes pensive ween, can various creeds and tenets mean, whence flow the ordent pray'r , but that of mooslim, pagan, jew, must, as the christian's, each be true : for God is everywhere.

36. Thus is one circle we divine, the radii from its bounding line, concentric still unite ; so from the wide extended round of all religions, will be found only lord of ligth.

37. Your solar orb in every ray shines forth the glorious God of day, oft with refracted beam ; on shifting clouds does he retire ? or can the quench his awful fire ? sdeak, sages ! do I dream ?

38. With broken heart and wounded soul, I wandering search from pole to pole, for balm to heel my woes: still not one doctor can I find, like death, to cure my tortur'd mind O come and bring repose.

39. Sweet bird of eve, thy plaintive note could never drown my louder throat, if rev'rence due to love did not silence my moans and sighs, and me turn these streaming eyes, to the great God above.

40. Before whose dreedful sword, this neck is like the cobweb's finest wreck, that floats upon the air, look, agnles ! tell me ay or nay, ye surely can the truth display, and will the whole declare.

41. That providence is just I own, though fortune sternly on me flown ; the fault perhaps is mine ; come cherubs ! teach the soothing plan of calm content to wayward man, and let me not repine.

42. Once I the pilgrim Souda spied, and then in earnest to him cried, "hast thou no fix'd retreat ?" enraged, responsive, thus he spoke, "sure, silly friend, you only joke, ? " or never heard of fate.

43. With reasons eye here take a glance- "through time and space's vast expanse," (nor blink it with a tear) "at one, by Cesar's palace doors, " Who knocking there incessant roars, "is any body here ?"

44. To speak little is becoming, but still never to this degree, that when a lover's eyes are closing, even than not to open thy mouth.

45. Like the rose, dearest maid, If thou wantonly show ;
Each charm which those blushes betray,
To thy bosom, from flowers wont the nightingale go;
And there, his fond heart give away.

46. At the dawn see ! my fair her sweet banquet renew, Hark !
Philomel sings from the grove ;
"Fly ye zephyrs and wash with the purest of dew,
"You blossoming cups for my love."

47. Not a grape can I find in this vineyard below,
With one drop of celestial wine.
Nay the heart which I have, is so soured with woe. I wish it had never mine.

48. Why thus peevishly threat, "fare you well, I go hence"
My fairest-at once disappear;
The morn's wretchedness now, is less fel-suspence,
(illegible)
Whose train, are hope, passion and (illegible)

49. That meek silence becomes thee we dare not deny,
Yet still may the Fair sympathise ;
Surely none of the sex, can muse, sullen stand by Her lover, when closing his eyes.

50. Wo is me ! What dire anguish this bosom assails ?
Dray fountains :- With tears flow amain,
Ere my heart like those orbs tossed on waves before gales,
Bursts hapless a bubble of pain.

51. Has not Souda one friend that will kindly enjoin,
"Go with thy goddess to nigth,
"And wash every sorrow away, as her shrine,
"With floods thou will shed in her sight.

52. Where are thy kind innocent expressions now, that having captivated my heart, thou talkest to me thus? All thy words are gibes, and every sentence is raillery.

53. Not a moment without sarcasm, and each breath las become a taunting joke.

54. Admiration hath not yer allowed the mirrar to sleep, that opened it's eyes on thy countenance.

55. The capsule of the flower doth not burst with such charms as when the garment of the fair gives way.

56. Who hath been walking in the garden, that now the zephyrs come over-loaded with the perfumes of blandishment.

57. Come quickly, my beloved, for without thee the clouds are not discharging hail, but bullets.

58. Why shouldst thou die the tips of thy fingers with hina, while thy can be dipped in the blood of victims (to thy love).

59. The damselss of India have become as cold as ice, and are rivalled in affection by the maids of Kabool.

60. The tresses of my love were not in cancord with Souda, till the comb interposing unravelled their (prejudices) contortions.

PARAPHRASE OF THE ABOVE VERSES

52. Was thy innocent prattle divested of art ?
That formerly ravish'd my ear,
With the view of insidioulsy stealing this heart;

Ah ! whence these harsh words I now hear ?

53. Why thus constantly poison whate'er you express,
With scoffs, gibes, and taunting, unkind ?
Can satire or wit on a lover's distress,
Become a benevolent mind ?

54. Since the morn I beheld thee so lovely and gay,
These eyes have been stangerss to sleep ;
All the night for my fairest I ravingly pray,
Whole days, can do nothing but weep.

55. Not a but where the lily just peers do I see,
So charms its admirer above ;
As the muslim receding can fascinate me,
To gaze on thy snow balls of love.

56. When Aurora from Phoebus comes tripping it by,
Her shape, breath ambrosial, and air,
Are so much my dear nymph's I distractedly cry,
Whence ! Whither ! thus early my fair ?

57. Though you clouds burst with peals we have nothing to fear
Since the skies will relenting avert,
While such innocence, beauty and goodness, are near,
Each shaft but thy own from my heart.

58. If kind nature, not art, lilies, roses, can grace,
With pencil and colours divine,
Shall paint sacrilegiously beauties deface,
Each bloom sees with envy in thine.

59. How Ye damsels of Hind prove more frigid and cool
Than hills cover'd over with snow,
As our genial warm plains, while the maids, of Kabool,
With love amid icicles glow-

60. Are those locks not intended to rivet thy chain !
Fly Souda ! inchantement is there !

What comb hath the power to release thee agian ?
From jetty fell ringlets of hair.

61. Where ever I carried these gushing eyes of mine, I filled the puddles that were drying up, with my tears.

62. I and the nightingale are from the first unfortunate, thy frown is ever on me, and over her is the roses thorn.

63. My plaints think not of giving me rest even in the grave, where I shall probably go to disturb the sleep of thousand.

64. It is impossible to wash out the decrees of fate, my heart is not to blame, and I must submit to whatever may happen to me.

65. Why my mistress bo offended at my admiration of thee, I am but a solitary tear, that in the twinkling of an eye, must trickle away.

66. In the definition of a love-sick patient's complaint, Avicenna himself being baffled, and forgetting the whole rules or art (or his own institutes of physic) departed weeping.

67. Hell I can bear, O Moonkir and Nukee, (the two sepulchral catechists) but I have not patience for question and answer (examination)

68. Souda may well say, behold the words condition ! even in spring the nigthtingale sings, oh alas! alas! and the rosebud sighs ah ! wo is me !

69. What shall I do with such things ? be there preserved, and I remain the humble dust of thy threshould.

70. What will this constant weeping of your's come to, Souda ? Deluge not the world with thy tears, O mad man !

71/72. The wind is exhausted, the cup-bearer fled, and my glass is not full ; O heavens, how can I behold the banquet room with these eyes ; the source of elegant composition is dried up, fancy has forsaken the world, and Souda the lunatic alone remains'.

73. Go thou gentle breath of the morning at the earliest dawn of the day, and if my fair one be asleep, let not a leaf rustle (to disturb her).

74. The muses daring wing when invoked, can not escape me, as the soaring falcon of my brilliant fancy is the guide thereof.

75. In short the slaughter of mankind is his employment, so that fate and death are falsely accused.

HINDOOSTANEE MUSIC.

Rekhtu, ریختہ

[illegible] (See page 153, [illegible]) [illegible]
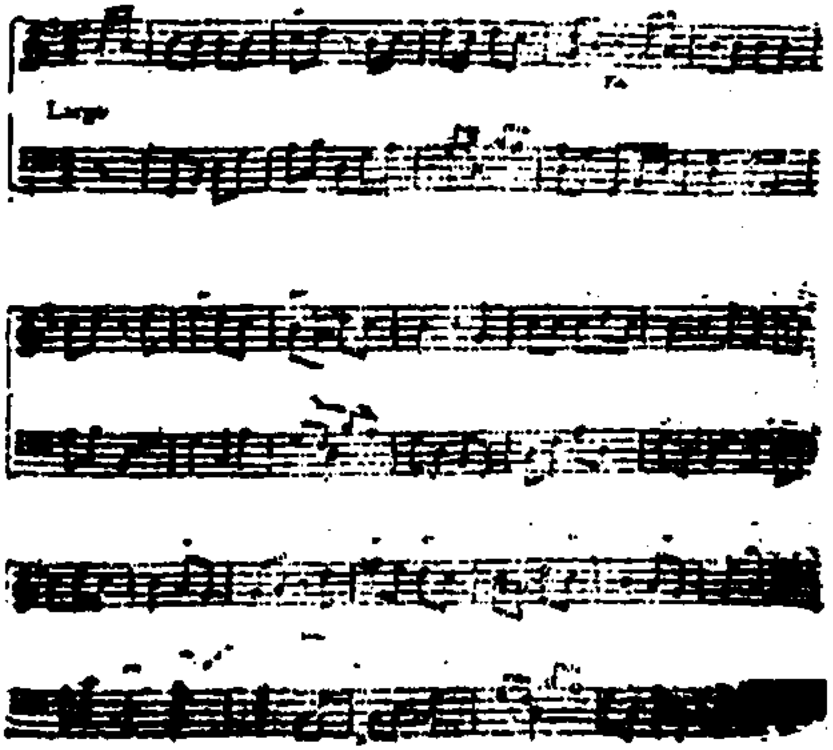
سودا کی کہی ہوئی تضمین کی طرز جو گلکرسٹ نے اپنی کتاب "دی اورینٹل لنگوسٹ" میں دی ہے۔

کتابیات

مائیکروفلم اورفوٹوسٹیٹ

۱۔ آزردہ، مفتی صدرالدین، تذکرہ آزردہ (فوٹوسٹیٹ) مملوکہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو۔

۲۔ حیدر بخش حیدری، گلشن ہند (فوٹوسٹیٹ) مملوکہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو۔

۳۔ ذکا، خوب چند، عیارالشعرا (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۴۔ سودا، مرزا محمد رفیع سودا، کلیات سودا ''نسخۂ رچرڈ جونسن'' (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۵۔ سوز، محمد میر، دیوانِ میر سوز (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۶۔ شورش عظیم آبادی، تذکرہ شورش (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۷۔ عشقی عظیم آبادی، تذکرہ عشقی (مائیکروفلم) دلّی یونی ورسٹی لائبریری۔

۸۔ مبتلا، غلام محی الدین، طبقات سخن (مائیکروفلم) خدابخش لائبریری پٹنہ۔

۹۔ بھیم سین، دلکشا، (مائیکروفلم) ہسٹری ڈیپارٹمنٹ، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

قلمی (فارسی)

۱۰۔ ابوالحسن امیر الدین (امراللہ الہ آبادی) تذکرہ مسرت افزا، خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔

۱۱۔ ابوالحسن امیر الدین (امراللہ الہ آبادی) تذکرہ مسرت افزا، بحوالہ معاصر حصہ ۶

۱۲۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، رضا لائبریری، رام پور۔

۱۳۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۱۴۔ حیرتؔ، قیام الدین، مقالات الشعرا، رضا لائبریری، رام پور

۱۵۔ ذکاؔ، خوب چند، عیار الشعرا، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔

۱۶۔ راسخؔ، عنایت خاں، ذکر مغنیانِ ہندوستان بہشت نشان، خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔ بحوالہ معاصر حصہ ۶

۱۷۔ سلطان علی حسینی صفوی، معدن السعادت، جلد ۴، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ

۱۸۔ سید ولی اللہ فرخ آبادی، تاریخ فرخ آباد، رضا لائبریری، رام پور۔

۱۹۔ حمزہ مارہروی، شاہ محمد، فص الکلمات، رضا لائبریری، رام پور۔

۲۰۔ شاکر خاں پانی پتی، تذکرہ شاکر خاں، بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔

۲۱۔ شفیقؔ، لچھمی نرائن، گل رعنا، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد۔

۲۲۔ شوق رام پوری، مولوی قدرت اللہ، طبقات الشعرا، رضا لائبریری، رام پور۔

۲۳۔ شوق رام پوری، مولوی قدرت اللہ، طبقات الشعرا، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد۔

۲۴۔ عبدالقادر چیف رام پوری، روزنامچہ، رضا لائبریری، رام پور۔

۲۵۔ عاشقیؔ عظیم آبادی، حسین قلی خاں، نشترِ عشق، رضا لائبریری، رام پور۔

۲۶۔ فتوت، عنایت اللہ، ریاض حسنی، سنٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد۔

۲۷۔ کمال، شاہ کمال الدین، مجمع الانتخاب، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔

۲۸۔ کمال، شاہ کمال الدین، مجمع الانتخاب، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد۔

۲۹۔ مبتلا، مردان علی خاں، گلشن سخن، رضا لائبریری، رام پور۔

۳۰۔ واصف، محمد مہدی، معدن الجواہر، آصفیہ لائبریری، حیدرآباد۔

۳۱۔ وامق، میر بہادر علی، قصر اللطائف، رضا لائبریری، رام پور، بحوالہ نقوش ۱۹۵۸ء

۳۲۔ نقش علی، باغ معانی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔

اُردو (قلمی)

۳۳۔ بیاں، احسن اللہ خاں، دیوانِ بیاں، آصفیہ لائبریری، حیدرآباد۔

۳۴۔ بیاں، احسن اللہ خاں، دیوان بیاں، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد۔

۳۵۔ حاتم، شاہ ظہور الدین، دیوان زادہ حاتم، آزاد لائبریری، علی گڑھ۔

۳۶۔ حاتم، شاہ ظہور الدین، دیوان زادہ حاتم، رضا لائبریری، رام پور۔

۳۷۔ حسن، میر حسن، دیوانِ میر حسن، رضا لائبریری، رام پور

۳۸۔ خلیق انجم، مرزا مظہر جانجاناں (تحقیقی مقالہ) دلّی یونیورسٹی لائبریری

۳۹۔ ضیغم، محمد عبداللہ، یادگارِ ضیغم، ادارہ دبیات اردو، حیدرآباد۔

۴۰۔ رند، مہربان خاں، دیوانِ رند، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ۔

۴۱۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، (حبیب سیکشن) آزاد لائبریری، علی گڑھ۔

۴۲۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد۔

۴۳۔ سوداؔ، مرزا محمد رفیع، قصایدِ سوداؔ، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد۔

۴۴۔ سوداؔ مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سوداؔ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔ بحوالہ نوائے ادب جولائی ۱۹۶۱ء (نسخہ خدا بخش)

۴۵۔ سوداؔ، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سوداؔ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، بحوالہ نوائے ادب، جولائی ۱۹۶۱ء (نسخۂ نرائن)

۴۶۔ سوزؔ، شاہ محمد میر، دیوانِ سوز، ۱۱۵۵ء ۱۸۹۱ انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ
س ۴۲ دس
ن ۱

۴۷۔ سوزؔ، شاہ محمد میر، دیوانِ سوز، ۱۱۵۵ء ۱۸۹۱ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔
س ۴۲ دس
ن ۲

۴۸۔ سوزؔ، شاہ محمد میر، دیوانِ سوز ۱۱۵۵ء ۱۸۹۱ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔
س ۴۲ دس
ن ۳

۴۹۔ مہدی علی خاں، تاریخ لطیف، رضا لائبریری، رام پور۔

۵۰۔ ناصرؔ لکھنوی، سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، لکھنو یونیورسٹی لائبریری۔

۵۱۔ ناصرؔ لکھنوی، سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، آزاد لائبریری، علی گڑھ۔

۵۲۔ مولف نامعلوم، قصہ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد، رضا لائبریری رام پور

فارسی مطبوعہ

۵۳۔ ابوالفضل، اکبر نامہ، مرتبہ عبدالرحیم، جلد سوم، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۸۶ء

۵۴۔ آزاد بلگرامی، میر غلام علی، سروِ آزاد، مطبع دخانی رفاہِ عام، لاہور، ۱۹۵۹ء

۵۵۔ آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانہ عامرہ، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۱ء

۵۶۔ انشا، انشاء اللہ خاں، دریائے لطافت، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۱۶ء

۵۷۔ تمنا اورنگ آبادی، اسد یار خاں، گل عجائب، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

۵۸۔ ثارنس، سرہنری، تاریخ نادری، ناقص الاول (نذیریہ لائبریری۔ دہلی)

۵۹۔ جگناتھ پرشاد، گلزارِ سخن، نول کشور، لکھنؤ ۱۳۳۶ء

۶۰۔ حسن، میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، انجمن ترقی اردو، دہلی۔ ۱۹۴۰ء

۶۱۔ حمید اورنگ آبادی، خواجہ خاں، گلشن گفتار، مرتبہ سید محمد، سلسلۂ مطبوعات مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۳۳۹ف

۶۲۔ حمید الدین خاں، نجچۂ عالم گیری، احکام عالم گیری، مرتبہ جادو ناتھ سرکار، ایم۔ سی۔ سرکار اینڈ سنز، کلکتہ، ۱۹۱۲ء

۶۳۔ خلیق، علی ابراہیم خاں، گلزارِ ابراہیم، مرتبہ سید محی الدین قادری زورؔ، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۳۴ء

۶۴۔ خوش گو، بندرابن داس، تذکرہ خوش گو، مرتبہ سید شاہ محمد عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، سلسلہ انتشارات ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۱۹۵۹ء

۶۵۔ درگاہ قلی خاں، (نواب ذوالقدر) مرقع دہلی، تاج پریس، حیدر آباد۔

۶۶۔ دولت یار جنگ نصر اللہ داستانِ ترک تازانِ ہند، جلد اول و دوم، مطبع دت پرشاد، بمبئی۔ ۱۳۱۰ھ

۶۷۔ سرورؔ، میر محمد خاں بہادر، عمدۂ منتخبہ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔۱۹۶۱ء

۶۸۔ شاہ غلام علی، مقامات مظہری، مطبع مجتبائی، دہلی۔۱۳۰۹ھ

۶۹۔ شاہ نواز خاں (نواب صمصام الدولہ) ماثر الامرا، مرتبہ مولوی عبدالرحیم، جلد اول، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔۱۸۹۱ء

۷۰۔ شفیقؔ، لچھمی نارائن، چمنستانِ شعرا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔۱۹۲۸ء

۷۱۔ شورشؔ عظیم آبادی، تذکرۂ شورش، (دو تذکرے) مرتبہ کلیم الدین احمد (دو جلدیں) لیبل لیتھو پریس۔ پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء دوسری جلد ۱۹۶۳ء

۷۲۔ شیفتہؔ، نواب مصطفےٰ خاں، گلشنِ بے خار، مطبع نول کشور لکھنو۔۱۸۷۴ء

۷۳۔ صدیق حسن خاں، شمع انجمن، یسر المطابع شاہجہانی، بھوپال۔۱۲۹۳ھ

۷۴۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد دوم، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔۱۸۶۴ء

۷۵۔ علی احمد خاں، مراتِ احمدی، مرتبہ سید نواب علی، جلد اول، اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، بڑودہ۔۱۹۲۸ء

۷۶۔ عشقیؔ عظیم آبادی، تذکرۂ عشقی، دو تذکرے، مرتبہ کلیم الدین احمد، (دو جلدیں) لیبل لیتھو پریس پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء دوسری جلد ۱۹۶۳ء

۷۷۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، جلد دوم وسوم، مطبع نول کشور لکھنو۔۱۸۹۷ء

۷۸۔ فتح علی حسینی گردیزی، (سید) تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔۱۹۳۳ء

۷۹۔ فراقؔی، کنور پریم کشور، وقائع عالم شاہی، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ، کتب خانہ رامپور۔ ۱۹۴۹ء

۸۰۔ قائمؔ، شیخ محمد قیام الدین، مخزنِ نکات، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۲۹ء

۸۱۔ قاسمؔ، حکیم قدرت اللہ، مجموعہ نغز، مرتبہ محمود شیروانی، سلسلۂ نشریاتِ کلیہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۳۳ء

۸۲۔ کنور درگا پرشاد، بوستان اودھ، احمد پریس لکھنؤ۔ ۱۸۹۲ء

۸۳۔ محمد کاظم (منشی)، عالم گیر نامہ، مرتبہ مولوی خادم حسین و مولوی عبدالحیٔ، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء

۸۴۔ محمد ساقی مستعد خاں، مآثر عالم گیری، مرتبہ آغا احمد علی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۷۱ء

۸۵۔ محمد ہاشم خافی خاں، منتخب اللباب، مرتبہ مولوی کبیر الدین احمد، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۷۴ء

۸۶۔ مصحفیؔ، غلام ہمدانی، عقدِ ثریا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، دہلی۔ ۱۹۳۴ء

۸۷۔ مصحفیؔ، غلام ہمدانی، عقدِ ثریا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۴ء

۸۸۔ میرؔ، میر تقی، نکات الشعرا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء

۸۹۔ میرؔ، میر تقی، ذکرِ میر، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۲۸ء

۹۰۔ نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، مطبع نظامی، کانپور۔ ۱۲۷۵ھ

۹۱۔ ہندی، بھگوان داس، سفینۂ ہندی، مرتبہ محمد عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۱۹۵۸ء

۹۲۔ یکتا، حکیم احمد علی خاں، دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، سلسلہ مطبوعات کتاب خانہ ریاست رام پور۔۱۹۴۳ء

اُردو مطبوعہ

۹۳۔ اثر، سید امداد امام، کاشف الحقائق، جلد دوم، مکتبہ معین الادب، لاہور۔۱۹۵۶ء

۹۴۔ اثر کاکوروی، عبدالرفیع علوی، نیرنگِ سودا، لالہ رام نرائن لعل بک سیلر الہ آباد، ۱۹۳۵ء

۹۵۔ اثر لکھنوی، مرزا جعفر علی خاں، انیس کی مرثیہ نگاری، دانش محل لکھنؤ۔۱۹۵۱ء

۹۶۔ احمد علی خاں شوق (حافظ) تذکرہ کاملانِ رام پور، ہمدرد پریس، دہلی ۱۹۲۹ء

۹۷۔ ادیب، سید مسعود حسن رضوی، روحِ انیس، کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ۔۱۹۵۶ء

۹۸۔ آرزو، مختار الدین احمد (مرتب)، احوالِ غالب، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔ ۱۹۵۲ء

۹۹۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، رفاہِ عام اسٹیم پریس، لاہور، بار ہشتم، ۱۹۱۳ء

۱۰۰۔ اسلم پرویز، انشاء اللہ خاں انشا، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۶۱ء

۱۰۱۔ اشپرنگر، یادگارِ شعرا، مترجمہ طفیل احمد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد۔۱۹۴۳ء

۱۰۲۔ امیر مینائی، مفتی امیر احمد، انتخابِ یادگار، رام پور، ۱۲۹۰ھ

۱۰۳۔ بشاش، دیبی پرشاد، آثار شعرائے ہنود، مطبع رضوی، ۱۸۸۵ء

۱۰۴۔ بے خبر، پنڈت برج کشن کول، بہارِ گلشنِ کشمیر، جلد اول، انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد۔۱۹۳۱ء

۱۰۵۔ تنہا، محمد یحیٰ، مرآۃ شعرا، عالم گیر الیکٹرک پریس، لاہور

۱۰۶۔ ثابتؔ رضوی، حیاتِ دبیر، مطبع سیوک اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء

۱۰۷۔ جرأتؔ، شیخ قلندر بخش، کلیاتِ جرأت، مطبع کارنامہ لکھنؤ ۱۸۸۳ء

۱۰۸۔ جان شیکسپیر، منتخباتِ ہندی، جلد دوم، لندن ۱۸۲۵ء

۱۰۹۔ جلال الدین جعفری، تاریخ قصایدِ اردو، مطبع انوار احمدی، الہ آباد

۱۱۰۔ حالیؔ، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ تنویر احمد علوی، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ

۱۱۱۔ خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر، حیات اور شاعری، انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ ۱۹۵۷ء

۱۱۲۔ رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، راجہ رام کمار پریس، لکھنؤ۔ ۱۹۵۲ء

۱۱۳۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکاتِ اُردو، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد۔

۱۱۴۔ رفعت، ابوالفضل محمد عباس، تذکرہ ماہِ درخشاں، مطبع شاہجہانی، ۱۸۹۲ء

۱۱۵۔ رنگینؔ، سعادت یار خاں، مجالسِ رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس لکھنو، ۱۹۲۹ء

۱۱۶۔ زورؔ، سید محی الدین قادری، سرگزشتِ حاتم، ادارہ ادبیاتِ اردو، ۱۹۴۴ء

۱۱۷۔ سری رام (لالہ) خم خانہ جاوید، جلد چہارم، ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۶ء

۱۱۸۔ سلامؔ سندیلوی، رباعیاتِ اردو، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

۱۱۹۔ سوداؔ، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، مرتبہ میر عبدالرحمٰن آہی، مطبع مصطفائی دہلی، ۱۲۷۲ھ

۱۲۰۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۹۱۶ء

۱۲۱۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۳۲ء

۱۲۲۔ سید عبداللہ، بحث و نظر، مکتبۂ اردو، لاہور، ۱۹۵۲ء

۱۲۳۔ سید عبداللہ، نقدِ میر، جہانگیر بکڈپو، دہلی

۱۲۴۔ سید عبدالحیٔ (حکیم) گلِ رعنا، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۴۰ھ

۱۲۵۔ شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ و مترجمہ خلیق احمد نظامی، سلسلۂ تصانیف مشائخ، دہلی۔ ۱۹۵۰ء

۱۲۶۔ شبلی نعمانی، موازنۂ انیس و دبیر، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور۔

۱۲۷۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد پنجم، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۲۴ء،

شوق، احمد علی خاں دیکھیے احمد علی خاں

۱۲۸۔ شیخ چاند، سودا، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

۱۲۹۔ صابر علی خاں، سعادت یار خاں رنگین، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۶ء

۱۳۰۔ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، ادبی پبلشرز، ممبئی ۱۹۶۱ء

۱۳۱۔ عبدالسلام ندوی، شعر الہند، (جلد اول)، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء

۱۳۲۔ غالب، اسد اللہ خاں، خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور

۱۳۳۔ فائز دہلوی، نواب صدر الدین خاں، فائز دہلوی اور اُس کا دیوان، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی ۱۹۴۶ء

۱۳۴۔ فراق، ناصر نذیر، میخانۂ درد، جید برقی پریس، دہلی ۱۳۴۴ھ

۱۳۵۔ فراق گورکھپوری، اندازے، ادارۂ انیس اُردو، الہ آباد، ۱۹۵۹ء

۱۳۶۔ قائم، قیام الدین، دیوانِ قائم، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، جمال پریس، دہلی ۱۹۶۳ء

۱۳۷۔ قاضی عبدالودود، عیارستان، سلسلۂ مطبوعات ادارہ تحقیقاتِ اُردو، پٹنہ ۱۹۵۷ء
۱۳۸۔ کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ، کیفیہ، انجمن ترقی اُردو، دہلی ۱۹۴۲ء
۱۳۹۔ کیفی چریاکوٹی محمد مبین، جواہر سخن، جلد دوم، ہندوستانی اکیڈمی، الہٰ آباد ۱۹۳۵ء
۱۴۰۔ گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات، (فرانسیسی) جلد سوم، بحوالہ معاصر حصہ ۲
۱۴۱۔ لطف، مرزا علی، گلشنِ ہند، مرتبہ مولوی شبلی اور مولوی عبدالحق، رفاہِ عام سٹیم پریس، لاہور ۱۹۰۶ء
۱۴۲۔ محمد ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، سلسلۂ مطبوعات مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ ۱۹۴۴ء
۱۴۳۔ محمد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۶۲ء
۱۴۴۔ مظہر مرزا مظہر جانجاناں، مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، مترجمہ و مرتبہ خلیق انجم، مکتبہ برہان، دہلی ۱۹۶۲ء
۱۴۵۔ میر، میر تقی، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۴۰ء
۱۴۶۔ میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، مترجمہ نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان، دہلی ۱۹۷۵ء
۱۴۷۔ نجم الغنی، بحر الفصاحت، نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۶ء
۱۴۸۔ نجم الغنی، تاریخِ اودھ، نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء پہلی تین جلدیں
۱۴۹۔ نساخ، مولوی عبدالغفور، گنج تواریخ مطبع نول کشور، ۱۹۷۵ء
۱۵۰۔ نساخ، مولوی عبدالغفور، سخن شعرا، نول کشور، ۱۲۹۱ھ
۱۵۱۔ نورالحسن ہاشمی، دلّی کا دبستان شاعری، انجمن ترقی اردو (ہند)
۱۵۲۔ یقین، انعام اللہ خاں، دیوانِ یقین، مرتبہ فرحت اللہ بیگ، مطبع مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ ۱۹۳۰ء

اُردو رسالے

۱۵۳۔ اُردو ادب، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۵۰ء
۱۵۴۔ اُردوے معلّٰی، غالب نمبر، دہلی یونی ورسٹی، دہلی ۱۹۶۰ء

۱۵۵۔ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۴۳ء
۱۵۶۔ دلّی کالج میگزین، دلّی نمبر
۱۵۷۔ سب رس، حیدرآباد، نومبر ۱۹۶۰ء
۱۵۸۔ سویرا، لاہور، خاص نمبر، ۲۹
۱۵۹۔ علی گڑھ میگزین، طنز وظرافت نمبر، ۱۹۵۳ء
۱۶۰۔ معاصر حصہ۔ ۱
۱۶۱۔ معاصر حصہ۔ ۲
۱۶۲۔ معاصر حصہ۔ ۱۵
۱۶۳۔ معاصر حصہ۔ ۱۸
۱۶۴۔ معاصر جولائی، ۱۹
۱۶۵۔ معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۵۲ء
۱۶۶۔ مجلّہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، ۱۹۶۳ء
۱۶۷۔ نقوش، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء
۱۶۸۔ نقوش، لاہور، مئی ۱۹۶۱ء
۱۶۹۔ نقوش، لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء
۱۷۰۔ نقوش، لاہور، طنز ومزاح نمبر
۱۷۱۔ نگار، لکھنؤ، اگست ۱۹۲۸ء
۱۷۲۔ نگار، لکھنؤ، جنوری وفروری ۱۹۵۷ء
۱۷۳۔ نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۱۹۵۲ء
۱۷۴۔ نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۶ء
۱۷۵۔ نیا دور، لکھنؤ، نومبر ۱۹۶۱ء
۱۷۶۔ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۵۹ء
۱۷۷۔ ہماری زبان، علی گڑھ، ۸/ مارچ ۱۹۵۹ء

179. **Bal Krishan, Commercial Relation Between India and England. George Routledge & Sons, Ltd. London, 1924**

180. Bernier F. Travels in the Mogul Empire, tr. A. Constable, 2 Ed, London, 1916

181. Fraser James, History of Nadir Shah. 2.Ed. A Miller London, 1742.

182. Gilchrist J., The Stanger's Infallible East India Guide, London, 1820.

183. Gilehrist J., Grammer of the Hindoostanee Language, Etc, Chronicle Press, Calcutta 1796

184. Gilehrist J, The Oriental Linguist, Chronicle Press, Calcutta, 1798.

185. Irfan Habib, The Agrarian System of Mughal India (1556-1707) Deptt. of History, Aligarh Muslim University, 1963

186. Kalinker Datt. Survey of India's Social Life and Economic Condition in the 18th Century, Firma K.L. Mukhpadhyay, Calcutta, 1961

187. Majumdar R.C., An Advance History of India, MacMillan & Co. Ltd. London, 1960

188. Manrique, F.S., Travels, 1629-43, tr.C.E. Luard, Vol. II, Hakluyt Society London, 1927

189. Manucci N. Storia Do Mogor, Vol.II, tr. W. Irvine, John Murray, Albemarle Street, London, 1907

190. Ralph Fitch, Narrative, ed. J.H. Ryley, Ralph Fitch, England's Poineer to India and Burma, London, 1899

191. Sarkar, J.N., Fall of Mughal Empire, Vol. I, M.C. Sarkar & Sons, Calcutta.

192. Sarkar, J.N. Studies in Aurangzib's Reign, M.C. Sarkar & Sons Ltd. Calcutta, 1933

193. Satish Chandra, Parties & Politics at the Mughal Court, Deptt. of History, Aligarh Muslim University, 1959

194. Shelvankar K.S., The Problem of India, Penguin Books Limited, Newyork, 1940

195. Thompson E. and G.T. Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule In India, Central Book Depot, Allahabad, 1962

196. Willianms M., Sanskrit-English Dictionary Clarendon Press, 1899.

१९६. धीरेन्द्र वर्मा, हिन्दी साहित्य कोश, बनारस, १९५८।

१९७. रामधन शर्मा, कूटकाव्य, दिल्ली, १९६३।

१९८. कृष्णलाल हन्स, निमाड़ी और उसका साहित्य, इलाहाबाद, १९६०।

شاریہ

اشخاص

آبرو، شاہ مبارک: ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۳، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۶۰، ۳۵۶، ۳۸۰، ۳۸۱، ۵۲۶۔

آتش: ۴۳۱، ۵۲۸۔

آرزو، سراج الدین علی خاں: ۷۹، ۸۰، ۸۱۔۸۳، ۸۴، ۸۷، ۹۳، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۱۰، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۲، ۱۶۶، ۲۹۰، ۲۹۱۔

آزاد، مولانا محمد حسین: ۷۰، ۷۱، ۷۸، ۸۲، ۸۵، ۸۷، ۹۱، ۹۲، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۱۸، ۱۲۹، ۱۴۸، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۸، ۱۹۴، ۲۱۳، ۲۲۳، ۲۳۵، ۲۸۷، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۱، ۴۰۷، ۴۱۲، ۴۱۸، ۴۱۹، ۵۲۶، ۵۶۳، ۶۰۲۔

آسی سبزواری: ۱۶۲، ۲۸۰، ۲۸۹، ۳۵۷، ۳۸۹، ۳۹۲، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۸، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۶۲، ۴۶۵، ۴۷۵، ۴۸۰، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۸۔

آسی عبدالباری: ۴۲۵۔

آشفتہ: ۶۱۵۔

آصف الدولہ، نواب: ۳۰، ۸۶، ۹۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۲۳۵، ۲۴۵، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۶، ۳۵۸، ۳۸۰، ۴۶۳، ۴۶۴، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۵۴، ۵۶۲، ۶۰۳، ۶۰۴۔

آغا باقر، سید: ۱۲۹۔

آغا مہدی، سید: ۱۲۳۔

آہی، میر عبدالرحمٰن: ۴۲۴۔

ابدالی، احمد شاہ: ۲۴، ۳۴، ۳۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۳۵۰، ۶۰۱۔

ابوالحسن، امیر الدین: ۹۰، ۴۸۰، ۵۵۵۔

ابوالخیر: ۳۸۴۔

ابوسعید: ۳۸۴۔

ابوطالب،مرزا : ۶۲، ۷۱، ۷۲۔

ابوالفضل: ۲۸۔

ابنِ انشا : ۱۴۳۔

ابن زیاد :۳۰۷۔

ابن نشاطی : ۳۵۵۔

اثر: ۱۶۷۔

احسن،مرزا احسن علی :۲۹۱، ۵۲۸، ۵۳۱۔

احسن،احسن اللہ :۱۴۹۔

احمد شاہ:۴۱۔

احمد،کلیم الدین :۲۵۷، ۲۵۸، ۴۱۲۔

ادیب،مسعود حسن رضوی:۳۴۲۔

ارسطو : ۱۴۸۔

اسد،میر اسد علی :۵۳۳۔

اسد، میر امانی : ۳۱۹، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵۔

اسلم پرویز،ڈاکٹر :۲۰، ۴۸۔

اشتیاق،شاہ ولی اللہ: ۱۴۹۔

اشپرنگر : ۷۰، ۸۲، ۱۱۸، ۵۲۷، ۵۹۶، ۵۹۷۔

اصلح الدین : ۳۲۶۔

اعظم خاں:۵۱، ۵۲۔

اعلاعلی،میر:۳۱۹۔

افسری :۲۹۰۔

افسوس،میر شیر علی:۴۲۳۔

اکبر:۲۴، ۲۵، ۲۹، ۲۴۶، ۶۰۱۔

اکسیر:۲۲۷۔

الفت:۵۲۷۔

امام اصغر:۴۸۷۔

امام باقر:۱۲۶، ۲۳۵۔

امام تقی:۲۳۵۔

امام جعفر صادق:۲۳۵۔

امام حسین : ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۴۱۔

امام رضا: ۴۶۱۔

امام،سید امداد:۱۶۷۔

امام ضامن:۲۳۵، ۲۵۱، ۵۰۷۔

امام عسکری:۲۳۵، ۴۶۲۔

امام مہدی:۲۳۵، ۲۴۳، ۲۵۲، ۲۵۴۔

امام کاظم: ۲۳۵۔
امید، قزلباش خاں: ۱۴۶۔
امیر الدین
دیکھیے:
ابوالحسن، امیر الدین
امیر، محمد یار خاں: ۱۱۳۔
امیر مینائی: ۵۲۵، ۵۶۵۔
امین الدولہ: ۵۵۷
انتظام الدولہ، نواب: ۱۱۱۔
انسان، اسد یار خاں: ۱۴۶۔
انشا، انشاء اللہ خاں: ۱۰۴، ۱۷۳، ۲۲۰، ۲۶۰، ۲۶۹، ۴۰۱، ۴۰۵، ۵۱۷، ۵۵۷، ۵۸۳۔
اندر راؤ: ۴۵۔
انور، منوہر سہائے: ۱۳۶۔
انوری: ۱۶۵، ۱۶۶، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۵۸۔
انیس: ۳۲۲، ۳۴۱۔
اودھم بائی: ۵۰، ۵۱۔
اورنگ زیب: ۲۳، ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۳۲، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۱۳۳، ۱۳۴، ۳۴۲، ۶۰۱۔
ایاغی: ۲۳۰۔
ایرانی، سعادت خاں: ۴۷۔
بابر، مرزا: ۵۳۹۔
باسط، خواجہ: ۱۵۸۔
بحری: ۲۳۰۔
بدایونی، عبدالقادر: ۲۵۔
برہان الملک: ۱۱۰۔
برنیئر: ۲۵، ۲۶۔
برہمن، چندر بھان: ۱۴۱۔
بسمل، مرزا بچو بیگ: ۵۳۷۔
بسنت، اسد خوانی، خواجہ: ۵۳۔
بسنت خاں، نواب: ۲۴۵، ۲۴۶۔
بشاش: ۵۹۵۔
بقا: ۱۲۳، ۲۷۴، ۲۷۵۔
بلگرامی، مرتضیٰ حسین: ۳۵۔
بنگش، نواب احمد خاں: ۹۸، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۶۰۳۔

بہار، ٹیک چند :۱۳۶۔

بھٹ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ :۱۵، ۱۹۔

بھیم سین :۲۸۔

بیان، احسن اللہ خاں: ۴۷، ۱۵۲، ۱۵۵، ۳۸۴، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۵۲۶۔

بیتاب، محمد اسماعیل :۱۴۸۔

بیدار :۲۳۰۔

بیدل، مرزا عبدالقادر: ۱۰۲، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۶۵، ۲۲۳، ۲۹۰، ۴۲۸۔

بیرنگ، دلاور خاں: ۱۴۸۔

پرشاد، جگ ناتھ: ۸۶۔

پرورش: ۵۴۰۔

پلیسیرٹ: ۳۰۔

تاباں، عبدالحی: ۳۶۷۔

تسلیم، محمد انوار حسین: ۸۶۔

تمکین :۸۸۔

تمنا، اسد علی خاں اورنگ آبادی: ۳۹۶۔

تنہا، مولوی محمد یحییٰ: ۴۱۰۔

تھامس رو: ۲۵۔

ٹکیت رائے، راجا: ۱۲۲، ۴۲۱، ۴۶۰۔

ثابت رضوی، سید افضل حسین: ۳۲۴۔

ثاقب، شہاب الدین: ۱۴۸۔

ثاقب، سید شمس الدین: ۱۴۷۔

ثنا، شیخ آیت اللہ: ۲۹۰۔

جاٹ، سورج مل: ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳۔

جامی، مولوی: ۱۶۲، ۲۸۴، ۲۹۰۔

جان برسٹو: ۱۲۰۔

جانجاناں، مرزا مظہر: ۴۹، ۵۵، ۵۷، ۸۷، ۱۰۳، ۱۱۳، ۱۳۳، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۶۹، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۲، ۱۷۱، ۲۶۰، ۲۷۳، ۴۸۰، ۵۲۶، ۵۲۸، ۵۴۴۔

جان گلکرسٹ: ۱۸، ۴۲۳، ۶۰۶۔

جانم، برہان الدین: ۳۵۵۔

جاوید رحمانی: ۲۰۔

جرأت، قلندر بخش: ۴۷، ۷۳، ۱۶۰، ۱۷۳، ۲۲۰، ۴۰۵، ۴۸۰، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۳۸، ۵۶۵، ۶۰۳۔

جسونت سنگھ: ۶۷، ۶۹۔

جعفر زٹلی، میر: ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۳۲،

٢٥٩، ٣٥٦۔
جمیل جالبی، ڈاکٹر :٤٦، ٦٤، ٥٣٨۔
جوانؔ :٤٢٣۔
جہاندار شاہ:٤٤، ٥٠، ٥٣٩۔
جہانگیر : ٢٤، ٢٥، ٢٦، ٢٧، ٣٠، ١٤٠، ٦٠١۔
جہاں آرا: ٣٠۔
جیمز فریزر:٣٨۔
جیناؔ، جینا بیگم:٥٣٩۔
جین، ڈاکٹر گیان چند:١٢٣۔
چتر بائی:٦٩۔
چودھری رشید:٢٠۔
چیف، عبدالقادر:٤٠١۔
چیوٹ، رام شرما:٣٩١۔
حاتمؔ، سید حاتم علی خاں : ٣٥، ٤٣، ٧٤، ٧٨، ٨٢، ٨٣، ٨٥، ١٢٩، ١٣٧، ١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ١٤٧، ١٤٩، ١٥١، ١٦٣، ٢١١، ٢٦٠، ٣٥٦، ٣٨٠، ٣٨١، ٥٢٦، ٥٥٦، ٦٠٢۔
حافظ، حافظ رحمت : ٢٩، ٢٥٦، ٣٣٤، ٣٨٤۔
حالیؔ، مولانا الطاف حسین: ٣٩٤، ٤٠٨، ٤١٠۔
حجام، عنایت اللہ:٥٤٠، ٥٤١۔
حزیںؔ، شیخ علی: ٨١، ٨٦، ٨٧، ١٠٦، ١٣٤، ١٣٦، ١٣٧، ١٣٨، ٢٩٤، ٣٢٠، ٥١٩، ٦٠٣۔
حزیں، میر باقر:١٥٢، ٥٢٦۔
حسرتؔ، ہیبت قلی خاں: ٤٧، ١٥٢، ٢٦٦، ٢٨٥، ٢٨٨، ٦٠٣۔
حسرت، جعفر علی:١٢٣، ٢٨٧۔
حسن، میر محمد حسن دہلوی : ٣٩٥، ٤٠٥، ٤٧٦، ٤٧٧، ٥٤٣، ٥٩٧۔
حسینؓ (امام):٢٧٨، ٤٨٦۔
حسینی صفوی، سلطان علی:٣٩٩۔
حشمتؔ، میر محتشم علی خاں:١٤٦۔
حضرت عابد:٣٣٨، ٣٤١۔
حضرت عباس : ٣٣١، ٣٣٢، ٣٣٣، ٣٣٦، ٣٣٨۔
حضرت علیؓ : ٧٧، ٢٣٥، ٢٤١، ٢٤٣، ٢٤٧، ٢٤٨، ٢٥١، ٢٥٢، ٣٧٣، ٥٠٩۔

حضرت قاسم :۳۴۱۔

حکیم آفتاب :۶۱، ۲۶۹۔

حکیم غوث :۴۵۶، ۶۰۸۔

خارجی، مولوی ساجد: ۴۶۴، ۴۶۵۔

خاقانی : ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۵۸، ۳۹۰، ۳۹۹، ۴۰۵، ۴۱۰، ۶۰۴۔

خاکسار: ۹۷۔

خاکی :۱۴۰۔

خالص، امتیاز خاں :۲۹۱۔

خان آرزو: ۴۷، ۷۳، ۵۲۵، ۵۲۶، ۶۰۲، ۶۰۳۔

خان، ماشاءاللہ: ۲۶۹۔

خان، محمد راغب :۲۹۴۔

خان، مرشد قلی : ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۶۰۲۔

خاں، ابراہیم علی: ۸۹۔

خاں، ابوالمنصور صفدر جنگ: ۵۶۷۔

خاں، احمد علی :۲۴۷۔

خاں، احمد یار :۵۶۴۔

خاں، اسمٰعیل قلی :۶۷۔

خاں، اشرف علی: ۹۵، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۴، ۵۷۴۔

خاں، تفضیل حسین: ۲۸۸۔

خاں، تیرانداز: ۵۹۶، ۵۹۷۔

خاں، جاں نثار: ۶۸۔

خاں، حافظ نظارت: ۴۲۱۔

خانخاناں، عبدالرحیم: ۲۴۹۔

خاں، حمیدالدین: ۶۸، ۵۳۸۔

خاں، خواجہ حمید اورنگ آبادی: ۳۲۱، ۳۹۳۔

خاں، خواجہ محمد یونس: ۵۲۸۔

خاں دوراں: ۲۶۔

خاں، رشید حسن: ۲۰۔

خاں، سرفراز الدولہ حسن رضا : ۱۲۰، ۱۲۲، ۲۳۵، ۲۵۱، ۲۵۶، ۵۲۸، ۵۲۹۔

خاں، سید حسین علی: ۳۲۔

خاں، سید عبداللہ :۳۲۔

خاں، سید علی حسن: ۵۲۸۔

خاں،شاہ عالم:۲۹۔

خاں،شرف الدین علی:۱۴۶۔

خاں، شیدی فولاد : ۲۶۴، ۲۶۵، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۶۔

خاں،عبدالباقی:۵۳۸۔

خاں،عبدالرحمٰن قندھاری:۵۶۲۔

خاں،علی ابراہیم:۸۶۔

خاں،علی مردان:۶۴، ۶۵، ۶۷، ۶۸۔

خاں، غازی الدین : ۱۱۰، ۱۱۶، ۲۳۵، ۲۴۱، ۲۴۴، ۲۵۰، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۹۷، ۵۴۰۔

خاں،غلام حسین :۵۵۳۔

خاں،غلام داؤد:۲۹۔

خاں،غلام عسکری:۱۱۳۔

خاں، فتح علی: ۴۷۹۔

خاں،فولاد

دیکھیے :

خاں،شیدی فولاد۔

خاں،قمر الدین:۵۵۔

خاں،کاظم بیگ:۵۶۷۔

خاں، کاظم علی، ڈاکٹر : ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۹، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۲۳۔

خاں،ماشاءاللہ: ۲۶۹۔

خاں،محمد راغب:۲۹۴۔

خان:مرشد قلی:۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۶۰۲۔

خاں،معالج: ۳۰۰۔

خاں،منصور علی:۳۴۵۔

خاں،مہربان:۳۵۹، ۳۶۰، ۴۸۶۔

خاں،نجف:۳۱۱۔

خاں، نواب احمد علی خاں : ۱۰۵، ۱۰۶، ۲۵۵۔

خاں،نواب افضل:۵۳۴۔

خاں،نواب درگاہ قلی:۵۱، ۵۶۔

خاں،نواب ذوالفقار:۱۰۱۔

خاں،نواب ضابطہ:۳۱۱۔

خاں،نواب علی محمد:۲۹۔

خاں،نواب محمد یار:۵۶۴۔

خاں، نواب نصیر الدین: ۴۰۲۔

خاں، نور علی: ۱۳۲۔

خسرو: ۸۰، ۸۱، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۶۲، ۲۹۰، ۴۵۸۔

خضر: ۱۷۰۔

خلیق انجم، ڈاکٹر: ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۱۲۲، ۳۲۲۔

خلیل علی ابراہیم خاں: ۵۵۶، ۵۹۴۔

خنجر خاں: ۶۸۔

خوش حال خاں: ۶۶۔

خورشید الاسلام، ڈاکٹر: ۵۶۳۔

داراشکوہ: ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹۔

داغ: ۴۳۱، ۵۲۵۔

داتا، فضل علی: ۹۷، ۱۴۷۔

دبیر: ۳۲۲، ۳۴۱۔

درد، خواجہ میر: ۳۵، ۴۹، ۵۵، ۸۶، ۸۸، ۹۳، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۷، ۱۷۸، ۱۹۹، ۲۲۰، ۲۷۹، ۳۱۵، ۳۱۶، ۴۰۵، ۵۵۶، ۵۶۵۔

دردمند، محمد فقیہ: ۴۷، ۱۵۲، ۶۰۳۔

دقیق: ۲۵۸۔

دل: شاہ فتح محمد: ۱۳۹۔

دیال داس، جبالہ: ۶۹۔

ذکا، اولاد محمد خاں: ۹۴، ۱۱۴۔

ذکا، خوب چند: ۳۳، ۳۴، ۵۳۴، ۵۳۷، ۵۳۹، ۵۶۲، ۵۸۰، ۶۰۲۔

ذوق، شیخ محمد ابراہیم: ۷۸، ۲۳۱، ۲۳۲، ۱۶۰۔

ذوقی: ۴۷۷۔

راسخ، عنایت خاں: ۶۳، ۶۷، ۳۵۶، ۶۰۲۔

راقم، بندر ابن: ۴۸۲، ۵۴۴، ۵۴۸، ۵۴۹۔

رتن راٹھور: ۶۹۔

رچرڈ جونسن: ۱۸، ۳۰، ۱۲۲، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۳۱، ۴۳۸، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۶، ۴۶۰، ۴۷۵، ۴۷۷، ۴۷۹، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۳، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۲، ۵۰۴، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۲، ۵۱۳۔

رستمی، کمال خاں: ۲۳۰۔

رضا، مرزا احسن رضا: ۵۴۹، ۵۵۱۔
رفعت، ابوالفضل محمد عباس: ۵۳۹۔
رند، لالہ کھیم نرائن: ۹۴۔
رند، مہربان خاں: ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۱، ۲۳۵، ۲۵۶، ۲۸۸، ۳۲۲، ۳۲۵، ۳۲۶، ۴۸۶، ۵۸۰، ۶۰۳۔
رنگین، سعادت یار خاں: ۴۸، ۱۰۳، ۲۰۲، ۴۰۴، ۴۰۵۔
رنگین: مرزا امان بیگ: ۱۴۹۔
رودکی: ۲۵۸۔
زلیخا: ۱۷۹۔
زین آبادی: ۶۸، ۶۹۔
ساجد شاہ آبادی، مولوی: ۲۹۸، ۳۰۶، ۳۸۹، ۴۲۶، ۵۰۸۔
سادات بارہہ: ۳۲۔
سامان، میر ناصر: ۱۴۸۔
سبحان: ۱۴۷۔
سجاد، میر سجاد: ۸۸، ۱۴۷۔
سرور، آل احمد: ۱۸، ۱۹، ۴۷۶، ۴۷۷، ۵۴۹، ۵۳۸، ۵۵۳، ۵۵۶، ۵۶۲، ۵۶۷، ۵۷۳، ۵۸۵، ۵۸۶۔
سرور، عبدالغفور: ۱۳۷۔
سراج اورنگ آبادی: ۳۸۴۔
سراج الدولہ: ۳۲۶۔
سردار پٹیل: ۴۵۔
سرکار، جادوناتھ: ۳۲۔
سرفراز الدولہ، نواب: ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۵۱، ۲۵۵، ۲۵۶، ۵۲۸۔
سرہنری ٹارنس: ۳۸۔
سری رام شرما: ۲۹، ۷۷، ۷۸۔
سری رام، لالہ: ۴۰۹۔
سعادت علی: ۵۲۵۔
سعدی: ۸۱، ۱۳۸، ۱۶۲، ۱۵۷، ۲۲۳، ۲۸۶، ۲۹۰، ۴۰۶، ۴۱۷۔
سعدی کاکوروی: ۱۴۰۔
سکندر: ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۲۴، ۳۲۵۔
سکسینہ، رام بابو: ۱۵۹، ۴۰۹۔
سلیم، محمد قلی: ۱۶۶، ۲۹۱۔
سلیمان شکوہ، مرزا: ۳۰۱، ۳۶۷، ۶۰۲۔

سلمان، مسعود سعد: ۳۴۲۔
سنبھلی، حکیم کبیر: ۱۱۳۔
سندیلوی، احمد علی: ۵۵۔
سیف خاں: ۶۸، ۶۹۔
سیماب اکبر آبادی: ۵۲۵۔
شادانی، ڈاکٹر: ۱۴۵،
شاہ افضل: ۵۸۰۔
شاہجہاں: ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۲۴۶، ۵۲۲، ۶۰۱۔
شاہ جہاں ثانی: ۱۱۱۔
شاہ جانم: ۴۳۔
شاہ حمزہ: ۳۹۸۔
شاہ درانی: ۴۲۱۔
شاہ سرمد: ۳۸۴۔
شاہ عالم: ۴۵، ۵۵، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۱۲، ۲۳۵، ۳۸۰، ۶۰۳۔
شاہ عباس ثانی: ۶۵۔
شاہ کمال: ۶۲، ۶۰۲۔
شاہ مبارک: ۵۵۔
شاہ، محمد قطب: ۳۱۹۔
شاہی: ۳۸۴۔
شاکرناجی: ۴۳، ۲۶۰۔
شجاع الدولہ، نواب: ۱۴، ۲۹، ۷۵، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۲۹، ۲۳۵، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۸۸، ۲۹۷، ۳۳۳، ۳۳۴، ۴۶۲، ۴۶۳، ۵۰۷، ۵۲۸، ۵۴۹، ۵۷۴، ۶۰۳، ۶۰۴۔
شبلی، مولانا: ۲۳، ۲۳۱، ۲۴۶، ۳۲۴، ۳۳۳۔
شبیر، حضرت: ۵۸۵۔
شرف، شیخ شرف الدین حسین: ۵۵۳۔
شفیق، لچھمی نرائن: ۲، ۷۷، ۸۸، ۹۴، ۹۹، ۱۱۴، ۱۲۵، ۱۵۵، ۱۵۶، ۳۲۱، ۳۹۵، ۴۷۹۔
شمر: ۳۰۷۔
شورش عظیم آبادی: ۱۰۱، ۱۰۲، ۳۹۶، ۵۴۵، ۵۸۵۔
شوقؔ، حافظ احمد علی خاں: ۵۶۵۔

شوقؔ، حسین علی: ۱۴۸۔

شوقؔ، قدرت اللہ: ۹۰، ۱۶۶، ۲۸۴، ۳۹۷، ۴۷۷، ۵۴۱، ۵۸۸، ۵۸۹۔

شوکت سبزواری: ۴۱۲۔

شیخ چاند: ۱۷، ۱۹، ۷۸، ۷۲، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۸۰، ۸۲، ۸۷، ۱۱۵، ۱۶۰، ۱۶۴، ۲۲۱، ۳۲۱، ۳۲۷، ۴۲۱، ۴۸۰۔

شیداؔ، فتح علی: ۴۷، ۱۵۵، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۴۳۰، ۴۲۲، ۴۵۶، ۴۷۷، ۴۸۰، ۴۸۱، ۵۵۴۔

شیر شاہ: ۲۹۔

شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں: ۱۵۹، ۲۳۳، ۳۵۶، ۴۰۱، ۵۲۸، ۵۴۴، ۵۵۳، ۵۶۲، ۵۶۵، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۹۶۔

شیلوانکر: ۲۴۔

شیواجی: ۲۸۔

شہیدؔ: ۱۴۷۔

صاحب عالم: ۱۲۷، ۳۰۱۔

صادق، لطف علی خاں: ۶۴۔

صادق، مرزا: ۴۲۱۔

صانعؔ، نظام الدین احمد: ۸۵، ۸۶، ۶۰۲۔

صائب، مرزا: ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۲۲۱، ۲۹۱، ۳۹۹، ۴۰۵۔

صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث: ۷۳۔

صدیقی، رشید احمد: ۲۶۰، ۴۱۱۔

صدیقی، محمد عتیق: ۴۲۳۔

صفدر حسین، سید: ۳۲۷۔

صہبائی، امام بخش: ۱۳۶۔

ضاحک، میر غلام حسین: ۹۶، ۱۱۶، ۲۲۰، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۹، ۲۹۲، ۲۹۷، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۲۴، ۳۵۶، ۳۹۵، ۴۱۳، ۴۵۵۔

ضعیفیؔ: ۲۳۰۔

ضیغمؔ: ۸۶، ۵۲۸، ۵۳۴۔

ضمیرؔ: ۳۲۲، ۳۳۰، ۳۳۳، ۳۳۶۔

طباطبائی، سید غلام حسین خاں: ۴۱۔

طباطبائی، سید علی: ۲۳۲۔

طبعیؔ: ۲۳۰۔

ظفر، بہادر شاہ: ۱۷۔

ظہور، ظہور علی: ۴۲۴۔

ظہوری: ۱۶۵، ۲۳۵۔

عاجز، عارف علی خاں: ۴۷، ۶۰۳۔

عارف، محمد عارف: ۱۴۷۔

عارفہ خانم: ۲۰۔

عاشق، حسین قلی خاں: ۱۲۶، ۱۲۸، ۳۹۷۔

عاشور کاظمی: ۲۰۔

عاصی، خواجہ برہان الدین: ۳۱۹۔

عالم گیر ثانی: ۳۵، ۴۴، ۵۵، ۱۱۱، ۱۱۲، ۲۳۵، ۲۴۹، ۲۵۱، ۴۶۲۔

عالی، نعمت خاں: ۴۶، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۱۶۲، ۱۶۵، ۲۹۰۔

عبد آل: ۲۳۰، ۳۵۵۔

عبدالحئی، مولانا: ۸۵، ۱۱۵۔

عبدالجلیل اٹل، میر: ۱۴۲۔

عبدالرشید: ۲۰۔

عبدالسلام، مولانا: ۲۳۲۔

عبدالصمد: ۱۳۷، ۵۲۵۔

عبداللہ، سید: ۱۶۷، ۳۴۲، ۴۱۳۔

عبدالودود، قاضی: ۱۷، ۶۴، ۷۳، ۷۴، ۱۱۴، ۱۴۵، ۲۶۹، ۳۱۸، ۳۲۵، ۴۱۸، ۴۲۱، ۴۲۳، ۴۳۷، ۴۸۱، ۴۸۸، ۵۰۲، ۵۱۸، ۵۲۹، ۵۷۴۔

عبید زاکانی: ۲۵۹۔

عرشی، امتیاز علی خاں: ۷۳، ۱۱۲، ۴۲۱، ۵۶۴۔

عرفی: ۱۳۴، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۴۷، ۳۱۲، ۳۱۵، ۳۹۷، ۳۹۸، ۴۱۰، ۶۰۴۔

عزیز: ۳۶۷۔

عشقی، شیخ محمد وجیہہ الدین: ۱۰۶، ۳۹۷، ۴۷۷، ۵۲۳، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۶۷، ۵۹۷، ۶۰۳۔

عطار، فرید الدین: ۳۸۴۔

عطاء اللہ محمد: ۱۴۲۔

عظیم، محمد عظیم: ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۸۳۔

علی ابراہیم: ۵۹۶، ۵۹۷۔

علی، میر ذوالفقار: ۵۳۳۔

عمادالملک، نواب: ۴۲، ۷۷، ۹۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۹، ۲۳۵، ۲۴۴، ۲۴۵، ۶۰۲۔

عمر خیام: ۳۸۴۔

عندلیب شادانی، ڈاکٹر: ۵۷۴۔

عیسیٰ: ۴۳۵۔

غالبؔ: ۱۳۷، ۵۲۵، ۵۳۴۔

غلام احمد: ۴۲۵۔

غلام حسن، میر: ۵۹۷۔

غمگینؔ: ۳۲۰۔

غنیؔ ۲۲۳، ۲۹۰۔

غواصیؔ ۱۴۳، ۲۳۰، ۳۵۵، ۳۸۴۔

فاروقی، خواجہ احمد: ۱۵۶، ۲۳۲۔

فاروقی، نثار احمد: ۴۸۴۔

فاطمہؓ: ۶۳۶، ۳۳۱، ۳۳۸، ۴۸۷۔

فائز دہلوی، نواب صدر الدین: ۱۴۵، ۱۴۹، ۳۵۶۔

فتوت، خواجہ عنایت اللہ خاں: ۸۶، ۳۹۴۔

فخر الدین، مولانا: ۴۹، ۵۴۱۔

فداؔ، لچھمی رام پنڈت: ۵۶۲۔

فدوی خاں: ۵۱، ۱۰۸، ۱۲۳۔

فدوی، شاہ محسن: ۱۴۷۔

فدوی، پنجابی: ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶۔

فدوی لاہوری: ۴۲۲، ۴۵۵، ۴۵۶، ۵۵۵۔

فراغ، میر مہدی حسن: ۳۰۱۔

فراقؔ گورکھپوری: ۱۹۹۔

فراق، مرزا مرتضیٰ قلی: ۱۴۶۔

فراق، ناصر نذیر: ۸۶۔

فراق، کنور کشور: ۴۵۔

فرخ سیر: ۱۰۲۔

فرہاد: ۴۰۴، ۶۱۲۔

فضل، شاہ فضل علی: ۱۴۹۔

فطرت، مرزا معز: ۱۴۶۔

فقیر، میر شمس الدین: ۸۱، ۱۳۸، ۱۴۶، ۳۹۰۔

فولادخاں
دیکھیے:
خاں، شیدی فولاد۔
فیاض الدین، افسر الدولہ: ۲۹۳۔
فیروز: ۳۵۵۔
فیضی: ۸۰، ۸۱، ۱۳۸، ۲۴۷، ۲۹۰۔
قاسم، قدرت اللہ: ۸۳، ۸۹، ۹۸، ۱۰۳، ۱۴۸، ۱۵۸، ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۷۵، ۳۹۸، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۵۳۴، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۵۳، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۶۲، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۷۴، ۵۸۵، ۵۹۶۔
قائم، قیام الدین: ۴۴، ۴۷، ۵۰، ۶۳، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۶، ۸۲، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۶۷، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۳۲۱، ۳۵۶، ۳۷۰، ۳۹۴، ۴۷۵، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۵۱۷، ۵۲۸، ۵۴۱، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۹۶، ۶۰۲، ۶۰۳۔
قتیل، مرزا: ۱۳۷، ۱۶۵۔
قدسی، حاجی محمد جان: ۸۳، ۱۰۳۔
قدوائی، صدیق الرحمٰن: ۳۲۵۔
قربان، میر جیون: ۵۶۵۔
قطب رازی: ۲۳۰۔
قطب، شاہ محمد قلی: ۱۴۳، ۳۸۴۔
قطب مشتری: ۳۵۵۔
قیس: ۴۰۴، ۵۶۸، ۶۱۲۔
کاظم، امام موسیٰ: ۲۴۹، ۲۵۱۔
کاظم، حکیم محمد میر: ۳۲۵، ۳۴۳۔
کالیلنکر، ڈاکٹر: ۲۳۔
کریم الدین: ۸۳، ۲۶۷، ۵۳۷، ۵۶۶، ۵۸۰۔
کسل سنگھ: ۵۲، ۵۳۔
کلاونت: ۶۶۔
کلیم: ۸۸، ۱۰۶، ۱۶۶۔
کمال اصفہانی: ۲۵۹۔
کمال، شاہ کمال الدین: ۷۳، ۹۰، ۱۲۵، ۵۲۶، ۵۲۹، ۵۴۱، ۵۴۹، ۵۵۳۔

کمترین، پیر خاں :۱۴۹، ۲۶۰۔
کیفی چریاکوٹی، مولوی محمد مبین: ۴۱۰۔
گارساں دتاسی: ۴۶، ۶۲، ۶۳، ۳۲۶، ۴۲۳۔
گردیزی، سید فتح علی حسینی: ۶۳، ۷۰، ۷۶، ۹۹، ۳۹۴، ۳۹۵، ۵۴۳۔
گرم: ۳۱۸۔
گلکرسٹ
دیکھیے:
جان گلکرسٹ۔
گماں، نذر علی خاں :۳۱۹۔
گمانی :۳۶۷۔
گنج شکر، بابا فرید: ۱۴۰۔
گیسو دراز، خواجہ بندہ نواز: ۱۴۰، ۱۴۳۔
لال کنور: ۵۰۔
لچھمی نرائن
دیکھیے:
شفیق، لچھمی نرائن۔
لطف، مرزا علی: ۹۰، ۹۱، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۶، ۱۳۷، ۲۶۶، ۲۸۳، ۲۸۴، ۴۸۰، ۵۶۵، ۵۶۷، ۵۶۸، ۶۰۴۔
لطفی :۲۳۰۔
ماہر، میر فخر الدین :۱۲۶، ۳۱۷، ۳۱۹، ۵۷۳، ۵۷۴۔
مالک رام: ۳۶۷، ۵۲۶۔
مبتلا، مردان علی خاں : ۸۹، ۹۰، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۶، ۲۶۷، ۳۹۸۔
مجذوب، میر غلام حیدر : ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۸۳، ۵۷۶، ۵۷۹، ۶۰۴۔
محب، شیخ ولی اللہ: ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۴، ۵۸۵۔
محمدؐ (آنحضرت) : ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۳۰، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۷۲، ۳۷۳، ۴۶۸، ، ۴۸۶۔
محمد اسلم: ۴۲۳۔
محمد اکرام: ۵۶۴۔
محمد بقا: ۲۶۶۔
محمد تقی اکبرآبادی، سید : ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۲۶۔

محمد حسن: ۱۷۔
محمد حمزہ، شاہ: ۱۲۶، ۱۵۶، ۶۰۴۔
محمد رضا: ۳۱۷، ۳۱۹۔
محمد ساجد: ۲۰۔
محمد شاہ: ۴۱، ۵۰، ۵۵، ۱۶۲۔
محمد سلیمان مرزا: ۵۸۰۔
محمد ہاشم: ۲۶، ۵۶۴۔
مختار الدولہ: ۲۹۴۔
مخلص، انند رام: ۱۴۶۔
مرتضیٰ قلی: ۹۷۔
مرزا احسن: ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹۔
مرزا بابر: ۱۱۰۔
مرزا بہلو: ۳۰۰۔
مرزا جان: ۵۴۹۔
مرزا شفیع: ۴۹، ۷۰، ۷۶، ۶۰۲۔
مرزا علی: ۳۰۰، ۴۸۲۔
مرزا گرامی: ۱۴۶۔
مرزا منو: ۵۲۔
مروّت، صغیر علی: ۶۰۰۔
مسکین، میر عبداللہ: ۳۲۰، ۳۴۵۔
میر سوز: ۱۸، ۷۳، ۷۴، ۸۶، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۵۵، ۲۸۹، ۳۶۰، ۴۰۵، ۴۳۷، ۴۶۸، ۴۸۶، ۵۵۴۔
مشتاق: ۲۳۰۔
مصحفی: ۴۷، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۳، ۱۴۴، ۲۶۰، ۲۷۵، ۲۹۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۵۶، ۳۹۹، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۴۴، ۴۸۱، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۵۶، ۵۶۴، ۵۶۸، ۵۷۴، ۵۸۰، ۵۹۹، ۶۰۳۔
مصدر: ۲۶۹۔
مضمون، شرف الدین: ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۳، ۲۱۱، ۵۲۶۔
معز اللہ، نواب: ۲۹۴۔
معین: ۵۸۷۔
مقبول، مقبول نبی خاں: ۹۸۔
مکند سنگھ، ہاوہ: ۶۹۔

مکین، مرزا فاخر: ۸۰، ۹۵، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۶۲، ۲۲۰، ۲۲۷، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۳۱۳، ۳۱۹، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۷۴۔

ملا وجہی: ۱۴۳، ۳۵۵، ۳۸۴۔

ملک خوشنود: ۲۳۰۔

ممتاز، فضل علی: ۴۸۴، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۳۔

ممتاز علی ابراہیم: ۴۸۴۔

ممنون، میر نظام الدین: ۵۴۹، ۵۵۰۔

منت، قمر الدین: ۴۷، ۶۰۳۔

منتظر، گنا بیگم: ۶۰۰۔

منشی تقدیر: ۴۶۲۔

منوچہر: ۲۷۔

موسیٰ: ۱۷۸، ۱۷۹۔

موزوں: ۱۴۹۔

مولانا روم: ۱۶۲، ۳۶۸، ۳۶۹۔

مومن خاں: ۴۲۴۔

مہر پرور: ۵۶۔

میاں نصیر: ۵۴۹۔

میر امانی
دیکھیے:
اسد میر امانی۔

میراجی: ۳۵۵۔

میر انیس: ۱۶۷۔

میر بخشی: ۴۶۲۔

میر، میر تقی: ۱۸، ۳۵، ۳۹، ۴۰، ۴۷، ۵۷، ۶۳، ۷۰، ۷۱، ۷۴، ۷۶، ۸۳، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۹، ۱۰۳، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۴۲، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۹، ۲۰۶، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۳۲، ۲۶۰، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۷، ۳۴۱، ۳۵۶، ۳۶۱، ۳۸۰، ۳۹۳، ۳۹۵، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۹، ۴۱۳، ۴۱۹، ۴۵۴، ۴۵۹، ۴۷۹، ۴۸۰، ۵۲۵، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۶۳، ۵۶۸، ۵۹۷، ۶۰۳۔

میر چھجو:۱۲۵۔

میر حسن: ۴۷،۷۵،۸۹،۹۰،۹۱،۹۳،
۹۴،۱۰۲،۱۰۶،۱۱۹،۱۴۰،۲۸۴،۲۹۶،
۲۹۸،۳۰۲، ۴۷۷،۴۸۰،۴۸۲،۴۸۴،
۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۴۰،
۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۵۴، ۵۵۶،
۵۶۴،۵۶۶،۵۸۵،۵۸۶،۵۸۸،۶۰۰

میر حسین:۴۲۲۔

میر زاہد:۱۲۳۔

میر قطبی:۳۶۷۔

میر محمد میر:۸۶،۳۹۴۔

میرزا جیون:۵۴۹۔

ناجی شاکر: ۱۴۳،۱۴۴،۱۴۹۔

نادر شاہ: ۲۳،۲۴،۳۲،۳۳،۳۴،۳۸،
۱۰۹،۱۱۰،۳۵۰،۵۶۷،۶۰۱۔

ناسخ، امام بخش:۱۲۸،۱۶۰،۲۲۳،۴۰۵۔

ناصر، سعادت خاں: ۵۵، ۶۳، ۷۱،
۸۲، ۱۱۶، ۲۷۱، ۲۷۵، ۲۸۳، ۲۸۷،
۲۹۰،۲۹۷،۴۰۶۔

ناصر علی:۴۶،۱۶۵،۲۲۳،۶۱۰۔

ناطق، قاضی لطف اللہ خاں:۲۹۳۔

ناظر، حیات خاں:۵۶۔

ناگل (کوئی بزرگ):۵۳۔

نالاں، میر احمد علی:۵۹۴،۵۹۵۔

نامی، میر تقی: ۲۶۸، ۲۷۵، ۲۷۶،
۲۷۷،۲۷۸۔

نثار، منشی سدا سکھ:۵۹۵۔

نجیب الدولہ :۱۱۱۔

ندرت کشمیری:۲۶۶،۲۷۱،۲۷۲،۲۷۳،
۳۸۹،۴۵۵۔

ندیم، مرزا علی قلی:۱۴۶،۳۱۹۔

نرپت سنگھ، راجا:۲۶۲،۳۵۶۔

نساخ، عبدالغفور: ۸۶، ۱۲۸، ۳۵۶،
۵۲۸، ۵۴۳، ۵۵۳، ۵۵۸، ۵۶۲،
۵۶۸،۵۷۳۔

نسیم، دیا شنکر:۵۲۸۔

نصرتی:۲۳،۳۵۵،۳۸۴۔

نصیر، شاہ:۱۶۰،۴۰۵۔

نظامی:۲۳۰،۳۵۵۔

نظیر:۵۹۶

نظیری، نیشا پوری: ۱۳۴، ۲۱۸، ۱۶۴، ۲۲۷، ۴۰۸۔

نعمت خاں: ۶۱۰۔

نقش علی: ۶۱، ۷۴، ۷۵، ۹۲، ۹۴، ۶۰۲۔

نور جہاں: ۳۰۔

نوری: ۲۳۰۔

نول کشور: ۸۶، ۱۰۶۔

وارستہ مل: ۱۳۶۔

واثق، میر بہادر علی: ۱۲۴۔

وجہی

دیکھیے:

ملا وجہی۔

وحشت، رضی علی: ۱۳۷۔

وحشت، میر ابوالحسن: ۵۹۶، ۵۹۷۔

وداد، سلمان قلی خاں: ۸۴، ۸۵، ۶۰۲۔

ولا، مظہر علی خاں: ۸۵۔

ولی اورنگ آبادی: ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۵، ۲۳۰، ۳۸۴۔

ولی اللہ، شاہ: ۲۸، ۴۱، ۴۷، ۴۹، ۳۰۵، ۳۰۶۔

ہاتف، میر علی: ۶۱، ۲۶۹۔

ہاشمی، میر ہاشم علی: ۵۹۹۔

ہدایت بخش، مرزا: ۱۱۰۔

ہدایت، ہدایت اللہ: ۴۷، ۸۵، ۲۷۹، ۵۶۵، ۶۰۳۔

ہندی، بھگوان داس: ۶۱، ۱۱۸، ۱۵۷، ۱۶۳۔

ہوس: ۵۷۴۔

یکتا، حکیم احمد علی خاں: ۹۳، ۱۰۷، ۱۵۷، ۱۶۳، ۲۶۶، ۴۰۰، ۵۶۴۔

یکتا، احمد یار خاں: ۵۶۴۔

یکرنگ، غلام مصطفےٰ خاں: ۱۴۸، ۳۱۹، ۵۲۶۔

یکرو، عبدالوہاب: ۱۴۷۔

یزید: ۳۰۷۔

یقین، انعام اللہ خاں: ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۸، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۶، ۳۹۳، ۳۹۵، ۴۷۸، ۵۲۶، ۵۲۸، ۶۰۹۔

مقامات

آگرہ:۲۷، ۳۴۔

اٹاوہ:۹۸۔

احمد نگر:۲۸۔

اڑیسہ:۳۰، ۳۴۔

استنبول:۴۶، ۳۴۹۔

اسطرآباد:۵۶۷۔

اصفہان:۴۶، ۳۴۹۔

افغانستان:۴۱۔

اکبرآباد:۵۳۳۔

الہ آباد:۱۱۲، ۵۸۵، ۵۹۵۔

امروہہ: ۵۶۴۔

امین آباد:۱۲۳۔

انبالہ:۵۷۹۔

انگوری باغ: ۵۰۔

اودھ : ۲۰، ۴۷، ۸۷، ۹۶، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۳، ۲۲۰، ۶۰۳۔

اورنگ آباد:۶۸۔

ایران : ۴۱، ۷۹، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۶۳، ۲۳۰، ۲۳۱، ۵۲۵، ۵۶۷۔

بحراوقیانوس:۳۰۔

بخارا: ۶۱، ۶۲، ۶۰۲۔

بدایوں:۵۸۵۔

بدخشاں:۶۸۔

برنگھم:۲۰۔

برہان پور:۶۸۔

بریلی:۵۳۸، ۵۶۲۔

بسولی:۱۱۴۔

بلخ:۶۸۔

بنارس:۵۹۶۔

بنگال:۳۰، ۳۱۔

بہار:۳۴۔

پاکستان:۵۶۳۔

پانی پت: ۴۲، ۱۱۱۔

پٹنہ: ۴۸۸۔

پنجاب:۲۸، ۳۱۔

پیرس:۵۶۔

ترکستان:۴۱۔

ٹانڈہ:۱۱۴۔

جنگلی گنج:۱۲۳۔

چاندپور:۵۶۴۔

چاندنی چوک:۳۵۔

چپور:۳۰۔

چوک سعداللہ خاں:۳۳۔

حبیب گنج:۱۸، ۴۲۰۔

حیدرآباد:۵۶۷، ۵۸۹۔

خالصہ:۳۱، ۳۸۔

خراسان:۴۱۔

خوارزم:۵۴۹۔

خیرآباد:۵۸۵۔

دہلی:۲۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۷، ۵۱، ۵۶، ۵۷، ۶۱، ۶۲، ۷۰، ۷۲، ۷۷، ۷۸، ۹۱، ۹۶، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۳۴، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۹۳، ۲۲۰، ۲۳۲، ۲۷۱، ۲۷۶، ۲۸۳، ۳۱۲، ۳۱۶، ۳۲۱، ۳۴۷، ۳۵۰، ۳۵۲، ۵۴۰، ۵۴۴، ۵۵۳، ۵۵۶، ۵۶۲، ۵۶۴، ۵۶۷، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۸، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳۔

دیبھ گڑھ:۳۳۔

ڈھاکہ:۳۰۔

رام پور:۳۲، ۱۴۴، ۴۸۴، ۵۶۴۔

سرائے بانکرمئو:۵۳۳۔

سمت برج:۵۰۔

سنبھل:۲۹، ۵۶۴۔

سندھ:۳۴۔

سونرگاؤں:۳۰۔

سہارنپور:۵۴۰۔

شاہ آباد:۲۹۔

شاہجہاں آباد: ۳۳، ۵۰، ۷۲، ۱۱۸، ۱۴۱، ۱۴۳، ۲۶۴، ۳۵۲، ۳۵۶، ۳۹۳، ۴۵۵، ۵۳۳، ۵۴۱، ۵۶۷۔

شمس آباد مئو:۵۵۴۔

صفدر جنگ:۴۷، ۱۱۰۔

عظیم آباد:۶۷، ۵۶۷، ۵۸۵، ۵۹۴۔

علی گڑھ: ۳۴۶، ۴۲۰۔

فرخ آباد: ۱۷، ۴۷، ۷۵، ۹۱، ۹۴، ۹۸، ۱۰۰، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۲۶۷، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۹۷، ۳۲۱، ۵۵۶، ۵۸۰، ۶۰۳۔

فیض آباد: ۷۵، ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۲۸۵، ۲۹۰، ۶۰۳، ۶۰۴۔

قندھار: ۶۸۔

کابل: ۶۱، ۶۲، ۶۰۲۔

کانگڑھ: ۵۶۸۔

کشمیر: ۲۹۔

کرناٹک: ۳۱۔

کڑاں میرپور: ۲۹۔

کسل پورہ: ۵۳۔

کلکتہ: ۳۲۵، ۴۲۳، ۵۶۷، ۶۰۶۔

لاہور: ۶۸، ۳۴۲۔

لکھنؤ: ۱۵، ۵۷، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۱۱۰، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۵۲، ۱۵۸، ۲۷۵، ۲۹۰، ۲۹۷، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۲۴، ۴۲۲، ۵۲۷، ۵۲۹، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۴۹، ۵۵۳، ۵۶۲، ۵۶۷، ۵۷۴، ۵۸۰، ۵۸۵، ۵۹۰، ۶۰۲، ۶۰۴۔

لندن: ۲۰، ۱۲۳، ۱۴۵۔

متھرا: ۵۴۴، ۶۰۳۔

محمدآباد: ۵۹۶۔

مرادآباد: ۲۹، ۵۶۴۔

مرشدآباد: ۵۳۴، ۵۶۷، ۵۹۴۔

مینو: ۵۹۶۔

نخاس: ۳۳۔

نگینہ: ۵۶۴۔

ہندوستان: ۱۹، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۴۳، ۴۷، ۵۱، ۶۱، ۷۰، ۷۱، ۷۹، ۸۱، ۸۹، ۱۱۱، ۱۱۶، ۱۲۸، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۲۸۷، ۲۹۷، ۳۱۴، ۳۱۷، ۳۲۵، ۳۴۱، ۳۸۱، ۳۹۰، ۳۹۱، ۵۴۹، ۵۵۸، ۵۶۳، ۵۷۹، ۶۰۲۔

کتابیں اور رسالے

آبِ حیات: ۹۸، ۲۲۳، ۲۸۷، ۳۲۴، ۴۰۷۔
ابراہیم نامہ: ۳۵۵۔
اردو ادب: ۴۲۱۔
ارشاد نامہ: ۳۵۵۔
اورنگ زیب: ۳۵۶۔
باغ معانی: ۴۷، ۹۲، ۶۰۲۔
بدیع الجمال: ۳۵۵۔
بہار عجم: ۱۳۵۔
پدم راؤ کدم: ۳۵۵۔
پنج رقعہ: ۲۲۳۔
پھول بن: ۳۵۵۔
تاریخ ادب اردو: ۴۰۹۔
تاریخ عالمگیر ثانی: ۴۲۔
تاریخ فرخ آباد: ۱۱۲۔
تاریخ لکھنؤ: ۱۲۳۔
تذکرہ: ۴۱۷۔
تذکرہ خوش معرکۂ زیبا: ۲۸۷۔
تذکرۂ شعرائے اردو: ۴۷، ۹۰، ۵۶۴۔
تذکرۂ قائم: ۶۲۔
تذکرۂ گردیزی: ۸۹۔
تذکرۂ مجمع الانتخاب: ۴۶، ۶۳۔
تذکرۂ مسرت افزا: ۸۸، ۹۰۔
تذکرۂ ہندی: ۲۷۵، ۴۰۵، ۴۰۶۔
تلامذۂ غالب: ۵۲۶۔
توصیف نامہ میراں محی الدین: ۳۵۵۔
چمنستانِ شعرا: ۱۵۵، ۳۲۱۔
چنداں: ۳۵۵۔
چہار باغ: ۹۴۔
حجت البقا: ۳۵۵۔
خزانۂ عامرہ: ۱۱۲۔
خوش نامہ: ۳۵۵۔
خوش نغز: ۳۵۵۔
دریائے لطافت: ۴۰۱۔
دستور الفصاحت: ۴۰۰۔
دیوانِ زادہ: ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۲، ۵۲۶۔
دیوانِ سوز: ۲۸۹۔
دیوانِ ضاحک: ۳۰۲۔
دیوانِ قائم: ۴۸۴۔
دیوانِ مرزا رفیع سودا: ۴۲۲۔
دیوانِ میر حسن: ۳۰۲۔

دیوانِ ولی : ۱۳۹، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۴۳۰۔

دیوانِ یقین ۴۳۰، ۴۷۸، ۴۷۹۔

ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان : ۶۴۔

ذکرِ میر: ۵۲۵۔

ریاض حسنی: ۳۹۴۔

سبیلِ ہدایت: ۷۸، ۱۹۴، ۲۶۸، ۲۷۵، ۲۷۶، ۴۱۹۔

سکندر نامہ: ۳۵۵۔

سودا: ۱۹۔

سیر المتاخرین: ۵۵۔

سیف الملوک: ۳۵۵۔

شاہ نامہ: ۳۵۵۔

شریں خسرو: ۳۵۵۔

شعلۂ عشق: ۴۱۸، ۴۱۹۔

شکار نامہ: ۳۶۱۔

شہادت التحقیق: ۳۵۵۔

شہادت الحقیقت: ۳۵۵۔

صبا: ۴۲۱۔

طورِ کلیم: ۲۳۳۔

طوطی نامہ: ۳۵۵، ۳۵۶۔

ظفر نامہ: ۳۵۶۔

عبرت الغافلین: ۷۰، ۷۸، ۹۵، ۱۶۲، ۱۹۴، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۴۱۹، ۴۲۴۔

عقد ثریا: ۱۳۹، ۳۱۲، ۴۰۵۔

غرائب اللغات: ۱۳۵۔

غیاث اللغات: ۱۳۵۔

فص الکلمات: ۱۵۶۔

قرآن شریف: ۲۲۴، ۳۰۹، ۵۸۸۔

قصر اللطائف: ۱۲۴۔

قصہ حقیقت برآمدنِ نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد: ۳۲۔

قولِ فیصل: ۱۳۷۔

کلیاتِ سودا: ۶۱، ۷۲، ۷۳، ۸۶، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۸، ۱۵۵، ۱۷۳، ۲۱۱، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۸۰، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۹، ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۲۱، ۳۲۵، ۳۵۷، ۳۶۹، ۳۹۲، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۳۰، ۴۶۸، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۲، ۴۸۴، ۵۱۸، ۵۲۹، ۶۰۳، ۶۰۶۔

کلیاتِ میر: ۱۰۷، ۲۸۰۔

گلِ عجائب: ۳۹۶۔
گلزارابراہیم: ۵۹۷۔
گلستاں: ۲۲۳۔
گلشنِ بےخار: ۲۳۳۔
گلشنِ عشق: ۳۵۵۔
گلشنِ گفتار: ۳۹۳۔
گلشنِ ہند: ۹۰، ۹۱، ۱۱۸، ۵۶۷۔
گلکرسٹ اوراس کا عہد: ۴۲۳۔
گنجِ تواریخ: ۱۲۸۔
لودک: ۳۵۵۔
لیلیٰ مجنوں: ۳۵۵۔
مثنوی گلزارِنسیم: ۵۲۸۔
مثنوی مولانا روم: ۳۵۵۔
مجالسِ رنگین: ۱۰۳، ۴۰۲۔
مجموعۂ نغز: ۱۰۳، ۲۶۶، ۴۱۷، ۴۱۸۔
مخزن نکات: ۹۷، ۵۶۴، ۶۰۲۔
مرغوب القلوب: ۳۵۵۔
مصطلحات: ۱۳۵۔
مطلع السعدین: ۱۳۶۔
معاصر: ۲۹۳۔
معدن السعادت: ۴۰۰۔
مقالات الشعرا: ۱۱۱۔
منفعت الایمان: ۳۵۵۔
نسیم الکلام: ۳۵۵۔
نشترِ عشق: ۷۹، ۱۱۱، ۱۵۶۔
نقوش: ۳۴۲۔
نکاتِ الشعرا: ۸۳، ۸۷، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۲۷۸، ۳۹۳، ۴۷۹، ۵۴۳، ۶۰۳۔
نوسرہار: ۳۵۵۔
نوائے ادب: ۴۸۸۔
وصیت الہادی: ۳۵۵۔
یوسف زلیخا: ۳۵۵۔

☆

☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

انیس (سوانح)

مصنف:
نیر مسعود
صفحات: 472
قیمت:-/174 روپے

جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن

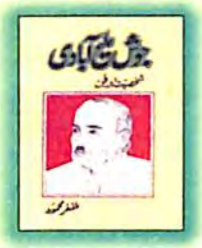

مصنف:
ظفر محمود
صفحات: 108
قیمت:-/38 روپے

حیاتِ جاوید

مصنف:
مولانا الطاف حسین حالی
صفحات: 908
قیمت:-/167 روپے

ابوالکلام آزاد

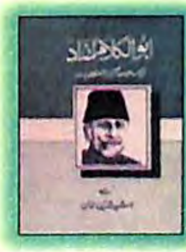

مرتب:
رشید الدین خان
صفحات: 684
قیمت:-/58 روپے

ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار

مرتب:
ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
صفحات: 400
قیمت:-/70 روپے

پریم چند با تصویر سوانح

مرتب:
کمل کشور گوئینکا
مترجم
ڈاکٹر اجے مالوی
صفحات: 103
قیمت:-/54 روپے

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066